



# جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ ملی کامہوار علمی و ادبی رسالہ



زیر ادارت

مولانا اسلم جبراجپوری

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ایس پی ایچ ڈی



نفت المذنبین

# جہاز

جلد ۱ | ماہِ محرم ۱۳۴۶ھ مطابق جولائی ۱۹۲۷ء | نمبر ۱

## فہرست مضامین

محمود حسین خاں صاحب متعلم جامعہ	بی سیاست خارجیہ
یوسف حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ) حال متعلم پیرس یونیورسٹی	انفرانسیسی ادبیات میں
حضرت مومن ٹوکی استاد جامعہ	توضیحیں
سید محمد عمر صاحب بی اے (ٹوکیو جاپان) رکن جمعیتہ ہائے	مجمعی
[ہندو سین المانی (برلن) و ہندو سین برق (نیویارک)]	
ڈاکٹر احمد محمد الدین پروفیسر زبان ترکی لائبرگ یونیورسٹی	ان میں جدید تمدنی تحریک
نہال سٹائے (ترجمہ)	انگریز زمین (فسانہ)
.....	سیاسات
.....	وجہ
.....	شذرات

# برطانوی سیاست خارجہ

کہتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ میں سوچ کبھی نہیں ڈوبتا۔ پھر جتنی یہ سلطنت وسیع ہوتا ہی اسکی سیاسی نشہ دو انہوں کا پھیلاؤ ہے۔ دنیا کا کوئی حصہ نہیں جہاں براہ راست یا بالواسطہ اس سلطنت کے اغراض کا سوال نہ پیدا ہوتا ہو، پھر جتنا اس کے اغراض اور اثر کا رقبہ وسیع ہو اسی قدر اس کی سیاست گہری ہے۔ اس لئے برطانوی سلطنت کی سیاست خارجہ پر کوئی تفصیلی بحث ایک مختصر سے مضمون میں کیے ممکن ہو۔ بطور ذیل کا مقصد بھی یہ نہیں ہے بلکہ صرف اس قدر کہ اس سیاست کے موجودہ مسائل کے اہم گنواؤں سے جانیں تاکہ پھر ہر مسئلہ پر بعد کو جدا جدا بحث ہو سکے۔

ہر شخص جو سیاست عالم سے کچھ بھی واقف ہو دیکھ سکتا ہے کہ گذشتہ جنگ کے بعد سے برطانوی سیاست خارجہ کا رخ بالکل پلٹ گیا ہے۔ جنگ سے پہلے اس سیاست کا مرکز بر غظم یورپ کی دہل عظمیٰ اور برطانیہ کی تعلقات میں مضمر تھا۔ پہلے فرانس سے، پھر فرانس اور روس سے، اس کے بعد جرمنی سے جنگ نے کچھ عرصہ کے لئے تو ان میں دو طاقتوں کو یعنی جرمنی اور روس کو یکساں کر دیا ہے۔ تیسری طاقت فرانس، جسکے آج یورپ میں سب سے قوی فوجی طاقت ہو۔ لیکن برطانیہ کی بحری قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے پاس کافی بیڑہ نہیں۔

برطانیہ کی سلطنت کی اساس اسکی بحری قوت ہو۔ اس کے وجود کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ سلطنت کے حصوں میں جو ایک دوسرے سے بہت دور ہیں ذرائع آمد و رفت قائم رہیں اور صرف جزائر برطانیہ ہی نہیں بلکہ دوسری برطانوی قومیں یعنی نوآبادیاں بھی دشمن کی زد سے محفوظ رہیں۔ اس ساری دنیا میں پھیلی ہوئی سلطنت کے لئے اگر کوئی خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے تو وہی جس کے پاس طاقت ور بیڑا ہو

زیٹھلگراور واٹرلو کے معرکوں کے بعد کوئی ایک صدی تک برطانوی پھر برطانوف رقیب دنیا کے سمندروں پر اڑتا رہا۔ اد کہیں بیسویں صدی کے شروع میں جرمنی کے بیڑے نے رقابت کا قد پیدا کیا۔ انگلستان نے اس خطرہ کو فوراً پہچاننا۔ جرمنی سے اتحاد کی کوشش کی۔ اسکی بحری قوت میں اضافہ کی رفتار پر پابندیاں عائد کرنی چاہیں اور جب دونوں باتیں نہ ہو سکیں تو اپنی ساری سیاست کا مقصد یہ قرار دے دیا کہ اس حریف کو

بے ضرر بنا دیا جائے۔ قرانیاں کر کے اپنے سابق دشمن فرانس اور روس سے اتحاد کیا اور اسی ترکیبیں کیں کہ گذشتہ جنگ میں دنیا کا بڑا حصہ جرمنی کے خلاف صف آرا تھا اور ماری دنیا نے جرمنوں سے جنگ کر کے انگریزوں کو اس بحری خطرہ سے نجات دلائی!۔

لیکن اسی جنگ کے دوران میں دو حریف اور پیدا ہو گئے، یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان۔ جنگ نے ان دونوں ملکوں کی مالی اور بحری قوت کو برابر بنا دیا ہے۔ اور انگریزوں کی تعمیر کا کام اسی رفتار سے ہوتا رہا تو ان کے پاس ایسے بڑے ہوں گے کہ دنیا نے آجک خیال میں بھی نہ دیکھے ہوں۔ ان دونوں ملکوں کی بحری قوت میں ترقی کا جو حال ہے اس نے انگلستان کی ریاست کو اپنے پرانے معیار قوت بحری سے کبھی "ر دیا ہے۔ پہلے یہ اصول تھا کہ برطانوی بیڑا دسب سے بڑی بحری قوتوں کی مجموعی طاقت سے کم نہ ہونا چاہئے۔ اب معیار یہ رہ گیا ہے کہ اپنا بیڑا کسی دوسرے ملک سے کم نہ ہو۔ لیکن اگر سلطنت کو قائم رکھنا ہے تو اب اس سے نیچے اتنا ممکن نہیں۔

نہیں پہلا مسئلہ تونس کا مسئلہ ہے۔ سفید اور پیلی نیلیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ بحر الکاہل کے مغربی ساحل پر چین و جاپان، پیلی نسل آباد ہے۔ مشرقی اور جنوبی ساحلوں پر سفید مشرق میں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا جنوب میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ۔ اس مسئلہ میں امریکہ اور ان نوآبادیوں کی انگریزی آبادی بالکل متحدہ خیال ہے۔ اگر امریکہ کو یہ منظور نہیں کہ ملک کی سب آبادی۔ کا رگزار لیکن کم احتیاج جاپانیوں کا سیلاب بر باد کر دے تو کینیڈا اور آسٹریلیا بھی اس کے ہمنوا ہیں۔ ان ملک کو سفید نسل کے قبضہ میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ پیلی نسل کو الگ ہی الگ رکھا جائے۔ امریکہ اور برطانوی نوآبادیاں دونوں اس حکم کو اصول موضوعہ کی طرح مانتے ہیں۔ آسٹریلیا اور کناڈا اس معاملہ میں امریکہ کے ایسے ساتھ ہیں کہ اگر بعض محال انگلستان کو خلا ہو جائے تو ان دونوں نوآبادیوں کے سلطنت برطانیہ سے جدا ہو جائیکہ خاصہ اندیشہ ہے۔

دوسرا مسئلہ چین کے مستقبل کا ہے۔ یہاں امریکہ اور جاپان ٹکر کھاتے ہیں جاپان کا چھوٹا سا ملک اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں۔ وہ اب کہیں اور جگہ چاہتی ہے اور سب سے قریب چین کا وسیع اور زرخیز ملک ہے۔ ۱۹۰۴-۵ء کی جنگ روس و جاپان کے بعد کو ریا پر قبضہ کر کے اس آرزو سے توسیع کو لین







دی گئی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ عظیم کے شروع ہونے پر جاپان نے کیا ڈچاؤ لے لیا اور شائع میں قدم چلے اور اپنے ”۲۱ مطالبات“ سے کل چین ہی کو جاپان کی باغداد ریاست بنانے کی فکر کی تھی لیکن امریکہ اور انگلستان کی مخالفت نے بات نہ بنے دی۔

تیسرا مسئلہ بحرالکاہل میں اقتدار کا مسئلہ ہے۔ سرچند پیکلہ زیادہ تر جاپان اور امریکہ کا مسئلہ ہے تاہم اس سمندری میں چونکہ کنیڈا، اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے سوا مل بھی ہیں۔ دوسرے ہندوستان میں اقتدار قائم رکھنے کیلئے بھی اس سمندریں کافی طاقت ہونا ضروری ہے۔ اس لئے برطانیہ کو بحرالکاہل کے مسئلہ سے بہت تعلق ہے۔ امریکہ کا تعلق چونکہ براعظم ایشیا سے روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے اور جزائر فلپائن اس کی نوآبادی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ بحرالکاہل میں امریکہ کے جہازوں اور کیسل کی راہ میں کوئی حیر حاصل نہ ہو۔ خط استوا کے شمال میں جاپان کو سابق جرمن مقبوضات کا نگران رہنے اور بحری تاروں کے مرکز جاپ کو جاپان کے سپرد ہوجانے سے امریکہ کے اس آمد و رفت کی راہ میں خطرے پیدا ہو گئے ہیں۔ سلطنت برطانیہ کی سیاست خارجہ کا سب سے اہم مسئلہ ہی امریکہ اور جاپان سے تعلق کا مسئلہ ہے۔ سلطنت اور تیاری جنگ میں امریکہ کا مقابلہ کرنا زیادہ متعجب نہیں معلوم ہوتا۔ ایک تو اس سے برطانوی مالیات پر تقریباً ناقابل برداشت بار پڑے گا۔ دوسرے خود امریکہ کے مالی ذرائع آج کم و بیش اٹھا نظر آتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسا کیا گیا تو مخالفتیں جو پہلے سے موجود ہیں زیادہ شدید ہو جائیں گی اور باہمی جنگ کا اندیشہ قریب تر ہو جائے گا۔ موجودہ مخالفتیں زیادہ تر معاشی مخالفتیں ہیں۔ دوران جنگ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صنعت و جہاز سازی، تجارت و جہاز رانی میں حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور آج ان میدانوں میں انگلستان کی سب سے توی حریف ہیں۔ ایک مقروض قوم سے امریکہ آج دنیا کی سب سے بڑی قرض خواہ قوم ہو گئی ہے اور ساری دنیا کی ساموکاری کے منصب پر انگلستان کو تیار ہی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے تیل کے ذخائر کے لئے بھی دونوں قوموں میں خوب روش و شور سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور تیل کا مسئلہ صرف معاشی نفع نقصان کا مسئلہ نہیں بلکہ جہازوں میں ایندھن کے طور پر تیل زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے تیل کے ذخائر کا ہاتھ میں ہونا بحری قوت کی بقا کی ضمانت ہے۔ عراق کے تیل کے ذخائر کے متعلق یہ اختلاف ظاہر ہوا۔ کیونکہ

ماں ریمو کے معاہدہ کی رودے تو انگلستان کو جب عراق کی نگرانی سپرد کی گئی تو تیل بھی انگلستان کو دیا گیا تھا لیکن امریکہ نے اس کے خلاف صدر نے اجتماع بلند کی۔ نیز اس کے خلاف بھی جب حالیہ ملکی بڑی تیل کی کمپنی "رائل ڈچ" ROYAL DUTCH کو جو تاتسوا گریزی انڈیا میں ہے سائٹرا میں بھی کے تیل کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اسپر امریکہ نے مطالبہ کیا کہ امریکن مفاد کی حامل اسٹینڈرڈ آئل کمپنی STANDARD OIL Co. کے ساتھ بھی مساوی رعایات ہونی چاہئیں۔ انگلستان اور امریکہ کے باہمی تعلقات پلاؤڈالنے والا ایک عنصر کزنلینڈ کا مسئلہ بھی تھا، کیونکہ امریکہ کی آبادی میں متعدد عنصر کزنل کے لوگوں کا ہے۔ اگرچہ مسئلہ تقسیم بڑا صاف ہو چلا ہے تاہم اب بھی کسی وقت ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن سے دونوں قوموں کے تعلق پر اثر پڑے۔

برطانیہ کی سیاست خارجہ کا قریبی مقصد یہ ہے کہ امریکہ سے مخالفت کی باتیں حتیٰ الوسع کم کر کے اڈبھی مجھوتہ سے بھری جنگ کی تیاریوں پر حدود عامہ کر کے دوستانہ تعلقات اور پرامن تعاون کی تدابیر کالی جائیں۔

اس کوشش کی کامیابی میں جاپان اور انگلستان کے تعلقات حائل ہوتے ہیں۔ اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاپان کا دوست رہ کر برطانیہ امریکہ کے ساتھ چل سکتا ہے یا نہیں، جاپان اور انگلستان میں ۱۸ سال سے اور جو دوستانہ معاہدہ رہا ہے اس سے انگلستان کو بہت فائدہ ہوا جنگ عظیم میں جاپان کی تو برطانیہ کے ایشیائی مقبوضات کے لئے پشت پناہ ثابت ہوئی کیا وچاؤ دشمن سے بلا انگریزی قربانیوں کے چین لیا گیا۔ اسٹریٹیا اور رینڈی لینڈ کی جو جپان کی جنگی جہازوں کی پناہ میں میدان جنگ میں پہنچیں لیکن جب اس معاہدہ کی تجدید کا وقت آیا تو امریکہ کی ناپسندیدگی کا اظہار ہونے لگا۔ برطانوی سلطنت کی جو کانفرنس ۱۹۳۱ء میں ہوئی اس میں معلوم ہوا کہ خود برطانوی نوآبادیوں کے نمائندے بھی اس معاہدہ کے متعلق متیقن انجیال نہیں ہیں کیونکہ اس کے نمائندے نے اپنے ملک کی رائے عامہ کے مطابق تجدید معاہدہ کی مخالفت کی بار بار اسپرٹشس ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور بالآخر انگلستان کے زمین لاٹو چائلر نے یہ فیصلہ منوگائی کی کہ معاہدہ میں تجدید کی کوئی ضرورت ہی نہیں وہ یوں ہی چل سکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کا کوئی حل نہ ہوا بلکہ معاہدہ صرف ملتوی ہو گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ معاہدہ کی جو قدر وقت انگلستان

دور جرمن بیڑہ کی تباہی کے باعث بہت سی آگنی تھی۔ اور نہ تو بایاں امریکہ سے آگاہ  
 چین سے معاہدہ کی تجدید کے سخت خلاف تھیں۔ اب اس معاہدہ کو قائم رکھنے کی خواہش  
 اگر تھی تو جاپان کو۔ اور اس لئے جب سلطنت کی کانفرنس میں معاہدہ طبعی طور پر طے نہیں کیا گیا بلکہ یہ قرار پایا کہ  
 معاہدہ ابھی سال بھر نہیں چل سکتا ہے تو اسے جاپان نے اپنے فائدہ کی بات سمجھا۔ لیکن انگلستان کا مقصد  
 صاف ظاہر ہو گیا۔ وہ ایک طرف تو جاپان کو بھی بالکل چھوڑنا نہیں چاہتا اور دوسری طرف امریکہ سے قریب  
 ہو کر انگریزی زبان بولنے والی قوموں کا اتحاد قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور امریکہ کا رخ یورپ کی نسبت ایشیا  
 کی طرف زیادہ ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی جاپان کے اقتدار کو مشرقی ایشیا میں بڑھے نہیں دینا چاہتا لیکن جنگ  
 کافی الحال کوئی خواہشمند نہیں۔ جاپان اس لئے نہیں کہ ابھی اپنے کو کمزور پاتا ہے امریکہ اس وجہ سے نہیں  
 کہ وہ جنگ میں جو حاصل کر چکا وہ پر امن ترقی میں بھی حاصل کر سکتا ہے۔ انگلستان اس واسطے نہیں کہ خود  
 اپنی سلطنت کے مسائل اور شرق قریب اور افریقہ کی جمید گیاں اسکے لئے کافی ہیں اور یہ غیر متیقن بات ہے  
 کہ اگر خود امریکہ سے جنگ ہوگئی تو با اگر امریکہ اور جاپان میں جنگ ہوئی اور امریکہ کی مدد کرنی پڑی تو سلطنت  
 کے لئے کیا خاص فوائد مرتب ہونگے۔ اسی وجہ سے انگلستان میں امریکہ جاپان اور انگلستان کے طرف  
 سمجھوتہ کا خیال پیدا ہوا۔ اور وہ صدر جمہوریہ امریکہ ہارڈنگ نے واشنگٹن میں ایک مجلس متفقہ کی جس میں انگلستان  
 اور جاپان ہی کو نہیں بلکہ چین، فرانس اور آسٹریلیا کو بھی مدعو کیا۔ اول الذکر چار طاقتوں میں معاہدہ جزائر بحر الکاہل کو متعلق  
 معاہدہ ہو گیا یہ انگریزی جاپانی معاہدہ ختم ہو گیا، جاپان کے توسیعی حوصلے دب گئے، اور بحری سمجھوتہ کے ذریعہ بیڑوں  
 میں اضافہ پر حدود و حدود کی گئیں واشنگٹن کانفرنس کے نتائج کی تفصیل میں جانا یہاں مقصود نہیں۔ اس سے  
 یہ ضرور ہوا کہ معاملہ کافی دنوں کو ٹل گیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ برطانوی سیاست خارجہ کا سب سے اہم کام  
 اب یہی ہے کہ امریکہ سے دوستی کو قائم رکھ کر جاپان کو بھی مخالف نہ ہونے دے۔ کام مکمل ہے۔ لیکن برطانوی  
 سیاست کی تاریخ اس قسم کے شکل کاموں سے خالی نہیں ہے۔ اور اگرچہ برطانوی سیاست میں اس معاہدہ  
 میں ادھکائی ہے اور خندق قائم انہوں نے اپنے قومی مفاد کے لئے ہمیشہ جس زیر کی کافورت دیا ہے اس  
 سے بعینہ نہیں کہ اس صورت حال سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

جہاں تک یورپ میں برطانوی سیاست کا تعلق ہے فرانس سے تعلقات کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔ دونوں قوموں کی وہ طویل کشیدگی جو ۱۸۰۴ء میں نشو و نما کے واقعہ کی شکل میں فرانس کے لئے بڑی ذلت کا سامان ہوا کر چکی تھی۔ ۸ مارچ ۱۸۰۲ء کے معاہدہ مراکو کے بعد سے غلصہ نہ دوستی میں بدل گئی تھی۔ یہ اختلاف جنگ کے دوران میں تو قائم رہا ہی اور آج بھی مضابطہ کے طور پر جاری ہے۔ لیکن ۱۸۰۲ء کے عہد نامہ وارسائی کے بعد سے اس دوستی کی سخت آزمائشیں ہوئی ہیں۔ برعظمیٰ کے تعلقات اور شرق قریب کے مسائل میں دونوں ملکوں میں انفرنس کا بہت تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ برعظمیٰ میں خصوصاً اس لئے کہ انگلستان تو چاہتا ہے کہ یورپ میں تجارت کو فروغ ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مفتوح اقوام کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہو جائے۔ انگلستان عام معاشی حالت کی اصلاح کو اس سے زیادہ اہم سمجھتا ہے کہ جرمنی سے کچھ رقم بطور تادان وصول کیجائے۔ لیکن فرانس کو یہ ڈر لگا ہے کہ جرمنی کہیں پھر مضبوط نہ ہو جائے۔ وہ تو جرمنی کو آساکر در کر دینا چاہتا ہے کہ پھر اس سے کسی قسم کا فائدہ نہ رہے۔ اسی وجہ سے اس نے رہائے کے علاقہ کو فرانس میں مضیم کر نگی تاکہ کام کو کشش کی، مغرب کے صنعتی اور کوئلہ والے علاقے جرمن سے علیحدہ کرنے چاہے۔ روس اور جرمنی کے درمیان پولینڈ کو فاصل بنایا جو کم دیش فرانس کی ایک ماتحت ریاست ہو اور برعظمیٰ فرانس کی فوجی قوت کا سہارا اس کے علاوہ فرانس یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنی مالیات کو درست کر نی کے لئے جرمنی سے جو کچھ وصول کر سکے۔ تادان کی شکل میں وصول کر لے جرمنی اور انگلستان کے تعلقات میں جنگ سے پہلے تو برطانوی سیاست کا مقصد جدید سمندریں جرمنی کے اثر اور اقتدار کو توڑنا تھا چنانچہ جنگ میں شکست کے بعد جرمنی کے پاس جنگی اور تجارتی بیڑہ بس نام ہی کو چھوڑ گیا، نوآبادیاں سب کی سب چھین لی گئیں۔ استلانی طاقتوں کے مقبوضات میں جرمنی کی جواہر لک تھیں اور جو حقوق تھے سب تلف کر دئے گئے نیز تمام جرمن کیل اس کے قبضہ کی کال لئے گئے استلانی طاقتوں سے تمام جرمنوں کو خارج کر دیا گیا۔ جب آنا مجبور کر لیا اور دل کھول کر نیا دکھالیا تو سیاست کا رخ بدلا جرمن سلطنت اور جرمن حیثیت کو اور تباہ کرنے میں اب انگلستان کا نقصان ہے۔ انگلستان کبھی یہ نہیں چاہتا کہ برعظمیٰ میں کسی ایک طاقت کو ایسا اقتدار حاصل ہو جائے کہ اس کا توازن کسی دوسری طاقت کے ذریعہ نہ ہو سکے اگر جرمنی کے اور حصے بخرے ہوئے اور جرمنی سے اس کے صنعتی علاقے اور اجناس خام کے ذخائر چھینے گئے تو پھر

فرانس کی بڑھتی ہوئی فوجی قوت کے مقابلہ کے لئے جرمنی کو کیسے استعمال کیا جاسکتا گا؟ جرمن معاشی زندگی کے انحطاط سے خود انگلستان کی معیشت پر بڑا اثر پڑے گا۔ برطانیہ کی سیاست خارجہ ان وجوہ ہے اب یہ چاہتی ہے کہ جرمنی کی طاقت میں کوئی مزید کمی نہ واقع ہو اور اس کی معاشی حالت ایسی ہو جائے کہ سلطنت برطانیہ سے تجارتی لین دین ہو سکے۔ البتہ یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ پھر کوئی ایسا موقع نہ دیا جائے کہ جرمنی خطرناک مقابل کی صورت اختیار کر سکے۔

روس اور انگلستان تو دراصل ہمیشہ بڑے دشمن رہے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی سیاسی ہنرمندی تھی کہ جنگ عظیم میں روس اور انگلستان کے دوش بدوش تھما لئے۔ انقلاب کے بعد بھی انگریزوں نے کرسکی جمہوریت کو اپنے ساتھ رکھا اور جب کہیں لینن نے بولشویک جمہوریت قائم کی اس وقت جاکر روس نے انگلستان کا ساتھ چھوڑا۔ اس کے بعد ہم کو کشمیش کی گئیں کہ روس میں اندرونی بغاوت کے ذریعہ اس بولشویک حکومت کو تباہ کیا جائے۔ لیکن یہ سب ناکام رہیں۔ جب بولشویک حکومت کا استحکام مسلم ہو گیا تو بے پہلے انگلستان ہی نے تجارتی تعلقات کی صورت نکالی۔ اس میں شک نہیں کہ چینی اور وسطی ایشیا میں روس کا بڑا تہاہلہ اثر برطانوی سیاست کے لئے آگکھ کا کانا ہے۔ لیکن جب تک اغراض کی یہ مضمر مخالفت حلانیہ نہ ہو جائے برطانوی سیاسی روی تجارت کے فوائد سے بھی بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ اور اگر روس کو بولشویک پروپاگنڈا میں مذہبی تبلیغ کا سا خفت نہ ہو تو مخالفتوں کے حلانیہ اظہار تک یہ تجارتی تعلق بھی طبع نہ تھا۔ اور اہل بصیرت کا خیال ہے کہ پچھلے دنوں روسی تجارتی وفد کے دفتر کی خلاف قانون تلاشی اور انقطاع تعلقات کا بظاہر اہم سیاسی واقعہ جو انگلستان میں پیش آیا اس کی ترمیم زیادہ تر انگلستان کی قدامت پسند حکومت کی یہ خواہش تھی کہ وہ ملک میں اپنی حریف مزدوروں کی حکومت کے آئندہ امکانات کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گم کر دے۔

مشرق قریب میں انگلستان کو زیادہ تر فرانس سے واسطہ ہے جنگ کے بعد بڑے بڑے علاقے جو پہلے ترکی کے قبضہ میں تھے ان دونوں طاقتوں کے ہاتھ آئے۔ جمعیت الاقوام کے قواعد کی دفعہ ۲۲ کی مدد سے یہ طے پایا کہ یہ علاقے جو ترکوں سے علیحدہ کئے گئے ہیں خود مختار ملک ہیں لیکن جنگ یہ اپنی خود مختاری کو قائم

رکنے کی قابلیت نہ پیدا کر لیں انگلستان یا فرانس انکی نگرانی کریں۔ ان علاقوں کی آبادی کی خواہشات کو بلائے  
 طاق رکھ کر ۱۳ اپریل ۱۹۰۲ء کو سال ریمو کے معاہدہ کی رو سے انگلستان اور فرانس نے ان علاقوں کو آپس میں  
 بانٹ لیا۔ فرانس کو شام ملا۔ انگلستان کو عراق اور فلسطین۔ ان علاقوں میں انگریزی اور فرانسیسی سیاست  
 اب تک ایک دوسرے کی مخالف رہی ہے۔ شام نے فیصل کو نکالا، انگلستان نے اسے عراق کے تحت پر  
 بٹھایا۔ انگریزوں نے یونانی ترکی جنگ میں یونانیوں کا پورا پورا ساتھ دیا فرانس نے اسی زمانہ میں انکوریہ کو  
 عہد نامہ میں ترکوں سے اپنے تعلق کو استوکیا وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی سیاست آئندہ جنگ میں ترکوں کے  
 مخالف جانے کے امکان کو پیش نظر رکھ کر ترکوں کی مخالف ہو کر اور فرانسیسی سیاست کا مقصد ترکوں سے میل رکھنا ہے  
 برطانوی سیاست اس بات کی پوری کوشش کر رہی ہے کہ عربی دنیا ترکوں سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائے  
 عراق میں فیصل کی، حجاز میں شریف حسین کی مدد، اور فلسطین میں صیہونی تحریک کی حمایت اور یہودیوں کی قومی  
 حکومت کے قیام کی تدبیریں اب اسی عرض کے حصول کے ذریعے ہیں۔ عراق کے معاملات میں تو برطانوی  
 نقطہ نظر سے خاطر خواہ ترقی ہو رہی ہے، لیکن فلسطین میں یہودیوں کے قدم جانے کا مسئلہ مشتبہ ہو چکے چند  
 مہینوں سے وہاں آکر بسنے والے یہودی کثرت سے واپس جا رہے ہیں اور صیہونی تحریک کے یورپنی  
 حمایتیوں میں بھی بہت بددلی پھیل رہی ہے۔ اور حجاز میں شریف حسین کو نجدیوں نے مکمل باہر کیا ہے بظاہر  
 دونوں باقی انگریزوں کی مرضی کے خلاف ہیں لیکن میدان سیاست کے یہ شرائط اور مخالف کے ان جھڑپوں  
 ڈل برداشتہ نہیں ہوتے۔ فلسطین میں عربوں کی تالیف مہلوب ہو رہی ہے۔ حجاز میں ابن سعود کی پیٹھ پر  
 ہاتھ پیرا جا رہا ہے نتیجہ اجماعی معلوم نہیں لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ کلیٹن صاحب سلطان ابن سعود سے معاہدہ  
 کی گفتگو کر رہے ہیں قلبی صاحب یہ مسلمان ہو گئے ہیں، اور انگریزی اخبارات سلطان کے ”مدبر“  
 کی تعریفوں سے پر ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی سیاست کے لئے پھیلی قومی تحریک نے بظاہر بہت ہی خشکیں پیدا کر دی ہیں  
 لیکن ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی نے اب ایک عرصہ کے لئے بالکل مطمئن کر دیا ہے۔ لیکن خود ہندوستان  
 آزادی کے علاوہ بیرون ہند ہندوستانیوں کا مسئلہ سلطنت کے ان گھر کے جھگڑوں میں ہے جبکہ چکا نا ضروری



ہے یعنی جنوبی افریقہ، کینیا، سابق جرمن مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کیساتھ جو سلوک ہوتا ہے اس میں خاندانی شکوہ شکایتوں کا رفع کرنا۔ اور اجزاء سلطنت کے تعلقات میں مہواری پیدا کرنا۔

مصر کو برطانوی اغراض کے تحفظ کے بعد ہر طرح کی "آزادی" دیدی گئی ہے جس کی حقیقت اور قدر کے مظاہر مصر اور دنیا کو وقتاً فوقتاً دکھا دئے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگ بھول نہ جائیں "بظاہر ہندوستان اور مصر دونوں میں مجلس آئین، اصلاح و رعایات و حقوق کی میٹھی مگر خواب آور ادویہ کا استعمال ابھی بہت دنوں جاری رہے گا۔

سطور بالا میں نہایت اختصار کے ساتھ ان مسائل کے بس نام لے دئے گئے ہیں جن سے برطانوی سیاست خارجہ دوچار ہے۔ سیاست کے طالب علم کے لئے انہیں سے ہر مسئلہ بہت غور طلب اور مطالعہ کا محتاج ہو اور امید ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ اپنی سیاسی و پیمپیوں کو روزانہ اخبارات کے "سنسنی خیز" مقالوں سے کچھ آگے بڑھا کر ان مسائل پر بھی ذرا گہری نظر ڈالینگے کہ انہیں سے اکثر دنیا کے مستقبل کے لئے اور خود ہمارے مستقبل کے واسطے اہم بات ان اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ توقع بجا نہ ہوگی کہ جامعہ کے صفحات میں کبھی کبھی ان مسائل پر تفصیلی بحث ہو کرے گی۔

# عرب فرانسسی ادبیات میں

## (۲) رولان کا گیت

ناظرین جامعہ کے لئے رولان کے گیت کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس میں اصل سے لفظ بلفظ ترجمہ کیا گیا ہے اور بعض محض خیالات کو لیکر عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم کی اگر تفصیل کو لیا جائے تو بہت طویل ہوگا۔ اس کے لئے فرصت کا انتظار ہے

یوسف

شارلمین کی ذات سے ازمنہ وطلیٰ کی بہت سادی ادبی روایات اور کہانیاں وابستہ ہیں، رولان کا گیت بھی انہیں سے ایک ہے۔ اس گیت میں اگرچہ شارلمین کی شخصیت رولان کے آگے ماند پڑ گئی ہے لیکن رولان کے رتبہ کو اس بات سے چار چاند لگ گئے ہیں کہ وہ شارلمین کا بھانجہ، اسکا درباری اور اس کی فوج کے سرداروں میں سے ایک ہے، اس گیت کے اصل مصنف کا کچھ پتہ نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ گیت شارلمین کی رونماں کی شکست کے بعد وجود میں آیا، شکست شارلمین کو شمشیر میں باسک تو مٹے ہاتھوں پر نہیں کے پہاڑی دروں میں اٹھانی پڑی۔ اس شکست میں بعض مشہور سردار مارے گئے تھے ساری قوم میں ایک بھل مچ گئی مختلف اوقات میں بھاٹوں نے اس جنگ کے شہداء کے حالات نظم کئے ہوں گے لیکن سب سے بڑھ کر رجب کی بات یہ ہے کہ اس پوری نظم میں باسک قوم کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ اندلس کے عربوں کو دشمن قرار دیا گیا ہے، اسکی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ عربوں کے خلاف مسیحی دنیا میں عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی۔ بھاٹوں نے اپنی بلبک کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے سارے واقعہ کو باطل و دوسرا ہی رنگ دے دیا، یا یہ کہ کلیسا نے مسلمانوں کے خلاف تبلیغ کے لیے یہ گیت بنوا کر بھاٹوں کے ذریعہ شہر کرایا عرض شکہ اس باب میں مختلف ادبی نظر سے پیش کیو جاسکتے ہیں اور بحث کی جاسکتی ہے، اس گیت کا مصنف کوئی بھی ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں میلون اور مذہبی تیوہاروں کے موقع پر گیت گایا جاتا تھا اور اس کے بعد سے برابر

ازمنہ وسطیٰ میں گیت نہایت مقبول رہا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ یہی رولان کی کہانی تھوڑے بہت فرق کیساتھ اطالوی اور ہسپانی ادب کے علاوہ جرمن اور پرنس زبان تک میں موجود ہے۔ اس گیت میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں انہیں اکثر سبالتہ اور غلط بیانی دونوں سے کام لیا گیا اور اس سبالتہ کی نوعیت بالکل وہی ہے جو مسلمان فرائزگوں نے حضرت خالد اور حضرت حمزہ کے جنگی کارنامے بیان کرنے میں برتی ہے۔ مسلمانوں کے متعلق جو غلط بیانیاں ہیں وہ دو باتوں پر دل ہیں، یا تو جان بوجھ کر کیا۔ نے انکی اشاعت کی یا یہ کہ بھانٹوں کی معلومات محدود تھیں، انہوں نے جیسا سنا دیسی نظم کر دیا مثلاً مسلمانوں کو اپلو کا پرستار بتانا ایک قابل مضحکہ غلطی ہے۔ پہل میں اس گیت پر تاریخی حیثیت سے تنقید ہی نہ کرنی چاہئے۔ اس گیت کے گانے والوں کو کبھی یہ گمان بھی نہ ہوا ہو گا کہ آئندہ جگہ کوئی انکی روایتوں پر تنقید کرنے بیٹھے گا۔ انہیں تو شاید اسکا بھی یقین ہو کہ کوئی ان گیتوں کو جمع کر کے لکھے گا اور پھر یہ بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اپنی تنقیدی قوت بہت کم استعمال کرتی تھی، سوچنے کا کام ایک مخصوص طبقہ کے ذمہ تھا۔ اس جماعت نے جو کہد یا سب نے اسنا صدقہ کر دیا، اگرچہ اس لحاظ سے ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اور موجودہ سوسائٹی میں بہت بڑا فرق نہیں، پہلے مذہبی طبقہ عام لوگوں کے لیے سوچنے کا فرض داکرتا تھا۔ اب سیاسی جماعتیں بعینہ وہی فرض انجام دے رہی ہیں، عام آدمی نہ پہلے سوچتا تھا: اب سوچتا ہے۔ لیکن تاہم پھر بھی فرد آج پہلے سے زیادہ آزاد ہے۔

اس گیت کی ابتدا یوں ہے: ہمارے پادشاہ شادل اعظم پورے سات برس اندلس میں ٹہرے یہاں تک کہ سمندر کے کنارے تک جتنی زمین تھی ساری فتح کر لی، کوئی قلعہ کوئی شہر، کوئی فصیل رکاوٹ کیلئے باقی نہیں رہی، بس ایک شہر ساراگوس رہ گیا جو پہاڑی پر واقع ہے، پادشاہ مارسل اس گندھی پر حکومت کرتا ہے۔ یہ پادشاہ خدا کو نہیں مانا، یہ محمد کو پوجتا ہے اور اپلو کا پرستار ہے، وہ بھلا ہمارے مقابلہ میں کیا ٹہر سکے گا، اسکی قسمت میں خواری لکھی ہے۔

پادشاہ مارسل کو جب شایرین کے اس ارادہ کی خبر ملتی ہے کہ وہ ساراگوس پر حملہ آور ہو گا تو وہ سراسیمہ ہو کر دربار منعقد کرتا ہے۔ سب شیروں سے رائے لیتا ہے اور بعد میں بیات ملے پاتی ہے کہ شایرین

کو کچھ دے دلا کر ڈال دینا اچھا ہے، بلانڈ کنڈران اپنی لمبی سفید واڑھی کی قم کھا کر کتا ہے کہ ”اگر ہم شیراؤنٹ، تنکاری کتے اور چار سو بچہ سوئے چاندی سے لہے ہوئے موچکاس رتھوں کے آج شایمین کے پاس نذرانہ کے طور پر بچاویں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ ہمارے شہر پر حملہ کا ارادہ منکر کر دیگا۔ اس کے سپاہی ماندہ ہیں۔ اور وہ خود اپنے دیس واپس جا چکا تھیں ہے“ بادشاہ مارسل اپنے خواص میں سے کلاؤن دانلی بالاکوئے، استارلان پریاتوں، اور گرلان لمبی واڑھی والے کو بلا میجتا ہے تاکہ ان سے آخری مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کرے۔

چنانچہ فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ بلانڈ کنڈران کی سرکردگی میں شایمین کو پھسلانے کے لیے وفد بھیج جائے بادشاہ شایمین کو روئے فتح کر چکا ہے۔ ایک سبزہ زار میں معاہدے درباریوں کے فروکش ہے، اس شہر کے سارے بت پرستوں نے بھی دین قبول کر لیا ہے سنیاسی گن ہیں۔ کوئی فطرت کھلتا ہے، کوئی بٹے بازی میں مشغول ہے۔ بلانڈ کنڈران اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر سب کے سب حیران رہ جاتے ہیں، وفد کی پیشی ہوتی ہے اور بادشاہ مارسل کی سب شرطیں شایمین کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔

باوجود بلانڈ کنڈران کی چکی چیری باتوں کے بادشاہ شایمین کو متسبا نہیں ہوتا لیکن جب اس نے بلانڈ کنڈران کی زبان سے یہ سنا کہ بادشاہ مارسل شاہی خاندان کے شہزادوں کو اور وہ خود اپنے دو دو بیٹوں کو کفالت کے طور پر شایمین کے حوالے کرنے کو تیار ہیں تو ذرا اس نے اپنا سر جھکایا، واڑھی پر ہاتھ پھیرا اور آخری جواب دینے سے پہلے اپنے میزروں کو مشورہ کے لئے طلب کیا۔

بلانڈ کنڈران بادشاہ مارسل کے میزروں میں سب سے زیادہ حائل اور بھرپور ہے، اس گیت میں ایک ایک ایک ذکر ہے اکی چالیس بڑی کارگر ہوتی ہیں شایمین کے پاس جو وفد مارسل کی طرف سے گیا ہے اس میں بھی شخص تر جان اور امیر وفد ہے۔

۱۵۰ یہ نام بظاہر عرب نہیں معلوم ہوتے۔ معلوم نہیں اکی کیا اہلیت ہے۔

۱۵۱ یعنی مسلمان، مسلمانوں کے لیے لفظ معراج برابر ہی گیت میں استعمال کیا گیا ہے، مذہبی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی طہری اور بت پرست دونوں ہیں۔

۱۵۲ اس گیت کو اس زمانہ کے طرز حکومت پرست روفنی بڑتی ہے، شایمین کوئی بات بھی بغیر اپنے میزروں کے مشورہ بغیر نہیں کرتا، اور اصل تبدیلی فزک حکومت نے بہت دنوں لگا بنے بعد اس کے جمہوری سٹیٹیشن فرنس میں بھی قائم رکھے

میشرب اپنی اپنی رائے دیتے ہیں، انیس رولان اور گینلون کی شخصیتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ ساری کہانی انہیں دونوں کے گہرے کزوں کا بیان ہے، رولان سچان نا تجربہ کار اور جنگ کا خواستہ مند ہے برخلاف اس کے گینلون تجربہ کار ہے اور صلح کی طرف مائل نظر آتا ہے، رولان نے جب دربار یون کا یہ رنگ دیکھا کہ وہ سب جنگ سے تھک گئے ہیں اور فرانس واپس جانے کوئی نہ کوئی فدرڈ ہونڈے ہیں تو کڑک کر یوں مخاطب ہوتا ہے "کیا تم لوگوں نے اسرائیل کی پرفریب باتوں کا یقین کر لیا، کیا سات سال ہم نے نفٹ میں ان پہاڑوں میں جان کھپائی ہے۔ کیا میں نے نوپل، کو میل، والسترن، بیتن، بلاگوے اور توویل عربوں سے بیکار قلع کئے، یہ سب دھوکا ہے دھوکا! اسرائیل نے زیتون کی شاخیں دیکر چند آدمی بھجوائے اور تم نے انکی باتوں پر یقین کر لیا، واہ واہ واہ واہ"

طے یہ پایا کہ اسرائیل کے پاس بادشاہ شارل اپنے اپنی بھیجے اور عربوں سے صلح کی چند شرطیں منظور کر رہے۔ اسی حالت میں دشمن کے ملک میں جانا اپنی جان پر کھیلنا تھا چنانچہ بادشاہ شارل کی خدمت کے جوش اور اپنی بہادری کے گھمنڈ پر ضعیف العمر نواب نانم، رولان اور زین کے پادری تربان نے باری باری اپنے آپ کو پیش کیا لیکن شارل نے ان میںوں کی تجویزیں منظور نہیں کیں، نواب نانم اس کام کے لیے بہت بڑا تھا، پادری تربان کے مشورہ کی ہر وقت اسے ضرورت تھی اور رولان نا تجربہ کار اور سیاسی چالوں سے ناواقف ہونکی بنا پر اس سفارت کے لیے موزوں نہ تھا۔ بالآخر رولان نے اٹھکر گینلون کا نام پیش کیا جو دربار یوں میں سب سے زیادہ جنگ ختم کرنیکا حامی اور صلح کرنے کا آرزو مند تھا گینلون دلیس تو اس مصیبت سے نکل چھٹنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شارل کو رولان کی اس تجویز سے اتفاق ہے تو خواہی نخواہی وضائی ظاہر کی، اُسے اس دیکھکر رولان نے اسے جلانے کے لیے ٹھہرا، رولان کی اس منہی نے زخم زہک کا کام

لے زیتون کی شاخیں صلح کی نشانی بھی جاتی ہیں۔

لے گینلون وہی شخص ہے جو آخر میں جا کر اپنے ہم وطنوں کو عربوں کے خلاف اور اپنی ذاتی پرخاش کی بنا پر دوغادے گا برخلاف اس کے رولان شجاعت، جوانمردی اور حب الوطنی کا پسمند ہے تا جبکہ فرانسیسی بادشاں میں بچوں کو رولان کا گیت پڑایا جاتا ہے کہ وہ اپنے مائے حب الوطن کا ایک آئندیل قائم کر لیں،

کیا چنانچہ اس ٹیٹہ گئینلوں کبھی نہیں بھونگا اور اپنی عیاریوں سے ایسی تیریں کر گیا جو بالآخر رولان کی تباہی کا باعث ہوں گی۔

گئینلوں نے ہمت کی اور بادشاہ کی طرف یوں مخاطب ہوا، ”میں سارا گوس جاقول گا، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہاں جانا موت کے ہم معنی ہے، یہ واضح رہے کہ میری بیوی آپ کی بہن ہے، اس بیوی کو میرا ایک بیٹا ہے جس کا نام آپ جانتے ہیں، بادوان ہے، میں اپنی ساری زمین جاندوٹے چھوڑے جاتا ہوں، میں اپنی آنکھوں سے شاید اب اسے نہ دیکھ سکوں گا، اسے آپ کے سپرد کرتا ہوں، یہ کہہ کر وہ روانہ ہونا چاہتا تھا کہ بادشاہ نے دستاورد سونما دینا چاہا لیکن یہ دتا گئینلوں کے ہاتھ سے گر پڑا، تیانہ کا گرانجنگو فرانسسپیوں میں بڑی محسوس نشانی بھی جاتی ہے، سب لوگ کہنے لگے کہ معلوم ہم پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے گئینلوں جانتا تھا کہ وہ کیا اور کون سی مصیبت اس نے کہا غریب ہم سن لو گے یا کچھ لو گے۔ بالآخر گئینلوں اپنی زرہ پہن پہنا کر اور تھیار لگا کر عرب الیمپیوں کے ساتھ اندلس کی طرف روانہ ہوا کہ بلانڈکندران سے راستہ میں یوں باتیں شروع ہوتی ہیں :-

بلانڈکندران - تمہارا بادشاہ شامل واقعی عجیب و غریب انسان ہے، اس نے پورے اور سارا کا سارا کا تارخ کر کے، صرف یہی نہیں بلکہ سمند پار انگلستان کے ٹینٹ پیرنگ سے خرچ وصول کر لیا ہمارے ملک میں کیا دہرا ہے، اور اس نے بیکار خرچ کیا ہے۔

گئینلوں - اس کی مرضی ہی بھری، کوئی اسے روک تھوڑی سکتا ہے۔

بلانڈکندران - فرانسیسی تو بڑی شریف نسل کے لوگ ہیں، تمام کام نوابوں نے خراب کیا ہے، یہ ہر وقت بادشاہ کو شور مچاتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ تم لوگوں کو بڑا ہی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

گئینلوں - جہانگ میں جانتا ہوں ایسا نہیں، اصل میں صرف رولان ہے جو ہم سب کو مصیبت میں ڈکھا چھوڑے گا۔ ہر روز وہ موت کے منہ تک جاتا ہے اور بچ جاتا ہے، اس کا گھنڈا سے تباہ کر کے چھوڑ دیا مرے بھی وہ کسی طرح تو ہمیں مین ملے۔

ملہ - بھاؤں کی خود ساختہ تاریخ ہے۔

بلانڈکنڈران۔ واقعی رولان اس لائق ہے کہ شخص اس سے نفرت کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری تلو کو نیچا دکھائے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرے۔

گینسلون۔ یہ تو ہے لیکن فرانسیسی اس سے بڑی محبت کرتے ہیں، وہ کبھی اسے دغا نہ دیں گے۔ وہ ہمیشہ انہیں دولت لکھوڑے، پھر تمھارا اور ریشی چادریں دیتا رہتا ہے، میری سمجھ میں تو اس طرح وہ نہ تو تک مارے ملک فتح کر ڈالے گا،

باتوں باتوں میں گینسلون اور بلانڈکنڈران میں یہ طے پا جاتا ہے کہ رولان کے ہلاک کرنے کی کوئی

تدبیر سوچنی چاہیے۔

گینسلون اچھوٹوں کے ساتھ اریل کے دربار میں پہنچا ہے، بلانڈکنڈران اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور اس طرح خطاب کرتا ہے: "سلامتی ہو ساتھ نام محمد اور ابو کو کے اور محفوظ! ہمیں ہمارے قوانین، ہم نے آپ کا پیغام شارل کو پہنچا دیا، اس نے ہماری باتیں سن کر اپنے دونوں آسمان کی طرف اٹھائے اور اپنے خدا کی تعریف کی اور کوئی قطعی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ایک میٹر کو آپ سے گفتگو کر نیکے لئے بھیجا ہے، اسکی گفتگو سے آپ کو صلح کی سب شرطیں معلوم ہو جائیں گی مارسیل۔ اچھا گینسلون کو جو کہنا ہے آئے اور کہے،

گینسلون پیش کیا جاتا ہے اور یوں مخاطب ہوتا ہے: "سلامتی ساتھ نام خدا کے جس کی ہم سب کرنی چاہئے، شالیمین آپ کے پاس یہ پیغام بھیجتا ہے کہ آپ فوراً کسی قانون اپنے یہاں نافذ کر لیں اور ایمین کی آدمی بادشاہت اس کے حوالہ کریں اور اگر ان شرطوں پر آپ کو معاہدہ منظور نہیں تو اپنی اور اپنی موت کے لیے تیار رہیے، یہ ایک بے شرمی کی موت ہوگی!"

بادشاہ مارسیل یہ سکر فہم سے کلکپا گیا، اپنی کمان پر تیر چڑھایا اور شہت لگاتا ہی تھا کہ

---

لے ان بھانٹوں کی سمجھ میں مارے غیر سچی ابو لو کے بھاری ہوتے تھے، مسلمانوں کے لئے انہوں نے یہ نصیب ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ابو لو کے ساتھ بڑا دیتے ہیں تاکہ ان غیر مسیحیوں میں جو مسلمان ہیں انہیں جو مسلمان ہیں تمیز ہو سکے۔

نے روک دیا گینلون نے یہ دیکھ کر اپنا ہاتھ اپنی تلوار پر رکھا اور میان سے دو انگل بائز نکال لیا، سب چلا  
ٹھے کہ اس گڑ بڑ کو دور کرو، سب عرب سرداروں نے بادشاہ کی خوشامد کر کر کے اسے تخت پر جا بیٹھا۔  
گینلون کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑا۔ جب اس نے دیکھا کہ دربار میں خاموشی ہے تو بادشاہ کی طرف بڑھ کے یوں  
بلا بہ آپ بیکار غصہ ہوئے شارل بادشاہ فرانس نے یہی شرطیں آپ کے پاس بھجوائی ہیں، وہ آپ کیلئے  
دہا پسین چھوڑے دیتا ہے آدھا وہ اپنے بھانجے رولان کے لئے لینا چاہتا ہے آپ کا سابقہ ایک بڑی  
بی مغرور پڑوسی سے پڑے گا، اگر آپ اس معاہدہ پر رضا مند نہیں ہوتے تو شارل خود مارا گوس کا حامی  
رہنے آتا ہے، آپ گرفتار کر کے ایکسلیسٹس میں بھیج دے جائیں گے، راستہ کی سواری کے لئے نہ آپ کو گھوڑا دیا جائیگا نہ پھر  
ی بار برداری کے جانور پر آپ کو چڑھا دیا جائیگا اور پھر اس کے بعد آپ کے لئے موت کا حکم ہے، لیجئے یہ جہر شدہ  
افذات لیجئے، انیں یہی باتیں لکھی ہیں۔“

بادشاہ مارسل اپنے غصہ پر نام ہوا گینلون کے ہاتھ سے کاغذات لیکر انہیں کھولا، اپنے شیروں کو  
مایا اور ان سے کہا کہ شارل نے باسان اور بایسل کے قتل کی یاد دہانی کی ہے، ان دونوں کو میں نے پہاڑ اٹھا  
مراد اٹھا، اگر مجھ کو پاری سے تو چاہئے کہ اپنے چچا الغالیف کو بطور کفالت کے اس کے پاس بھیج دے  
مواے اس کے ہمارے تعلقات قائم کر لیں اور کوئی دوسری صورت نہیں۔“

اتنا شکر مارسل کا بیٹا کچھ عرض کرنے کی اجازت لیکر بادشاہ کی خدمت میں یوں مخاطب ہوتا ہے۔  
گینلون نے جو احمقانہ باتیں کہیں ہیں ان کے بعد اسے کوئی حق نہیں کہ وہ زندہ رہ سکے مجھے اجازت دیجئے کہ  
اس کے ساتھ انصاف کروں۔“

گینلون نے یہ سنا اور اپنی تلوار میان سے نکال لی اور ایک شاہ بلوط کے پیڑ کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا  
مارسل نے جیسے کہ اس نوجوان کی باتوں کو سننا ہی نہیں، اپنے شیروں کو تھلی میں بلایا اور ان سے مشورہ  
لیا کہ کیا کرنا چاہئے، بلانڈ کنڈران کو سارا حال معلوم تھا ہی اس نے سب باتیں بادشاہ کو بتائیں اور کہا کہ

یہ ایکس فرانس کے جنوب مشرق میں ایک غریب عربوں نے مسکے عین اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ فرانس کی ازمنہ دہلی کی تاریخ  
میں اپنی ملی اور ملتی خصوصیتوں کی وجہ سے اس غریب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔



گینلون ہمارے مقصد کے لیے بڑے کام کا آدمی ہے اس لیے مجھے اس بارہ میں عہد کیا ہے۔ بلا مکندر ان پھر دوسری مرتبہ گینلون کو بادشاہ کی حضوری میں پیش کرتا ہے

ماریل: ”میں نے تمہارے ساتھ بڑی بچی کا بڑا زور دار رکھا۔ میں غصہ میں تمہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل شام سے پہلے پہل اس حرکت کی تلافی کروں گا۔ مجھے تم سے محبت ہے میری خواہش ہے کہ تم اپنے بادشاہ شارل کا احوال ذرا اپنی زبان سے سناؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ بہت ضعیف ہو گیا ہوگا۔“ اس نے اپنی عمر بسر کر لی، بھلا اس کی عمر ۲۰۰ سے کم کیا ہوگی، دس دس اکٹھا بنا پڑا ہے، اس کی ڈال نے نہ جانے کتنی زدیں سہی ہیں۔ اس کا تو کچھ کہنا ہی نہیں کہ اس نے کتنی دولت حاصل کی اور کتنے تاج والوں کو فقیر کر دیا۔“

گینلون: ”جی ہاں، جو کوئی اسے دیکھتا ہے کہتا ہے کہ واقعی شارل سے بڑھ کر کوئی بہادر نہیں، باوجود بڑا بچے کے اس کی جوانمردی زبان زد عالم ہے۔ میں اس کے اوصاف بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اتنی بڑائی اور نیکیوں کے لئے میرے پاس لفظ نہیں، اس کی ذات سے دنیا میں شرافت کا اظہار ہے، وہ اپنے باجگذار نوابوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ موت کو اس بات پر ترجیح دیتا ہے کہ اسے ساتھ بے عہدی یا بے وفائی کو سب دباری۔ بھلا کوئی بتاؤ کہ شارل کا جی اب تک لڑائیوں سے بھرا کیوں نہیں؟ کیا اس کی کہی امید ہے؟

گینلون: ”کبھی نہیں جب تک اس کا جنگجو بھانجہ رولان زندہ ہے اس وقت تک لڑائیاں جاری رہیں گی۔ اس کے گنبد کے تلے رولان اور اولیوئے جیسا جنگجو شاید ہی کوئی اور ہو، ان دونوں سے شارل کو بے انتہا محبت ہے، یہ دونوں شارل کے ۲۰ ہزار ہراول کے افسر ہیں ان کے بھروسہ پر شارل دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“

۱۵ اولیوئے: رولان کے خاص دوستوں اور شارل کے مقربوں میں سے ہے، اس نے جوان کی موت اس گیت میں بڑے پر درد طریقہ پر بیان کی گئی ہے، اولیوئے جرمن بہادری کا اسی نمونہ ہے، آخری سرگرمی میں جب رولان بھی بہت چھوڑ رہا تھا اس وقت اولیوئے نے رولان کو شرم دلائی ہے، رولان کی نسبت اولیوئے کی بہن آود سے ہو چکی تھی چنانچہ اولیوئے کہتا ہے کہ اگر رولان نے خود بھی بڑی لڑائی تو وہ اس لڑائی میں کوئی جرح نہیں کیا تھا ہم بڑے ہی گیت کا یہ حصہ جرمن جماعت کی اہلی خاتون سے سمجھا جاتا ہے۔

ماریل۔ میرے پاس یہی فوج ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں، میں چار لاکھ سپاہیوں کو ہر وقت تیار کر سکتا ہوں اور چاہوں تو شارل کی فرانسیسی افواج کو شکست دیدوں۔

گینلون۔ ذرا یہ آسان کام نہیں۔ آپ بے فائدہ اپنے بے گنتی آدمیوں کی جان ضائع کریں گے، اس حماقت کو چھوڑیے، عقل کی باتیں کیجئے، شارل کو دھن دولت دیکر واپس کیجئے۔ کفالت کے لئے ۲۰ آدمی دربار سے بھیج دیجئے تو شاید شارل پیارے فرانس کی طرف واپس چلا جائے، عقب کی فوج چھوڑ جائیگا، اسی رولان اور اولیوے پر سبے زیادہ اعتماد ہے، یہ دونوں فوج کے ساتھ رہیں گے، اگر آپ میری سنس تو ان دونوں کو ہلاک کر نیکی تدبیریں کل سکتی ہیں، شارل کا دل ان دونوں کی موت ناگہانی سے پاش پاش ہو جائے گا اور پھر ہمیشہ کے لئے وہ لڑائی کا خیال چھوڑ دے گا۔

ماریل۔ بھلا اسی کوئی تدبیر ہے

گینلون۔ مجھے معلوم ہے، تم اپنے ایک لاکھ آدمی رولان اور اولیوے کے خلاف بھیج دو، پہلے وار میں تمہارے آدمی ہارے جائیں گے اور انکے بھی لیکن آخر شجاعت کہاں تک کام کرے گی۔ اُنہیں تھکے ماندے آدمی تمہارے حملے کی تاب نہیں لاسکیں گے، رولان اور اولیوے قتل ہو گئے تو گویا شارل کا سیدھا ہاتھ دھڑ سے کٹ گیا۔ پھر کیا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں بھی ہو جائیگی۔

ماریل۔ اگر اسی تدبیر پر عمل کرنا ہے تو پھر معاہدہ سے کیا فائدہ ؟

گینلون۔ میں اپنی تلوار مرعیت کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں دیوں کی نشانیاں ہیں کہ میں تمہارے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

ان باتوں کے بعد ماریل نے ایک کتاب منگوائی جو ہاتھی دانت کی چوکی پر رکھی رہتی تھی اس کتاب

جلد جرمول کو فرانس میں آباد ہوئے دو صدیاں بھی نہیں ہوئیں لیکن فرانس کی سرزمین سے انہیں اتنی محبت ہو کر گویا وہ اپنے آبائی وطن کو باطل بھول گئے۔ جن کا جب ذکر ہوتا ہے تو درباری اور سپاہی پیارا وطن کھرا بے خدات حب الوطنی کا اظہار کرتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب وطنیت کو دنیا بھر کی ہر جگہ زندگی کے ہر شعبہ پر عادی تھا لیکن شارل کی فوج میں پادری تریان بھی مذہبیت کے ساتھ ساتھ وطنیت کا دیوانہ نظر آتا ہے

غلہ از منہ وطنی میں مزار لوگ اپنی تلوار کی موٹھیں تھویندے دھیر دھیر ایتھے آئے مگر جنگ کے وقت انکی غیب مدد ہوتی رہے۔

میں محمد علی احمد علیہ السلام کا قانون لکھا ہوا تھا، ایک عرب نے اسپر ہاتھ رکھا اور رقم کھائی کہ اگر عقب میں رولان ہوا تو بچ کر نہیں جا سیکے گا۔  
گینلون، خدا کرے بسا ہی ہو۔

ملکہ برامیون نے گینلون سے کہا کہ وہ اسکی بیوی کے لئے دو ہار بھجوائی جنکی قیمت روم کے سب خزانوں سے زیادہ ہوگی۔ تہا رہے بادشاہ نے اسی چیز کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھی ہوگی، مارسل نے گینلون کے کندبوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، تم بڑے دانا ہو میں نہیں بالالال کے دیتا ہوں اگر تم رولان کو عقب میں لکھو دو۔ گینلون۔ مجھے اب دیر ہو رہی ہے، مجھے روانہ ہو جانا چاہئے۔

بادشاہ شارل شہر گالن کے قریب ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ گینلون کی واپسی کا اسے سخت انتظار ہے۔  
ترکے ہی گینلون شہر میں پہنچ جاتا ہے، بادشاہ دیر سے بستر سے اٹھا صبح کے بھنسنے سننے میں اور دیر ہوئی، دروازہ سے جب نکلا تو رولان، اولیوئے اور نواب آرم کے ساتھ گینلون پہنچا تھا۔

گینلون، حضور والا۔ سلامتی ہو آپ پر میں سارا گوس سے شہر کی کجیاں لیکر آیا ہوں اور ساتھ ہی مارسل نے آپ کی خدمت میں ایک بہت بڑا خزانہ اور ۲۰ کفالتی جانین بھی ہیں مگر وہ اپنے چچا الغالیف کو نہ بھیج سکا تو انہیں اسکا کوئی قصور نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے ۱۷ لاکھ سلحہ سپاہیوں کو دیکھا جو الغالیف کیساتھ سمندر کی طرف بھاگ گئے ہیں کیونکہ یہ لوگ اس سچی قانون کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے جسے مارسل نے قبول کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت دور سمندر میں نہیں گئے ہوں گے کہ طوفان نے انہیں آلیا ہوگا اور وہ سب ڈوب کر ختم ہو چکے ہونگے۔ آپ یقین کریں کہ ایک مہینہ نہیں گزرنے پائیگا کہ مارسل خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اسی قانون کو قبول کرے گا جو آپ اسے دیں گے۔

شارل۔ تم نے اپنا منصب بہت خوبی سے انجام دیا تمہیں اسکا بدلہ ملیگا، اچھا، سب پاہ کو پیارے فرانسس اپس ہو سکی خوشخبری دو۔  
(بقیہ حصہ آئندہ)

# غزل

( از جناب مولانا یوسف شرف الدین صاحب مومن اتاؤ جامعہ طیبہ )

نود گل کی ہے کیا لالہ کس شمار میں ہے      یہ رنگ دہسب اسی کی عیاں بہاؤ میں ہے  
جنوں کے فیض سے رونق عجب بہاؤ میں ہے      کہ جوئے خون بھی رولاں رشت کو بہاؤ میں ہے  
مڑہ ترپ میں ہے تنکین اضطراب میں ہے      تری قسم ہے کہ تو بھی دل نگار میں ہے  
سے جاؤں اس آنکھوں میں حیرے دیوانے      عجیب حسن گریبان تار تار میں ہے  
خوشا وہ زبیت کہ گزری اسی کے در پہلا      خوشایہ موت کہ اب خبر کو سے یا میں ہے  
ہزار کچھ ہو کر ایک دن ملو گے تم نہ      بندھی ہوئی میری امید انتظار میں ہے  
دل پہ شک و شکایت دلیں یاں امید      عجیب حال مرا جلوہ گاہ یا میں ہے  
رنگ گل جسے دیکھو آپ سے باہر      عجیب رنگ جہاں موسم بہار میں ہے  
دل نہ مل مجھے بدنام ہی کریں گے ہم      وہ تیری ضد ہے تو یہ اپنے اختیار میں ہے  
ملا کے خاک میں دیر ہیں دولت جاوید      یہ دم و راہ عجب عشق کے دیار میں ہے  
ہزار حشر اٹھاجی کبھی نہ چھوڑے گا      امید ہے تو بہت دم امیدوار میں ہے  
تہر نے دیتی ہے جھکوکھاں تیری شوقی      قرار ہے تو اسی قلب بقرار میں ہے

نوشہ اضطراب وہ بچنیاں نہیں ہے یاں

خدا کے فضل سے دل اب تو اختیار میں ہے

لے عذاب ہر تباہ سے ملی اماں تو میں

# تضنین

(از مولانا مومن ٹونگی)

تضنین میں مولانا کو خاص قدرت حاصل ہے جسے نقادان فن نے تسلیم کیا ہے۔ اس وقت  
حافظ کے دو شعروں پر اپنی تضنین بدیع نظمیں ہیں، انشا اللہ ہم کبھی مزید نونے پیش کر سکیں گے۔

(۱)

تل گیا جور پہ تو میں نے بھی سر ٹیک دیا

چھوڑا اب نہ خدا کے لئے تسمہ بھی لگا

قہر ڈھا، حشر اٹھا، خوب سا خوب جلا

عہد کر دی کہ بسوزی زخم خویش مرا

پہنچ غم نیست تو می سوز کہ من میا زم

(۲)

نشر چھوے دل میں کلیجہ میں برھیاں

سینہ پہ چڑھ کے حلق پہ خنجر کیا رواں

اب خاک و خوں میں ہم کو ملا کر چلا کہاں

از دامن تو دوست نہ دار نہ عاشقاں

پیرا بن جسوری ایشاں دریدہ

# آسمانی بجلی

شخص نے بجلی کا طوفان دیکھا ہے جس میں چمک اور گرج دونوں ہوتی ہیں کبھی یہ بارش سے قبل ہوتا ہے اور اکثر اس وقت ہوتا ہے کہ گرد و غبار آسمان پر زیادہ ہوا آندھی آتی ہو۔ بارش سے قبل کا اکثر خطرناک ہوتا ہے اور بجلی گرنے کے حوادث اکثر ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہو یا ہو چکی ہو تو بھی یہ طوفان دیکھنے میں آتا ہے۔ مگر بجلی گرنے کا حادثہ کم ہوتا ہے۔ ابتدائی قومیں یعنی جنکے دماغی قوانین و مآد ریت یافتہ نہیں ہوتے۔ ہر منظر قدرت کو دیتا سمجھتی ہیں اور اکثر بجلی کو پوجتے ہیں یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں یورپ میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جوں کے اگر گھٹنے بجائیں تو طوفان تل جائیگا۔ اور جب طوفان آتا تھا تو گھٹنے بجائے جاتے تو چنانچہ یورپ کے کسی گاؤں میں اسی طرح طوفان آیا اور تمام گاؤں کے لوگوں نے رسیاں پکڑ کر گرے کہ گھٹنے بجانا شروع کیے۔ اتفاق سے اسی وقت بجلی گر جا رہی تھی اور یہ سب فنا ہو گئے۔ یہ محض جہالت کا سبب ہے۔ ہندوستان میں بھی بعض لوگ بجلی کے متعلق عجب عجب توہمات رکھتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ سیاہ یا سرخ کپڑے پہنی زیادہ گرتی ہے کالے سانپ پر یا دودھ والے جانور پہنی گرتی ہے۔ یا اس شخص پہنی گرتی ہے جو لٹا پیدا ہوا ہو۔ یا اور اسی طرح کے خرافات خیالات عوام میں پھیلے ہوئے ہیں۔

مندرجہ ذیل معنوں میں ہم سائنٹفک و بجلی کے طوفان کی سمجھائیں گے اور پھر یہ بھی بتائیں گے کہ بجلی گھٹنے وغیرہ بجانیسے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے مکان اور جان محفوظ رہ سکیں۔

سب سے پہلے امریکن طبیعی جن فرسٹن نے یہ دریافت کیا کہ مصنوعی بجلی یعنی وہ جو رگڑ سے پیدا ہوتی ہے یا شبن وغیرہ سے تیار ہوتی ہے وہ اور آسمانی بجلی ایک ہی ہیں صرف فرق یہ ہے کہ وہ مطیع ہے اور ہم اسے بنا سکتے ہیں اور قابو میں رکھ سکتے اور یہ آسمانی بجلی نہ ہمارے قابو کی ہے اور نہ اس پر ہم نے اتنا اثر کیا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ ہم کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے ایک تینگ ریشمی کپڑے کی بنائی اور اس پر ایک تانبے کا تار لگا دیا۔ ایک ڈوری باندھ کر اس تینگ کو آسمان پر چڑھا کر نیچے ایک ریشمی رول سے اسے پکڑا مگر ڈوری میں ایک کنبی بھی باندھ دی اور جب کنبی کے پاس کوئی تار لے جاتا تھا تو چمکایاں

تھکتی تھیں اسی ڈورے سے اُس نے اپنا LEYDEN JAR لیڈنی مرتبان بھر لیا جس سے رٹا ہوا کہ اس بجلی میں جو زمین پر ہے اور اسی جو آسمان پر ہے کچھ فرق نہیں ہے۔ یہ نظریہ فرنیکلن نے انیسویں صدی کے ابتدا میں معلوم کر لیا تھا اور اسی بنا پر اُس نے برق ریا LIGHTNING CONDUCTOR بنایا جو مکانوں، برجیوں اور مناروں پر لگایا جاتا ہے۔ ایک روپی پڑوسی سرائی قوم کا تجربہ کرنے میں ہلاک بھی کیونکہ اُس نے اُس یغی رومال کی احتیاط نہیں کی تھی جو فرنیکلن نے اپنے ابتدائی تجربہ میں کی تھی۔

یہ اٹھارہویں صدی تک معلوم ہو گیا تھا کہ بادلوں میں دو قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ ایک کا نام مثبت دوتا کا منفی رکھا۔ بطور سہانہ یہ مان لیا کہ مثبت سے منفی کی طرف بجلی رواں ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جس طرف سے بجلی آتی ہے اس کا نام مثبت رکھا ہے اور جہر سے جاتی ہے اس کا نام منفی رکھا ہے۔ تقاطع طیس کے مانند دو جنس بجلی ایک دوسرے سے ٹکنے کی کوشش کرتی ہے اور ہم جنس سے گزیر کرتی ہے یعنی دو قوا مثبت کے برابر رکھ دیں تو یہ ایک دوسرے کو ڈھکیلینگے اور ان کی بجلیاں آپس میں نہیں ملن گی، مگر جب مثبت اور منفی برابر رکھ دیے جاویں تو بجلی کی کوشش ہوگی کہ بیچ میں ہوا کو توڑ کر ایک دوسرے سے مل جاویں اور

سیل کے وقت ایک قسم کا شعلہ پیدا ہوتا ہے اور نالٹے کی آواز آتی ہے۔ سیل میں WILKINSHURST مشین ایک عام چیز ہے۔ اس سے کئی کئی انچ لمبا شعلہ نکل سکتا ہے اور شاید ہی دنیا میں کوئی بجلی کا گلاب جگوس نے ناسٹنگی میں اس کے تار کا جھکا نہ کھایا ہو۔ اس مشین میں کئی ہزار ولٹ پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جو کہ میں روک ہوئی ہے اس لئے آدمی نہیں مارتا۔ بادلوں میں بھی یہی دو قسم کی بجلی پائی جاتی ہے جب کہ بادل دوسرے مختلف قسم کی بجلی کے بادل کے قریب آ جاتا ہے تو ایک میں سے بجلی دوسرے میں بھرجا اور چمک پیدا ہوتی ہے بعض وقت ہم اس کے ساتھ جوتا ہوتا ہے دوری کی وجہ سے اور اُس کے

لہ دلت بجلی کا ایک پیمانہ ہے جیسے لب میں چھو دلت کی قوت ہوتی ہے پچھول اور بجلی کی روشنی میں ۱۱۰ سے ۲۵۰ دلت ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھا لگتا ہے اور اگر دیر تک مارا جے تو خطرناک ہوتا ہے۔ امریکا میں ذرا بڑی تعداد لیا جاتا ہے یا کم از دلت کا محض ہلے نام چھو جاتا ہے اس کا محض ایک سو پچیس کے لئے کافی ہے

ہونگی وجہ سے ہینس بن سکتے۔ اور بعض وقت جب یہ سنا زور کا ہو تو گرن جھکوانی دیتی ہے۔ ایسی بجلی جو ایک بادل سے دوسرے بادل میں سرایت کرے اسے برق شرف SHEET LIGHTNING کہتے ہیں۔

بعض اوقات ایک بادل سے دوسرے بادل اور دوسرے سے تیسرے میں بجلی میں بھرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اس میں استقدر زور ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں روک سکتی اور یہ زمین پر گرنا چاہتی ہے بجلی کی ایک جگہ بعض اوقات سکڑ کے کئی لاکھوں حصہ کے وقفہ کی ہوتی ہے مگر اپنی شدت کی وجہ سے ہلکے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ دیر تک چمکتی رہی۔ اس میں کروڑوں گھوڑوں کی قوت ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ ان تک یہ ہلکے دھوکے دے رہی ہے۔ اور انسان کے قابو میں نہیں آسکی۔ دنیا کی تمام قوتوں کی طرح یہ بھی کم سے کم مزاحمت کا راستہ ڈھونڈتی ہے، چنانچہ بلند عمارتیں یعنی۔ منارے۔ برج۔ درخت وغیرہ جو اس کے قریب آگئے ان کے ذریعہ سے یہ زمین میں پست ہونا چاہتی ہے۔ اور چونکہ ان چیزوں میں کچھ نہ کچھ مزاحمت ہوتی ہے لہذا ان دونوں قوتوں میں یعنی بجلی اور فتنے مذکور میں ایک کشمکش ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجلی زیادہ زوردار کر کے کے ساتھ گرتی ہے۔ ایسی بجلی کی شکل آپ نے دیکھی ہوگی کہ آسمان پر ایک لہری کی سی ہوتی ہے اسے FORKED LIGHTNING یا برق شاختا نہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کو معلوم کر کے فرنیکن نے تجویز کی کہ اگر عمارتوں پر تار نہیں مزاحمت کم ہو تبند تمام پر لگادیں تو وہ آسانی بجلی کو گزر جانے دیں گے اور نہ کشمکش ہوگی نہ زلزلہ اور نہ عمارت کا نقصان ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ تار زمین میں دور نہ لگا دیا جائے۔ خشک زمین بھی طاقتور ہے یعنی بجلی کو روکتی ہے۔ لہذا ایسے تار زمین میں اتنی گہرائی تک جانے چاہیے جہاں موسم گرم میں نمی نکل آئے۔ اس تار کو جو اکثر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں لگایا جاتا ہے ایک

Insulation میں مضمون لکھتے وقت ہمیشہ ہمیں برقی ارد کی اصطلاحات پیش نظر رکھنا ہوں اور حتی الامکان عبارتیت ہوں جو ہم نے شائع کیا ہے جہاں ہمیں کا ترجمہ کافی ہوتا ہے اسے ترجمہ کر لیتا ہوں اور جہاں ترجمہ نہیں ملتا وہاں لکھ دیتا ہوں چنانچہ برق شرف۔ برق شاختا نہ۔ برق ربا وغیرہ میں نے وضع کئے ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ برہنہ طالع میں تو میں خوشی سے قبول کر لیتا ہوں بہتر ہو کہ ان اصطلاحات میں خود ایسی اصطلاحات جمع کرتی رہے اور موجودہ اصطلاحات پرانی کی بجائے نئے جو جب دوسری مرتبہ شائع کیے تو وہاں تک نہیں اور اضافہ شائع کر دے۔





بیگنے کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ درخت سے ہٹ کر کھلے میدان میں آجانا چاہئے۔ اگر گھٹا جنگل ہے تو اونچے درختوں کی پناہ نہ لے۔ بلکہ کسی چھوٹے درخت یا سجاڑی کی آڑ میں کھڑا چاہئے۔ اگر باہل چیل میدان ہو تو سواری سے اتر کر اس کے پاس تھوڑے فاصلہ پر لیٹ جانا چاہئے۔ کیونکہ سواری نسبتاً زیادہ بلند ہے اگر کوئی گڑبا مل جائے تو گڑھے میں لیٹنا زیادہ بہتر ہے۔ بیٹھے رہنے میں بھی نسبتاً زیادہ خدشہ ہے۔ گیلے کپڑے حفاظت کا باعث ہو سکتے ہیں کیونکہ سوکھے کپڑے کے مقابلہ میں گیلے کپڑے بہتر موصل ہے۔ اگر کسی پھلی گزرنی والی ہے تو زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ گیلے کپڑوں میں سے یعنی انسان کی بالائی سطح پر سے گزر جائے۔ اور جسم میں سے ہو کر نہ گزرے۔ اگر کوئی لمبی لکڑی یا برچھا ہو تو اسے گاڑ کر اس سے قدرے فاصلے پر لیٹنا چاہئے۔ اگر لکڑی باہل خشک ہو تو گیلے کپڑے اس پر لیٹ دینے سے زمین تک پہنچ جائے پھتری جس کے ہاتھ میں ہوائے اسکی احتیاط ضرور رکھنی چاہئے کہ پھتری اور زمین تک صرف وہی ایک واسطہ نہ ہو۔ اگر لوہے کی ڈنڈی ہے تو اسے زمین پر لگا کر اس کے نیچے بیٹھ جانا چاہئے۔ تاکہ اگر بجلی گرے تو انوں میں اور ڈنڈی میں ہو کر زمین میں چلی جائے۔ یہ سب احتیاطیں صرف چیل میدان میں اور اسوقت کرنی ہیں جب یہ دیکھ لے کہ باہل سر پھلی برقی شاخاں کی صورت میں چمک رہی ہے۔ اگر سر پر برقی شرف چمک رہی ہے تو پھر ان احتیاطوں کی ضرورت نہیں۔ برقی شاخاں کی علامت یہ ہے کہ ہمیں کرکٹ ہوتی ہے اور اسکی فصل لہریہ دار ہوتی ہے

برقی ربا کے پاس کھڑے ہونے میں تو کچھ اندیشہ نہیں کیونکہ بجلی گرے گی تو یہی زمین پر پست ہو جائیگی مگر جس وقت بجلی کا طوفان کہیں بھی آ رہا ہو تو تاریکے جنگلوں سے دور رہنا چاہئے بعض اوقات گائے بھینس ریل کے کنارہ کے تاروں کے پاس مری ہوتی ملی ہیں۔ حالانکہ انکے سر پر طوفان نہیں آیا۔ بلکہ کسی دور مقام پر طوفان آیا تا رہا پھلی گری اور چونکہ بعض وقت زمینا نہیں ہوتا۔ یعنی لکڑی یا پتھر پر لگا ہوتا ہے یا لوہے کے کعبے بھی خشک زمین پر ہوتے ہیں اس لئے بجلی بجائے زمین میں چلی سکے تا رہیں پہنچ کر درد و تک جو اس کے قریب ہوا ہلاک کرتی چلی گئی۔

بعض کا خیال ہے کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر جاتی ہے وہاں بجلی پھر نہیں گرتی۔ حالانکہ تجربہ نے بتایا ہے

کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر سکتی ہے وہاں بجلی کے گزینا احتمال زیادہ ہے۔ اول تو یہ کہ ضرور اس مقام میں اوہ بجلی دلا دلا دل میں فراغت کم تھی جب ہی بجلی گری۔ دوسرے پے درپے کئی کئی مرتبہ بھی اسوجہ سے گزینا امکان ہے کہ جب بجلی گرتی ہے تو اس پاس کی ہوا میں غلا پیدا ہو جاتا ہے اور ہوا کے خلا کی فراغت بہت کم ہوتی ہے۔ اسی لئے اس میں سے بجلی کے گزینا آسان راستہ بن جاتا ہے جہاں بجلی گرتی ہے وہاں بعض وقت تھوڑی دیر تک گندھک کی سی بو آتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جب بجلی کا شعلہ پیدا ہوتا ہے تو یہ آکسیجن کے اجزا میں تغیر پیدا کر کے تین چاروں کا ایک سالمہ بنا دیتا ہے۔ اسے اوزون OZON کہتے ہیں۔ یہ دق۔ دمر اور پھپھیرے کے مریضوں کے لیے مفید ہے۔ اس گیس اوزون کی بو گندھک کی بو سے شبابہ ہوتی ہے۔ ورنہ بجلی میں گندھک وغیرہ کچھ نہیں۔

بعض وقت لوگ براہ راست بجلی کے صدمہ سے تو نہیں مرنے بلکہ پاس کی مقام پر بجلی گری اور ہوا میں غلا پیدا ہوا اس نلے میں چاروں طرف سے ہوا بڑی سرعت کیساتھ داخل ہوتی ہے جسکے مجموعے میں آدمی گر جاتا ہے اور اس خوف سے کہ وہ بجلی سے گرا ہے اس کے قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس نے بجلی کا شعلہ یا چمک دیکھی وہ کم سے کم اس خاص ضرب سے محفوظ ہے۔ کرہک ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ کرہک چمک کا قیوہ ہے اور اگر کسی کے پاس روک ٹھڑی STOP WATCH ہو اور اسے وہ چمک ہونے ہی چلا دے اور جو وقت کرہک ہوا سے بند کر کے دیکھے کہ کتنی سکینڈیں آواز آتی اور ۱۲۰ فٹ نی سکینڈ کی رفتار کو حساب لگا سکتا ہے کہ بجلی کتنی دور گری ہے۔ جہاز کی جنگ میں یہ روک ٹھڑی بھی دشمن کی توپ کا فاصلہ بتاتی ہے یعنی چمک پیدا ہونیکے بعد توپ کی آواز کے وقفہ کو ناپ کر محاسبہ معلوم کر لیتے ہیں۔

اگر کسی بزمیہ پر بجلی گر جائے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ پورے جسم پر گری ہے یعنی جسم کے اندر سے ہو کر گزری ہے تب تو اس کے بچنے کی امید نہیں جسکی علامت یہ ہے کہ جسم کٹ جائیگا یا سیاہ پڑ جائیگا اور درجہ حرارت جسم کا تھوڑی دیر تک بجا رہے گا۔ مگر صرف قلب کی حرکت بند ہو گئی ہو تو مصنوعی تنفس سے آدمی کے بچنے کی امید ہے مصنوعی طریقہ تنفس کا فوراً شروع کر دے اور ڈاکٹر کو فوراً بلا لیں۔ مگر جب تک ڈاکٹر نہ آئے

یہ ترکیب کریں۔ ایسے مریض کو پہلے زمین پر اوندھا لٹا دے۔ اُس کے پاس بھیڑ نہولے دے ہو اگلی ہوئی صاف ہو۔ اگر کپڑے بھیگے ہوں تو ایک آدمی گیلے کپڑے اتار کر سوکھے کپڑے پہنا دے۔ مگر نفخ کے علاج میں دیر نہ کرے یہ فوراً شروع ہو جانا چاہئے۔ اوندھا اس طرح لٹا یا جائے کہ دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوں۔ ہر ایک جانب کو بھٹکا ہوا دونوں ہاتھوں کے پچ میں رہے۔ ایک شخص اُس کی کمر پاس طرح بیٹھے کہ وہ اُس کی دونوں رانوں کے پچ میں آجائے مگر اس پر بوجھ نہ ہو۔ اور یہ بیٹھنے والا نفخ اُس کی پیٹھ کو اس طرح دونوں ہاتھوں سے سونتے کہ اُس کے پیٹھروں پر ایک دھبہ بوجھ ہو کہ وہ دیں اور انہیں کی ہوا خارج ہو۔ اور دوسری دفعہ میں یہ سب بوجھ بچے کی طرف کر تک آجائے تاکہ پیٹھروں میں جو غلا پیدا ہو گیا ہے ان میں ہوا پھر بھر جائے۔ یہ عمل منٹ میں پندرہ بیس کی رفتار سے ہوتا رہے۔ کیونکہ انسان اسی قدر سانس ایک منٹ میں لیتا ہے۔ اگر مضروب کی ہتھی بند نہیں ہوئی ہے تو اُس کی زبان کو باہر کھینچ لینا چاہئے۔ کوئی تیز سیریشلہ برائٹی تھو۔ یا چائے کو شش کر کے پلا دینا چاہئے۔ مگر چیزیں بہت گرم نہ ہوں۔ اُس کے تمام جسم کو گرم رکھنا چاہئے۔ اگر اکسین کے سلنڈر میسر ہوں تو اُن کے ذریعہ سے کسی ڈاکٹر کی رائے سے نفخ سنبھالنا بھی مفید ہے۔

ضمنا یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کے کبلی کا مارلگ جائے اور اُس کا ہاتھ کھلتا ہو جو اعصاب کے مخلوق ہو جائیگی وجہ سے نہیں کھلتا۔ اور جسے غوام کہتے ہیں کبلی نے پکڑ لیا تو ایسے وقت جو نفخ اُس کے قریب ہو اور مدد دینا چاہتا ہے وہ اس برق زدہ کو سوکھے کپڑے سے پکڑ کر کھینچے مگر جسم کو ہاتھ نہ لگائے۔ ورنہ خود بھی مبتلا ہو جائیگا۔ یا کسی لکڑی کی ڈنڈی کی چھتری یا لکڑی سے اُسے اپنی طرف کھینچے۔ اگر کچھ نہ تو لاتا اگر کراسے دھکا دے (بعد میں چاہے تو معافی مانگ لے) دو پٹہ یا دو مال یا رسی ہو تو اُسے چھٹک کر اُس کے ذریعہ سے کھینچے۔ لات مارنے میں یہ مصلحت ہے کہ اگر کبلی نفخ مذکور میں سے بچانے والے میں سرایت کر لگی تو صرف ٹانگوں میں ہی سرایت کرے گی اور چونکہ ٹانگوں میں کوئی عضو نہیں

لے یہ ترکیب نفخ کی پانی میں ڈوبے ہوئے گیس سے مسوم ہوئے، مارگزیدہ، یا مکان میں جو کبلی کے تارنگے ہوتے ہیں اُن سے چھو کر بیہوش ہونے والوں پر بھی استعمال کیا جاسکتی ہے۔

نہیں ہے اس لئے سوائے ایک جھٹکے کے اندیشہ جان کا نہیں ہے۔ اگر ہاتھ سے کھینچے گا تو اس ہاتھ کے ذریعہ بجلی سرایت کرے گی اور قلب میں سے ہو کر زمین میں سرایت کرے گی جس کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اگر کسی کے پاس سوکھی لکڑی کی کلباڑی ہو تو آہر پر ایک ضرب لگا کر کاٹ دے کہ برقی رد قلع ہو جائے مگر یہ دیکھ لے کہ لکڑی سوکھی ہے۔ گیلی لکڑی میں سے بجلی سرایت کر جائیگی۔ اس کے کپڑے پکڑ کر کھینچے میں صرف ایک ہاتھ استعمال کریں یہ تو سر برقی انجنیر کو چاہئے کہ ایک ہاتھ ہمیشہ جیب میں رکھے تاکہ اگر بجلی گزرے تو ایک ہاتھ کے ذریعہ سے ٹانگوں میں گزرے۔ مگر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گزرنے میں بچ میں دل پوتا چہرہ صدمہ کا پہنچا جھلک ہو۔ ہندوستان میں بعض وقت ٹرام کے تار گر جاتے ہیں اور تار کی زد میں دو دو تین تین آدمی ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں احتیاط مفید ہوگی۔

# ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک

انیسویں اور بیسویں صدی میں ایشیائی تاریخ کی امتیازی خصوصیت وہ تمدنی تحریک ہے جو مشرق بعید میں رونما ہوئی یعنی ترکی اور جاپان میں شروع شروع میں مقصد دونوں کا ایک ہی تھا لیکن اپنے منازل ارتقا میں اس تحریک نے دونوں ملکوں میں بالکل مختلف حیثیت اختیار کر لی جاپان میں اس کا نتیجہ یورپ کی مادی اور صنعتی تہذیب کو قبول کرنا کی شکل میں نکلا۔ جاپانیوں کو تھوڑے زمانہ میں جو کامیابی نصیب ہوئی اُس کی وجہ اُنکے ذہنی اور جماعتی حالات اکابر جغرافی موقوفہ اُن کی مضبوط اور دانشمندانہ سیاست تھی جس نے اس انقلاب کی اندرونی کلفتوں کو نہایت کامیابی سے دفع کیا۔ جاپانی تجارت صنعت، فوج، بیڑہ جو اس کی وجہ سے عالم وجود میں آئے اور وہ تجارتی اور صنعتی ذہنیت جو ان تمام چیزوں کے پیچھے موجود ہے، اُس نے یورپ سے خراج بختیں وصول کیا۔ جدید جاپان کی شکل میں مغرب نے خود اپنی چہرہ کا نظارہ کیا۔

ترکی میں اس تحریک نے بالکل دوسری راہ اختیار کی جاپان میں جن داخلی و خارجی اسباب نے سہولتیں پیدا کی تھیں انہوں نے یہاں رکاوٹیں پیدا کیں، ملک کی قومی ترکیب، قوم کی ذہنی حالت کل تمدنی زندگی پر عادی اور ساری مذہب، بادستہ کی غلط استعمال ہونے والی قوت اور جغرافی موقوفہ کو جس سے یورپ کی سیاست یہ سب چیزیں تمدنی زندگی کی تجدید اور تشکیل نو کی راہ میں حائل ہیں اور نہایت صبر اور استقلال سے کام کر نیے بعد مغلوب ہو سکتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ترقی کی رفتار یہاں بہت دھیمی رہی اور تحریک کا سارا زور جو دراصل خارجی مقاصد کے لیے تھا اندر کھپ کر یعنی ذہنی زندگی پر جا پڑا۔ جاپان میں یورپ کی مادی اور صنعتی تہذیب کو قبول کرنا کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا برخلاف اس کے ترکوں کے ہاں ایک ذہنی انقلاب رونما ہوا جس کا نتیجہ ایک نیا تصور کائنات اور



مسئلہ کے لئے وقف کرنا چاہیے۔ مشرقی انسانوں کی تقدیر زیادہ تر اُنکے مذاہب کی تقدیر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ تمدن یہاں ہمیشہ مذہبی مسئلہ بن جاتا ہے۔ مشرقی انسان جو اپنی ذات اور اسکی حدود کا بدرجہ اتم شعور رکھتا ہے۔ اسی شعور حدود کی وجہ سے خراب جاتا ہے کہ یہ اُس کی قوت اوادی کو فنا کرنے کا باعث ہے اُس کی تہذیب باطنی کا کمال اُس کی شخصیت کی کمزوری بن جاتا ہے۔ مشرقی انسان کا سکون اُس کے عموں کا نتیجہ ہی خود اسکا ارادہ عمل کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ مشرق کی سکون پسندی کا مفہوم یہی ہے، اگر کوئی تخلیقی کام بطور تمدنی عمل کے ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ یہ دیوتاؤں کی طرف سے ہو چنانچہ جب سے ترک اشیا کے تمدنی حلقے میں داخل ہوئے ہیں انکا بھی یہی حال ہے۔ لہذا وہ تمدنی تحریک جس سے ہم یہاں بحث کرنا چاہتے ہیں اپنے فیصلہ کن مداخلت میں پہنچکر مذہبی تحریک ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس رسالہ کے تمام توصیحات میں اسلام کو اس درجہ غفل ہے۔

ان توصیحات کی بنیاد کس مواد پر رکھی گئی ہے؟ اس موضوع پر مغرب میں جو تھوڑی بہت کتابیں ہیں ظاہر ہے کہ انکو ہمیشہ نظر رکھا گیا ہے لیکن اُن کی اتباع کا امکان نہ تھا۔

ترکیہ جدید ترین قسم کے لوگوں نے کام کیا ہے :- (۱) اخبار دول کے نامہ نگار، سیاح فضل خانوں کے عہدہ دار یا سین و غیرہ یعنی وہ لوگ جو اہل علم نہیں ہیں (۲) مخصوص علوم کے حامل مثلاً مورخ، معائن، معاشی (۳) مغربی مستشرقین۔ مصنف کتاب کا خیال ہے کہ یہ لوگ جس راہ پر چلے ہیں اس پر نہ چلنا اس کے لئے جائز ہی نہیں ضروری ہے۔ پہلے گروہ کے نامزدوں سے کوئی علمی بحث کرنا بیکار ہے۔ ہر جگہ کہ یورپ میں اُنکا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ شاید مستثنیات کو چھوڑ کر اُنکے متعلق کہاجاسکتا ہو کہ یہ لوگ جو اطلاعات دیتے ہیں وہ خود ثابت کرتی ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ دوسرے گروہ کے علماء ممکن ہے کسی اور حیثیت سے مغرب کے لئے مفید کام انجام دیتے ہوں لیکن ترکیہ جدید کے سمجھنے میں اُن سے کوئی مدد نہیں ملی۔ یہ تو غافل علمی تحقیقات کرتے ہیں یا یورپی اقوام کے لئے نئے نئے میدان عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں پہلی صورت میں یہ اپنے موضوع کو تمام وکمال موجودہ یورپ کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، اپنے معیاروں کے مطابق اُن پر کام کرتے ہیں اور تاریخی ہمدردی سے بالکل مبرا ہوتے



ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی کی کل تمدنی زندگی سے واقف ہوتے ہیں حالانکہ اس سے واقف ہونے کے بعد ہی اس کے مختلف شعبوں کو سمجھنا ممکن ہے۔ دوسری صورت میں انکا موضوع خود کوئی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا ہے بلکہ تمدن مغربی کے اصول و مقاصد کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اس طرح ان علماء کی تحقیق کم و بیش تحقیق نوآبادیات کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اس سے ملک اور اس کے باشندوں کے متعلق معلومات بہم پہنچتی ہے اور اس معلومات کو عملی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ترکوں کی روح اور عہد حاضر کی ذہنیت سے بہت دور رہتے ہیں۔

مشرق ظاہر ہے کہ زیادہ تر سانی دجپی رکھتا ہے اور وہ بھی حال کی بنیاد ماضی سے زیادہ جہاں عام تمدن کا تعلق ہے یہی تاریخ سے آگے نہیں بڑھے ہیں کہیں پچھلے چند سالوں میں اور جرمنی کے اندر خصوصاً دوران جنگ میں انکی توجہ دور حاضر کے ترکوں کی طرف منعطف ہوئی لیکن اس میدان میں ابھی صحیح سوال قائم کر نیکی ضرورت ظاہر ہوتی ہے، ایک حد تک یہ لوگ بھی دوسرے گروہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مبتشر قین ہیں جو لوگ اسلام کی تحقیق میں مصروف ہیں انہوں نے ترکیہ جدید کی مذہبی تحریک میں بہت کم دجپی ظاہر کی ہے (اس سلسلہ میں بس ایک بار تھان کی کتاب جدید عثمانی شاعری کا نام لیا جاسکتا ہے)

رانج الوقت مغربی تصنیفات سے علیحدہ رائے اختیار کر نیکی ایک اور وجہ بھی ہے، مذہب سب چیزوں سے علیحدہ اپنی نشوونما اور حرکت نہیں لکھتا۔ وہ مطلق خود مختاری جو پہلے اس سے منسوب کی جاتی تھی اب اس سے بچیں رہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ مظاہر مذہبی کو بھی تمدنی زندگی اور تمدنی تحریک کی مجموعی حالت کی روشنی میں سمجھا جائے، اگر نقطہ نظر اختیار کر لیا جائے تو ماضی اور حال کے تاریخی مذہب اسلام پر بڑی حد تک وہ حکم نہ لگائے جائیں جو علماء مغرب کی طرف سے لگائے گئے ہیں وہ تقدیر پرستی جس پر اس قدر طعنے دئے جاتے ہیں۔ اسناد پر قین، دراجہا و کا نبد ہونا۔ یہ سب چیزیں دراصل ممالک اسلامی کے جماعتی معاشی اور سیاسی حالات سے مشروط ہیں۔ ماضی اور حال دونوں کے مسائل اسلامی پر مغربی توضیحات میں ارتقاء اور نشوونما کے لزوم کو بالکل نظر انداز کیا ہے۔ ایک

حد تک ان سب میں اسلام پر غور کرنے کا وہی قدیم کلیائی باوریوں والا نقطہ نظر کارفرما ہے جس کو اصولاً دور حاضر نے رد کر دیا ہے۔ فرق صرف یہ کہ کلیائی اور عیسائی معذرت و تنقید کی جگہ عیسائی اور یورپی قدور نے لی ہے۔

ایسی حالت میں مصنف کتاب نے اپنے کو مجبور پایا کہ وہ براہ راست ترکی ماخذ استعمال کرے اور اس طرح انکو وسیع تر معلقوں کے علم میں لے آئے۔ یہ ترکی ماخذ آخر کیا ہیں اور چونکہ یہ کتاب پوری تمدنی تحریک کو پیش کرنا چاہتی ہے اس لئے اس کے لئے ضروری ہے کہ علوم و فنون، آئین و معیشت، جماعتی زندگی، فلسفہ، مذہب، ان تمام شعبوں کے مظاہر کو پیش نظر رکھے۔ لیکن ایک ایسی تمدنی تحریک کے متعلق جو بھی نشوونما کے عالم میں ہے اور جس میں تفسیر یا کوئی چیز نئی ختم اور مکمل نہیں ہوئی ہے یہ کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر قدیم تمدن کی ساخت کی وجہ سے بھی بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ترکی علوم کوئی چیز نہیں۔ اس نام سے جو چیز موسوم کی جاتی ہے وہ تقریباً سب کی سب مغربی درآمد ہے۔ آئینی زندگی میں بڑی نسل درمیش ہے، جدید حکومت نے نیا قانون بنایا جس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ مغربی قانون سے استعار لیا گیا ہے۔ لیکن مختلف جانب سے اسکی مخالفت ہو رہی ہے۔ قانون اسلامی جو اپنی ہی مضبوط صورت میں شہری قانون ہے وہ نئی زندگی کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے اور اس میں زیم ہونی چاہئے۔ معیشت جدید کو لمبی نئے وجود میں آنے والے فائدہ گاہوں، معاشی سیاست کا کارروائیوں اور جدید معاشی قوانین کی وجہ سے ایک آخری شکل اختیار کرنی ہے۔ جماعتی زندگی میں بھی سب کچھ غیر متعین ہے۔ وہ فلسفہ بھی موجود نہیں جو کل ذہنی زندگی کو پیش کر سکے۔ مذہب بی اپنی تکلیفیں بدل رہا ہے۔ اس کتاب کا مقصد جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ نہیں ہے کہ اس تحریک کو ام نتائج اور اسکی نیک نیت بیان کی جائے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس تحریک اور اس کی وجہ سے جو انقلاب ہوا ہے وہ ہے کیا یعنی اس کی ذہنی اور روحانی حقیقت، اسکا رجحان اور اس کے وجود و مسائل کیا ہیں، اپنے مقصد کو اس طرح محدود کرنے سے ہمارا کام ایک حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ اس تمدنی تحریک کی وجہ سے جو انقلاب رونما ہوا ہے وہ ایک طرف تو ایک تر تصد

حیات و کائنات کے وجود میں آنے سے عبارت ہے اور دوسری طرف ایک نئی سیاسی اور معاشی جماعت بندی سے۔

ریاست کی تشکیل کا اظہار تو حکمران کے فرامین سے ملتے جلتے کے قانون دستور سے اور ریاست کے دوسرے اعمال سے ہوتا ہے نئے نظام معاشی کے نشوونما کو پہلے تو افراد کے اس معاشی رویہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جو نئے تصور کائنات نے پیدا کیا ہے یعنی جلب منفعت کی نہایت قوی آرزو میں اور دوسرے نئی حکومت کی مالی اور معاشی ریاست میں پہلی چیز کے لیے تو مصنف نے خود اپنے ملاحظات پر بھروسہ کیا ہے اور آخر کے کلام کو ناخذ قرار دیا ہے۔ اور دوسرے کیلئے حکومت کے مالی اور معاشی قوانین اور دوسری کارروائیوں کو۔

نئے قانون کے متعلق جو ابھی معروض تدوین میں ہے کوئی جدا گانہ بحث نہیں کی گئی ہے نظام جماعت کے متعلق بھی براہ راست ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے لیکن مذہبی مسئلہ کے متعلق کافی کتابیں موجود ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر ان کا صحیح حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔

جدید تصورات حیات و کائنات کے لیے شاعری میں خاص مانعہ ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ شاعری ہی نے اس نئے تصور کو پیدا کیا اور آگے بڑھایا، اس پر آگے بڑھ کر یہ دھوئے کیا جاسکتا ہے کہ دراصل یہ سارا تمدنی انقلاب جدید شاعری ہی کا کرشمہ ہے جسے پہلے اس میں انقلاب ہوا اور پھر یہ انقلاب تمام تمدنی زندگی پر پھیل گیا۔ بالکل سن کا قول ہے کہ قومی زندگی کے بڑے بڑے انقلابات اپنا اعلان احساس جمال، اور فوقی نظر کے تغیر کی صورت میں کرتے ہیں بغیر ترکی میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے گئے تھے یعنی اس وقت جب کہ مغربی تمدن کا اثر ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ عارف پاشا (متوفی ۱۲۶۶ھ) کے ہاں جو جدید شاعری کا پہلا علم بردار ہے اس نے طرز کی تشکیل ہو چکی تھی، عارف پاشا کسی یورپی زبان سے واقف نہ تھا اور اپنی ساری تعلیم کے لئے خود اپنے وطن کامرہ میں منت تھا، اس نے ترکی ادب کے وجود اور عقل کا خاتمہ کرنا چاہا، اس نے ایک نئی زبان میں لکھنا شروع کیا اور ایک حد تک شاعری بھی کی اور اس کے بعد آنے والے زمانہ میں ایک نئی ذہنیت کی روشنی ان پر پڑی تو دکھانے لگی جہاں ایک موت و آخرت کی قہید خوانی تھی وہاں اب یکایک تازہ و خوش آئند آوازیں قوم کو مل رہی تھیں اور تازگی کی حقیقت آشا زندگی کی دعوت دینے

لگیں، اور یہ بات محض اتفاقی ہی نہ تھی۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ترکی فلسفہ کا کوئی وجود نہیں۔ عربی اسلامی تمدن کا تاریخ میں جو اثر ہوا وہ تمام اسلامی اقوام کے لئے سخت مصیبت ثابت ہوا ہے۔ ان لوگوں نے یونانی فلسفہ کو لے لیا تھا اور اسلام کے اصولوں سے اسکی تطبیق کی کوشش کرتے تھے یا کہیں کہیں تھوڑا بہت خود اس فلسفہ سے بھی شغف رکھتے تھے جو غیر مذہب کے باہر ہوتی وہ مذہب کی دشمن تھی اور اس لئے اہل دین کے نزدیک اُسے وجود کا حق مہل تھا۔ جو چیزیں اسلام کے موافق ہوتیں وہ پھر فلسفہ نہیں، اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں وہ لامتناہی ذہنی جنگاں شروع ہوئی جو کہیں اب جا کر ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں فلسفہ بے دینی کا مرادف تھا۔ مدرسوں کے نصاب میں منطق تک کو سمجھا جاتا اور شبہ و نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور نہایت احتیاط سے اسکی تھوڑی تھوڑی خود اکیں پہنچائی جاتی تھیں لیکن خود اپنے فلسفہ کا نہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ ہر قسم کی فلسفیانہ فکر معدوم تھی، تصوف نے شاعری کو آلہ کار بنالیا تھا اور شعر کو علم و عرفان کا ذریعہ مقرر کیا اور یہ کوئی نئی بات تھی۔ بشرق میں شاعری ہمیشہ سے ذہنی زندگی کی حامل ہی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر فلسفی ہوتے تھے اور فلسفی شاعری کیا کرتے تھے۔

اسی رجحان کا اثر عثمانی ترکی شاعری پر ہمیشہ رہا ہے اور اب بھی واقع ہے۔ ترکی عثمانی ادب کی تاریخ کے شروع میں ہمیں شاعری میں تعلیمی نظم ہی غالب صنف نظر آتی ہے۔ شروع کے شاعر جان بوجھ کر اس لئے شعر کہتے ہیں کہ اپنی قوم کو پورے کھائیں۔ ایسی تاریخی حیثیت میں ترکی شاعری کو دور جدید میں ایک تمدنی مٹن سپرد کر دیا۔ وہ شاعری جو پہلے رائج الوقت اور رفتہ رفتہ بے جان خیالات کی حامل تھی اُس کے ذہن اب یہ کام ہوا کہ وہ کل تمدنی زندگی کو ایک نئی شکل دے۔ اُس نے اپنا یہ فرض نہایت کامیابی سے پورا بھی کیا۔ اس طرح ترکی شاعری ترکوں کی ذہنی زندگی کا صحیح آئینہ ہے اور اسی وجہ سے جدید تصور کائنات کی تحقیق کے لئے یہی ایک خاص اخذ ہے۔ یہ بات جدید شاعری کی فرنگی پسند شاخ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہر چند کہ اُس میں ترکی شاعری کی تاریخی روایتی، تمدنی مقصد کو اصولاً ترک کر دیا ہے۔

جدید عثمانی ترکی شاعری میں سے میں نے بالالزام ان لوگوں کے کلام کو پیش نظر رکھا ہے۔ انسانیت کا

۱۔ اور عبد الحق باریون۔ ۲۔ توفیق ٹکرت۔ ۳۔ ضیا گوگ الپ اور محمد امین۔ ۴۔ محمد عاکف دان ناموں کے انتخاب کی وجہ بیان کرنا ہمیں بہت دو پہنچا دے گا۔ اس لیے اگر یہ جی نہیں چاہتا تاہم میں اُس سے گریز کرتا ہوں۔ اس کے بجائے میں مختصر طور پر اُس حیثیت کو بیان کئے دیتا ہوں جو ان مصنفوں کو اس نئی تمدنی تحریک میں حاصل ہے جس کے یہ حامل ہیں۔

نامتو کمال (۱۸۲۴ء - ۱۸۸۸ء) خود ایک مدرسہ، یہ عاقل اسلامی ترکی تمدن کے اساس پر قائم ہے اور اسے زندہ رہنے کے قابل اور قائم رکھنے کے لائق سمجھتا ہے۔ یہ اسے خوب جانتا ہے اور اسلام کی تاریخی شکل کا منکر ہے۔ اس نئے احساس کی وجہ سے جو اس کے اندر بیدار ہے وہ دور حاضر سے بیزار ہے اس لئے اس کی نظر ایک طرف تو قدیم اور اصلی اسلام پر لگی ہوئی ہے جس کی نئی تفسیر کرنیکی کوشش اُس نے متعدد کتابوں اور مضمونوں میں کی ہے اور دوسری طرف اہل عثمان کی قدیم تاریخ پر جسے اُس نے خود کئی جلدوں کی ایک کتاب میں پیش کیا (عثمانی تاریخی غیر مطبوعہ) اپنی ان ادبی سرگرمیوں میں وہ اپنے جدید تصور کائنات کا بھی اعلان کرتا ہے اور اس طرح عہد قدیم کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے، اسلام کا نام لیکر وہ دنیا سے بیڑی دنیا سے نفرت اور کابلی کے خلاف جہاد کرتا ہے اور لوگوں کو عمل کی اور حیات و کائنات کو قبول کرنیکی دعوت دیتا ہے۔ وہ استبداد کا تباہ کن دشمن ہے اور حریت انسانی کا علمبردار ہے، عثمانی وطن کا تصور اسی سے بڑے ترک محب وطن کی تخلیق ہے۔ اسکی ساری زندگی اور اسکی ساری سرگرمی قوم کے لئے ہے۔ سچی حکومت قوم کی خدمت کا نام ہے، فنون لطیفہ، زبان سب کچھ اُس کے نزدیک بس اس عظیم الشان مقصد عظیم کے حصول کا ذریعہ ہے جس کے حصول کی آرزو میں وہ تیار ہے۔ "اگر میں اپنی قوم کی اس بہار کو دیکھے بغیر مر جاؤں جس کی امید میں جیتا ہوں تو میرے لوح مزار پر لکھ دینا، وطن سوگ میں ہے اور میں بھی سوگ میں ہوں" یہ مغرب سے بھی واقف ہیں اور مغرب کی تمدنی ترقیاں بھی نہیں کہ کچھ کچھ اسلام سے مطابق سمجھتا ہیں بلکہ جہاں تک اسلام انکی اجازت دیتا ہے یہ خود اسلام کی طرح نظر ہیں یہی وجہ ہے کہ انی زور دار

اقتضائی تحریروں میں وہ ہمیشہ صرف اسلامی خیالات اور عثمانی روایات کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اپنے تمام خیالات کو اسلامی اصولوں سے اخذ کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اسکا مذہب کا تصور خالص اسلامی ہے اور اسکا تفکر و احساس بھی، اپنے قومی تمدن کے دھمول اساسی کے سہارے سے اس انقلابی اور افتخالی شخصیت نے جو غیر معمولی قوت اور مضبوط ارادہ سے متصف تھی اپنی اولیٰ اپنے بعد میں انیوالی نسل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے، کمال کوئی بہت بڑا اہل فن نہ تھا لیکن اسکا اثر اس ذہنیت کی وجہ سے تھا جو اس کے فن میں جاری و ساری تھی نظم میں یہ قدیم استادانہ نظر کا قبیح تھا لیکن نثر میں اس نے ایک نئی زبان پیدا کی اور اسے اپنے نئے خیالات کا حامل بنایا۔ وہ نئی ذہنیت جو انیسویں صدی کے آغاز سے اندر اندر تیار ہو رہی تھی اور جو باقی کمال کی ذات میں آکر ظاہر ہوئی، اس نے اُمّت کے معاصرین و دوست عبدالحق حامد میں اپنا فنی کمال حاصل کیا، حامد اب تک زندہ ہے اور بعد میں انیوالی تمام تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے

عبدالحق حامد سال پیدائش ۱۲۷۵ھ مختلف عناصر کا ایک ترکیبی مجموعہ ہے۔ اس نے اپنے تجربہ زندگی میں اسلام اور ترکوں کے امنی کو پھر زندہ کیا ہے مستقبل کی تشکیل کی ہے۔ اور ان دونوں کو اپنی ذات میں یکجا کر لیا ہے۔ قدامت اس کی ذات میں آگے اپنی زندگی گزارتی ہے لیکن قدیم نہیں معلوم ہوتی جدت نے اس میں اپنی تکمیل حاصل کی ہے لیکن جدید نظر نہیں آتی۔ اپنی غفلت اور زور کے باوجود باقی کمال کا کام ایک جزوی کام ہے۔ یہ جزئیات میں بہت نیا وہ محسوس جاتا ہے اور جھگڑوں میں اپنے کو کھودیتا ہے اسکا فن اور اس کی شاعری زندگی میں جامی ہے۔ حامد برخلاف اس کے سر نہ پا اہل فن ہے کمال کی بے مبنی اور سیاب و شی کا اس میں تپ نہیں۔ وہ ایک پرسکون صاحب فکر اہل فن ہے۔ اس کے ہاں زندگی فن اور شعریں جا کر مل گئی ہے۔ اس کے لئے اپنا فن زندگی ہی کی ایک شکل ہے بلکہ خود زندگی ہے کمال نے ایک دفعہ امیر عترت میں کیا کہ تم بزدل ہو تو اس نے ذیل کے الفاظ میں جواب دیا کہ آپ مجھے الزام لگاتے ہیں کہ میں بزدل ہوں۔ نہیں میں بزدل نہیں۔ میں کچھ پرسکون ہوں۔ لیکن میرا سکون مستقل نہیں وقت آئے گا تو آپ دیکھ لینگے کہ مجھ میں حصہ بھی ہے اور گرمی بھی۔ امتداد کے خلاف میں نے جو کچھ کہا ہے

اُس میں تو بزدلی کا پتہ بھی نہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھئے کہ جو راہ آپ نے کھولی ہے اُس پر میں نہ چلوں گا یہی میری راہ بھی ملے ہے۔ اپنی تصانیف میں دورِ حاضر سے آگے بڑھ گیا ہے اور انیس استقلال کی تفسیر کرتا ہے۔ حال کی بے بھیموں۔ مخافتوں۔ اور ناگامیوں سے وہ اپنے سکون میں جمع واقع نہیں ہونے دیتا، اپنی فن و شعریں کسی چیز کو پورا کر لینا اُس کے نزدیک اصلی حقیقت ہے۔ حامد کا ایک دوست یعنی مشہور شاعر اور نظری عالم اس کے نام ایک خط لکھتا ہے جس میں اس بات کی شکایت ہے کہ تو میں فن اور شعر کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ حامد اس بات سے افسردہ نہیں ہوتا اور جواب میں لکھتا ہے: تم کہتے ہو کہ یہ قوم فن کی حقیقت ماہیت کو نہیں سمجھے گی، یہ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اس سے ہوتا کیا ہے ہمیں چاہئے کہ قوم کا کچھ خیال نہ کریں اور اپنی راہ چلیں حقیقی فن اس بارہ میں وجود الہی کی طرح ہے کہ اُس کے کام اور اثرات تو ظاہر اور آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن وہ خود چھپا ہوا ہے اور آنکھوں سے اوجھل ہے۔ حامد ترکی اور اسلامی عہد گذشتہ کی حیثی جاگتی تصویر ہے لیکن اسکی ذات سے نئے تصور کائنات و حیات کی شاعرانہ ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

حامد رومانی ہے یعنی انیسویں صدی کی مغربی رومانیت کا شاگرد ہے، یہ تعلق اُس کے لئے بڑا اہم تعلق ثابت ہوا ہے، یہ ترکی تمدنی زندگی کی تشکیل کرنی والا اپنے فن میں بھی بڑا صنّاع ہے بلکہ اُس کا سب سے بڑا مجدد، قدیم ترکی شاعری کی طرف اُس کا رویہ ہی رومانی ہے جس طرح مغربی رومانیت نے عہدِ قدیم سے تعلق تو لیا اور پڑانے آئینِ صورت کو چھوڑا اسی طرح حامد نے فارسی اور عربی اثر کو ختم کیا جسکی حیثیت ترکی فنونِ لطیفہ کے لئے وہی تھی جو قدیم یونان و رومہ کی مغربی فنون کے لئے اُس نے قدیم طرزِ بیان کی پابندی کو چھوڑا اور اس طرح ترکی شاعری کو موت سے نجات دی۔ اُسکی یہ کوشش مطالبہ وقت کی اتنی مطابق تھی اور زمانہ نئی فنکلوں کو اس طرح ڈھونڈ رہا تھا کہ حامد جلد کامیاب ہو گیا۔ حامد پر مغربی رومانیت بھی ایک اثر نہیں ہے بلکہ اور بہت سی شاہتیں بتانی جاسکتی ہیں مغربی رومانیت میں جو حیثیت ایک کامل خیالی

یونانی عورت کی تمثیل وہ حامد کے ہاں اندلسی عرب خاتون کی ہے۔ وہاں جو شخصیت قرون وسطیٰ کی تھی وہ یہاں اسلام اور آل عثمان کے عہد قدیم کی ہے۔ رومانیوں میں تو می پچی کے ساتھ جو کبھی تھی وہ اس کے ہاں یوں ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے سب سے پہلے شاعری میں ترکی قومی بحر کا استعمال کیا۔ رومانیت کے تصور کائنات نے اُس پر اپنا اثر ڈالا ہے اور رومانی جو طبع بھی اس کی شاعری کا ایک جزو ہے۔ اس رومانی اثر نے شاعر پر اور بعد کے حالات پر کیا ہی مفید اثر ڈالا ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سے نقصان بھی پہنچا اور بعض دوسرے عناصر سے ملکر جن کا ذکر یہاں نہیں کیا جاسکتا اُس کے جذبہ حیات کو مکدر کر دیا ہے اور اس کے تصور حیات و کائنات میں کچھ نہیں پیدا کر دی ہیں۔

اس کے نزدیک بھی شاعری عظیم کائنات قومی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ اپنے خود زندگی کی ایک شکل ہونے کی وجہ سے اس کو ایک گونہ خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کسی اعلیٰ تر مقصد کے لئے اسے بطور ذریعہ استعمال کرنا عائد خوب سمجھتا ہے، البتہ اس کے بعد آئینے فرنگی دوستوں نے اس معاملہ میں اس سے علمی گدی اختیار کی ہے اور یہ اصول اختیار کیا ہے کہ فن کو فن کی خاطر ہونا چاہئے۔

اس مغرب پسند جماعت کا خاص نمائندہ توفیق فکرت ہے (۱۸۶۸-۱۹۱۲ء) فکرت کی ذات ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی یا بچ کی منزل ہے، وہ قدم بنیادیں جس پر حامد اور کمال مضبوطی کے ساتھ کھڑے تھے اس کے پیروں تلے مترنزل ہو چلی ہیں۔ قدامت ختم ہو گئی ہے اور فکرت کے سامنے اس سے اپنا رشتہ کاٹ کر مغربی خیالات کے سیلاب میں آمچلتے ہیں، کمال اس کا دشمن تھا اور حامد جب تک مقابلہ میں اپنی ہستی کو قائم رکھتا تھا فکرت کے ہاں دنیا سے نفرت اور یاس مٹرنی پائی جاتی ہے یہ بدہ کی بڑی عظمت کرتا ہے اگرچہ اس نے آخر میں انکو مغلوب کر لیا ہے، علمی نظر سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی ذہنیت جس نے کمال اور حامد کی ذات میں ظہور کیا تھا فکرت اور اس کے دوستوں میں اگر مصالح ہو گئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ بھی دراصل بخت بوی کا زمانہ تھا کیونکہ طرز خیال اور طریقہ احساس کے باوجود یہ جدید ذہنیت ان کی نظموں میں برابر جھلکتی ہے اور ہم آگے چل کر کمال



اور حامد کے ساتھ اکثر فکر و کام بھی پائیے۔

ضیا گوک الپ (سال ولادت ۱۸۷۵ء) مغرب پسندی کے خلاف ایک رد عمل ہے یہ ایک مثلاًشی حق ہے اور اہل نظر و عظیم اشلان اتحاد ترکیبی جو حامد کی ذات میں ظاہر ہوا تھا مغرب پسندی کے عہد میں اس میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اس میں جو کچھ قدیم چیزیں تھیں انکو لوگوں نے غلط سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور جو کچھ نئی تھیں انکی تکمیل اور انکا حصول ابھی باقی تھا۔ تاریخ کا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ غیبا نے اس حقیقت کو پہچانا اور کوشش کی کہ ایک نیا اتحاد ترکیبی پیدا کر کے اس ہیجان کو رفع کرے چنانچہ ترکی قوسیت کا خیال وجود میں آیا۔ اس کے متعلق ہم آگے چلکر دیکھیں گے کہ عثمانی ترکی زمین پر پہلے سے اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں غیبا نے صرف اس کی ترجمانی کی اور اس کا مطلع نظر قائم کیا۔

محمد امین (سال ولادت ۱۸۶۹ء) طبقہ عوام کا ایک مدرس ہے یہ ترکوں کے قدیم کارناموں، ان کے دکھ درد اور مصیبتوں اور جس مستقبل کی یہ امید رکھتے ہیں اس کا گیت گاتا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اپنی قوم کے تمام طبقوں میں روشنی بھیلانا ہے۔ نئے خیالات اس کے پاس نہیں ہیں لیکن یہ اپنے زمانہ کی سچی تصویر ہے اور اس کے خیالات و خواہشات کی ایک خاص شکل میں ترجمانی کرنا خوب جانتا ہے اس لئے ان خیالات اور خواہشات کا اس کے ہاں مطالعہ کرنا دلچسپی سے غالی نہیں۔

محمد عارف (سال ولادت ۱۸۷۲ء) ان تمام تغیرات کا بہت اچھا نمونہ ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس کا باپ ایک قدیم طرز کا عالم ہے یعنی عالم دین، باپ نے قدیم طرز پر لڑکے کو تعلیم دی ہے اور عارف اسی قدیم ذہنیت اور قدیم تصورات کی دنیا میں رہتا ہے۔ ہر خدائی شکل نئی ہے لیکن اس کی ابتدائی نظموں میں بھی عہد قدیم کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہ کمال اور حامد کی بڑی عزت کرتا ہے اور مغرب پسند کا نہایت شدت کیساتھ مخالف ہے لیکن خود ان ابتدائی نظموں میں ایک اندر دینی تغیر کے آثار پائے جاتے ہیں یہ تغیر تھوڑے ہی عرصہ میں پورا ہو جاتا ہے اور عارف قدیم ترکی ایرانی شاہی اور خصوصاً تصوفانہ شاعری سے بالکل جدا ہو جاتا ہے، مغرب پسندی کی طرقت چلا جاتا اس کی کیفیات و داعی کے

اعتبار سے بالکل نامکن ہے، حامدا و رکال اور بے سے زیادہ مصری محمد عبدہ اور فرید دہدی کے زیر اثر یہ ایک نئی راہ نکالتا ہے اور جدید تصور کائنات و جات سے آگریوں ملتا ہے کہ دنیا کو عمل اور عمل کو مزین بناتا ہے۔ اسکی شخصی نشوونما کے یہ منازل گویا کل ترکی قوم کے ارتقاء کے منازل میں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ شخص ترکوں کی نئی دنیا کے لئے ایک کائنات بھل کی حیثیت رکھتا ہے۔

منیا اور امیں میں اسکے شاعری نے پھر اپنا تاریخی تمدنی فرض اختیار کر لیا ہے، عاکف کے ہاں تو یہ چیز خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے ”میں اب لمبی صوفیوں مثلاً حافظ ذخیرہ کے کلام کو نہایت لطیف لے کر پڑھتا ہوں۔ لیکن یہ میں جانی گیا ہوں کہ ان مشاعروں کے خیالات انسان کو مادی زندگی سے دور کرتے ہیں اور اُس کے احساس فرض کو تلف کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے فن کا بھل میں جو جوہر اور زوال کے بھصیب عہد میں عالم وجود میں آیا۔ یہ آدمیوں پر بخد کی طرح، انیون کی طرح اثر کرتے ہیں لیکن اسکی تو ہمیں ضرورت نہیں۔ میری نظر تو بھلکین دلاتی ہے کہ ہمیں ایک زندہ صبح اور ذوق عمل پیدا کرنے والے ادب کی ضرورت ہے“ یہ ان مغرب پسندوں کی شاعری پر بھی ایسا ہی حکم لگاتا ہے، جو فن کی خاطر فن کا خالی اصول دھراتے ہیں۔ عاکف نوکلتم خیال ہے کہ فنون لطیفہ کو اہم اعراف تمدنی کیلئے بطور ذریعہ کے استعمال کیا جاسکتا ہے اور تاریخ تمدن کے نقطہ نظر سے یہ برکت ثابت ہوتی ہے اسیں شک نہیں کہ وہ اس خیال میں ذرا مبالغ ہو کام لیتا ہے اور شاعری اُسکے منظوم و غزل کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اُسکا شاعرانہ اثر زائل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی مختلف عناصر کو ایک نئی ترکیب دینا چاہتا ہے جو ضیاء کی ترکیب سے بہت مختلف ہے۔ اُس ترکیب کا شاعر ہے جسے ہم نے بعد کو ترکیب اصلاح کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ ایک مصلح ہے اور اس قسم کا اخلاقی اقدار جیسے شوخی۔ یہ شعرا جو اکثر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں دراصل ایک سلسل ارتقاء کی گریاں ہیں، انکی تصانیف نئی ذہنیت کے مختلف حصوں کی حال ہیں جن سے آگے جھلک رہی ترکیب ہوگی۔

یہ تمدنی تحریک شروع کب ہوتی ہے؟ میں یہ سوال اس جگہ پیش نہ کرتا اگر اس کا بہت قریبی تعلق

ایک دوسرے سوال سے یعنی اس تحریک کے اسباب کے سوال سے نہ ہوتا۔ اس دوسرے سوال کا جواب لوگ نہایت یقین کیا تھا۔ دیتے ہیں کہ ساری تحریک کا سبب مغربی تمدن کا اترہ ہے اس جواب میں یقیناً کچھ حقیقت ہے لیکن جو شخص ترکوں کی سیاسی نہیں بلکہ ذہنی زندگی کو اچھی طرح واقف ہو اس کو اس جواب پر تشکی نہیں ہو سکتی۔ سلطنت عثمانیہ کی تاریخ ایک مخصوص تمدن کے پیدا ہونے، پھیلنے پھولنے اور زوال پذیر ہوجانے کی تاریخ ہے۔ یہ تیرہویں صدی میں شروع ہوتی ہے اور سولہویں صدی میں کمال کو پہنچتی ہے۔ سترہویں صدی میں زوال شروع ہوتا ہے لیکن ذہنی اعتبار سے وہ زوال اٹھارہویں صدی میں ختم ہوجاتا ہے۔ سیاسی اور عاشری انحطاط تو آج تک جاری ہے لیکن ترک جب انیسویں صدی میں داخل ہوئے ہیں تو ایک نئی ذہنیت کے آجڑے ہوئے عناصر ساتھ لیکر داخل ہوئے ہیں۔ قدیم ترکی شاعری جس کے لئے اٹھارہویں صدی سب سے زیادہ نمونہ کا زمانہ ہے اس کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے، انیسویں صدی کے شروع میں ایک جدید شاعری کے ابتدا کے شواہد ملتے ہیں (یعنی مامم مترجم کا موس متوفی ۱۸۱۹ء اور عاکف پاشا متوفی ۱۸۲۲ء کے کلام میں) ذہنی تجدید کی خواہش یہاں پہلے سے موجود ہے نیز اعظم اور کاھر نیایشانی کے زمانہ میں اس کی ترقی اور مختلف جنگ کے میدانوں میں دول یورپ سے مقابلہ میں ترکوں کو مغربی قوموں کی قوت سے آگاہ کیا قبل اس کے کہ وہ ان کے تمدن کے متعلق کچھ جانتے اس نئی دنیا کی ضروریات کے لائق ہونے کی خواہش نے ان میں سیاسی تجدید کا غم پیدا کیا جو اگرچہ موجود تو پہلے سے تھا لیکن جسے اپنا سب سے دانشمند اور مضبوط حامی، سلیم ثالث (۱۸۰۹ء - ۱۸۳۹ء) کی ذات میں نصیب ہوا۔ اب یہ بات بدیہی تھی کہ ترکوں کی نظریہ پر مبنی تمدن پر پڑتی۔ اس سب کے ساتھ ساتھ اور چیزیں بھی محرک ہوئیں۔ اپنے تفصیل سے بحث کئے بغیر میں صرف ان کل اسباب کو میں ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ان اسباب کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ (۱) داخلی (دب) خارجی۔ داخلی اسباب یہ تھے (۱) قدیم نظام فوجی کا ٹوٹنا اور سیاسی قوت کا زوال جو اٹھارہویں صدی میں لشکر کی ترتیب نو کا باعث ہوا۔ سلیم ثالث نے اس معاملہ میں بنیادی تغیر کرنا چاہا اور بلاغاً اس کی خطرناکی جان وی لیکن محمود ثانی نے ۱۸۲۵ء میں لشکر کے قدیم منصب داری نظام کو ختم کر کے قومی لشکر کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں

سلطنت عثمانیہ کے زوال کی سطح زیادہ زائد رہی

چلکر بہت اہم نظام حیثیت اختیار کی۔

(۲) بڑے بڑے علاقوں کا ہاتھ سے نکل جانا جو قدیم سلطنت کے لئے بمنزلہ نوآبادیوں کے تھے اور معاشی زوال۔ ان واقعات کیوجہ سے ایک قومی تجارتی سیاست معاشی کی بنیاد پڑی جس میں نئے لشکر کی ضروریات کو پورا کرنا ایک خاص مقصد تھا

(۳) قدیم نظام ریاست اور علمہ نظم و نسق کا حالات کے اعتبار سے ناموزوں ہونا۔ قدیم ریاست میں جذبہ سیاسی، معاشی اور تمدنی کاموں کی صلاحیت نہ تھی۔ قدیم فوجی اور انتظامی نظم کو ہٹا دینے کے بعد ضروری تھا کہ سلطنت کو از سر نو منظم کیا جائے اور ایک مرکز پر لایا جائے۔ ان اسباب نے جدید نظام ریاست پیدا کیا۔

(۴) تمدن قدیم کی ان ذہنی بنیادوں کی تباہی جو قدیم معیشت اور ریاست پر قائم تھیں اس کا نتیجہ یعنی کھنوں کی شکل میں نکلا جو روز بروز اور کل ہوتی گئیں مدارس، کتب خانے، اوقاف سب پر زوال آیا۔ یا تو معاشی حالات اور پیسہ جنگوں کے باعث ان کا قائم رکھنا ناممکن ہو گیا یا انہیں وہ پہلی سی قوت جذب باقی نہ رہی۔ قدیم نظم و نسق کی قوت بھی جاتی رہی چنانچہ ریاست نے نئے مدارس کھولے، ایک نئی یونیورسٹی اور ایک اکادمی جنہیں علوم نو کو دواج دیگیا۔ ۱۷۰۰ء خارجی اسباب یہ تھے:-

(۱) مغربی سرمایہ داری کی توسیع (۲) ترکی کے خلاف یورپ کی تباہ کن سیاست (۳) مغربی تمدن کا علم اور سلام اور ترکوں پر یورپی نکتہ چینی۔

مذکورہ بالا دو قسم کے اسباب میں سے کسی ایک کو فیصلہ کن اہمیت دے دینا ٹھیک نہ ہو گا۔ پہلے اسباب کے بغیر دوسرے بے اثر رہتے اور دوسروں کے بغیر پہلوں کی تشریح کم و بیش نہ ہو سکتی۔ ہر جگہ دونوں ہی قسم کے اسباب برسرِ کار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور بتانا چاہئے کہ اولیت اندرونی اسباب ہی کو حاصل ہے۔

دوسرے واقعات بطور اسباب زوال پیش نظر آسکتے ہیں (مثلاً جنگیں مختلف اشخاص کا شعرو غیر) وہ دراصل مخصوص حالات میں جن سے مذکورہ اسباب کے عمل میں روک پیدا ہوئی یا مدد ملی خود انہیں کوئی فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں۔ آخر میں دو باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ اس کتاب کا موضوع ترکیہ اور وہ بھی جدید ترکیہ ہے

۱۷۰۰ء عبدالرحمن خرف کی کتاب تاریخ دولت عثمانیہ جلد ۲۔ تتمہ۔

اسکو ایک تو قدیم عثمانیوں سے الگ رکھنا چاہئے اور دوسرے اسلام میں حیثیت اہل سر۔ اس معاملہ میں خواہل علم کے یہاں ایسی گروہ ہے کہ فہم اور علم میں باہر ہوتی اور انہیں مکہ کرتی ہے۔ ترکیہ جدید پر حیثیت نئی حیثیت کے بجائے خود نظر کرنی چاہئے۔ قدیم ریاست اور قدیم تمدن تو اب ختم ہو چکا۔ جو چیز ہمارے سامنے ہے وہ بن رہی ہے، ہمیں کوئی چیز تیار ہو کر ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ابھی ابتدائی مراحل کی بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ اگر اس سب کو قدیم حالات ہی کا تسلسل سمجھا جائے تو غلطی ہوگی نیز یہ بھی دانتیں کہ جدید ترکیہ یا خود ترکیہ کو کل اہل اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے (اور پھر ظاہر ہے کہ کل شرق کے نقطہ نظر سے تو اور بھی نہیں لیکن افسوس مگر غلطی ایسی جمی ہے کہ اکثر شرقی نہیں معلوم ہوتی اسلام اقوام میں تو جن میں ترک، ایرانی، عرب جو ہیں جماعتی و معاشی حالت فوجی تعلیم، عام تربیت، زمین پر بسنے کے طریقوں، وسائل آمد و رفت، انتظام ریاست اور قانون کے اعتبار سے اتنی بھی یکسانیت نہیں ہے جتنی اقوام مغرب میں۔ دوسرے میں پھر ایک مرتبہ ترکوں پر مغربی تمدن کے اثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ تاریخ تمدن کا ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جو چند جملوں میں حل نہیں کیا جاسکتا جیسا اوپر کہا جا چکا ہے کہ لوگ اس اثر کے انداز نہیں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مغربی خیالات کا انگریز ایک طرف تو تعلیم اور حرکت پیدا کرنے کا باعث ہوا لیکن دوسری طرف تباہ کن اور مضر اور یہ سلم ہے کہ ترکوں میں آج جو ذہنی چمکنی عام ہے وہ بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے لیکن تحریک تمدن میں ترک بس اس حد تک آگے بڑھے ہیں جہاں تک انہوں نے خود تخلیقی کام کیا ہے۔ جن بڑے آدمیوں نے اس تحریک میں کچھ کام کیا ہے وہ یا تو مغرب سے بالکل متاثر نہیں ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے جلدی اپنے کو مغربی اثر سے آزاد کر لیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب پسندی ختم ہو چکی ہے جذبہ قومیت اور اصلاح اسی کا رد عمل ہیں۔ اب تک جو خیالات اور افادہ گاہیں یورپ سے مستعار لی گئی ہیں انہیں آخری چیز نہیں سمجھنا چاہئے۔ انکی حیثیت بس عارضی اور اکثر ناکام کوششوں کی سی ہے۔ اب تک ہر چیز غیر متعین ہے۔

# دو گز زمین

(۱)

» بڑی بہن اپنی چھوٹی بہن سے ملے گانوں آئی۔ بڑی بہن کی شادی شہر میں ایک دوکاندار سے ہوئی تھی، چھوٹی کی گانوں میں ایک کسان سے۔ دونوں بہنیں بیٹھی چا پنی رہی تھیں کہ بڑی نے شہری زندگی کی بڑیا شروع کیس۔ کیسے آرام سے رہتے ہیں۔ کیسے کیسے کپڑے پہنتے ہیں، اس کے بچوں کی پاس کتنے اچھے اچھے لباس ہیں، تھیر جاتے ہیں، مگر گت رہتی ہے، طرح طرح کی تفریحیں ہیں۔

چھوٹی بہن کو برا لگا اور اس نے دوکانداروں کی زندگی کی بُرائی شروع کی اور کسانوں کی طرفداری کی تیں اپنی زندگی کو تمہاری سے بدلوں گی۔ وہ بولی، ہم سوتے بھونٹے رہتے ہیں، پر خور سے تو آزاد ہیں، تم لوگ ہم سے بہتر مٹنگ سے رہتے ہو اور اکثر ضرورت سے زیادہ کما لیتے ہو لیکن یہ بھی تو اکثر تمہارے کہ سب کچھ کھو بیٹھتے ہو۔ کہاوت سنی ہوگی، ”نفع نقصان جڑواں بھائی ہیں“ اگر تمہارے کہ آج جو مالدار ہے کل ٹھیک کے ٹکڑوں کو لگ جاتا ہے، ہماری زندگی میں یہ اندیشے نہیں کسان کی زندگی بہت سوتی نہیں ہوتی مگر بس ہوتی ہے۔ ہم مالدار تو کبھی نہ ہونگے لیکن ہمارے پاس کھانے کو ہمیشہ کافی ہوگا۔

بڑی بہن طنز آ بولی ”بس؟ ٹھیک، اگر سوروں اور بچھڑوں کی زندگی چاہتی ہو، تم نفاست کے طور طریقوں کو کیا جانتا ہو تمہارے میاں کیسی ہی محنت کریں تمہاری موت بھی ایسی ہی ہوگی جیسی زندگی ہے بس گوبر کے ڈھیر پر۔ اور تمہارے بچوں کی بھی۔

”ہسکا کیا؟“ چھوٹی بہن نے جواب دیا، ”ہاں ہاں ہمارا کام موٹا ہے بعد اے مگر یقینی تو ہے ہیں کسی کے آگے جھکنا تو نہیں پڑتا، اور تمہارے ارد گرد شہروں میں طرح طرح کی رغبتیں ہیں۔ آج ممکن ہو سب ٹھیک ہو مگر کل ممکن ہے شیطان تمہارے میاں کو تاش، شراب عورتوں میں پھانس دے اور بس سب کچھ تباہ ہو جائے۔ کیوں کیا اکثر ایسا ہوتا نہیں؟“

گھر کا مالک چھوم، آتش دان پر پھورتوں کی باتیں سن رہا تھا، ”بات تو بالکل ٹھیک ہے“ اس

نے سوچا یہ بچپن سے دھرتی مانا کہ جو تنے میں ایسے لگے رہتے ہیں کہ ہم کسانوں کو وقت ہی نہیں ملتا کہ سر میں کوئی حماقت جگہ پکڑے۔ ساری وقت یہ ہے کہ کافی زمین نہیں۔ اگر بہت سی زمین ہوتی تو میں تو کجنت شیطان سے بھی نہ ڈرتا۔“

عورتیں چاہتی تھیں۔ تھوڑی دیر کپڑوں کی بات بیاہیں ہوئیں۔ پھر چار کے برتن دھو دھلا کر سونے کو لگائیں لیکن شیطان آتش دان کے پیچھے میٹھا سب باتیں سن رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ کان کی بیوی نے اسیں غمی پیدا کر دی ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اگر بہت سی زمین ہو تو شیطان سے بھی نہ ڈروں۔ اچھا اچھا شیطان نے خیال کیا ”میرا تیرا مقابلہ ہو گا۔ میں تجھے زمین بھی دے دوں گا اور اس زمین کے ذریعہ تجھے اپنے قابو میں لے لوں گا۔“

(۲)

گانوں کے قریب ایک خاتون رہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی زمیندارنی جس کی کوئی ۱۰۰۰ اکڑ کی جلا تھی۔ جب تک اس نے ایک بوڑھے سپاہی کو اپنا کارندہ نہیں بنایا تھا جو لوگوں پر گئے دن جبراً نے کیا کرتا تھا اس خاتون سے اور کسانوں سے خوب ہنتی تھی۔ یہوم لاکھ خیال رکھتا لیکن ہمیشہ کچھ نہ کچھ بھجاتا کبھی کوئی گھوڑا سڑکے کھیت میں جا نکلا کبھی کوئی گائے خاتون کے باغ میں جا پہنچی کبھی بھیرے اس کی چراگا ہوں میں چلے جاتے اور اسے جیسے جبراً دینا ہوتا۔

یہوم ادا تو کر دیتا لیکن گڑگڑایا کرتا۔ اور غصہ میں گھر جانا اور گھر والوں سے سختی کرنا۔ ساری گری بھوم کو اس سپاہی کی وجہ سے بڑی تکلیف رہی۔ اور جب جاڑا آیا اور دیکھیں گیل کو اٹھیل میں باندھنا پڑا تو یہوم کو خوشی ہوئی۔ چونکہ ہارنہ چرکتے تھے اور اس نے چارہ دینا پڑتا تھا جو اسے اچھا نہ لگتا تھا مگر پھر بھی روز کی فکر تو نہ تھی۔ جاڑے میں خبر اڑی کہ یہ خاتون اپنی زمین بیچتی ہے اور بڑی شرم دلی سرائے کا مالک اس کی بات چیت کر رہا ہے۔ کسانوں نے یہ سنا تو بہت ڈرے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر سرائے والے نے زمین لے لی تو اس کا زندہ سے زیادہ جہانوں کی مصیبت ہوگی۔ اور ہمارا سارا سہارا تو اسی جاندہ پر ہے۔“

کان گانوں کی طرف سے خاتون کے پاس گئے اور درخواست کی کہ سرائے والے کو زمین نہ دے

ہم لوگ اس سے بہتر قیمت ادا کر گئیے۔ خاتون راضی ہو گئی۔ کسانوں نے کوشش کی کہ ساری جائیداد گڈوں کے نام سے خرید لیں اور سب کے سب مشترک طور پر اس کے مالک ہوں۔ دودھم اس کام کے لئے ملکر بات چیت کر رہی لیکن معاملہ طے نہ پاسکا شیطان نے انہیں بھوٹ کا بیج بویا اور وہ یہ کرائے نہ ہو سکے چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ الگ الگ ہی زمین خریدیں جتنی جس کو توفیق ہو۔ خاتون جیسے پہلی تجویز پر راضی ہو گئی تھی اس پر بھی راضی ہو گئی۔

ذرا ہی دیر میں پھوم کو خبر لگی کہ اسکا ایک بڑی۔ وہ ایک خریدتا ہے اور خاتون نے کہہ دیا ہے کہ آدھے دام نقد اور آدھے سال بھر بعد۔ پھوم کے دل میں حیرت پیدا ہوا۔

”بھلا دیکھو، اس نے سوچا ساری زمین کی جاتی ہے۔ اور مجھے کچھ نہ ملے گا“ پھر اپنی بیوی سے بات شروع کی ”دوسرے لوگ خرید رہے ہیں اس نے کہا“ اور میں بھی کوئی نہیں ایک خریدنے چاہئیں۔ زندگی دوسرے ہوئی جاتی ہے۔ یہ کارندہ تو مارے جو مانوں کے ہمیں کچلے دیتا ہے۔

دونوں نے ملکر غور کیا اور تدبیریں سوچیں کہ کس طرح زمین خریدیں۔ بچا کر سورو بال رکھے تھے۔ ایک بھیر بچا آدمی شہر کی کھیاں بھیجیں۔ ایک بیٹے کو مزدوری پر بھیجا اور بیٹی کی اجرت لے لی، کچھ ایک بہنوئی سے قرض لیا اور اس طرح جیسے تیسے کر کے آدمی زمین کی قیمت اکٹھا کی۔

یہ کچھ تو پھوم نے ۴۰ ایکڑ کا ایک کھیت چاہا جس میں کچھ پر خجمل تھا اور خاتون کے پاس اسکا معاملہ کرے گیا۔ معاہدہ ہو گیا۔ پھوم نے ہاتھ ملایا اور کچھ رقم پیشگی ادا کی۔ پھر دونوں شہر گئے اور دس دنوں پر دستخط ہوئے۔ آدھے دام نقد ادا کر دیئے اور باقی دو سال میں دینے کا اقرار کیا۔

اب پھوم کی اپنی زمین ہو گئی۔ اس نے بیع قرض لیا۔ اور جو زمین خریدی تھی اس میں بویا۔ فصل اچھی ہوئی اور سال کے اندر ہی اندر سے خاتون اور بہنوئی دونوں کا قرض ادا کر دیا۔ اب یہ زمیندار بن گیا۔ اپنی ہی زمین جو بنا ہوا اپنی زمین پر گھاس بکھانا، اپنی لکڑی کاٹنا، اور مویشیوں کو اپنی چراگا ہوں پر چراتا یہ اپنے کھیت جو تنے یا پتے ہوئے غلہ لگھاس کی رکھت دیکھنے جاتا تو اسکا دل خوشی سے پھولنا نہ سنا۔ اس کی زمین پر جو گھاس لگتی تھی اور جو پھل کھتے تھے وہ اسے اور سب سے کچھ ہی الگ نظر آتے تھے پہلے جب وہ اس زمین کے پاس سے گذرتا تو یہ زمین بھی ایسی ہی معلوم ہوتی جیسے اور کوئی زمین۔ لیکن اب تو یہ کچھ اور ہی نظر آتی تھی۔



(۳)

چنانچہ پھوم مطمئن تھا اور خوب گذرتی اگر پڑوس کے کان اس کے کھیت اور چراگاہوں میں بجا دخل نہ دیتے اس نے پہلے نرمی سے سمجھایا اور بھایا لیکن کسی نے نہ سنی۔ کبھی گانوں کا چرواہا گائیں اس کے کھیت میں چھوڑ دیتا کبھی رات کی چراپی میں گھوڑے اس کے غلے کے کھیت میں پہنچ جاتے۔ پھوم انہیں بار بار ہلک دیتا اور بالکل کو معاف کر دیتا۔ چنانچہ عرصہ تک اس نے کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔ لیکن آخر نہ رہا گیا اور اس نے ضلع کی عدالت میں رپٹ لکھا ہی دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب اس لئے ہے کہ کانوں کے پاس زمین نہیں اور وہ کوئی بری نیت سے اسے دکھ نہیں دیتے۔ لیکن پھر سوچتا ”میں کہا تک معاف کرتا رہوں؟ یہ تو جو کچھ ہے سب تباہ کر دیئے گئے۔ انہیں سبق دینا چاہئے۔“

لہذا اب انہیں پھانس ہی دیا۔ ایک سبق دیا پھر دوسرا اور دوسرا دین کانوں پر جرم نہ ہو گیا۔ تھوڑے دنوں میں پھوم کے پڑوسی اسوجہ سے اس سے جتنے لگے اور کبھی کبھی جان بوجھ کر اپنے مویشی اس کی زمین میں چھوڑ دیتے ایک کان تو رات کو پھوم کے جھل میں گس گیا اور بھال کی خاطر بچ لیو کے درخت کاٹ ڈالے۔ ایک دن درختوں کے پاس سے گذرتے ہوئے پھوم نے کچھ سفید سفید پڑو دیکھا۔ قرب گیا تو پچھلے ہوئے تے زمین پر پڑے تھے اور درختوں کے بجائے انکے ٹھونٹ باقی تھے۔ پھوم کو بہت غصہ آیا

اگر ایک یہاں کاٹ دیا ہو، ایک دہاں تو بھی برا تھا۔ ”پھوم نے سوچا ”پر اس بد معاش نے تو پورا گچھا کاٹ ڈالا۔ معلوم ہو جائے کہ کون ہے تو بتلاتا۔“

پھوم بڑی الجھن میں پڑ گیا کہ آخر کون ہو سکتا ہے۔ آخر کو فیصلہ کیا ”ہونہ ہو سین ہوگا۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔“ وہ سین کے گھر گیا کہ ذرا دیکھے۔ لیکن کچھ نہ دکھائی دیا اور خواہ خواہ کی تو تو میں میں ہوئی۔ لیکن اسے اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ سین ہی کا کام ہے لہذا مقدمہ دائر کر دیا۔ سین کی طلبی ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی پھر ایک اور دفعہ سماعت ہوئی اور آخر میں سین رہا ہوا اس لئے کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہ تھی۔ پھوم کو اور بھی بچ ہوا اور اس نے اپنا غصہ بچوں اور ضلعوں پر نکالا۔

”تم چوروں سے اپنی قبلیاں چکنی کراتے ہو۔ اس لئے کہا، اگر تم لوگ ایماندار ہوتے تو ایک چور کو پھیل

زچھوٹ جانے دیتے۔

الغرض پھوم بھغفوں سے بھی لڑا اور اپنے پڑوسیوں سے بھی لوگ اس کے گھر میں آگ لگا دینے کی دھمکیاں دینے لگے۔ اور اگرچہ پھوم کے پاس زمین پہلے سے زیادہ قبی لیکن گانوں میں اسکی حالت بدتر ہو گئی۔ اسی زمانہ میں خبر اڑی کہ بہت سے لوگ دوسری جگہ جا کر آباد ہو رہے ہیں۔ یاس کیوں اپنی زمین چھوڑا، پھوم نے سوچا کہ کچھ اور گانوں والے چھوڑ جائینگے تو ہمارے لئے کافی جگہ ہو جائیگی۔ میں خود انکی زمین لے لوں گا اور اپنی جائیداد ذرا بڑھا لوں گا۔ پھر ذرا آرام سے زندگی کے گی۔ ابھی تو اتنی تنگی ہے کہ آرام سے رہنا مشکل ہے۔ ایک دن پھوم گھر بیٹھا تھا کہ ایک کسان گانوں میں سے گذرتے ہوئے اس کے پاس آکھلا۔ اسے اس نے رات کو ٹھہرایا اور کھا کھلایا۔ باتیں ہوئیں تو پھوم نے پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو۔ اجینی نے جواب دیا کہ وہ دولگا سے آتا ہے جہاں وہ کام کیا کرتا تھا۔ بات میں بات نکلی اور اجینی نے بیان کیا کہ وہاں بہترے لوگ جا جا کر بس رہے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ اس گانوں کے کچھ لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ یہ لوگ وہاں کے گانوں میں جا کر شریک ہو گئے ہیں اور ہر ایک کو ۲۵-۲۵ ایکڑ زمین ملی ہے۔ زمین ایسی اچھی ہے کہ جو رانی بوئی جاتی ہے وہ گھوڑے برابر اونچی مہتی ہے اور ایسی مٹنی کہ ہانس کے پانچ ہاتھ چلاؤ اور گٹھایا رہے۔ ایک کسان بس اپنے دودھ لیکر آیا تھا اور اب اس کے پاس اپنے چھ گھوڑے ہیں اور دو گائیں۔

پھوم کے دل میں آرزو بھڑکی۔ اس نے سوچا، میں کیوں اس تنگ سوراخ میں پڑا تکلیف اٹھاؤں جب دوسری جگہ اتنی اچھی طرح رہنا ممکن ہے۔ میں اپنی زمین اور گھر بیچ کر دام کر لوں اور ان سے وہاں جا کر پھر کام شروع کر دوں اور ہر چیز نئی لوں۔ یہاں کی گھڑ بھاڑ میں بہتہ تکلیف ہی ہوتی ہے۔ لیکن پہلے خود جا کر سب کچھ معلوم کر آؤں۔

گرمی کے آتے آتے یہ تیار ہو کر چلا۔ دریا سے دولگا میں ایک بھاپ کی کشتی پر بیٹھ کر یہ سارا پنچا پھر ۳ میل پیدل چلا اور اس جگہ پہنچا۔ اجینی نے جو کہا تھا سب ٹھیک ٹھاک نوں کے پاس بہت سی زمین تھی ہر شخص کو گانوں کی طرف سے ۲۵ ایکڑ زمین دی گئی تھی اور جس کے پاس روپیہ ہو وہ ۵۰ روپیہ ایکڑ کے حساب سے جتنی زمین چاہتا خرید سکتا تھا۔

سب کچھ تہہ سرا لیکر خزان ہوتے ہوتے پھوم اپنے گھر آیا اور اپنی تمام چیزیں بیجا شروع کیں زمین اس نے خانہ  
سے پی۔ گھر بچا مویشی بیچے اور گانوں کی رکیت کو علیحدہ ہوا۔ بس وہاں بہار تک ٹہرا اور پھر اپنے گھر کے لوگوں  
کو لیکر نئی جگہ کا رخ کیا۔

(۴)

پھوم اور اس کے گھر کے لوگ جب اپنے نئے وطن میں پہنچے تو ایک بڑے سے گانوں میں شریک ہونے  
کی درخواست دی۔ پنجوں کی دعوت کی اور ضروری کاغذات حاصل کئے۔ پانچ حصے زمین اس کے اور اس کے  
بیٹے کے نام لکھی گئی۔ مٹی گانوں کی چراگا ہوں کے علاوہ ۱۲۰ ایکڑ زمین اس کا ایک جگہ نہیں بلکہ ادھر ادھر  
مختلف جگہوں میں) پھوم نے ضروری عمارتیں بنائیں اور مویشی خریدے۔ گانوں کی دی ہوئی زمین ہی پہلے  
وطن کے مقابلہ میں ممکن تھی اور سب زمین اچھی۔ بالکل۔ اب وہ پہلے سے وہ چند بہتر حال میں تھا۔ اس کے پاس  
دو افر زمین تھی اور چراگا ہوں اور اب یہ جتنے مویشی چاہتا رکھ سکتا تھا۔

پہلے تو مکان بنانے اور بنے مکان کے شغل میں خوب خوش رہا لیکن جب خوب رہ بس لیا تو سوچنے  
لگا کہ یہ زمین بھی کافی نہیں پہلے سال اس نے گانوں کی زمین پر گہوں بونے اور فصل اچھی ہوتی چاہتا تھا کہ  
گہوں ہی بونے جائے لیکن اس کے لئے زمین کافی نہ تھی کیونکہ جس پر پہلے بویا تھا اس پر بونہ سکتا تھا۔ اس علاقہ  
میں گہوں یا تو مٹی زمین پر بویا جاتا ہے یا ان جگہوں پر جو کچھ عرصہ خالی رہے ہوں۔ دو ایک سال گہوں  
بویا جاتا ہے۔ اور پھر اسے چھوڑ دیتے ہیں جب تک خوب لمبی لمبی گھاس کھڑی ہو جائے۔ بہت سے لوگ  
ایسی ہی زمین چاہتے تھے اور یہ کافی نہ تھی۔ اس لئے بھگڑتے تھے۔ جو لوگ اچھے حال میں تھے وہ تو یہ زمین  
گہوں بونے کے لئے چاہتے تھے اور جو بڑے حالوں تھے وہ اس لئے کہ دوسروں کو اٹھا دیں اور مکان ادا  
کرنے کے لئے اس طرح روپیہ کر لیں۔ پھوم اور گہوں بونا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک کاروباری سے سال  
بھر کے لئے زمین لی۔ بہت سا گہوں بویا اور خوب فصل ہوئی لیکن زمین گانوں سے دو بہت تھی اور علاوہ  
کو دس میل گاڑیوں میں لا کر لانا پڑا۔ تھوڑے دن بعد پھوم نے دیکھا کہ بہت سے کان کاروباری علیحدہ  
علیحدہ قطعوں پر رہے ہوئے ہیں اور خوب مالدار ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر میں بھی کوئی صافی

زمین خرید لوں اور اس پر گھر بنالوں تو پھر اور سی بات ہو جائیگی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور ایک جگہ۔“  
 معافی زمین خریدنے کا خیال اسے بار بار آیا۔ کہیں مین سال تک یہ وہی کئے گیا۔ کڑیہ پر زمین لیتا اور  
 گیہوں بوٹا۔ موسم اچھا رہا اور فصلیں عمدہ رہیں اور اس نے کچھ رقم بچا لی۔ یہ اسی طرح مزہ سے رہ سکتا تھا لیکن ہر  
 سال دوسروں کی زمین لینے سے اور اس کے لئے سبک جھک کرنے سے اکتا گیا۔ جہاں کہیں ابھی زمین ہوتی  
 کسان دوڑ پڑتے اور سب زمین اٹھ جاتی اور تیزی نہ کر دو کچھ بھی ہاتھ نہ آتی۔ تیسرے سال ایسا ہوا کہ اس  
 نے اور ایک کاروباری نے ملکر کسانوں سے کچھ زمین چراگاہ کے طور پر لی۔ اور انہوں نے اسپرل بھی چلا دیا۔  
 تھا کہ کچھ جھگڑا ہوا۔ کسانوں نے عدالت میں کارروائی کی فیصلہ کے خلاف ہوا اور اس طرح ساری  
 محنت اکارت گئی۔

”اگر یہ میری اپنی زمین ہوتی، پھوم نے سوچا، تو میں خود مختار ہونا اور یہ سب بد مزگی نہ ہوتی۔“  
 پھوم اب زمین خریدنے کی فکر کرنے لگا۔ ایک کسان ملا جس نے ۱۳۰۰ ایکڑ زمین خریدی تھی، لیکن  
 اب کچھ پریشانی میں تھا۔ اس لئے سستے داموں اسے بیچتا تھا۔ پھوم نے بجائے ٹاؤن کیا اور معاملہ ۵۰۰ روپے  
 پر چکا، کچھ نقد کچھ بعد کو۔ سارا معاملہ طے ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک دن ایک راگیر کاروباری پھوم کے  
 یہاں اپنے گھوڑوں کے لئے چارہ لینے ٹہرا۔ پھوم کے ساتھ چارپائی اور باتیں ہوئیں کاروباری نے باتوں میں  
 کہا کہ وہ ابھی بشکیروں کے علاقہ سے آرہا ہے اور وہاں ۱۳۰۰ ایکڑ زمین ایک ہزار روپے میں خرید کر لیا ہے  
 پھوم نے اور پوچھا کچھ تو تاجر نے جواب دیا: ”بس ضرورت اس کی ہے کہ سرداروں سے دوستی پیدا کر لو  
 میں نے کوئی شہر بل کے چوٹے اور قالین دتے اور ایک کبس چائے کا۔ اور جو شراب پیتے تھے انہیں شراب  
 پلائی۔ اور وہ آئے ایکڑ سے بھی کم میں زمین لے لی“ اس نے پھوم کو دستاویز دکھائی اور کہا کہ ”زمین  
 دریا کے کنارے کے قریب ہو اور ساری کی ساری نئی زمین ہے۔“

پھوم نے اس سوال کو رد کر دیا اور تاجر نے کہا ”وہاں اتنی زمین ہے کہ سال بھر چلو تو نہ کر سکو اور  
 سبکی سب بشکیروں کی ہے۔ یہ سب بھٹیروں کی طرح بھولے ہیں اور زمین قریب قریب مفت ہی ملتی  
 ہے۔“

”ٹھیک ہے“ پھوم نے خیال کیا۔ اپنے ایک ہزار دہل سے میں صرف ۱۳۰۰ ایکڑ زمین کیوں خریدوں اور  
قرضہ دہل سے اپنے سرلوں۔ اگر یہی روپہ لیکر وہاں چلا جاؤں تو اس سے دس گنی زمین مل جائے۔“

(۵)

پھوم نے وہاں کے راستہ کے متعلق سوالات کئے جب تاجر چلا گیا تو اس نے خود زوالگی کی تیاری  
شروع کی۔ بیوی کو تو گھر بار دیکھنے کے لئے چھوڑا، ایک آدمی ساتھ لیا اور نکل کھڑا ہوا۔ راہ میں ایک شہر  
میں ٹہرے، چار کا ایک گٹھا خرید لیا اور جیسا کہ تاجر نے کہا تھا، کچھ شراب اور دوسرے تحفے تحائف۔ چلتے  
چلتے ۳۰ میل سے زائد نکل گئے اور کہیں ساتویں دن اس جگہ پہنچے جہاں بشکیروں نے نیچے لگائے تھے  
تاجر نے جو جو کہا تھا سب ہو پہنچ نکلا۔ یہ لوگ دریا کے کنارے میدان میں ندے سے ڈھکے ہوئے  
خیموں میں رہتے تھے۔ نہ زمین جوتے نہ روٹی کھاتے۔ انکے مویشی اور گھوڑے میدان میں چرتے پھیرے  
خیموں کے پیچھے بند جاتے اور گھوڑیاں دن میں دو مرتبہ انکے پاس لیجائی جاتیں۔ گھوڑیوں کا دودھ دودھا  
جاتا اور اس سے شیر بنتا۔ یہ شیر عورتیں بنایا کرتی تھیں، مرد بچا چھ اور چائے پیتے، گوشت کھاتے اور بانسری  
بجاتے۔ اس کے علاوہ اور کوئی فکر نہ تھی۔ سب کے سب نہایت معنوط تھے اور خوش و خرم اور گرمی بھر کا میدان  
بھی کسی کو نہ آتا تھا۔ سب جاہل تھے۔ روپی کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن سب جمعیت کے نہایت اچھے تھے۔

پھوم کو جو دیکھا تو سب خیموں نے کل آئے اور اسکے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ایک ترجمان بول  
گیا۔ اور پھوم نے بتلایا کہ زمین کے لئے آیا ہے۔ بشکیر بہت خوش ہوئے۔ پھوم کو سب اچھے خیمہ میں لے گئے اور  
وہاں پر کئے ٹکیوں پر ایک قالین بچھایا گیا اور اس کے گرد خود بیٹھے۔ اسے چار اور بچا چھ دی۔ ایک بھڑنگ  
کرائی۔ اور اس کے لئے گوشت تیار کر لیا۔ پھوم نے اپنی گاڑی میں سے تحائف نکالے اور بشکیروں کو دئے  
اور چار بھی تقسیم کی۔ پھر کیا تھا بشکیر بچے نہ ساتے تھے۔ آپس میں خوب باتیں کرنے لگے اور پھر ترجمان سے  
کہا کہ ترجمہ کرے۔

ترجمان نے کہا: ”یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سے بہت خوش ہیں۔ ہماری رسم ہے کہ اپنے صہان کو خوش  
کرنیکے لئے سب کچھ کرتے ہیں۔ اور اسکے تحائف کا بدلہ کرتے ہیں۔ تم نے ہمیں تحفے دئے اب کہو کہ ہماری

بڑوں میں ہمیں کوئی سب سے زیادہ پسند ہے تاکہ ہم وہ نہیں دیں۔  
 ”مجھے تو یہاں جو میرے زیادہ پسند ہے“ پھوم نے کہا ”وہ تمہاری زمین ہے۔ ہمارے یہاں  
 بن پر بہت آبادی ہے اور زمین کا زور ختم ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے پاس بہت زمین ہے اور اچھی ہیں  
 ، ایسی زمین کبھی نہیں دیکھی۔“

ترجمان نے ترجمہ کیا بشکیروں نے تھوڑی دیر آپس میں بات چیت کی پھوم کچھ نہ سمجھا کہ کیا کہتے  
 لیکن یہ ضرور دیکھتا تھا کہ سب بہت خوش ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں چلا رہے ہیں۔ پھر سب چپ ہو گئے  
 پھوم کی طرف دیکھنے لگے۔ ترجمان نے کہا ”یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے مخالف کے بدل میں یہ جتنی زمین  
 چاہیں خوشی سے آپ کو دینگے تم اس انگلی سے بتا دو اور زمین تمہاری ہو جائیگی۔“  
 بشکیروں نے پھر گفتگو شروع کی اور کچھ جھگڑنے لگے۔ پھوم نے پوچھا کہ کس پر جھگڑتے ہو تو ترجمان  
 ، کہا کہ بعض کا خیال ہے کہ سردار سے پوچھ لینا چاہئے اور اسکی غیر حاضری میں زمین کے متعلق کچھ کرنا ٹھیک  
 ، اور بعض کہتے ہیں کہ اسکی دہائی کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(۶)

بشکیر جھگڑتی رہے تھے کہ ایک آدمی بڑی سی لومڑی کی کھال کی ٹوپی پہنے پہنچا سب چپ ہو گئے  
 لیم کو کھڑے ہو گئے۔ ترجمان نے بتایا کہ یہی ہمارا سردار ہے۔

پھوم فوراً بہترین چوہہ اور ڈھائی سپر چائیک لکرا لایا اور سردار کی خدمت میں پیش کیں۔ سردار نے تھوڑے  
 کیا اور جا کر مسند پر بیٹھ گیا بشکیروں نے اس سے کچھ کہا نا۔ تھوڑی دیر تک سردار سستار ہا  
 سے اشارہ کیا کہ چپ ہو جاؤ اور خود پھوم سے روسی میں یوں مخاطب ہوا۔

”اچھا ٹھیک ہے جو زمین چاہو جن لو۔ ہمارے پاس بہت ہے۔“

”یعنی جانوں اتنی کیسے مل سکتی ہے؟“ پھوم نے سوچا ”معاذ پکا کر تیکے لئے دس ماہ پر چاہئے  
 تو آج کہہ دیجئے کہ تمہاری ہے اور پھر ممکن ہے جین لیں۔“

پھر اونچی آواز سے کہا ”آپ کی عنایت کا شکریہ۔ آپ کے پاس بہت زمین ہے اور مجھے تھوڑی سی

درکار ہے۔ لیکن میں ذرا یہ بات بلی کر لینی چاہتا ہوں کہ میرا ٹکڑا کون ہے۔ کیا یہ ناپ کر میرے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔ موت زسیت خدا کے ہاتھ ہے۔ تم بھلے لوگ تو مجھے زمین دیتے ہو لیکن تمہاری اولاد کیا ٹھیک ہے مجھ سے پھین لے۔

”ٹھیک کہتے ہو سردار نے کہا۔ ہم زمین تمہارے حوالہ کر دیں گے۔“  
 ”میں نے سنا ہے کہ ایک تاجر یہاں آیا تھا۔ اور آپ لوگوں نے اُسے کچھ زمین دی اور دستاویز لکھی ہیں بھی ہی چاہتا ہوں۔“

سردار سمجھ گیا: ”اچھا“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ تو بہت آسان بات ہے۔ ہمارا منشی ہے تم تمہارے ساتھ شہر چلیں گے اور دستاویز پر باضابطہ دہر ہو جائے گی۔“  
 ”اور قیمت کیا ہوگی؟“ پھوم تلے پوچھا۔

”ہمارے دام ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ دن بھر کے ایک ہزار روپے۔“  
 پھوم کی سمجھ میں نہ آیا۔ ”دن بھر؟ یہ کونسا ناپ ہے؟ کتنے ایکڑ ہونگے؟“  
 ”ہمیں اسکا حساب لگانا نہیں آتا۔ ہم تو دن کے حساب سے جیتے ہیں۔ دن بھر میں جتنی زمین گرجا چل لو وہ تمہاری اور دام ایک ہزار روپے۔“  
 پھوم کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”مگر دن بھر میں تو آدمی ایک بہت بڑے ٹکڑے کو چاروں طرف جاسکتا ہے۔“

سردار ہنسا۔ ”وہ سب تمہاری ہو گئی“ اس نے کہا۔ ”لیکن ایک شرط ہے۔ اگر تم اسی دن اس جگہ نہ لوٹ آئے جہاں سے چلے تھے تو درپہ ضبط۔“

”لیکن جہاں جہاں جاؤ گنا اس پر نشان کیسے کروں گا؟“  
 ”کیوں۔ تم کو اس جگہ چلیں۔ ہم شہر جائیں گے تم ایک پھاڑا لیکر چل کھڑے ہونا۔ جہاں ضروری سمجھو نشان کر دینا۔ ہر موڑ پر گڈ لکھو دکر اسی پٹی لوٹ دینا پھر بعد کو ہل لیکر ایک گڈ سے دوسرے گڈ سے تک جانا۔ جتنا بڑا چکر چاہو لگا لو لیکن سوچ ڈوبنے سے پہلے جہاں سے چلے تھے وہاں پہنچنا۔“

مٹی زمین گھیر آؤ گے سب تمہاری :

پھوم بہت ہی خوش ہوا طے ہلاک کل صبح ہی چلیں گے۔ تھوڑی بات چیت ہوئی۔ کچھ چاچھری  
 ٹھوڑا سا گوشت کھلا۔ پھر چا۔ آئی۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ پھوم کو سونے کے لئے پردوں کا بستر لا بشکر اُدھر  
 اُدھر چلے اور وعدہ کر گئے صبح ہوتے ہوتے جمع ہو جائیں گے۔ اور سو بج نکلنے سے پہلے سوار ہو کر  
 قرہ جگہ کو چلیں گے۔

(۷)

پھوم پردوں کے بستر پر لیٹا تو گر نیند رات بھر نہ آئی۔ ساری رات وہی زمیں کا دبیاں رہا۔ کتنا بڑا  
 قطعہ گھیروں گا۔ اس نے سوچا۔ میں تو دن میں آسانی سے ۳۰ میل چل لیتا ہوں۔ دن تو آج کل بڑا  
 ہوتا ہے۔ ۳۰ میل کے چکر میں کتنی کچھ زمین نہ آجائیگی۔ خراب خراب پنج ڈالوں گا یا کسانوں کو اٹھا دوں گا۔  
 لیکن اچھی اچھی خود رکھوں گا اور اسپر اپنی کھیتی کر دوں گا۔ دو جوڑی بل خریدوں گا۔ دو مزدور اور رکھوں گا  
 نوئی ڈیرہ سوا کر جو توں گا اور باقی پر مویشیوں کی چراگاہ بنا دوں گا۔

پھوم رات بھر بڑا جاگایا اور بس صبح ہوتے ہوتے ذرا آنکھ لگ گئی۔ آنکھیں منہ ہی تھیں کہ  
 ایک خواب دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اسی خیمہ میں بڑا ہے اور باہر کوئی کھل کھل کر رہا ہے۔ سوچا کہ کون  
 ہے۔ اٹھا، باہر گیا اور دیکھا کہ بشکیروں کا سردار خیمہ کے باہر بیٹھا ہے اور اپنی کوکھ پر بے ہوشی کے  
 مارے لٹا جاتا ہے۔ سردار کے پاس جا کر پھوم نے پوچھا کہ ہے پرستے ہو؟ تو دیکھا کیا ہے کہ وہ سردار  
 نہیں ہے بلکہ وہ تاجر ہے جو کچھ دن ہوئے اس کے یہاں ٹہرا تھا اور اس زمین کا قصہ سنایا تھا۔ پھوم  
 پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ کیا بہت دن سے یہاں ہو؟ کہ دیکھا کیا ہے کہ وہ تاجر نہیں بلکہ وہ کسان ہے  
 جو بہت سے نوئے دو لگا سے پھوم کے پرانے وطن میں آیا تھا۔ پھر دیکھا کہ وہ کسان بھی نہیں بلکہ خود شیطان  
 ہے جس کے کھڑ میں ایک سینگ۔ وہی بیٹھا کھل کھل کر رہا ہے اور اس کے سامنے ایک آدمی چپ  
 بڑا ہے، ننگے پاؤں بس ایک کرتہ اور پاجامہ بدن پر ہے۔ پھوم نے خواب ہی میں اس آدمی کو غور  
 سے دیکھ کر پہچانا یا تا تو معلوم ہوا کہ یہ مردہ ہے اور خود ہی ہے! خوف سے گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔



”آدمی بھی کیا کیا خواب دیکھتا ہے“ اس نے سوچا۔ ادھر ادھر دیکھا تو دروازہ میں سے دکھائی دیا کہ دن نکل رہا ہے۔ وقت ہو گیا ہے۔ انہیں اٹھانا چاہئے۔ اب تو روانگی کا وقت ہے۔  
(وہ اٹھا، اپنے آدمی کو جو گاڑی میں پڑا سو رہا تھا، اٹھایا۔ اس سے کہا کہ زمین کسے اور خود بشکیروں کو بلائے نکلا۔ میدان میں چل کر زمین ناپنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔  
بشکیر اٹھے اور جمع ہو گئے۔ سردار بھی آیا۔ چھاپہ چینی شروع کی۔ پھوم کو بجا، پیش کی لیکن یہ تو ہٹنا ہی نہ چاہتا تھا۔  
”چلتا ہے تو بس چلو۔ وقت ہو گیا ہے“ اس نے کہا۔

(۸)

بشکیر تیار ہو گئے اور سب چل کھڑے ہوئے۔ کچھ گھوڑوں پر کچھ گاڑیوں میں۔ پھوم خود اپنی گاڑی میں اپنے آدمی کو ساتھ لیکر اور ایک پھاڑا رکھ کر چلا۔ میدان میں پہنچے تو صبح کی لالی دکھائی دینے لگی تھی۔ سب ایک تسلے پر چڑھ گئے (جسے بشکیر نکھان کہتے ہیں) اور سب اپنے گھوڑوں اور گاڑیوں سے اتر کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ سردار پھوم کی طرف بڑھا اور اپنا ہاتھ میدان کی طرف اٹھا کر کہنے لگا۔  
”دیکھو جہاں تک تمہاری نظر جاتی ہے سب ہمارا ہے۔ اب کا جو ناصہ جاہولے سکتے ہو۔  
پھوم کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔ ساری نئی زمین تھی۔ سب چورس جیسے ہاتھ کی پتیلی۔ ایسی سیما جیسی کافی ختمنا تھا اور جہاں کھڈے تھے انہیں طرح طرح کی چھاتی چھاتی گھاس۔  
سردار نے اپنی کھال کی توبی اتار کر زمین پر رکھ دی اور کہا: ”یہ نشان ہے یہاں سے چلو اور یہیں لوٹ آؤ۔ جتنی زمین کے گوجھلو گے سب تمہاری ہے۔“

پھوم نے روپیہ نکال کر توبی پر رکھا۔ پھر اپنا کوٹ اتارا اور سب بے آستینوں کی صدی پہنے رہا۔ اپنی پٹی کھوکھر پٹ کے نیچے خوب کسی اور پانی کی لپک کچی پیٹی میں باندھی۔ ذرا بوٹ کسے اور آدمی سے پھاڑا لیکر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ذرا دیر سوچا کہ کدھر جائے، ہر طرف کو جی لچا آتا تھا۔

”کیا پردا ہے؟“ اس نے آخر میں فیصلہ کیا۔ ”میں نکلتے ہوئے سورج کی طرف جاؤں گا۔“

”وقت ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔ اس نے دل میں سوچا اور ٹھنڈے ٹھنڈے میں چلتا بھی آسان ہے۔“  
سورج کی کرنیں شکل ہی سے اوپر نکلی تھیں کہ پھوم اپنا پھاڑا ڈاکند سے پر رکھ میدان میں اتر پڑا۔ اور

جل کھڑا ہوا نہ بہت آہستہ نہ بہت تیز۔ کوئی ہزار گز جا کر رکا اور ایک گدھا کار کے مٹی کے تودے ایک پر ایک رکھ دیئے تاکہ جگہ دکھائی دے سکے پھر آگے بڑھا اور جب بدن ذرا کھل گیا تو اس نے قدم بڑھائے۔ تموڑی دیر کے بعد ایک گدھا اور کھودا۔

پھوم نے مڑ کر دیکھا۔ ٹیلہ سوئج کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسپر جو لوگ تھے وہ بھی اور گاڑی کے چلتے ہوئے پیسے بھی۔ اندازہ سے پھوم سمجھا کہ کوئی تین میل چلا ہوں گا۔ اب ذرا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے صدری اتار کر کندھے پر ڈال لی اور چلا۔ اب خوب گرمی ہو گئی تھی۔ اس نے سوئج کی طرف دیکھا: ناشہ کا وقت آچکا تھا۔

اس نے اپنے سے کہا، پہلا پہر ہو چکا۔ لیکن دن میں چار پہر ہوتے ہیں اور ابھی تو بہت سویر ہے۔  
لوٹنا نہ چاہئے۔ لیکن ذرا جوتے اتار لوں۔

اس نے بیٹھ کر جوتے کھولے، بیٹی میں کھونس لئے۔ اور آگے چلا۔ اب چلنے میں آسانی ہو گئی تھی۔  
”تین میل اور چلوں گا“ اس نے سوچا اور پھر انیس کو مڑ جاؤں گا۔ یہ جگہ تو اچھی ہے کہ اسے چھوڑتے ہی دکھائی ہے۔ جھٹے آگے بڑھوا بھی ہی اچھی زمین آتی جاتی ہے۔

تموڑی دیر تو سیدھا چلا اور مڑ کر دیکھا تو ٹیلا خسل سے دکھائی دیتا تھا اور اسپر جو لوگ تھے وہ کلاچوٹے لگتے تھے۔ اور سوئج میں کچھ چیزیں جم جم کرتی دکھائی دیتی تھی۔

”اوہو“ پھوم نے خیال کیا میں اس طرف تو کافی دور نکل آیا۔ اب مڑنا چاہئے اور پینے پینے بھی چور ہوں۔ پیاس بھی سخت لگی ہے۔

وہ رکا۔ ایک بڑا سا گدھا کھودا اور اسپر مٹی کا ایک ڈھیر بنایا۔ اپنی کپڑی کھولی اور کچھ پیکر ٹھیک انڈر ہاتھ کو ہولیا۔ چٹنا گیا چلتا گیا۔ گھاس اونچی نمی اور گرمی سخت تھی۔ پھوم تھکنے لگا۔ سوئج کی طرف دیکھا تو دو پہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا ”اب ذرا آرام کر لینا چاہئے“ بیٹھ کر اس نے تموڑی روٹی کھائی، پانی پیا لیکن لیٹا نہیں کر کہیں سونہ جائے۔ تموڑی دیر سہتا کر پھر چلا پہلے تو آسانی کے ساتھ کیونکہ کھانا کھا کر ذرا بدن میں دم آ گیا تھا۔ لیکن گرمی بہت بڑھ گئی تھی اور اسے نیند آنے لگی لیکن وہ چلے ہی گیا۔ یہ سوچ کر کہ تکلیف گھٹے

بھر کی ہے، زندگی ساری عمر گزارنی ہے۔

اس طرف بھی وہ خوب دور نکل گیا۔ اور بائیں کو مڑنے ہی کو تھا کہ ایک ترکھن دکھائی دیا۔ ”اُسے پھوڑنا تو بہت برا ہے“ اس نے سوچا۔ ”اسیں من خوب ہو گا۔ اس نے اس کھڈے کے گرد بھی گیا اور اس کے دوسری طرف جا کر پہلے ایک گڈ ہاکھو دا پھر بائیں کو مڑا۔ ٹیکہ کی طرف دیکھا لیکن گرمی ہو چکی تھی اور وہاں بھی گھنٹی تھی اور وہیں تھر تھراہٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ ٹیکہ کے آدمی اب شکل سے دکھائی دیتے تھے۔

”اوہو“ پھوم نے سوچا میں بہر دور دور سے لیا۔ اس طرف ذرا کم کرنا چاہئے۔“ اور وہ تیسری طرف تیز تر قدم اٹھا کر چلا۔ سوچ کو دیکھا تو وہ کوئی آ رہا۔ اتر چکا تھا اور اس نے اپنے مربع کی تیسری طرف دھکیل بھی مٹے نہ کئے تھے۔ اور یہ منزل مقصود سے کوئی دس میل تھا۔

”نہیں“ اس نے سوچا۔ ”اگرچہ زمین کا ایک کونا کٹ جائیگا لیکن مجھے اب سید ہا لونا چاہئے۔ کہیں بہت دور نہ نکل جاؤں۔“ اور یوں اب بہت سی زمین مل ہی چکی ہے، چنانچہ پھوم نے جلدی جلدی ایک گڈ ہا کیا اور سید ہا ٹیکہ کا رخ کیا

(۹)

پھوم سید ہا ٹیکہ کی طرف پہلا ٹیکہ اب پاؤں شخص سے اٹھتے تھے۔ گرمی نے اسے بھگت لیا تھا۔ اس کے تنگے پاؤں سب کس کس زخمی ہو گئے تھے اور اب ساتھ نہ دیتے تھے۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن اگر سوچ ڈوبتے ڈوبتے واپس پہنچتا تھا تو یہ ممکن نہ تھا۔ سوچ تو کسی کا انتظار نہیں کرتا اور برابر اچھلا جا رہا تھا۔

”یا اللہ“ اس نے خیال کیا۔ ”کہیں بہت سائینے میں غلطی تو نہیں کی؟ اگر دیر ہو گئی تو؟“ اس نے ٹیکہ کی طرف دیکھا اور سوچ کی طرف۔ ابھی منزل مقصود سے بہت دُور تھا اور سوچ کدھر سے آن لگا تھا۔ پھوم بڑا چلا پہلے میں بڑی شکل تھی لیکن قدم بڑا بڑا کر رہی رکھ گیا۔ بہت کوشش کی مگر منزل دور تھی۔ دوڑنا شروع کیا۔ کوٹ بھیک۔ جوتے پھینکے۔ کپڑے تو پیسے بھینکی اور صرف چھوٹا ڈاڑھ بنے دیا جس پر یہ سہارا لے لیتا تھا اسے سوچا اب کیا کروں؟“ اس نے پھر سوچا۔ ”میں نے بہت کی ہوس کی اور سارا کام بگاڑ لیا۔ اب سوچ دوڑنے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔“

اس خوف سے سانس اور بھی پھول گیا۔ وہ دوڑے گیا۔ اسکا گلا کترہا اور پا جا سہ بدن سے چٹ گیا تھا اور زبان پر کانٹے تھے۔ سینہ ایسے جل رہا تھا جیسے لوہا کی دھنکنی۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ستورہ اور پانوں ایسے ساتھ چھوڑے دیتے تھے جیسے اس کے ہوں ہی نہیں۔ پیوم کے دل پر یہ ڈر جا کہ نہیں مرنے جائے۔ موت کا ڈر تھا مگر یہ رکا نہیں۔ اتنی دور دور کر اگر اب رکا تو سب مجھے یہ قوت بنا دیتے تھے۔ اس نے سوچا۔ وہ دوڑے گیا بشکیر اسکی طرف دیکھ کر چلا رہے تھے انکی آوازیں سنیں اور ان سے ذرا اسکا دل بڑھا۔ اپنی آخری قوت جمع کر کے یہ دور تار مارا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اور گرد کی چادریں ہٹ کر تیرا اور خون کی طرح لال معلوم ہوتا تھا، ہاں بس اب ڈوبنا ہی چاہتا تھا۔ سورج بہت نیچے آگیا تھا لیکن یہ جی اپنی منزل کے قریب ہی آن لگا تھا۔ پیوم کو ٹیلہ پر وہ ہاتھ جو اسکی مہت بڑھانیکے لئے لوگ ہلا رہے تھے۔ اسے دکھائی دیتے تھے۔ اسے زمین پر چڑھنے کی ٹوپی بھی نظر آتی تھی اور اسپر جو روپہ رکھا تھا اور سردار جو زمین پر اپنی کوکھ کپڑے بیٹھا تھا پیوم کو اپنا خواب یاد آگیا۔

”زمین تو بہت ہے“ اس نے خیال کیا، لیکن خدا مجھے اس پر زندہ بھی رہنے دے گا! میں نے تو اپنی زندگی کھو دی زندگی کھو دی! میں کبھی اس جگہ نہ پہنچوں گا۔“

پیوم نے سورج کی طرف دیکھا جو زمین تک پہنچ گیا تھا۔ اسکا ایک حصہ تو غائب ہو چکا تھا جو کچھ سکت باقی تھی اس سے کام لیکر یہ چر آگے کو بھینٹا۔ اوپر کا دھڑا آتا آگے کو جھکا دیا کہ اس کے پانوں اتنے آگے بڑھ سکے اور یہ گر گیا۔ ٹیلہ تک پہنچا ہے کہ اندھیرا ہو گیا تھا اور نگاہ الٹائی تو سورج چھپ چکا تھا۔ وہ چلا یا ”میری ساری محنت اکارت ہوئی، اور رکنا ہی چاہتا تھا کہ بشکیر دل کے چلانکی آواز سنی اور اسے خیال آیا کہ اسے نیچے سے سورج ڈوبا ہو معلوم ہوتا ہے لیکن اوپر ٹیلہ والوں کو ابھی دکھائی دیتا ہوگا۔ خوب گہرا سانس لیکر یہ ٹیلہ کے اوپر چڑھا۔ وہاں ابھی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اوپر چڑھ کر اس نے ٹوپی دیکھی۔ اس کے سامنے سردار بیٹھا کوکھ کپڑے ہنس رہا تھا۔ پیوم کو پھر اپنا خواب یاد آیا۔ اور اس نے ایک جھنجھاری۔ پیروں نے ساتھ چھوڑ دیا وہ آگے کو گرا اور ہاتھ سے ٹوپی کو چھو لیا۔

”خوب آدمی ہے“ سردار بولا ”اس نے بہت سی زمین حاصل کی“  
 پھوم کا نوکر دوڑ کر آگے آیا اور اسے اٹھانے لگا تو دیکھا کہ منہ سے خون بھر رہا ہے۔ پھوم مر چکا تھا۔  
 بشکیروں نے اظہارِ افسوس کے طور پر زبان سے تہ تہ تہ کیا۔  
 نوکر نے بھاڑا اٹھا کر پھوم کے لئے قبر کھودی اور اسے دفن کر دیا۔ چوٹی سے ایڑی تک بس اسے  
 دو گرز زمین کی ضرورت تھی ا۔

---

# اقتباسات

انجمنِ اقوام اور مدارسِ بھارتیہ | یہ خبر پچھپی سے پڑھی جائیگی کہ انگلستان میں اساتذہ کی مختلف جماعتوں اور لیگ آف ٹیچرز یونین کی جانب سے ایک یادداشت بعنوان ”مدارسِ بھارتیہ و اس عالم“ بورڈ آف ایجوکیشن میں برائے غور پیش کی گئی ہے۔ اس کے پیش کر نیکی غرض یہ ہے کہ جو غارش کچھ عرصہ قبل انجمنِ اقوام کی سب کمیٹی نے بھارتی مدرسوں میں انجمن اور اسکے اغراض و مقاصد کی تعلیم کی بابت کی ہے اس کی تائید کی جائے۔ اس تعلیم کے لئے جو دلائل پیش کئے اور جو طریقے بتائے گئے وہ قابلِ ذکر ہیں۔

یادداشت میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے کہ تعلیم کے دوسرے مقاصد بھی اس سے پورے ہوں۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ نصابِ تعلیم کے مضامین میں زیادہ نظم و ربط پیدا کیا جاسکے۔ اور سب کے سب ایک ہی وسیع مقصد ”یعنی انسانیت کے تحت میں آسکیں، جیسے طلبہ کے لیکچر کی مضبوطی لکھنا ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی اشتراکِ عمل کے واقعات اگر ایک طرف تاریخِ جدید کا متبہ ہیں تو دوسری طرف جغرافیہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان تمام مضامین سے تعلق رکھتے ہیں جو مدارس کے نصابِ تعلیم میں داخل ہیں اور جن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی عالمگیر سبق بھی رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ نئی نوعِ انسان کی اصل ایک ہی ہے۔

پھر مذکور ہے ”اس علم میں علیٰ قوائد بھی ہیں۔ کیونکہ بین الاقوامی رشتہ کا متقبل دنیا سے جدید کے ہر طالبِ علم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب تک کہ قانون کا نظام درجہ نہ ہو، جس کے ہم اپنے ملکوں میں عادی ہو گئے ہیں، سارے جہان میں قائم ہو جائے۔ ان کے بہترین کارنامے اور اس کی بلند ترین کوششیں رائے جاسکتی ہیں۔ اور اس کی زندگی بھر بے قدر اور بے مقصد ہو جائیگی لیکن سارے جہان میں قانون کا نظام حکومتیں تہا قائم نہیں کر سکتیں۔ یہ ایک وقت ممکن ہے جبکہ اس ملک اور دوسرے جمہوریت پسند ملکوں کی رائے عامہ سارے جہان میں قانون کے نظام قائم ہو سکی ضرورت کو سمجھ دے اور اپنی م ”وہ علم جس سے یہ نتائج مترتب ہوں“ شہریوں، ان کے ملکوں، اور ساری دنیا کے لئے علمی فوائد

رکھتا ہے۔ علاوہ بریں ملک کے کسی باشندے سے مسائل خارجہ کی نسبت نہ تو کسی معقول غور و فکر کی توقع کی جاتی ہے نہ عمل کی۔ اگر وہ اس امر کی نسبت کچھ بھی علم نہیں رکھتا کہ گزشتہ ایک سو سال سے اقوام عالم کا مفاد کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ رہا ہے۔ حالات کا صحیح اندازہ کئے بغیر کچھ کرنا یا سوچنا اکثر مشکلات کا باعث ہوتا ہے اور اہل کے بچے خود تہذیب ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، اگر دنیا سے جدید کی نسبت اسی قلعہ فہمی میں رہ کر بڑے ہوئے کریں گے یا آزاد اجداد کی، یا آزاد حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی "نزاع" (دبلی) کی یا ان کتب تواریخ دنیا سے بھجنا خاتمہ مسئلہ پر ہوتا ہے نہ

اس کے بعد یہ کام ایسے اساتذہ کے سپرد کرنے پر زور دیا گیا ہے جو انجمن اقوام کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ تاریخ اور جغرافیہ کو خاص طور پر وہ مضمون قرار دیا گیا ہے جس کے ضمن میں تعلیم دیا جائے۔ کیونکہ "انجمن" اور اس کا ٹینڈ کی تاریخ کو دنیا کی تاریخ سے ربط دیکر پڑھنے ہی سے انگریزی بچے انجمن اقوام کی قدر جان سکیں گے۔ کہ یہ پھل نخل زمانہ میں لگ کر بک چکا ہے۔ اور دنیا کے مختلف ممالک قوموں کے حالات، ان کے اقتصادی مفاد کی باہم وابستگی، مغربی یورپ کے غیر مسلح خطوں و نیز افریقہ و مشرق وسطے کے ممالک محروسہ کے نقصانوں سے واقفیت ہی ان کی نظروں میں وسعت پیدا کر سکتی ہے۔

"انجمن کے اغراض و مقاصد کی تعلیم کے لئے جن علوم کا جاننا ضروری ہے ان میں صرف تاریخ و جغرافیہ ہی نہیں بلکہ جیالوجیا کا چکا ہے، وہ تمام علوم ہیں جو مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ ہماری نسل کی طرح زبان بھی غیر ملکی عناصر پر مشتمل ہے۔ سائنس اپنی اہل میں بین الاقوامی ہے۔ اور اسی طرح سے فنون لطیفہ و فن تعمیر وغیرہ بھی پورے پورے طرز کی مختلف انواع ہیں۔ یہ تمام باتیں طالب علموں کے ذہنوں میں ڈالی جائیں۔ یہ سب کچھ تعلیم کے ذہنی پہلو سے متعلق تھا۔ اسکول میں بچوں کے جذبات کو براؤنچ کرنا عموماً نا پسند کیا جاتا ہے۔ تاہم تعلیم کرنا پڑتا ہے کہ صرف نئے علم سے جب تک جذبات متعاضدیں بھی تقوڑی بہت تبدیلی نہ پیدا ہو۔ بین الاقوامی اشتراک عمل کو دنیا کے کاروبار میں اصول کار نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ احساس بھی پیدا کرنا چاہئے کہ انسان سارے عالم کا شہری ہے۔ پریسیڈنٹ دلن نے ایک بار کہا تھا کہ "وہ زمانہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے جب لوگ انسانیت سے غداری کرنا دلچسپ ہی شرمناک سمجھیں گے جیسا آج کل ہیں

عذاری کرنا بھاجاتا ہے۔ یہ کسی انگریز، یا برطانوی، یا برطانوی دولت متحدہ اقوام (جو خود انجمن اقوام کا ایک نمونہ ہے) سے شہرے کے لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں نہ مفاد انسانی کی روز افزوں وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ موجودہ حب الوطنی بھی وسیع تر وفاداری کے جذبات میں تبدیل ہوتی جائے۔ یہاں تک کہ اس ن بدن قریب آنے والی دنیا میں کل کے ساتھ عذاری اجزاء کے ساتھ دشمنوں وطن خود، عذاری جائے۔

”اس وسیع تر وفاداری کے پیدا ہونے سے موجودہ جذبات میں جو تبدیلی ہو اس کے ساتھ ساتھ

تقدیس میں بھی تبدیلی درکار ہے۔ یعنی ایک ایسی خواہش کا پیدا ہونا، جو دنیا کا خیال سب سے اہل رکھے۔“

نیا کی اقتصادی کانفرنس جنگ عظیم کے بعد دنیا کی اقتصادی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے باعث ملکوں کو جو مالی نقصانات ہوئے اُنکی تلافی کے لئے انہیں ایسی صورتیں اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا جو خواہ وہ تھی اعتبار سے ضروری ہی ہوں آگے چل کر بہت مضرت ثابت ہوئیں اور ان کے مجموعی اثر سے دنیا کی اقتصادی زندگی میں بہت ابتری پھیل گئی اس کے لئے انجمن اقوام کی طرف سے متعدد

انفرنس منعقد ہوئیں، ان کی تجاویز سے تھوڑی بہت حالتوں کے سدھرنے میں امداد ہوئی لیکن پھر بھی صلاح کی ضرورت بہت کچھ باقی ہے۔ چنانچہ اسی لئے اس سال پھر جمعیت اقوام کے زیر اہتمام جنیوا میں ایک کانفرنس اسی غرض سے منعقد ہوئی ہے کہ بین الاقوامی اقتصادی مسائل پر غور کرے۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ پچاس ملکوں کے بھیجے ہوئے اراکین پر مشتمل تھی اور ایک سال سے اس کے ایجنڈے کی تیاری اور اس میں پیش ہونے والے مسائل پر غور و خوض و مطالعہ ہوتا رہا ظاہر ہے کہ اس بین الاقوامی کانفرنس کے محققانہ فیصلے دنیا کی آئندہ اقتصادی حالت پر کتنا اثر ڈالنے والے ثابت ہونگے۔

کانفرنس کی رپورٹ کا مرکزی بحث یہ ہے کہ ان موانعات کو کم کیا جائے جو ایک ملک دوسرے ملک کی ہوئی اشیاء کی فروخت پر ٹیکسوں وغیرہ کی صورت میں (عامد کرنا ہے) اس میں شہ نہیں کماؤ آزاد تجارت کا اصول کانفرنس میں ضابطہ اذ بحث تھا، کیونکہ یہ کانفرنس مختلف ملکوں اور ہر نقطہ نظر کی نمائندہ تھی۔ مگر سب کے سب اس پر ضرور متفق تھے کہ زیادہ سے زیادہ تجارتی آزادی دیکھائے۔

چنانچہ رپورٹ میں مذکور ہے کہ غیر ملکی اشیاء تجارت پر ٹیکس لگانے کا جو دستور جنگ کے بعد سے



قائم ہو گیا ہے۔ اس کی اگرچہ بعض نہایت ہی شدید صورتیں اب نسبتاً کم ہو گئی ہیں۔ تاہم اب بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اسکے لئے چار خاص خاص وجوہ جو تباہ کئے گئے ہیں یہ ہیں۔

۱۔ غیر ملکی اشیا پر بڑے ٹیکس لگانا جو آئے دن بدلے جاتی رہتے ہیں، پیدایش اور تجارت کو بہت نقصان پہنچائے گا۔

۲۔ تجارت میں آسانیاں ہم پہنچانے سے دنیا کی اقتصادی حالت بہت کچھ سدھرتے گی۔

۳۔ اگرچہ غیر ملکی اشیا پر ٹیکس لگانے کا حق ہر آزاد ملک کو ہے، مگر پھر بھی کیسی ملک کا خالص فائدہ نہیں ہے

۴۔ جن وجوہ کی بنا پر غیر ملکی اشیا کی تجارت میں رکاوٹیں پیدا کر دی گئی ہیں، انہیں سے بہتر ہے اب باقی

نہیں ہیں اور جو باقی ہیں وہ برابر کم ہو رہے ہیں۔

خاتمہ رپورٹ کا پانچ تجاویز پر ہوتا ہے۔ انہیں سے دو قابل ذکر ہیں، ایک میں تو بہت سے ملکوں

کے پیچھے ہوئے نامزدوں کی شرکت کو بین الاقوامی اشتراک عمل کے لئے جنگوں نیک خیال کیا گیا ہے۔ اور

دوسرے میں اس بات کی ضرورت بتائی گئی ہے کہ دنیا کے ممالک حتی الامکان ایسے طرز عمل سے احتراز

کریں جن سے اقتصادی دشواریاں پیدا ہوں۔ کیونکہ یہی مشکلات جنگوں کی محرک ہوتی ہیں۔

(ع.ق.ج)

# تنقید و تبصرہ

**القائم** | دارالعلوم دیوبند کا ہمارا دینی و علمی رسالہ۔ زیر ادارت مولانا حبیب الرحمن صاحب  
یہ رسالہ دارالعلوم دیوبند کے آرگن کی حیثیت رکھتا ہے، اور ایک عرصہ سے جاری ہے۔ نہ ہی رنگ و تاب  
ہے۔ اس کے مضامین اکثر قدیم تہذیبیت، اور جدید عقیدت کی رزم گاہ ہوتے ہیں جس میں آخر الذکر کو ہمیشہ قلم  
”دکھ و دشمن“ ہونے کا نگر رکھتا ہے۔ تاہم مضامین بیشتر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی  
یہ ہے کہ اسے استقلال کے ساتھ جاری ہے اور اپنا ایک مخصوص انداز و معیار رکھتا ہے۔ جو لوگ غور و خوض  
کے بعد لکھے ہوئے مذہبی مضامین، نئے خیالات کے غلبہ کے خلاف پرانے خیالات کی مضطربانہ جدوجہد فقہی  
ہکات و لطائف، اور دارالعلوم دیوبند کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رسالہ کو مفید پائیں گے۔ کماخذ  
کتابت، طباعت عمدہ۔ حجم ۶ صفحے چند سالانہ دور پر لپے اٹھانے سے معمولی اک قیمت فی پرچہ ۴۰  
دفتر القائم دارالعلوم دیوبند سے مل سکتا ہے۔

**تجلی** | سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ۔ زیر ادارت محمد سر دار علی صاحب  
پیش نظر نمبر کاخذ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے لیکن حجم ایک سہ ماہی رسالہ ہونی کی  
حیثیت سے کم ہے یعنی صرف ۱۰۰ صفحے۔ شاید سہولت یا چندہ کم رکھنے کی غرض سے۔ مضامین لمبے  
اور پر از معلومات ہیں۔ مگر سہ ماہی رسالہ کے لئے جیسے بلند پایہ تحقیقی مضامین ہونے چاہئیں، انہیں میں لیکن  
ہندوستان کے عام رسالوں کے معیار اور مضامین کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کی امید  
رکھنا بھی عبث ہے۔ اگر رسالہ کا موجودہ معیار ہی قائم رکھا گیا تو غنیمت ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ بہت  
افزائی کے قابل ہے۔

عام قیمت سالانہ (۴۰) ششماہی (۲۰) فی پرچہ (۱۲) گورنمنٹ سے صر سالانہ  
منجور رسالہ تجلی، کتب خانہ مسجد چوک، حیدرآباد سے طلب کیجئے۔

کیف | صحیفہ علمی و ادبی زیر ادارت جناب رفیعی جہیری۔ سائز چھپنے ۳

یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو اجیر سے نکلتا شروع ہوا ہے اگر صرف حسن ظاہری دباطنی ہی کو سب کو  
کے پیچھے کا ذریعہ سمجھا جائے تو پہلی ہی نظر میں خیال گزرتا ہے کہ اس رسالہ کی مدت حیات بہت کم ہے سرور  
خاصہ خوشنما ہے۔ مگر اندر کا حصہ بجا نظر مضامین، کاغذ، کتابت، طباعت کے بہت ہی قابل اصلاح ہے  
اگر دوسرے نمبروں میں بھی یہی شان قائم رہی تو ہم سمجھیں گے کہ یا تو اس رسالہ کو اشاعت کی پرواہ نہیں  
ہے۔ یا عام مذاق سے سورتوں رکھتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اس کی کیوں کو پورا کر کے اس کو ایک بلند پایہ  
علمی و ادبی رسالہ بنایا جائیگا۔ حجم ۸۰ صفحہ چند سالانہ (لحم، سببشہابی (عمر) قیمت فی پرچہ (۲۰) نمونہ مفت  
ملنے کا پتہ: پیچہ دفتر کیف حویلی پیر زادگان۔ اجیر شریف (ع۔ ق۔ ج)

دنیائے افسانہ | مصنف محمد عبدالقادر صاحب سروری۔ تقطیع ۲۰۲۲ء حجم ۲۱۰ صفحات قیمت چھپنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی حیدر آباد، دکن

اس کتاب میں ادب اردو کے اُس خاص شعبہ سے بحث کی گئی ہے جس کو افسانہ کے وسیع مفہوم  
سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اردو ادب کی کم مانگی کو دیکھتے ہوئے سروری صاحب کی یہ نیکد کوشش قیناً قابل داد ہے  
جو دنیائے افسانہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے اور جو پہلی ساٹھ تک تصنیف جس میں افسانوی ادب  
کے تمام تعلقات تفصیلی اور محتفانہ انداز کی بحث پائی جاتی ہے۔

فسانہ کی جہ جزئیات، انکی اہمیت، ضرورت، ابتدا، ارتقا مختلف اقسام و فن پر پہلو سے  
روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترتیب بھی خاصی ہے بعض ابواب مثلاً "ناول کا موعود"، "ناول نگاروں کے  
فرائض" فورٹ ولیم کالج کی کوششیں، وغیرہ مصنف کے ذوق اور احترام مطالعہ و کاوش کو ظاہر کرتے  
ہیں۔

ہم مصنف کی اس رائے سے متفق ہیں کہ آجکل اردو زبان میں جو محدود رجحانیاں تحریریں  
”ادب لطیف“ کے نام سے شائع ہو رہی ہیں وہ سخت نکتہ چینی کے قابل ہیں۔

کتاب بحیثیت مجموعی مفید اور دلچسپ ہے، زبان سلیس و شستہ ہے کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔ جو زیادہ قابل اعتبار نہیں۔

کتابت و طباعت میں حیدرآباد کے اب عام مطالعے نے بھی خاصی ترقی کر لی ہے۔ پہلی نظر میں یہ کتاب علیگڑھ کی مطبوعہ معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال ہماری رائے میں مصنف، طابع و اشرب قابل داد اور سستی حوصلہ افزائی ہیں۔

**الہلال** شائقین علم ادب کے شدید و مسلسل انتظار کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا مشہور و معروف ہفتہ وار مصلوہ رسالہ اب تیسری بار پھر جاری ہوا ہے۔ مسلمان ہند کی تاریخ بیداری اور زبان اردو کی تاریخ صحافت میں الہلال کے پہلے اور دوسرے دور کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ اس عرصہ میں اردو نے کافی ترقی کر لی ہے اور بے شمار رسالے و اخبارات نکلنے لگے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ الہلال اپنے اس تیسرے دور میں بھی سب سے بلند پایہ سب سے مفید اور اردو میں سب سے نظیر پرچہ ہے۔ اب تک ۶ نمبر نکل چکے ہیں ہر ایک اپنی ظاہری و ضمنی خوبیوں کے لحاظ سے اپنے سابقہ دوروں کی مبارک یاد تازہ کرتا ہے۔ سرورق کی سادہ و لکشی لیتھو کے حصہ میں جس کتابت اور پاکیزہ طباعت کا گلشن جیسی جگہ میں انتظام کر لینا مولنا ہی کا حصہ کہا جاسکتا ہے آپ کا حصہ علاوہ اپنی دیگر خصوصیات اور جن آفرینیوں کے بہت سی تصاویر سے فرین ہوتا ہے، نغمہ شریعت سے آخر تک ہر صفحہ جن اہتمام و صحت ذوق کا قابل قدر نمونہ ہے۔

الہلال کی ممتاز خصوصیات اس کا خوش و زوائد سے پاک ہونا ہے۔ اپنے معنوی محتاجات کے اعتبار سے بھی عروج و باطن و اخبارات کے لئے اب بھی پہلے دوروں کی طرح قابل تقلید نمونہ ہے۔

”اثار عتیقہ“، ”ذاکر علیہ“، ”بصائر و حکم“ وغیرہ عنوانات منتقل ہیں اور ان کے تحت نہایت گراں پایہ اور سچ مفید مضامین برابر آرہے ہیں۔ آخر الذکر میں ”انسانیت موت کے دروازہ پر“ اور ”شامیر عالم“ اپنے اوقات و فوات میں سب کے زیر عنوان حضرت علی اور حضرت امام حسین علیہم السلام کا واقعہ شہادت پر بڑی تفصیل کیا تھ بڑے ہی عبرت آموز طریقہ پر جاری ہے اور یہ عنوان خصوصیت سے نہایت مفید ہو گا جس کی ترتیب میں مخصوص کاوش و محنت کو دخل ہے۔ بریڈسٹرنگ میں مغربی ممالک سے آئے ہوئے مقتدر

اور قیمتی معلومات سے پرکارتیک سلسلہ بھی بہت مفید و کارآمد ہے۔

ایک بڑا فائدہ بھی نکل چکے ہیں جن میں ایک کا مغربی اور دوسرے کا مشرقی اسلامی تاریخ سے تعلق ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ عید و بند پائے ہیں اور ضرورت ہے کہ اردو میں اس قسم کی چیزیں پیدا کی جائیں۔ کیا اردو میں "ادب لطیف" کا غلط مفہوم سمجھنے والا گروہ اس قسم کے فنون پر توجہ کرے گا؟ ہم مولانا کے اس اصول کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کہ۔

بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

بہر حال ادبیات اردو کے آشنائے فن طبع و تقریر مضامین کے شائق علمی و مذہبی بلند پایہ تھانے کے تلاشی اور عام پبلک سب کے لئے اہلال حقیقتہ نہایت مفید و قابل قدر ہے جس میں بہت کافی مواد ہوتا ہے۔ ۲۲ صفحات اور بہترین کاغذ وغیرہ کو دیکھتے ہوئے چند سالہ سلسلہ محصور لڑاکا کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ کم ہے۔

ملنے کا پتہ بنیور اہلال ملک بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ (۱-۱۰ م)

## شذرات

لیگ آف نیشنز (انجمن اقوام) کا قیام جنگ عظیم کا ایک بڑا کامیاب واقعہ ہے۔ اتحاد عالم کا تخیل شاید اس قدر جلد نہ فروغ پاتا۔ اگر جنگ کے تباہ کن نتائج اس سے ایک عام بیزاری نہ پیدا کر دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کا طرز عمل ابھی تک نہیں بدلا ہے۔ کمزور ملکوں پر دراز دستیاں اسی طرح جاری ہیں، رنگ اور قوم کے امتیاز میں وہی شدت ہے، آپس کی چشمک اسی طرح قائم ہے، تخفیف سامان حرب کا مسئلہ اسی طرح ناقابل حل ہے، لیکن اس سے بہتر کوئی الزام نہیں آتا اس کے رنج و تخیل پر عمل کرنے کے لئے دنیا ابھی تیار نہیں ہے، اور عرصہ تک نہ ہوگی تاہم اس کا وجود اس گری ہوئی حالت میں بھی کہ جب اس کی کارروائیوں میں قیام امن کی مخلصانہ کوششوں کے بلند آہنگ دعوؤں کے باوجود اس کے اراکین کی خود غرضیاں صاف جھلکی ہیں فائز سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہ بلا واسطہ یا بالواسطہ انسانوں کا ذہن ان امکانات کی طرف منتقل کرتی رہی جو دنیا کے اتحاد اور اس کے نتائج میں مضمر ہیں۔ اور جو باتیں آج ناممکن ہیں ان کے آئندہ ممکن بنانے کے لئے پیہم تبلیغ ہوتی رہے گی۔

چنانچہ یخبر و محبی سے پڑھی جائیگی کہ انگلستان میں انجمن اقوام ہی کی تحریک سے اساتذہ کی مختلف جماعتیں اور لیگ آف نیشنز یونین کی جانب سے ایک یادداشت اس تجویز کی تائید میں پیش کی گئی ہے کہ انجمن اقوام اور اسکے اغراض و مقاصد سے متعلق ضروری معلومات مدرسوں کے نصاب تعلیم میں داخل کر لی جائیں تاکہ مدرسہ چھوڑ کر قبل طلبہ انجمن سے بخوبی آشنا ہو جائیں اور اس کے اغراض و مقاصد سے ہمدردی رکھیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان نہایت دلفریب تجویزوں میں سے نہیں ہے جو محض دلچسپی کے لئے پیش کی جاتی ہیں اور جن پر عمل کرنے کے بہت سے وجوہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اس میں ایک معقول اور قابل عمل اسکیم ہے جس پر بڑی حد تک عملدرآمد بھی ہو چکا ہے۔

اس تحریک کے پیش کرنا والے مستحق تحسین ہیں۔ انہوں نے بہت صحیح طریقہ اختیار کیا ہے۔ انجمن قوام کے مشن کی تبلیغ کا تعلیم گاہ ہی وہ مقام ہے جہاں خیالات و تصورات کی تشکیل ہوتی ہے، اور زندگی کا لائحہ عمل بنتا ہے۔ ملک کے نوجوان یہاں سے جو زندگی کی نظری تعلیم حاصل کر کے جاتے ہیں وہی انکے آئندہ طرز عمل کی رہنمائی ہے، اس صورت میں اگر انکی تعلیم کا ایک حصہ عام اخوت و اتحاد کے سبق پر مشتمل ہو جو انجمن کا مقصد جدید ہے، تو اس سے بہت ہی مفید نتائج مترتب ہونگے۔

اگرچہ ہیں اسیں کلام ہے کہ صرف نظری تعلیم کافی ہوگی کیونکہ دنیا نصیحتوں سے نہیں سیکھتی تجربہ سے سیکھتی ہے۔ اور جب تک منفرد رہنے کے فوائد ہر ملک کے لئے متحدہ رہنے کے فوائد سے واقعہ کم نہ ہو جائیں گے اس وقت تک اتحاد عالم کی حکیم محض ہو امیں رہے گی۔ تاہم تعلیم سے آنا تو ضرور ممکن ہے کہ آنے والی نسلیں نئی نوع انسان کو زیادہ محبت کے ساتھ اور اس کے مصائب و تکالیف کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ دیکھنے کی طرف مائل ہوں گی۔

ہندوستان کے لئے بھی ایک ایسی تعلیمی پالیسی درکار ہے جو اتحاد عالم تو بعد کی چیز ہے، ملک میں وطنیت کے تخیل کو ترقی دے اور ان دو بڑے بڑے فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے جن کے تعلقات کی کشیدگی ملک کو ہر قسم کی ترقی سے روکتی ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کشیدگی کا سبب ملک کی اقصیٰ تعلیمی پالیسی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بدقسمت ملک جہاں چار سے لیکر سبھا اور لیگ تک ہندو اور مسلم ہے۔ ایک بڑی تعداد تعلیم گاہوں کی بھی انہیں فرقہ دارانہ اوصاف سے متصف رکھتا ہے، جہاں ”ہندو“ اور ”مسلم“ نقطہ نظر سے بچوں کی تربیت و تعلیم ہوتی ہے۔ اور مشترک مدارس میں بھی انکے دست و پاؤں میں وطنی خیال کے لئے گہری جگہ نہیں ہے چنانچہ ان درس گاہوں کے مذاقہ نوجوان کوئی مشترک نصب العین نہیں رکھتے، اور اپنے اپنے فرقوں کے متقبل کو ایک دوسرے سے آزاد و غیر متعلق سمجھتے ہیں۔

عجب ہر ان تباہین تعلیم پر جو ملک کی تعلیم کو وطنی نقطہ نظر سے دینا ضروری نہیں سمجھتے اور خاموشی ہیں اور ان فوس ہے ان ”رہنمایان“ قوم پر جو تعلیم گاہوں کو چھوڑ کر محض اخباروں کو قومی پروپیگنڈے کا ذریعہ بنانا

ہیں، اور نہیں سمجھتے کہ عام پبلک اس نئے خیالات کی قدر و عکاس کا بڑا حصہ غلامی اور غیر ذمہ داری کی حالت میں گزارنے کے بعد پھیل سکتی ہے، اور اگر یہ ہو بھی گیا تو انہیں علی جامہ پہنانے کیلئے اپنے اندر کیرکٹر نہیں پیدا کر سکتی۔

اگر ملک میں مسیح و طینت کا بیج بونا اور اس کے اندر آزادی و ذمہ داری کا جذبہ پیدا کرنا ہے تو تعلیم کا ہوں کی اصلاح سب پر مقدم ہے، کہ یہاں تخیل اور کیرکٹر دونوں کی تعمیر ممکن ہے تعلیم کا ہوں کی جگہ اخبار کو ذریعہ بنانے والے چشمہ آب کو چھوڑ کر سراب کے پیچھے دوڑتے اور قومیت کی بنیاد مضبوط جان کے بجائے ہوا پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

رائل کمیشن مغرب اپنی تحقیقات شروع کرنے والا ہے، ضروری ہے کہ شہادتوں میں مسئلہ تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دیکھائے قانون اصلاحات کے ذریعہ جو چند "نیشن بلڈنگ" (قومیت کی تعمیر کرنے والے) محکمے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آئے ان میں ایک محکمہ تعلیم بھی ہے۔ اصلاحات کی دوسری قسط ہندوستانیوں کے عام اختیارات انتظامی میں خواہ جس حد تک بھی توسیع ہو۔ محکمہ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنی کے لئے متفقہ مطالبہ کرنا چاہئے، تاکہ ملک میں ایک ایسی تعلیمی پالیسی پر عمل کرنے کا موقع ملے جس سے واقعی طور پر "قومیت کی تعمیر" ہو۔ اگر حکومت اس مطالبہ کو نامنظور کرے، اور یہ بہت زیادہ خلاف توقع بھی نہیں ہے، تو ملک میں پرائیویٹ قومی اسکولوں اور کالجوں کے قائم کر نیکی زبردست تحریک پھیلانی چاہئے۔ یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس پر موالاتی اور ترک موالاتی، سوراہی اور شروط تعادنی، خلافتی اور ہندو سچائی، کانگریسی اور مسلم والے سب کے سب متفق ہو سکتے ہیں، اگر ان کے دل میں قوم کا سچا درد اور اس کی خدمت کا صحیح جذبہ موجود ہے۔

ایسے چند تعلیمی ادارہ رکھنا کامیابی سے چلا لینا بھی ملک کے مستقبل پر عظیم اثر ڈالے گا۔

کیا وہ لوگ جنہیں "اکابرین قوم" کے نام سے پکارا جاتا ہے، گورکھنا اور باجے کے انداد کی کوششوں سے اتنا وقت بچا سکیں گے کہ انسان کی حفاظت اور اس کی عزت نفس کے قائم رکھنے کے لئے بھی کچھ کر سکیں؟۔ اگر ایسا ممکن ہو تو جہاں انانیت، شہرت پسندی، تنگ نظری اور خدمت قوم کے



ضائع کر دے جانے والے موقعوں کی دانتوں سے دفتر کے دفتر بیاہ ہونگے۔ وہاں انکے نامہ اعمال کے چند صفحے اس عمل نیک کے بیان سے بھی روشن ہونگے۔ اور شاید یہ انکی نجات کا سبب بنے۔

دنیا کی اقتصادی کانفرنس کا منعقد کرنا جمعیت اقوام کے لئے باعث فخر و مباحثات ثابت ہوگا۔ کانفرنس کے قبل حالات کا اقتباس پچھلے صفحوں پر یہ ناطرین کیا جا چکا ہے۔ یہاں چند سطروں میں اس پر مزید روشنی ڈالنی مناسب ہوگی۔ اپنی نوعیت میں یہ پہلی کانفرنس نہیں ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی اقتصادی حالت میں جو ابتری پھیلی ہے، اس کی درستی کے لئے متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں ہو چکی ہیں لیکن ابتداءً ان میں زیادہ تر ایسی تھیں جن کی غرض صرف وقتی مشکلات کو دور کرنے پر غور و خوض کرنا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی بار برڈلز میں ایک بین الاقوامی اجتماع اس لئے ہوا کہ مستقل اقتصادی دشواریوں پر غور کرے۔ مگر اسیں شریک ہونی والی قوموں کے خیالات اور حکمت عملی کے اختلاف نے اس اجتماع کو زیادہ کامیاب ہونے نہیں دیا۔ ۱۹۵۱ء کی دوسرے اجتماع کی ضرورت باقی رہی۔

چنانچہ وہ ضرورت اس سال پوری کی گئی۔ یہ کانفرنس ایسے اراکین پر مشتمل تھی جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے آئے ہوئے تھے۔ اور اگرچہ نائنٹھ کی حیثیت نہ رکھتے تھے مگر اپنی ملکی حکومتوں کے نامزد کردہ ضرورت تھے۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے سب کے سب اپنے وقت کے متبحر عالم ہیں اور اقتصادیات عالم پر نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے کمال بصیرت رکھتے ہیں۔ سائنسی تجاویز متفقانہ ہونے کے علاوہ ملکوں کی حکومتوں کے نزدیک قابل اعتناء ہونے کا بھی امکان رکھتی ہیں۔ کیونکہ کانفرنس کے تمام اراکین حکومت کے با اثر لوگ ہیں۔

کانفرنس کی بین الاقوامی اور اس کے اراکین کی نیم سرکاری حیثیت، ابھکا سمجھ، اور سب سے بڑھ کر، اتفاق اور اشتراک عمل کی طرف رجحان، جو کانفرنس کے متفقہ فیصلوں سے صاف ظاہر ہے، امید افزا

جیزیں ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ کانفرنس نے دنیا کی اقتصادی حالت کے سدھانے کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت اہم اور قابلِ قدر ثابت ہوگا۔

ترکی جدید کے متعلق ہمارا مبلغ علم بیشتر وہ معلومات ہیں جو اخباروں کے ذریعہ ہمیں ملتی رہتی ہیں۔ یہ اطلاعات کبھی کبھی غلط صورت میں، اور عموماً غلط اہمیت کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ پھر کسی مخصوص طرزِ عمل کے سمجھنے اور اس پر رائے زنی کرنے کے لئے صورتِ حالات سے بخبری اس پرستادہ علاوہ ہر اس جن بظاہر غیر معمولی واقعات کی خبریں ہم تک پہنچتی ہیں، وہ بالکل منفرد اور ایک دوسرے سے مختلف و آزاد ہوتے ہیں، اور اس تحریک کا مکمل تصور نہیں پیش کرتے جو انکی تہیں کام کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے ترکی کی جدید تمدنی تحریک ہمارے لئے ایک رازِ سرستہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور ہم اس کے موافق یا مخالف کوئی صحیح رائے قائم کر کے آئے دن رونما ہونے والی تبدعاتِ شیعہ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے ہر ایک پر الگ الگ نظر ڈال کر بھی حیرت کرتے ہیں کبھی غصہ۔

جب تک ہماری معلومات کا ماخذ ترکی تصانیف براہِ راست نہ ہوں، ہماری واقفیت اور غلط فہمی کا ازالہ محال ہے۔ کیونکہ ترکوں کے خیالات و نقطہ نظر کے سمجھنے اور اس تمدنی تحریک کے رجحانات و خصائص اور اسباب و علل کا صحیح حال جاننے کے لئے جو انہیں ایک زندگی کی طرف لیجا رہے ہیں بہترین ذریعہ خود ترک ہی ہو سکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس مقصد کے لئے مفید اور پراثر معلومات تصانیف ترکی زبان سے آردو میں منتقل کرانی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا اور بالواسطہ ذرائع پر ہی قناعت کی گئی تو حقیقی ترکی ہمیشہ تاریکی میں رہے گی اور اس کے کارناموں کے اعتراف اور اس کی دشواریوں سے ہمدردی کی جگہ ہمارے دل میں اس سے بچا عداوت و نفرت پیدا ہوگی

خوش قسمتی سے اس معاملہ میں سبقت کا موقع جامعہ کو حاصل ہوا ہے۔ امید ہے کہ ہم ناظرین

کی ضیافت طبع کے لئے ترکی کی جدید تمدنی تحریک پر مسلسل مضامین نکال سکیں گے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی بعنوان ”ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک“ اس نمبر میں بدین نظرین ہے۔ یہ ڈاکٹر احمد علی الدین کی کتاب ”ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک“ کے دیباچہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے جرمن زبان میں تصنیف کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف ایک ترک ہیں جو لائپزک یونیورسٹی میں ترکی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں اور جو مضامین آئندہ نکلیں گے وہ بھی اسی کتاب کو ابواب کا مخلص یا ترجمہ ہونگے ختم ہونے پر شاید انہیں علیحدہ ایک کتاب کی صورت میں بھی منسٹاع کیا جاسکے مگر یہ موقوف ہر مساعدت حالات پر۔

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں موسیقی کی تعلیم پر بڑا زور دیا جا رہا ہے۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک موسیقی نہ صرف جذبات سے تعلق رکھتی ہے بلکہ اسکا اثر جسم و دماغ دونوں پر پڑتا ہے حال میں سلطنت برطانیہ کی تعلیمی کانفرنس نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا۔ سر ایچ ہینڈل و جنہوں نے کانفرنس میں اسے پیش کیا، بتایا اگر کوئی چند سال سے ماہرین تعلیم موسیقی کی طرف بہت توجہ دے رہے ہیں، اور اسکو طالب علموں کی ذہنی تربیت کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ سر ہینڈل نے خود بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں موسیقی کی زبان کیا بلحاظ حسن و کیا بلحاظ پیچیدگی عبارت و دقت معنی و ہی مرتبہ رکھتی ہے جو شیکسپیر اور بکین کی زبانوں کا ہے، اور انہیں کی طرح سیکھی جانے کی مستحق ہے۔

یورپ کی دیکھا دکھی ہندوستان کے مدارس میں بھی موسیقی کو رواج دینے کی تحریک عام ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں ہمارے علماء کس حد تک اس کی تائید کریں گے مخالفت تو شاید بہت ہوتی اور اب بھی ہوگی مگر یورپ سے اٹھی ہوئی دوسری نئی تحریکوں کے مقابلہ میں اس کے لئے آسانیاں زیادہ ہیں۔ کیونکہ ایک طبقہ نے موسیقی کو ”روح“ کے لئے مفید پاکر پہلے ہی سے مندرجہ ذیل رکھی ہے!

یکم اگست سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے۔ بائیں پھیلپوں میں ہندو نہیں بھی

گئے۔ مگر امینہ ہے کہ اسل طلبہ کی تعداد اور زیادہ ہوگی شکریہ کہ جامعہ سے جو سوتیلے ہو گیا تھا، آہستہ بہ آہستہ دور ہو رہا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ درس گاہ کسی انقلابی تحریک کے تحت نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ ایک خالص تعلیمی نصب العین رکھتی ہے اسکا مقصد صرف اس قدر ہے کہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو اندیکر کٹر اور دینی و ملی فرض کا احساس بھی پیدا کرے۔ اور ہر چل کے مدرسہ جامعہ بنے دوسرے مدارس کے مقابلہ میں جو امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر مقامی حضرات نے اب اس کی طرف توجہ شروع کر دی ہے، اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے یہاں بھیج رہے ہیں۔ انشاء اللہ سچی خدمت ہی جامعہ کا اختیارات ثابت ہوگی تاہم بیرونی حضرات کو جامعہ اور اس کے اغراض و مقاصد سے واقف کرنے کیلئے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھنے ضروری ہیں۔ اس فرض سے اہل قلم ہمدردان جامعہ نے پوری طرح سبکدوشی حاصل نہیں کی ہے۔ تاہم چند درز سے ملک کے اکثر مقتدر اخبارات نے جامعہ پر ہمدردانہ مضامین لکھنے شروع کر دئے ہیں جامعہ انکے اس احسان کی بید ممنون ہے۔

کاش اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا کہ قوم نے جامعہ کی مالی امداد کی طرف بھی ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر اظہارِ انوس اور شکایت کے لئے کیا رہ جاتا ہے ہمارے شاعروں نے "غنائی" کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ خواہ افراد کے حسب حال نہ ہو، اکثر "قومی" اداروں کے حسب حال ضرور ہے جنہیں ہمیشہ قوم کی بے توجہی کا گلہ رہتا ہے، اور جو شمار تمناؤں کے ساتھ صرف "وعدوں" کی آس پر گزارہ کرتے ہیں!

رسالہ جامعہ چار سال سے ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اپنی سنجیدہ و بلند پایہ علمی و ادبی مضامین کی بدولت ملک کے بہترین مخالفین بلکہ پاجکاتے خوش قسمتی سے اس کو ایسے مواقع بھی حاصل ہیں کہ کیا بیانات حاضرہ و معلوم جدیدہ سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کر سکے۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی بوری کی کوشش کی گئی ہے، و تاہم یہیں جلد کے مضامین کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ چھ ماہ کی قلیل مدت میں عام واقفیت کے لئے کتنا مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔

اس طرح جامعہ ایک بہت بڑی تعلیمی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی علمی و سرکاری

لیٹ انگریزی موسے کی وجہ سے بیانات حاضرہ و معلوم جدید سے متعلق اپنے خاص میں ہی رہیں۔  
 جتنے ہیں۔ اور وہ دلچسپ لک ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اردو کے جو سادے  
 آج کل جاری ہیں اور جن کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ نئے مسائل اور نئی باتوں سے سبک لکھ کر ہیں  
 انہیں سے کم اپنے فرض کو محسوس کرتے اور کمتر ادا کر سکتے ہیں۔ رسالہ جامعہ کی کوششیں بہت زیادہ محنت  
 انسانی کے قابل ہیں۔

ہیں اس کی قوی امید ہے کہ جامعہ کا مستقبل اُس کے ماضی سے بہتر ہوگا۔ لیکن اس کے لئے صرف  
 جاری ساعی کافی نہیں ہوں گی بہت کچھ ہمدردان جامعہ کی امداد پر بھی منحصر ہے۔ اسی کی توقع پر ہم نے اپنی  
 طرف سے بسم اللہ کر دی ہے صفحات کے زیادہ کر نیکی تو فی الحال استطاعت نہیں ہے، مگر قلم باریک کڑ  
 گیا ہے جس سے مواد پہلے کی نسبت ڈیوڑھا آیا ہے۔ انشاء اللہ یہی خط قائم رکھا جائے گا۔ کاغذ بھی  
 پیسے سے بچھا لایا گیا ہے مگر اسکی اور دوسری پیش نظر تبدیلیوں کو متعلق طور سے عمل میں لانے کے لئے ہمیں  
 آپ کی بہت افزائی کا انتظار ہے۔

رسالہ کی سب سے بڑی مشکل اشاعت کی کمی ہے۔ اگر آپ خریداروں کے جیبا کرنے میں تھوڑی سی  
 بھی تکلیف گوارا فرمائیں تو یہ بہت بڑی امداد ہوگی۔ آپ کے لئے چند خریدار بنانے مشکل نہیں مگر اس سے  
 رسالہ کی شکل حل ہو جائیگی۔ یہ رسالہ علمی خدمت کے لئے اپنی سچی و غلطیوں کو مشنوں کا آپ سے ہی ہتھ  
 چاہتا ہے۔ آپ کی ہمدردی سے توقع ہے کہ حتی الامکان اس امداد سے ذریعہ فرمایا جائے گا۔

مطبع جامعہ علمیہ اسلامیہ دہلی

پرنٹنگ ماسٹر محمد حبیب بی (دکن)

باتام سیکورٹ اور پرنٹنگ ماسٹر محمد حبیب بی

محمد حبیب بی

# جواب

جلد ۹ | ماہ صفر ۱۳۲۶ھ مطابق اگست ۱۹۰۷ء | نمبر ۲

## فہرست مضامین

۸۲	جواب ید محمد عمر صاحب بی ای	۱۔ روشنی کی رفتار
۹۵	یوسف حسین صاحب بی ای (جامعہ محال شعلہ علم پریس یونیورسٹی)	۲۔ عرب فرانسیسی ادبیات میں
۱۰۸	ڈاکٹر احمد علی الدین پروفیسر یان ترکی لائبرک یونیورسٹی	۳۔ ترکیہ جدیدہ میں تمدنی تحریک
۱۱۸	پروفیسر ڈیوڈ ڈاشیر (گلبرن) مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین	۴۔ غفوان شباب کی مجموعی نفسی سیرت
۱۳۲	سید عایت علی صاحب آغاز برہان پوری	۵۔ غزل
۱۳۵	سہ جواب محمد یحییٰ صاحب تنہا	۶۔ کوہ نینئی تال (نظم)
✓ ۱۳۷	سہ چیون مترجمہ پروفیسر محمد مجیب صاحب	۷۔ شادی کا پیغام (ڈراما)
۱۶۲	۹۔ مشذرات	۱۵۶
		۱۵۶

# روشنی کی رفتار

جب نظر رفتار ہمارے کانوں میں پڑتا ہے تو ہم اس کے معنی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ایک فاصلہ دروازہ کا تصور ذہن میں نہ ہو یعنی رفتار کے معنی یہ ہونگے کہ ایک جسم ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک وقت میں پنچا جب ہم ساٹھ میل فی گھنٹہ کہتے ہیں تو ذہن میں یہ بات فوراً آجاتی ہے کہ متحرک چیز ایک گھنٹے میں ساٹھ میل گئی ہے یا ایک منٹ میں ایک میل یا ایک سکنڈ میں ۱۶ فٹ مسافت طے کی گئی۔ یہ ان چیزوں کی مسافت حال ہر جہیں ہم اسی طرح دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ یہ رفتار ہماری سمجھ میں آسانی آجاتی ہے۔ اور جس کی سمجھ نہ آئے وہ ریل میں چٹکر تجربہ کر سکتا ہے۔ ایک رفتار آواز کی ہے۔ اگرچہ آواز میں بظاہر ہم نہیں مگر اس کی رفتار بھی ہم بغیر کسی آواز کے معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ایک توپ کو چلتے ہوئے دیکھا جس وقت اسپرٹی لگا گئی ایک شعلہ پیدا ہوا اور دھماکا ہوا۔ اگر ہم دس میل کے فاصلہ پر کھڑے ہوں اور ہمارے پاس روک ٹوک نہ ہو تو ہم دیکھیں گے کہ شعلہ پیدا ہونے سے آواز کے پہنچنے تک ۱۶ سکنڈ لگ گئے۔ تو معلوم ہوا کہ آواز کی رفتار تقریباً گیارہ سو بیس فیٹ فی سکنڈ ہے۔ یہ تجربات ایسے ہیں جنہیں ہم روز کر سکتے ہیں۔ مگر یہ تجربات اس وجہ سے آہستہ ہیں کہ یہ رفتاریں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ چند میل فی سکنڈ بھی ہم ناپ سکتے ہیں مگر روشنی کی رفتار ایک سکنڈ میں سو میل نہیں ہے بلکہ ایک لاکھ چھاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ایک سکنڈ ناپیں یہ خطا کے گرد سات چکر لگا کر آسکتی ہے یعنی زمین کا قطر جو خط استوا پر سب سے زیادہ یعنی ۲۶ ہزار میل کا ہے اور ایک سکنڈ میں پورے سات چکر لگا سکتی ہے۔ اس سے آپ کو روشنی کی سبک رفتاری کا پتہ لگیگا۔

سو بج جو ستاروں میں سب سے نزدیک ترا اور چھوٹا ستارہ (ذات اب) ہے اس کا فاصلہ نو

۱۰ لاکھ کھربا میل *astronomical unit* نامی عام طور سے استعمال کی جاتی ہے اس میں ایک سو فی ہوتی ہے جب چاہے اور جب چاہیں روکنے میں اس سے سکنڈ کی گنت تک کا وقفہ معلوم ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں *Stop Watch*

نیں لاکھ میل ہر وہاں سے یہ روشنی نہ منٹ میں بہانک آتی ہے بعض تارے ایسے ہیں جن کی روشنی دو ہزار برس میں پہنچتی ہے۔ ان اعداد سے آپ انکی بعد مسافت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ دو ہزار برس کے معنی یہ ہیں کہ جو روشنی اس وقت ہم ان تاروں کی دیکھ رہے ہیں وہ روشنی ہے جو آج سے دو ہزار سال قبل وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ اگر وہاں کوئی مہذب مخلوق ہے اور اُنکے پاس کوئی بڑی دوربین ایسی جس سے وہ زمین کے حالات دیکھ سکتے ہیں تو اُس وقت وہ دیکھیں گے کہ ابھی حضرت عیسیٰ نہیں پیدا ہوئے۔ بلکہ ہندوستان میں ہاتابادہ درخت کے نیچے گیان دھیان میں مصروف ہیں۔ اور اگر ہم ذرا اس طرف آجاویں یعنی اسی جگہ جہاں زمین کی روشنی کو پہنچنے میں تقریباً اُن برس لگتے ہیں تو وہاں سے زمین پر ہم کیا دیکھیں گے کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب دی جا رہی ہے۔ اگر اسی روشنی کے راستہ پر ہم اس تارہ سے زمین کی طرف چلے آویں تو کیا دیکھتے آئیں گے کہ عرب میں ظہور قدسی ہوا ہے۔ اور تاریخ کو ہم اس طرح باسانی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ جیسے جیسے ہم زمین کی طرف اترتے جائیں گے ہم زمانہ حال کے واقعات کے قریب آئیں گے۔ اور جیسے جیسے دور جائیں گے ہم کو تاریخ قدیم زندہ نظر آئے گی۔

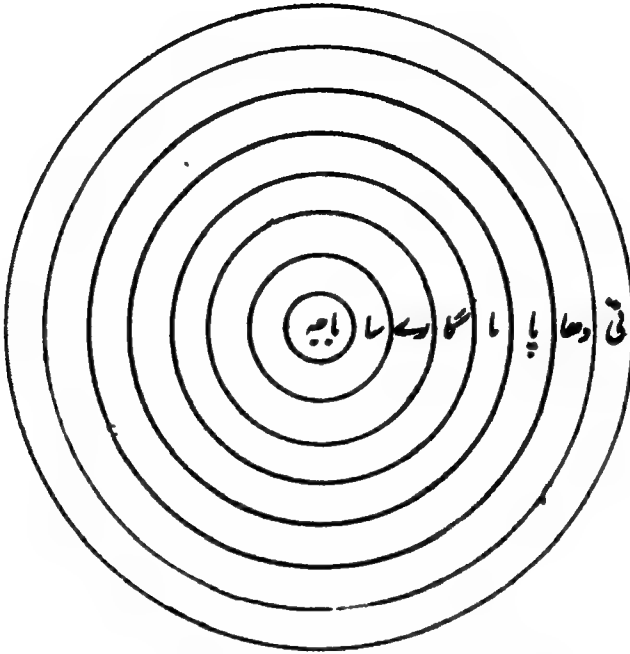
روشنی کی تیز رفتاری اس بیان کو سمجھنے میں پھر مدد راہ ہوگی۔ ایک دفعہ پھر آواز کی رفتار کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کی رفتار گیارہ سو بیس فیٹ فی سکینڈ ہے۔ اپنے دس میل کے فاصلہ پر توپ کی چمک دیکھی تو اُس کے دھماکے کی آواز آپ کو، ۴ سکینڈ میں آئے گی۔ اگر آپ چمک دیکھتے ہی مخالف سمت میں آواز کی رفتار سے روانہ ہوئے تو آپ کو کبھی یہ آواز نہیں سنائی دیگی۔ فرض کیجئے کہ بجائے توپ کے یہاں باجن بج رہا ہو اور اُس میں سے مسلسل یہ سُر نکل رہے ہیں۔

سا۔ رے۔ گا۔ با۔ یا۔ دعا۔ نی

جیسا کہ قاعدہ یہ سُر نضایں ایک ملحق کی شکل میں پھیلتے ہیں۔ دیکھو شکل تبرا

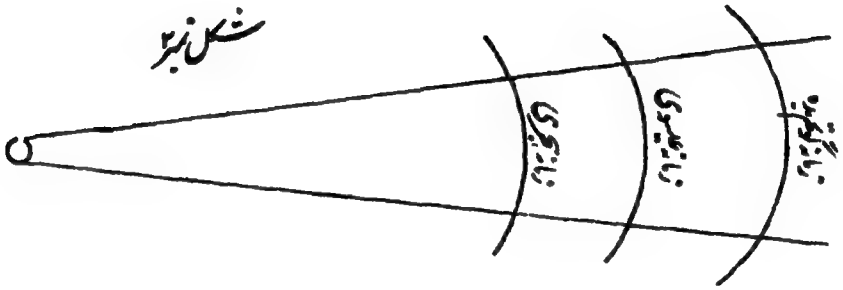
ہر ملحق کو ہم نے ایک مخصوص سُر کے واسطے مقرر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جوادول سُر یعنی سا بجا گیا وہ ملحق کے آخر سرے پر پہنچ جائیگا جب فی ہجیگا۔ فرض کیجئے ان سات سُر کو، ۴ سکینڈ میں بجا گیا ہو اور ایک دفعہ بجا کر موبند کر دیا پہلا سُر اُس وقت جبکہ آخری سُر، ۴ سکینڈ کے بعد بجائے دس میل پہنچ چکا تھا۔ یعنی جس وقت یہاں





”نی“ بکر باجہ بند ہوا ہے تو اس وقت ہم نے دس میل کے فاصلہ پر سنا ہے۔ اگرچہ باجہ بند ہو چکا ہے مگر ہم اسی ترتیب سے باجہ بن رہے ہیں۔ یہاں تک کہ پہلا سُر سنانے کے، ہر سکند گزرنے پر جس فی سکر باجہ کے بند ہونیکا علم ہوگا اگر کم سات آدمی قطع میں کھڑے کر دیں اور ایک وقت واحد میں یہ پوچھیں کہ وہ کیا سن رہے ہیں تو سب مختلف سرودوں کو بتائیں گے۔ کیونکہ پہلے قطع والا اگر سائن رہا ہے تو دوسرے والا رے اور تیسرے والا گادھلی ہذا، جو باطل باجے کے پاس ہے اُسے فی سنانی دے رہا ہے اور جہاں ابھی آواز نہیں پہنچی ہے یعنی جو گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے وہ کہیں گے کہ ابھی باجہ کہاں بج رہا ہے جو وہ کچھ سنے۔ اب فرض کیجئے آپ فی سکر گیارہ سو میں فیٹ فی سکند کی رفتار سے زیادہ تیز یعنی بارہ سو فیٹ فی سکند کی رفتار سے آگے بڑھ گئے تو یہی آوازیں آپ کو بھرنائی دیں گی۔ مگر اب انکی ترتیب الٹی ہوگی تی دحا پا ما گارے سا۔ کیونکہ آخری سُر کو آپ پہلے سن لیں گے اور اول سُر کو بعد میں سنیں گے۔ کیونکہ آپ اب ان سرودوں کا تعاقب کر رہے ہیں جس طرح ایک شخص ٹرین کو پکڑنے دوڑے تو پہلے بریک بیٹھا اور آخر میں انجن۔ روشنی بھی اسی طرح چاروں طرف پھیلتی ہے۔ اب زمین اور اس تارے کو لگا جہاں سے روشنی یہاں تک دو ہزار سال میں پہنچتی ہے۔ اس فاصلہ کو بہت میں دو ہزار سال روشنی کہا جاتا ہے۔ اور

سے ظاہر ہے کہ جو روشنی زمین سے آج وہاں پہنچ رہی ہے وہ ہزار سال قبل رواں ہوئی تھی اسی طرح جس طرح باجہ بند ہوئیے، ۲۴ سکند بعد اسکا سر پہلی دفعہ دس میل کے فاصلہ پر سنگا گیا اسی طرح جو روشنی دو ہزار سال قبل وہاں سے روانہ ہوئی تھی آج زمین پہنچی ہے۔ اب ہم اس فاصلہ کو اسی طرح مختلف فاصلوں میں تقسیم کر لیں جس طرح آوار کے حلقوں کو کیا تھا۔ تو ہم دیکھیں گے کہ اس ستارہ پر بیٹھنے والا جو ہماری



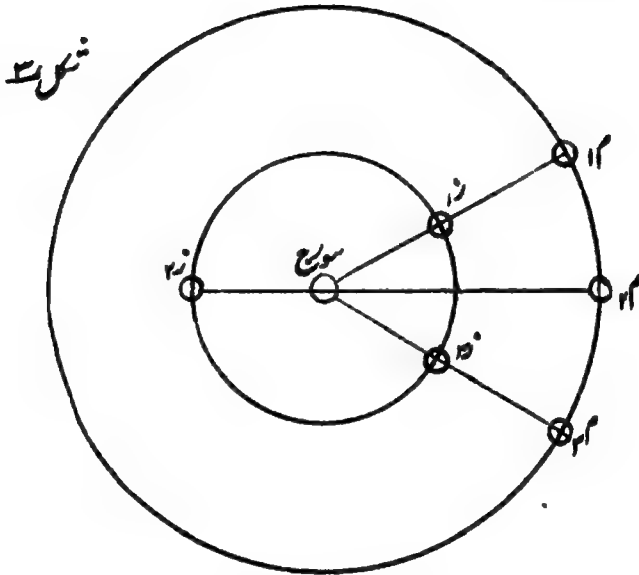
زمین کی سیر کر رہا ہے وہ تو یہاں گوتم بدھ کو لگیا کے درخت کے نیچے دیکھ رہا ہے۔ مگر جو شخص پہلے ملحقہ میں ہو وہ حضرت عیسیٰ کے صلیب کے واقعات کو دیکھ گیا۔ اور جو خوش نصیب ۸۱ پدم میل پر ہے وہ حضور انور صلیم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ فارثورے نکل کر مدینہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح جو شخص ہم سے ۱۰ کھرب میل کے فاصلہ پر ہوگا وہ ہمارے ہاں ۱۹۳۷ء کے واقعات دیکھ رہا ہے جب دو آفتاب کے پاس آجائیگا تو صرف آٹھ منٹ پہلے کے واقعات دیکھ رہا ہوگا۔ اب تصور کیجئے کہ آپ اس ستارہ سے فضا میں دو لاکھ میل فی سکند کی رفتار سے زمین سے پرے روانہ ہوئے۔ تو اب آپ کو سب واقعات اُلٹے نظر آئیں گے یعنی آپ گوتم بدھ کو دیکھیں گے کہ انکی تاریخی چل رہی ہے۔ اور پھر انکی لاش لوگ لے پائوں گھر کو لیجا رہے

۱۵۔ روشنی سال "Light Year" کا خدو خد ایک ایسی کائی ہے جو بہت میں علیٰ اعموم استعمال ہوتی ہے اسے بینر میل کے سمجھا جاتا ہے یعنی وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کر سکے وہ "روشنی سال" کہلاتا ہے۔ ایک سکند میں ایک لاکھ ۴۰۰ ہزار میل روشنی کی رفتار ہے۔ ایک میل میں حساب لگائیے کتنے سکند ہوتے ہیں۔ ان سکندوں کو ایک لاکھ ۴۰۰ ہزار سے ضرب دے کر معلوم کر لیجئے کہ ایک روشنی سال تقریباً ۱۰ کھرب میل کا ہوتا ہے۔

ہیں۔ پھر لاش بزرگ پر پڑی ہے اور اب وہ چل پھر رہے ہیں۔ اور اب راجہ کے بیٹے ہو گئے۔ پھر وہ بچہ ہو گئے۔ پھر بچہ بڑا ہوا۔ یہ سب واقعات آپ اس طرح دیکھیں گے جس طرح کسی سینما کی فلم کو اٹا دکھا دیا جائے جو تصاویر اول ہوئے ہیں وہ آخر میں دکھائے جاویں۔ اگر ہم یکا یک وہاں پہنچ جاویں تو ہم تمام دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کس قدر عمدگی اور آسانی سے کر سکیں گے۔ نہایت صحیح تاریخ عالم اور تمام مذاہب کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ اور جو کمزوریاں اور حسد و زوائد مذاہب میں داخل ہو گئے ہیں وہ سب صاف ہو سکتے ہیں۔ آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت میں روشنی کی رفتار سے اور خصوصاً اس بچہ کی کیفیت سے کہ اگر روشنی کی رفتار سے تیز فضا میں سفر کیا جائے تو ہم اُنے واقعات دیکھیں گے۔ بڑی مدد ملی ہے دانش را اللہ ائندہ کہی ہم مفصل بحث اس موضوع پر کریں گے۔ آئن سٹائن کے نظریہ کے شائع ہونے کے بعد ایک رلن میں فلم دکھائی گئی جس میں ایک پروفیسر نے ایک ایسی فرضی مشین ایجاد کی جو روشنی سے تیز فضا کے عالم میں سفر کر سکتی تھی اُس پر شجرہ اس کے واقعات دکھائے گئے جنہیں زمین کے سب واقعات اسی طرح سے اُنے نظر آتے رہے ہیں۔ ظہیرین غالباً اسے سمجھ گئے ہوں گے۔

اب ہم ناظرین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس رفتار کو یعنی ایک لاکھ ۶۶ ہزار میل فی سکند کو کس طرح دریافت کیا گیا۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے گلیلو کے زمانہ تک یہ خیال چلا آ رہا تھا کہ روشنی ایک جمی چیز اور اس کی رفتار نہیں ہے بلکہ آفاقی ہے۔ مگر گلیلو نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ اس کی رفتار معلوم کی جائے۔ چنانچہ اس نے دو آدمیوں کو دو لمپ دیکر تھوڑے فاصلہ پر کھڑا کیا۔ ایک نے لمپ کو ڈھانچ لیا دوسرے نے دیکھتے ہی دوسرے لمپ کو ڈھانچ دیا۔ پہلے شخص کے لمپ کے ڈھانچنے کے وقت دوسرے شخص کے لمپ ڈھانچنے کے درمیان میں جس قدر وقفہ ہوا وہ اُنکے فاصلوں کے دو گئے فاصلہ کے برابر روشنی کی رفتار بھی گئی۔ مگر غلطی کا بہت بڑا احتمال تھا۔ اور روشنی ایسی تیز رفتار چیز ایسے بھدے تجربہ کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کے بعد آئینسویں صدی میں دو طرح سے تجربات کئے گئے سب سے پہلے ریو مر Michelson نے سیاہ معلقہ لہلہ شتری کے گہن سے صحیح اندازہ لگایا کہ روشنی کی رفتار کتنی ہے۔ سوئج کے گرد نوکر ورتیں لاکھ میل کے فاصلہ پر تقریباً دائرہ کی شکل میں زمین گھوم رہی ہے اور

مشتری کا مدار  $Orbita$  سورج سے ۸ کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور زمین کے مدار سے ۳۹ کروڑ میل کے فاصلہ پر گھوم رہی ہے۔ مشتری کے پانچ توابع یا اقار  $Satellites$  کہ ہیں۔ جو ۱۱ گھنٹے ۵۸ منٹ سے لیکر ۱۶ دن ۱۶ گھنٹے ۳۲ منٹ ۱۱ سکند میں اپنا دور مشتری کے گرد ختم کر لیتے ہیں۔ انکی حرکت دوری کے وقت کا تعین اس سلسل راستہ سے معلوم ہو سکتا ہے جو اس خط میں واقع ہو جس کا مرکز سورج اور نقطہ مشتری ہے۔ دیکھو شکل ذیل



شکل ۳

ہر چاند چونکہ مشتری کے سطح مدار کے متوازی گھومتا ہے لہذا ہر چاند کو ہر گز میں ایک دفعہ گھٹن لگتا ہے۔ خود مشتری کا سال ۱۱۸۶ سال کے برابر ہوتا ہے یعنی زمین جس طرح ۳۶۵ دن میں ایک پورا چکر آفتاب کے گرد لگاتی ہے۔ اسی طرح مشتری اپنے مدار کے لیے ہونیکی وجہ سے ادراپنی چال کے سست ہونیکی وجہ سے تقریباً پونے بارہ سال میں ایک دورہ لگاتی ہے۔ ایک وقت میں زمین اور مشتری کا قرآن  $Conjunction$  ہوتا ہے۔ فرض کیجئے مشتری کے ایک چاند کو اس وقت گھٹن لگا جبکہ زمین اور مشتری متقارنہ قرآن

لے توابع یا اقار ان چھوٹے سیاروں کو کہتے ہیں جو کسی سیارے کے گرد گھومتے ہیں اور تار و ثنابت کے گرد سیارہ چکر لگاتا ہے جس طرح زمین کے گرد چاند چکر لگاتا ہے۔ یہ سیارہ نہیں ہو سکتا ہے توابع کہلاتا ہے اور زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے اسے سیارہ کہتے ہیں

میں تھے اور یہ قمر غائب ہو گیا۔ اگر روشنی ایک دم یہاں آجاتی یعنی اس کی رفتار لامتناہی ہوتی اور دور سے دور فاصلہ سے بھی ایک چشم زدن میں آجاتی تو گہن کا وقت اور گہن کے دکھائی دینے کا وقت ایک ہوتا مگر وہ روشنی جو مشتری کے چاند سے چلی آئے م، از فاصلہ طے کرتا ہے۔ اگر حرف ن، روشنی کی رفتار میل فی سکند ہے تو ظاہر ہے کہ اس روشنی کو زمین تک آنے میں م، از سکند لگیں گے۔ اگر ن، مشتری کے راستہ کا نصف دائرہ یعنی س م، اور ن، زمین کے راستہ کے نصف دائرہ کے یعنی س ز کے برابر ہے تو یہ مساوات ملے گی۔ یعنی ن، روشنی کو زمین تک آنے میں ن، سکند لگیں گے یعنی گہن کے لگنے کے ن، سکند کے بعد ہم کو گہن نظر آئے گا۔

زمین ایک سال میں ۳۶۰ درجہ اپنے مدار کے طے کرتی ہے اور مشتری ۱۱۸۶ برس میں یہی تین سو ساٹھ درجہ طے کرتی ہے۔ جب مشتری ۱۶۰۵ درجے طے کرتی ہے تو اسے ۶۵۴ سال لگتا ہے۔ مگر اس عرصہ میں زمین ۱۹۶ درجے طے کر کے بالکل مقابل میں آجاتی ہے یعنی اگر ایک خط مستقیم م، سے کھینچا جائے تو اس کو کاٹتا ہوا زہر تک پہنچ جائیگا اسے اصطلاح ہیت میں مقابلہ position کہتے ہیں۔ جب زمین مقابل آجائے اور پھر قمر کا خوف ہو تو ہم دیکھیں گے کہ روشنی اس مدت میں نہیں آتی جتنی مدت میں پہلے جبکہ قربان میں تھے آنے لگی بلکہ اب اسے چونکہ فاصلہ زیادہ طے کرنا ہے یعنی م، زہر کا فاصلہ طے کرنا ہے یعنی اب روشنی کو ن، فاصلہ طے کرنا ہے اور اب جو وقت لگے گا وہ ن، سکند کے برابر ہو گا۔ زمین کے مدار کا قطر تقریباً ۱۸ کروڑ ۵ لاکھ میل کا ہے اور پہلے خوف کی نسبت جب زمین اور مشتری مقابل ہونے میں روشنی ۱۶ ۱/۲ منٹ دیر میں پہنچتی ہے تو معلوم ہوا کہ روشنی کی رفتار یعنی ف =  $\frac{92955500}{16.5} = 5633666$  میل فی سکند ہے۔

انحراف نور۔ وہ کیفیت ہے جس میں ایک ستارہ جہاں اعتدال زمینی میں نظر آتا ہے اعتدال خریفی

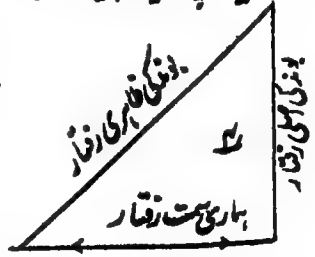
### Aberration of Light

اعتدال زمینی اور اعتدال خریفی ہیت کی اصطلاح میں اس وقت کو کہتے ہیں جبکہ زمین کے ہر حصہ میں دن اور رات برابر ہو جاتے ہیں۔ یہ سال میں دو دفعہ ۲۰ مایچ اور ۲۰ ستمبر کو ہوتے ہیں۔

میں وہاں نظر نہیں آتا یعنی اصول ریاضی و ہیت سے جہاں اسکی جگہ کی تعین کی جاتی ہے وہاں سے وہ ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اعتدال برسی میں زمین کی حرکت اُس سمت کے باطل مخالف ہوتی ہے جس میں اُسکی حرکت اعتدال غریبی میں ہوتی ہے یعنی سورج کے اپنے مدار پر وہ ان دونوں اعتدالین پر جب آتی ہے تو نسبتہ انکی حرکتوں کی سمت مختلف ہوتی ہے۔ اس شاہدہ سے وہ باتیں ثابت ہوئیں ایک یہ کہ زمین کی رفتار کا تعلق کچھ اس انحراف نور سے ضرور ہے اور ایک ہی ستارہ کو جب مختلف اعتدالیں سے دیکھا جائے تو چونکہ مختلف مقامات پر نظر آئے ہیں اس لئے سمت سے بھی تعلق ہے۔ (دیکھو شکل نمبر ۵)

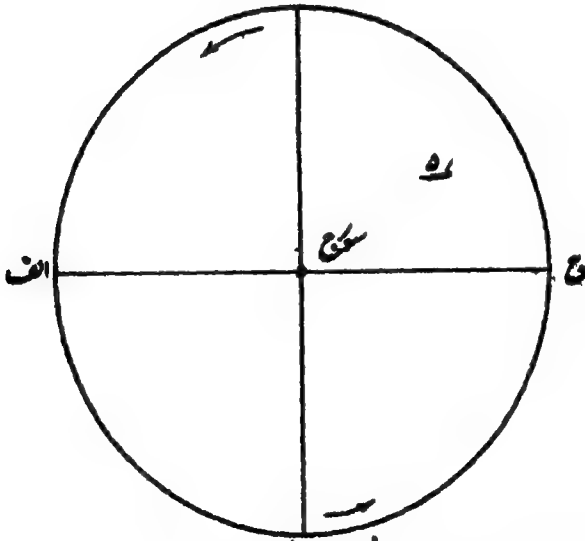
ہم اس نظریہ کو ذیل کی مثالوں اور شکلوں سے واضح کرتے ہیں اور پھر بتائیں گے کہ کس طرح انحراف نور سے روشنی کی رفتار کو معلوم کیا۔

فرض کیجئے بارش بالکل سیدھی ہو رہی ہے یعنی ہوا بالکل نہیں ہے اور بوندیں عمودی شکل میں زمین پر گر رہی ہیں۔ اگر ہم بارش میں کھڑے ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ بوندیں ہمارے سر پر برس رہی ہیں۔ اگر ہم کسی ایک سمت میں چلنے لگیں تو اب ہم دیکھیں گے کہ بارش سامنے سے ہو رہی ہے اور بوندیں ہم کو ترچھی پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے جیسے ہم اپنی رفتار کو بڑھائیں گے بوندوں کا ترچھا پن زیادہ ہوتا جائے گا پھر کبھی بعض وقت بالکل منہ کے سامنے کرنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بوندیں تو خود بذاتہ خواہ کسی رفتار سے گریں ترچھی نہیں ہوتیں بلکہ ہماری رفتار کی نسبت سے وہ ترچھی ہوتی جاتی ہیں۔ اگر ہم بوند کی رفتار اور اپنی رفتار کی نسبت سے خط کھینچ کر ایک مثلث بنالیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ زاویہ جو بوند کے اصلی راستہ اور ظاہری راستہ کے خطوط سے ہماری رفتار کی نسبت سے گھٹنا بڑھتا ہے۔ اس زاویہ کا نام رکھا ہے۔ علم مثلث کی رو سے  $\sin \theta = \frac{\text{ہماری رفتار}}{\text{بوند کی رفتار}}$



۵. Tangent - ہم کو شش تو میں ہمیشہ کہ تاہوں کے عام فہم زبان میں مضمون لکھوں مگر جہاں ریاضی کے اصول کے بغیر چارہ نہیں دہاں مجبوراً لکھنا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی بہت سے امور کو میں خود حل کر کے آسان ترین

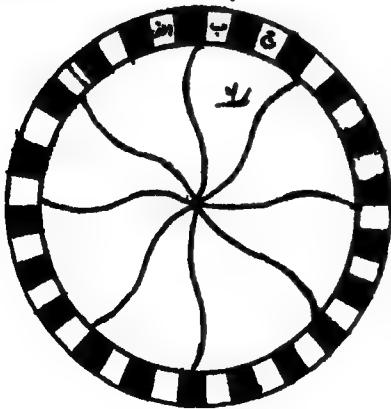
پہلے اور نسبت مستقل ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک ستارہ سے اسی طرح روشنی آرہی ہے۔ اور بجائے  
بادل کے کہ ستارہ ہے۔ اور بجائے بوند کے روشنی آرہی ہے۔ اور بجائے ہمارے چلنے کے زمین تقریباً اہل  
فی سکن کی رفتار سے اُس طرف جاری ہے تو ہم سادات بالا سے نسبت کو معلوم کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم کو اس  
طرح روشنی اور اپنی رفتار کا احساس نہیں ہوتا جس طرح بارش میں ہموں ہاتھ مگر یہاں ہم کو درمیںوں اور دیگر  
آلات نکل کی مدد سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ ستارہ جس جگہ دکھائی دینا چاہئے وہاں ہمیں نظر آتا۔ اور یہ  
ستارہ بھی ہماری زمین کے مدار کی سمت اور رفتار کی نسبت سے اپنی جگہ آسمان پر بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔



ستارہ کی اصل جگہ تو وہ ہے جو اوپر کی شکل میں ہے۔ مگر جب زمین الف پر ہوتی ہے تو ستارہ  
مذکورہ بالا جگہ سے نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ جگہ پر نظر آتا ہے جہاں زمین الف پر ہوتی ہے۔

جائے اپنی اصلی جگہ کے اُپر نظر آتا ہے۔ اور جب زمین ب پڑا جاتی ہے تو ستارہ ب پُر نظر آتا ہے وہی بڑا  
 وہ بھی اپنی اصلی جگہ نظر نہیں آتا۔ اگر نقساع عالم میں ہم کو محسوس ہو سکا کہ ہم اپنے مدار پر وہ اسیل نی سکند کی رفتار  
 سے چل رہے ہیں تو ہم کو روشنی بھی اسی طرح ترچھی آتی ہوئی نظر آتی جس طرح بارش ترچھی برستی ہوئی نظر آتی  
 مگر ہلکو چونکہ اپنی اصلی رفتار کا بھی زمین اپنے مدار پر آفتاب کے گرد گھومتی ہے احساس نہیں ہوتا اس لئے  
 ہم کو صرف ستارہ اصلی جگہ سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ رفتاروں کی نسبت اگر ہم عمود اور قاعدہ بنائیں  
 تو ہلکو معلوم ہو جائے گا کہ جواز ایہ بنتا ہے وہ تقریباً ۲۲ ثانیہ کا ہوتا ہے جس کی قیمت ہمیں معلوم ہے۔ لہذا  
 اس اصول سے روشنی کی رفتار جو معلوم کی وہ ایک لاکھ ۸ ہزار اسیل نی سکند ہوتی۔ جو پہلی رقم سے دُ  
 ہزار کم تھی۔ چونکہ یہ شبہات کی بنا پر تخمینہ لگایا گیا تھا۔ اب یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح تجربہ سے اسے  
 براہ راست ناپا جائے۔

اس کے لئے جو ب سے پہلی اور ناکام کوشش گھیلونے کی تھی۔ اُس سے یہ خیال ہوا کہ روشنی  
 کو اُسی طرح ناپ سکتے ہیں کہ اس کے راستہ کا کھٹنا اور بند کرنا فوراً ہو سکے اور یہ ناپ کی اختیار میں ہو۔ اور گرتی  
 تیز ہو کہ ایک مقررہ فاصلہ پر جب روشنی چلی جائے اور وہاں سے عکسی آئینہ پر لگ کر واپس آئے تو یہ راستہ  
 اُس کا بند ہو جائے۔ چنانچہ فریڈلے نے سب سے پہلے یہ کوشش کی اسکا اصول یہ تھا کہ روشنی کے منبع سے  
 ایک شعاع کو لیکر کچھ فاصلہ پر ڈالا۔ جہاں ایک عکسی شیشے نے اس شعاع کو واپس کر دیا۔ اب اس شعاع



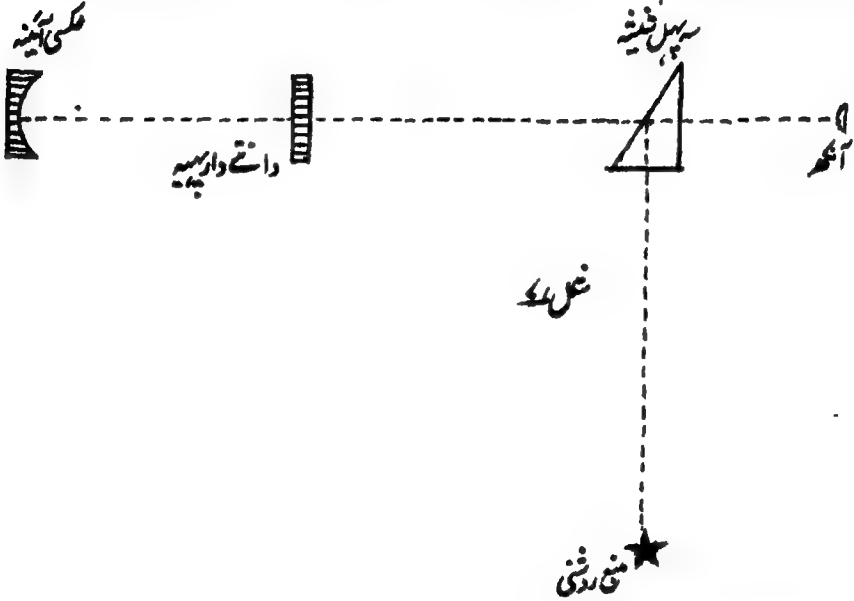
کو اس فاصلہ کا دو برابر راستہ طے کرنا پڑا جب یہ شعاع منبع کو  
 پہنچی تھی تو اس کے راستہ میں ایک تیز حرکت کرنیوالا دانت  
 دایرہ بیٹھا۔ دیکھو شکل ۶ اور اس بیٹے کے ایک دانت میں سے  
 یہ روشنی کی شعاع گزری تھی مگر بیٹہ یا کن ہو تو یہ روشنی کی  
 شعاع واپس آکر بھی اسی دانت میں سے آجائیگی مگر اس  
 بیٹہ کو اس سرعت سے حرکت دی گئی کہ روشنی کو اس نے

Freeze





ایک دانت میں سے نکلے تو دیا مگر جب یہ واپس آئی تو دانت میں چپکا تھا اور بجائے غلبہ کے ٹھوس پیسہ  
 سامنے آگیا تھا اگر روشنی کی رفتار اتنا ہی تیز ہوتی یعنی تمام فضا میں سے ہو کر یہ آنا آجاتی تو پیسہ  
 کو خواہ کتنی ہی تیز حرکت دیجاتی تو بھی یہ اُسی غالی دانت میں سے واپس آجاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔  
 اسی اصول کو مد نظر رکھ کر فروزنے تجربہ کیا۔ اُس کے بعد کورنوس (Cornus) توکا (Foreman)  
 وغیرہ آلات میں ترمیم کر کے زیادہ محنت کے ساتھ روشنی کی رفتار کو ناپا۔ مگر اصول تقریباً وہی تھا



پرس کی مدد سے جو تجربہ کیا گیا تو اُس میں دانت والے پیسہ سے مکسی شیشہ جہاں سے روشنی واپس آتی ہے  
 ۱۰.۳۹ میٹر (چودہ میل تقریباً) کے فاصلہ پر تھا۔ اور پیسہ میں ڈیڑھ سو دانت تھے۔ پیسہ کا قطر ۳ ملی میٹر  
 تھا۔ اور تقریباً ۹ سو چکر فی سکند کی رفتار سے گھوم سکتا تھا۔ اس رفتار سے ۱۳۵۰۰ دانت فی سکند  
 گزرتے تھے۔ اور چونکہ ایک دانت کی چوڑائی یونٹ میٹر سے بھی کچھ کم ہوتی تھی۔ اس لئے روشنی ایک  
 دانت کے بیچ میں سے گزر کر جب ۷.۸ میل طے کر کے واپس آتی تھی تو اُسے دایبہ پر بجائے دانت

لے ایک میٹر ایک گز اور ۳۴.۳۴ انچ کے برابر ہوتا ہے۔ کلومیٹر نزار میٹر کا ہونا ہے جو تقریباً ۶۲.۶ میل کے  
 برابر ہوتا ہے۔

ان اعداد میں زیادہ سے زیادہ میس کلو میٹر فی سکند کی غلطی کا احتمال ہے جو ایسے بڑے اعداد میں ضرور نظر انداز کر نیئے قابل ہے۔ اگر ان اعداد کو سیلوں میں منتقل کر لیں تو ۸۵۸۹۳۱ میل فی سکند ہے مگر علی العموم جب تک کہ خاص طور سے بہت ہی صحت سے اپنا منظور ہوا ایک لاکھ ۸۵ ہزار کی رقم بھی یاد رکھنے اور یہ معمولی حساب کے لئے کافی ہے۔ روشنی حرارت اور بجلی کی رفتار ایک ہی ہے جس طرح آواز کا واسطہ (Medium) ہوا ہے اسی طرح ہوا روشنی اور حرارت کا واسطہ اتھر کے ذریعہ ہے جو تمام فضا کے عالم میں سرگرم بھرا ہوا ہے جس طرح بغیر ہوا کے آواز کا سننا ناممکن ہے اسی طرح اگر اتھر نہ تو بجلی کی چمک نظر آنے نہ آفتاب کی روشنی نہ اس کی حرارت اور لاسلی کے آلات سب بیکار چلیں اور خبر رسانی وغیرہ ناممکن ہو۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ اتھر کے ذریعہ جو قوتیں منتقل ہوتی ہیں ان کی رفتار وہی ہے جو روشنی کی ہے۔

# عرب فرانسیسی ادبیات میں

## رولان کا گیت

(۳)

شارل راتوں رات فرانس کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، سیز کے قریب پہنچ کر فوج نے ٹراؤ ڈال دیا باب لوگ تھکے ماندے تھو سو گئے۔ شارل بھی سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ گینلون اسے پکڑنے کے زور سے ہلا رہا ہے اور پھر اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اکیس پہنچا ایک ریچھ نے اس کے سیدھے ہاتھ میں کاٹ کھایا، پھر ایک تیندوا اس پر حملہ کرتا ہے، پھر ایک خرگوش چھلانگیں مارتا آتا ہے اور ریچھ کا سیدھا کان فوج لیجا آتا ہے، شارل کے اس خواب کی کوئی تعبیر سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے دن شارل نے سرداروں سے پوچھا کہ عقب میں کسے رکھنا چاہئے جس طرح لڑائی میں حرا دل کی فوج اہمیت رکھتی ہے ویسے ہی واپسی پر عقب کی فوج اہمیت رکھتی ہے۔ دشمن سے اگرچہ صلح ہو گئی ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری چیز ہے۔ تنگ و تاریک دروں سے گزرنا خطروں سے خالی نہیں گینلون۔ شارل کی تقریر سن کے بحث سے بول اٹھا کہ اس کے لئے رولان سے زیادہ کوئی دوسرا سوز دل نہیں، رولان بہادری میں آپ اپنی نظیر ہے اور بہت سی لڑائیوں کا اسے تجربہ بھی ہے۔ پھر شارل نے پوچھا کہ ہرادل پر کون رہے؟ گینلون نے اوجھے والی ڈنارک کا نام پیش کیا۔

شارل نے گینلون کی دونوں تجویزیں منظور کر لیں، رولان خوش ہے، اسے اپنی جان خطروں میں ڈالنے میں حزا آتا ہے۔ اس نے سب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جب تک میری تلوار سلامت ہے اس وقت تک خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی، ہمارے آدمی گھوڑے، تلو اور سب سامان صحیح سلامت فرانس پہنچ جائیگا، اس کے بعد گینلون سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”تم نے جس لئے میرا نام پیش کیا ہے مجھے معلوم ہے، تم مجھے تمہارے کہ تمہاری طرح میرے ہاتھ سے بھی دستا نہ کر جائے گا۔ پھر شارل کے پاس جا کر

یہ کہنے لگا: ”مجھے اپنی کمان بطور نشانی مرحمت کیجئے، دنیا میں کوئی طاقت نہیں جو اسے میرے ہاتھ سے بچھین سکے جب تک جان میں جان باقی ہے اس کی بے عزتی نہیں ہونے دوں گا۔“

شارل - پیارے بھتیجے! میں اپنی آدمی فوج نہیں دیتا ہوں، یہ تمہاری سلامتی کے لئے ہے۔

رولان - اتنی فوج کا کیا کروں گا، خدا مجھے اس دنیا میں اور آخرت میں ذلت دے اگر میں اپنے بزرگوں کے نام پر اپنی آنے والی دوں، میں ہزار بہادر فرانسیسی میرے لئے بہت کافی ہیں۔ آپ بے کھٹکے رہئے جب تک میں زندہ ہوں آپ کو کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔

رولان اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے، اولیوئے اور اسکے دوسرے ساتھی ہمد کرتے ہیں کہ چاہے کچھ ہی ہو لیکن کبھی ایک دوسرے کو دعا نہیں دیں گے، رولان گوتے والی ہم کو میں بہادر ساتھ کر کے پہاڑی دروں کی گنجائش کے لئے بھیجتا ہے،

شارل کی باقی فوج فرانس واپس جا رہی ہے سب لوگ دشوار گزار گھاٹیوں اور دروں کو خوشی خوشی طے کر رہے ہیں، اگاسکون کی سرسبز شاہاب زمین دیکھ کے سب کو اپنی اپنی موروثی جاگیریں یاد آئیں سب کو اپنی بیٹیاں اور اپنی بیٹیاں یاد آنے لگیں سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ڈبڈبائے لگے۔ شارل کی طبیعت گری جا رہی ہے، وہ بہت رنجیدہ ہے۔ اسے اپنے بھتیجے رولان کو عقب میں چھوڑنے کا بہت رنج ہے۔ وہ بے دخل اپنے آنسو روک سکتا ہے۔ اس حالت میں دیکھ کر نواب ناظم نے پوچھا۔

ناظم - آپ کی طبیعت کیا کچھ نامسا ز ہے۔

شارل - مجھ سے کچھ نہ پوچھو جو تجھ سے سوال کرے مجھے ناخوش کرے گا لیکن میں اپنا دکھ چھپا بی نہیں

نوٹ (۱) جن لڑائی کی حالت میں جب رولان کے دوست اولیوئے نے کہا کہ دیکھو گینٹلون نے ہمیں دعا دی تو رولان نے کہا کہ اپنے ایک عزیز کے متعلق یہ رائے من کے بہت ناگوار معلوم ہوا حالانکہ یہاں وہ خود گینٹلون کی پست پر شکر کر رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ گیت جانوں کے محافظوں میں صدیوں محفوظ رہا۔ حافظ چاہے کتنا فوری ہو لیکن انسانی حافظہ ہے یہ اختلاف بیانی قابل معافی ہے۔

ہاں گینٹلون کے ہاتھوں فرانس تباہ ہو گیا۔ آج رات میں نے خواب میں دیکھا اگر گینٹلون میری تلوار ہے، تباہ اس کی تادیل اس کے سوا اور کیا ہے کہ میرے بھتیجے رولان پر جسے میں تنگ و تاریک دوروں میں چھوڑ آیا ہوں، کوئی مصیبت آنیوالی ہے۔ رولان کے بعد اس کی جگہ کون پر کرے گا اور انکی نوجہیں فرانس واپس جا رہی ہیں اور ہر پل میں بالکل دوسرا ہی نقشہ جم رہا ہے، انکی خوب آد بھگت ہو رہی ہے، سونا چاندی، ریشم کے کپڑے، گھوڑے، فخر، ادب اور شیر کے طور پر اسے دے جا رہے ہیں۔ کرسٹیل نے اہلین کے سارے صوبہ داروں کو اپنی اپنی کے ساتھ طلب کیا ہے، ماراگوس کے مقام پر چار لاکھ آدمی جمع ہیں سب سے اونچے میٹار پر علی اللہ علیہ وسلم اکابر نصب کیا گیا ہے اور ہر ایک اس کی پرستش کرتا ہے اور نیازیں ہے۔ اب عہد کر کے گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، اور فرانسیزیوں کے مقابلہ کو بھٹکتے ہیں، اکابر بھتیجا ایک فخر پر سوار ہے، چلتے وقت بادشاہ مارسل کی خدمت میں یوں عرض کرتا ہے۔

”میں نے بہت دنوں سے آپ کی خدمت کی ہے، اسکا بدلہ مجھے سوائے تکلیف کے اب در کچھ نہیں ملا، کتنی لڑائیاں میں نے جیتیں، لیکن کوئی انعام و اکرام نہیں۔ اب اس دفعہ رولان دار کرنے کے بدلے میں مجھے کہیں جاگیر عطا کیجئے، اگر رولان کے اپنی تلوار سے دو کمرے نہ کر دوں، نہیں! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میری مدد کریں تو اہلین کے پھانگوں سے فرانسیزیوں کو باہر دوں گا۔ شارل تھک ہار کے فرانس واپس چلا جائے گا۔ اور پھر میں ہمیشہ کے لئے لڑائی بھگڑے جیتی ہو جائے گی۔“

بادشاہ مارسل اپنے بھتیجے کو دستاوردیتا ہے، وہ دستانہ لیکریوں مخاطب ہوتا ہے۔

”جناب والا! آپ نے جو چیز مجھے عنایت کی ہے وہ انمول ہے۔ اب اپنے سرداروں میں کر چنے ہوئے میرے حوالہ کیجئے تاکہ شارل کے بارہ نوابوں کے مقابلہ میں انہیں لیجاؤں۔“

اکا بھائی۔ بھتیجے میں تیرے ساتھ چلتا ہوں، شارل کے عقب کی نوج کو مار لینا کوئی بڑی بات

ہے جو میں کہتا ہوں کہ چھوڑوں گا۔

دوسری طرف سے ملک بربر کا بادشاہ کو رسائی آتا ہے، ان سے بھی نوایوں کی طرح دون کی یعنی شروع کی ”ہم لوگ فرانسیسیوں کو ضرورت کی دینگے، ساری دنیا کا سونا بھی ہمیں ہمارے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتا۔

مارسل والئی بریجان اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑائے لارہا ہے، مارسل کے پاس آکے ایک دم سے گھوڑا روک کے یوں کہتا ہے ”اگر رولان میرے ہتے پڑتا تو اچھی طرح مزہ چکھاؤں گا۔

بالاگوے کا امیر بھی پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت خوش رو آدمی ہے، اپنے گھوڑے جب کاٹھی کس کے تن کر بیٹھتا ہے تو اس کے چہرے سے عجب وقار اور دیدہ بیکتا ہے۔ اسکی سوراہی کے دور دورے چرچے ہیں۔ اچھے اچھے اسکا لوہا مانے ہوئے ہیں، اگر یہ ہمارا ہم مذہب ہوتا تو کیا اچھا ہوتا!۔ یہ نوجوان بادشاہ مارسل کے قریب پیٹکریوں مخاطب ہوتا ہے۔

”میں اپنی جان پکسل کے روٹیو ڈجاتا ہوں، اگر رولان اور اڈیوے کو پالیا تو بس دونوں نہیں، فرانسیسیوں کے لئے یہ ماتم اور بے عزتی کا دن ہوگا، بادشاہ شامل اب بڑھا ہوا، اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا ہے، اس لڑائی کے بعد مہم چھوڑ دیکھا اور تھک کر لیمن ہمارے لئے چھوڑ جائے گا۔“

نوجوان کی یہ باتیں سن کے بادشاہ مارسل نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔

والئی مورین فنی خورہ ہے سارے اسپین میں اس سے بڑھکے کوئی عیار نہیں، بادشاہ مارسل کی خدمت میں یوں عرض کرتا ہے۔

”روسیو دین میں اپنا دستا نہ لئے ہوئے میں ہزار کی سرکاری کروں گا، اگر کہیں رولان

(۱) یہ بھی حیات کی یہ غفلت خواہش باطل دیسی ہے جیسے ہمارے ہندوستان کے بعض مسلمان ہاتھ کا مذہمی کی تعریف کرتے کرتے یہ کہنے لگتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان ہوتے تو کیا اچھا ہوتا۔

(۲) یہ وہ جگہ جہاں سرکار کا راز گرم ہوگا، فرانس اور اسپین کی سرحد پر کوہ پر نہیں کے دروں میں اس مقام کی یادگار تانک موجود ہے، سناہی بعض چٹانوں پر تلوار کی کات کے نشان موجود ہیں جنہیں رولان کی تلوار دریندال کے کات بتایا جاتا ہے، ایسی روایت سے زیادہ اضافہ سازی معلوم ہوتی ہے۔

سے آنا سامنا ہو گیا تو اس کے نیچے بونی کر ڈالوں گا، قسم کھا کے کہتا ہوں کہ شارل اپنی اس شکست کا عمر بزم کو تادم ہے گا۔

انہی میں ترمیس والی تاریکوں میں ان پہنچا ہے، یہ عیسائیوں کی جان کا بڑا دشمن ہے۔ ماریں کریں کہتا ہے، یہ ہمیں دنیا میں کسی بات کا ڈر نہیں جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم، بہ مقابلہ و اس کے سینٹ پٹر کے زیادہ عزیز ہیں، مگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں تو میدان ہمارے ہی ہا تھر ہے گا۔ روسیہ و چین میں رولان کے مقابلہ پہ جاؤں گا۔ اسے موت سے بچا نیوالی کوئی چیز نہیں، میری تلوار دیکھے کیسی اچھی اور لمبی ہے۔ دروندالی کے خلاف اسے عنقریب آزمائے، بہت جلدی سب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں کون بھاری رہا، اگر فرامیسی ہم سے نکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے، بڑے شارل کی قسمت میں اب بے غرتی اور رسوائی معلوم ہوتی ہے کبھی تاج پہن کے اب وہ نہیں نکلتے گا۔

اس کے بعد اسکریمز والی دائیترن، اسرسل کپٹن آتا ہے یہ خالص عرب ہے، والزن اس کی جاگیر ہے۔ یوں عرض کرتا ہے۔

”میں رولان کے کمنڈر کو بچا دکھانے آیا ہوں، اگر وہ میرے مقابلہ میں آیا تو اپنا سر و مٹھ پر سلامت نہیں بچائے گا۔ اولیوے جے اپنی سہمداری کا غرہ ہے، اس کی بھی خیریت نہیں، اس شکست کے بعد فرانس بجائیں بجائیں بے بس لگے گا، شارل کا کوئی باجگزار بھی نہیں رہے گا۔

... بوشاوا اسرسل استرگان اور استراموز کو دیکھ کے انکی طرف ہستائے بڑھا آئے اور بان سے

(۱) دروندالی رولان کی تلوار کا نام ہے۔  
 (۲) ناموں کا یہ رنگا بڑا ذخوار ہے، مسلمانوں کے جو نام اس گیت میں مذکور ہیں کبھی سننے میں نہیں آئے یا تو یہ ہوا ہے کہ تلفظ غلط ہو گئے ہوتے یا اصل نسخہ ہو گیا ہے یا یہ کہ یہ نام نہیں اور خود بجاؤں کی تعریف ہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے ناموں سے بہت کم آملی کے قریب کے مالک اکثر آشنا تھے اس لئے گیتوں میں اس بات کا ضرور ذکر نام لایا ہو گا کہ مسلمانوں کے نام پہلی رکے جائیں بعد میں تلفظ کی غرابی سے وہ کچھ کے کچھ ہو گئے ہونگے۔ شہرہوں کے ناموں کا بھی یہی حال ہے جن شہروں کے ناموں کا ذکر ہے آج وہ نہیں ملتے۔  
 (۳) یورپ میں ازمنہ دسل کی سلاطین کی کہانیوں میں دستانہ کو دھی اہمیت ہے چونکہ دستانہ کی کہانیوں میں میٹرا اٹھانیکو۔



کہتا ہے کہ تم میرے ان دستاویزوں کی عزت آبرو بچانے میں کوئی کوتاہی نہ کرنا۔

الترکان اور استرا مارز۔ ہم آپ کا حکم بجالانے کو ہر وقت تیار ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ رولان اور اولیوے دونوں کو قتل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔ ہماری تلواریں بڑی لمبی اور دھاردار ہیں۔ ہم انہیں گرم گرم خون سے لال کرینگے۔ فرہنسی ہلاک ہوں گے۔ شارل روتارہ جائیگا ہم اسے پکڑے گا آپ کے حوالہ کر دیں گے۔

مرگزار والی بیوی دوڑا ہوا آتا ہے۔ اس کی جاگیر کی حد کار میں سے جا کے لٹی ہے۔ یہ آدمی بڑا ہانکا ہے۔ اس کی طرح داری ایسی ہے کہ ساری عورتیں اس کے لئے مسر وختی ہیں۔ انیس کوئی ایسی نہیں جو اسے دیکھ کے سکرا نہ دیتی ہو، یہ سوار بھی بڑا اچھا ہے، بادشاہ کی خدمت میں یوں عرض کرتا کہ ”کوئی ڈر کی بات نہیں۔ روسیو وین رولان کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں گا۔ رولان اور اولیوے دونوں میرے ہاتھ سے سچی کے کہاں جاسکتے ہیں۔ شارل کے بارہوں نوابوں کی موت بھی میری ہی ہاتھ پر لگی ہے، میری تلوار ملاحظہ ہو! اسکی مٹھیا سونے کی ہے پریم کے امیر نے مجھے یہ تحفہ کے طور پر دی تھی۔ اسے فرانسیسیوں کے خون میں رنگین کروں گا۔ سال ختم ہونے سے پہلے پہلے فرانس پر ہمارا قبضہ ہو جائیگا۔ اور سنٹ ڈینس کی منڈی میں ہم جا کر اپنے بچھونے بچھانینگے۔

دوسری طرف سے شیرنیل والی مونیکر آتا ہے۔ یہ جس ملک کا رہنے والا ہے، کہتے ہیں وہاں سحرا کی روشنی ہوتی ہے، لیکہوں اگتے ہیں زمینہ برستا ہے، اس تک نہیں گرتی۔ کوئی پتھر نہیں جو کالانا ہو بعض کا تو خیال ہے کہ شیطان پورہ ہے، یہ بھی مارسل کے سامنے یوں ڈینگا رہا ہے مجھے جھوٹا کہنے گا اگر رولان کو نہ ماروں، اس کی دروغ لالی کو ٹکڑے ٹکڑے ذکر دوں تو نام نہیں

(۱) سینٹ ڈینس شہنشاہ ڈینیس کے عہد میں گول فرانک کو میلانی بنائیں غرض سے فرانس اسے تھے یہاں یہ شہید ہو چنانچہ انکی یادگاریں پیرس کا ایک بڑا چھانک پورٹ ڈینس آجک موجود ہے، سینٹ ڈینس پیرس کے قریب آج کل ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں سینٹ ڈینس کا مزار تھا۔ ازمنہ وسطیں غالباً اس جگہ کو آجکل سے زیادہ اہمیت ہو سینٹ ڈینس کی شہادت کی یاد میں واکتوبر کو تہوار منایا جاتا ہے۔

بارہوی جاگیردار بادشاہ ماریٹل کے قریب جمع ہو گئے انکے ساتھ ایک لاکھ آدمی ہیں جو لڑائی کے لئے بیتاب ہیں، انہیں جلدی ہے کہ اپنی تلواروں کو فرانسیسیوں کے خون میں نہلا لیں۔ سب تین تین زبانیں چبھتے ہیں، سردل پر لوہے کے خوں ہیں، دنیا کی فولا کی تلواریں ہیں، سب کے پاس مضبوط ڈھالیں ہیں اور والانس نیرے ہیں انکے جھنڈے بعض معید ہیں اور بعض لال، سب نے اپنے ٹوٹے ہوئے چھوڑ دیے ہیں اور تیز گھوڑوں پر سوار ہو کر تھار بند میں مصروف ہیں۔ مطلع صاف ہے سورج کی روشنی میں انکے اسلحہ دکھ رہے ہیں، ہزاروں ٹکٹے بچ رہے، فرانسیسی اس شور کو سن کر گھبرا جاتے ہیں اور آپس میں یوں گفتگو کرتے ہیں اولیوئے۔ دوستو! معلوم ہوتا ہے عرب تیار ہو کے ہم سے لڑنے آرہے ہیں، عنقریب ہیں شاید ان سے دو چار ہونا پڑے۔

رولان۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، ہمیں اپنے بادشاہ کی عزت کی خاطر بس ہیں رک جانا اور عربوں کا مقابلہ کرنا چاہو اپنے آقا کے لئے ہیں ہر صیبت برداشت کرنا چاہئے، اگر سردی کی خلیف پہنچ ہے اپنی کھالیں اور اپنے رومیں قربان کرنے میں کوئی دریغ نہیں! ہم میں ہر ایک اپنی اپنی مردانگی کے جوڑ کھائے گا اور ہمارے بعد کوئی ہمارے لئے بے عزتی کے گیت نہیں گائیگا! (۱) عرب گراہی میں ہیں اور ہم بچائی پر ہیں یقین کر دیں کہیں کوئی بزدلی کی مثال اپنے دوستوں کو نہ دوں گا

اولیوئے ایک اونچے نیلے چہرے پر کراہ اور ہر انداز نظر دوڑاتا ہے، اس نے عربوں کو اتے دیکھا اور رولان کو بلا کے یوں کہا۔

اولیوئے۔ دیکھو۔ اسپین کی سرحد سے زمینیں اور خود لاکھوں کی تعداد میں چکے نظر آ رہے ہیں معلوم

(۱) رولان کی تقریر ازمنہ سلی کے جیوڈل آئینل کو ظاہر کرتی ہے، باجگڈارا اپنی سرحدیں بیاٹنگ کر جان اور مذہب تک اپنے لارڈ کی خاطر قربان کر کے کوآ مادہ رہتا ہے۔ اکثر یہاں ہے کہ باجگڈار مع اپنی تمام رعیت کے اپنے جیوڈل لارڈ کا مذہب قبول کر لیتا تھا، خصوصاً کیتھولک پر لٹنٹ بھگروں کے زمانہ میں تو یہ حق قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔

(۲) رولان کے نزدیک اس سے بڑھ کر اور کوئی بے عزتی ممکن نہیں کہ وہ بیکے بعد لوگ بے عزتی کے گیت گائیں جس طرح آئینل رائے عامہ کا ظہار اخبارات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اسی طرح ازمنہ سلی میں معلوم ہوتا ہے گیت بنانا پرہیزگیزانہ کا بہترین طریقہ تھا اور ساتھ ہی کسی کو ابھی نیک نامی دینے کا سب سے زیادہ کارگر ذریعہ بھی یہی تھا۔

ہوئے گینٹلون دغا باز نے جس مصیبت میں ڈلوئے کا پورا سامان کر دیا ہے شاید اس نے ہم دونوں کا نام اسی لئے عقب میں رہنے کو پیش کیا تھا۔

رولان کہا تو کہا اب ایسی بات کہی مت کہنا، میرے عزیز گینٹلون کے متعلق ایک نفظ میرے سامنے نہ نہ نکالنا۔

اولیوئے دوسرے ساتھیوں سے یوں مخاطب ہوا ہے  
 "کبھی کسی انسان نے اتنا بڑا ہم غیر نہ دیکھا ہوگا۔ وہ ایک ملاکے کم کیا ہوں گے؟ اگر لڑائی ہوئی  
 یہ یاد رکھو دنیا میں ایسی لڑائی کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔ دوستو! خدا ہمیں اہتفال دے آخر وقت تک  
 اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے۔"

سب ملکر مردوہ ہے وہ جو پیٹھ دکھائے، ہم اس وقت تک دغا نہیں دیں گے جب تک  
 جان میں جان باقی ہے۔

اولیوئے دشمن قوی ہے، ہم تھوڑے ہیں دوست رولان اپنا زنگھا بجاؤ تاکہ شارل کو ہمارے خطرہ  
 خبر ہو جائے، وہ ابھی ہم سے بہت دور نہیں بیٹھا ہوگا۔

رولان میں اچھل تھوڑی ہوں جو ایک کیرول پیارے فرانس میں کیا میں اپنا نام ڈیٹا تھوڑی چاہتا  
 لڑائی کے وقت دیکھنا، اپنی دروندال کے ایسے ہاتھ نکالوں گا کہ اس کا سارا پھل ہونے کی ٹھیکہ  
 میں شرابور ہو جائیگا۔ ہمارے دشمنوں کی بدبختی انہیں ہمارے مقابلہ پر لارہی ہے میں تمہیں کہتا ہوں  
 سب کی موت انہیں یہاں لائی ہے۔

اولیوئے دیکھو میری سن لو اب بھی ہر سگھا بجاؤ تاکہ شارل ہماری مدد کو کچھ فوج بھیج دے۔  
 رولان۔ میرے خدا کو جو بات پسند نہیں آئیگی کہ میں اپنے ہونٹوں کے نام پر ہر گناہوں اور فرزانہ  
 بے آبروزی کا ذریعہ بنوں مجھے ہرگز نہ گوارا نہیں کہ کوئی آدمی یہ کہے کہ ہم نے عربوں سے ڈر  
 نہ نکھایا کیا۔

اولیوئے۔ میں نے اپنی آنکھ سے عربوں کی فوج دیکھی ہے، ساری وادیاں چوٹیاں اور میدان

پتے پڑے ہیں، ہماری فوج انکے مقابلہ میں کچھ نہیں لیکن میں بزدل نہیں ہوں، انہیں دیکھ کے میرا جوش اور بڑھ رہا ہے، یہ بات تو خدا کو نہ اس کے فرشتوں کو پسند آئے گی کہ میری وجہ سے فرانس کی بدنامی ہو جانے کو میں بے عزتی پر ترجیح دیتا ہوں لیکن دیکھو رولان! اب وہ ہمارے قریب آتے جا رہے ہیں۔ تم آخر اپنا ڈھکسا بجانے پر تیار نہوئے، اگر شارل آجاتا تو کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ دریا کے کنارے چھانچوں کی طرف ذرا اپنی فوج کو دیکھو اور انکی فوج کو دیکھو کچھ کہتا ہوں قابل رحم حالت ہو آج جو فوج شارل کے عقب کی فوج کہلاتی ہے، افسوس کہ کل وہ باقی نہیں رہے گی۔

رولان کیسی ہلکی ہلکی باتیں کر رہے ہو، نفیس ہے اس دل پر جو محبت سے خالی ہے، ہم استقلال سے لڑیں گے اور جیتیں گے۔

رولان جوش میں تیندوے کی طرح بھرا پڑتا ہے، جوش میں اگر اپنے ساتھیوں کے رد و ردیوں کو نظر کر رہا ہے۔

”دوستو! ہمارے بادشاہ نے ہمیں جن کے عقب کی فوج میں بھیجا ہے، شارل کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم میں سے کوئی بزدل نہیں، ہمیں اپنے آقا (سینئر) کی خاطر سب مصیبتیں بھیلنی پڑ گئی اور اپنا خون اور گوشت ضائع کرنا پڑے گا۔ عربوں کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے جوہر دکھاؤ۔ میں اپنی پیاری دنیوں کے اتھو دکھاؤں گا۔ اگر میں مر گیا تو لوگ میری تلوار کو دیکھ کے کہیں گے کہ ہاں! یہ بادشاہ شارل کے بے شریف باجگزار کی تلوار ہے۔“

مہاپادری تر بان ایک نیلے پرچہ کر یوں وعظ کرتا ہے۔

”اپنے آقا کے لئے ہمیں اپنی جانوں سے درمغ نہ کرنا چاہئے، مسیحی دین کے قیام کے لئے ہر زبانی پیچ ہے، عربوں کے فوجی دل تم دیکھ رہے ہو، لڑائی ضرور ہوگی، دو تہی تلواریں چلاؤ اور خدا سے رحم کی درخواست کرو، تمہاری رگوں کی سلامتی اور تمہارے گناہوں کی معافی کی میں بھی مان کر دل گا، یاد رکھو۔ اگر مردے تو شہید ہو گے جنت میں سب سے اونچی جگہیں تمہیں ملیں گی۔“

سب فرانسسی گھوڑوں سے اتر کے سجدہ کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

رولان نے ٹیلے پر چڑھ کے عربوں کی فوج کو دکھایا تو ڈنگ رہ گیا، اولیوے سے آکر کہنے لگا۔ قہقہے  
 تم نے ٹھیک تھا، گینٹوں نے سونے جاندی کے عوض ہماری جانیں بادشاہ مارسل کے ہاتھوں ہی ہیں  
 لیکن یہ سودا ایسا سہل نہیں، جو قوت تک ہمارے ہاتھوں میں تلواریں ہیں اس وقت ہم دشمن کو پہا  
 چٹکے نہیں دینگے۔ پھر جوش میں آکر سب ساتھیوں کی بہت افزائی ان لفظوں میں کرتا ہے "اگر خدا نے  
 چاہا تو شام سے پہلے پہلے ہم عربوں سے آنا مال غنیمت چھین لیں گے کہ فرانس کے کسی بادشاہ نے بھی  
 کبھی نہ دیکھا ہو گا۔"

اولیوے۔ میرا دل بات کرنے کو نہیں چاہتا۔ تم نے آخر میری ایک نہ مانی اور وہی کیا جو تمہارے من  
 میں آئی۔ تم نے زنگھانہ بجایا، شارل کو ہماری اس حالت کی باہل خبر نہیں، اسکا اسمیں کوئی قصہ نہیں  
 ہمارے ساتھیوں کا بھی کوئی تصور نہیں۔ وہ دیکھو! وہ آن پہنچے! چلو! چلو! بڑھو! مارو! میں خدا  
 کا واسطہ دیکھتے کہتا ہوں کہ دار کا بدلہ دار سے دو۔"

گھمان کی لڑائی شروع ہو گئی، مارسیل کا بھتیجا الیرد تھو فرانسیموں کو گالیاں دیتا ہوا گھوڑا  
 بڑھائے چلا آتا تھا کہ رولان نے روکا اور بڑھ کے اس زور کا وار کیا کہ اسکی ڈیال اور زرہ دونوں ٹکڑے  
 ٹکڑے ہو گئی، اپنی تلوار کے پھل کو الیرد ٹھکی چھاتی کے خون سے رنگین کر لیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو  
 چلا کے کہا کہ دیکھو! پہلا وار کیا بھر پور کیا ہے، ایرلو تھو کی لاش دھڑاک سے زمین پر گر پڑتی ہے رولان  
 پھر چلاتا ہے کہ دیکھو! "حق ہماری طرف ہے، دشمنوں کی طرف جھوٹ ہے۔"

بادشاہ مارسیل کا بھائی فالسارون نکل کے باہر آتا ہے اور اپنے بھتیجے کو زمین پر گرتا دیکھ کے  
 بدلہ لینے کو آگے بڑھتا ہے، فرہنسی فوج کے ایک سردار نے ایسی تلوار ماری کہ اسکا سترن ہوا لگ  
 جا پڑا، ملک بربکا بادشاہ کو رسامالی اپنے ساتھیوں کی بہت بہت افزائی کر رہا ہے، پادری تریبان  
 کو اس بربری بادشاہ سے جانی دشمنی ہے، اس نے بڑھ کے اسکا خاتمہ کر دیا۔"

(۱) سجدہ سے میری مراد پروسٹریٹن (Prostration) ہے یعنی گھٹنے کو زمین پر ٹیک کر گردن جھکا کے  
 تین زخماں پی چھاتی اور ماتھے پر صلیب کا نشان بنانا۔

رولان اپنے نیزہ سے پندرہ عرب سردار مار چکا ہے، اس کے ہاتھ میں بس نیزہ کا دستہ رہ گیا ہے، اب وہ اپنی تلوار دروندال میان سے باہر نکالتا ہے اور شیریل کی طرف بڑھتا ہے، ایسا وار کرتا ہے کہ شیریل کے پیچھے کے دھچکڑے ہوتے ہیں، انھوں تک چہرہ کٹ جاتا ہے، دوسرا وار بڑھ کے ہڈی پر کرتا تھا کہ وہ بھی گھوڑے پر سے گر گیا، لاش کو دیکھ کے رولان نے کہا۔

”غلام زادو! تم نے کیوں اپنے آپ کو بدبختی کے راستہ پر ڈالا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری کوئی مدد نہ کرے گا۔ بھلا تم جیسے بھگورے ہم سے لڑنے آئے ہو،“ اسی طرح رولان ہر طرف مارا دھاڑا پھر تاجر جد ہر نکل جاتا ہے صفیں کی صفیں الٹ دیتا ہے!

اولیوے تاشہ تھوڑی دیکھ رہا ہے وہ بھی اپنے کام میں مشغول ہے، اس کی تلوار کا دستہ ٹوٹ گیا ہے، ابھی ابھی اس نے ریزہ زور سے گور کو قتل کیا ہے، رولان اس سے کہتا ہے ”یار کیا کر رہے ہو تمہاری تلوار جس کا نام آٹھ لڑا تھا کیا ہوئی، اس کی ٹھیا سونے کی اور قبضہ بھور کا تھا۔“ اولیوے۔ اتنا استعمال کرنا پڑا کہ ختم ہو گئی۔

نواب گیران نے اپنے خیمہ گھوڑے سو ریل کی باگیں چھوڑ دی ہیں، عربوں کی صفیں الٹا پلا پڑ رہا ہے، دو برجھوں کو دشمنوں کے پیٹوں میں توڑ چکا ہے اور انہیں دو رخ پہنچا چکا ہے۔ رولان نے دور سے دیکھا اور اولیوے کو پکار کے کہا ”دیکھو! نواب گیران آج ہاتھ دکھا رہا ہے، واہ، واہ کیا وار کیا ہے اسے ہاتھ کہتے ہیں۔“

لڑائی گھمان کی ہو رہی ہے دونوں طرف سے جانیں ضائع ہو رہی ہیں، بہت سے فرانسیسی مر گئے، یہ اب کبھی اپنی ماؤں، بیٹیوں اور بیٹیوں کو نہ دیکھ سکیں گے، گینلوں نے کیسی دغا دی۔

پہاڑوں کے دوسری طرف فرانس کی سرزمین میں آندھی بادل کا ایک طوفان اٹھا ہے کہ خدا کی پناہ! زمین بھی بل رہی ہے، بہت سے تو کہہ رہے ہیں کہ شاید قیامت آتی والی ہے، دنیا ختم ہو رہی ہے انہیں معلوم نہیں یہ سب غاصر فطرت رولان کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

دشمن ایک لاکھ میں سے صرف دو ہزار رہ گئے ہیں، اتنے میں بادشاہ مارسل اپنی خاص فوج لیکر

مدد کو پہنچ جاتا ہے، اس کی فوج کے ۲۰ دستے ہیں، یہ دیکھ کے ردوان اپنے ساتھیوں کو یوں مخاطب کرتا ہے، "دوستو! در ساتھیو! گینلون نے ہماری سب کی موت کا پورا سامان کر دیا ہے، وہ ابھی تھوپی رہے گی، شامل ضرور سکا بد لایگا، اب ہمیں چاہئے جان فوڈ کے لڑیں، میں اپنی درو ندال کے ہاتھ نکالتا ہوں، ہم نے اتنی لڑائیاں جیتیں ہیں۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ بھاٹ ہماری بدنامی کے گیت فرما میں گائیں۔"

مارسیل کی فوج سے ایک عرب باز نکلتا ہے، اس کا نام اہم ہے، ساری فوج میں اس کی عیاری مشہور ہے، نہ یہ خدا سے ڈرتا ہے اور نہ کنواری کے بیٹے کو مانتا ہے، وہ کالا بھنگ پر قتل و غارت میں اسے مرزا آتے ہیں، لڑائی کو یہ ساری دنیا کے سونے پر ترجیح دیتا ہے کبھی کسی نے اسے ہتے سکرانے نہیں دیکھا لیکن یہ بڑا بہادر ہے، اسی وجہ سے بادشاہ مارسیل اس سے بڑی محبت کرتا ہے تربلین (پادری) اس نے دور ہی سے دیکھ کے کہہ دیا تھا کہ یہ آدمی بڑا سخت مرتد معلوم ہوتا ہے، اسے میں اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں گا۔ تربان کا گھوڑا تیزی میں بے مثل ہے، اس کا نام گردستانی ہے، ہونا کب کے بادشاہ کو قتل کر کے اس نے اس پر قبضہ کیا تھا، اس گھوڑے کی ٹانگیں سستی ہوئی رانیں اور پیٹھے چوڑے پچھے، کوکس نکلی ہوئی ہیں، دم سفید یا لیلی اور کان چھوٹے ہیں، گھوڑہوڑ میں کوئی گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا،

پادری تربان نے اس پھرتی سے اہم پر حملہ کیا کہ وہ دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا، اہم کی ڈھال پکھراج اور نیم اور دالوں سے جڑی ہوئی تھی، ایک شیطان نے وال بیتا کے مقام پر اس ڈھال کو

راگیت میں بیانے دیو کے ہر جگہ شیطان کا قحط استعمال کیا گیا ہے جرموں نے سیاست قبول کر کے اپنی انتہا تک بھی بدل دی ہے چنانچہ وہ اپنی کہانیاں میں سامی اتھالوجی کے مفصلہ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ مشرق میں ایرانیوں اور ہندوستانیوں نے سامی مذہب قبول کیا اور سامی اتھالوجی کے الفاظ مثلاً خبات وغیرہ بھی اپنے یہاں رائج کر لئے لیکن انکی اتھالوجی کا بنیادی پتھل آدین ہی رہا، چنانچہ ایران اور ہندوستان کی ساری کہانیوں سے یہ بات نکلا رہے، "الف میلہ جو ایرانی پتھ میں لکھی گئی، اسی بات کی تصدیق کرتی ہے۔۔۔"

ایرنگلاٹ کے مذکیا تھا اور امیر نے اس کو تحفہ کے طور پر بھیجا تھا، اس میں پہلے وار میں تم نہیں ہوا دوسری دفعہ ترپان نے نیزہ اسکے پیٹ پر آ رہا کر دیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

ماریل کی تازہ ملک سے فرانسیسیوں کے پیرا کھڑے تھے، رولان اور اولیوے برابر بہت فرائی کر رہے ہیں اور چلا چلا کے کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس دن کے بعد ہم نہیں رہیں گے لیکن ہمارا نام ہمیشہ ریگیا جنت کے دروازے ہمارے لئے کھلے ہوئے ہیں وہاں ہم معصوموں کی قربت کی لذت پائیں گے رولان نے اپنے مشہور شہسوار ارنجیلے اور ساتوں کو زمین پر گرتے دیکھ کر اولیوے سے کہا کہ ”دیکھو ایسے کیسے بہادر آج خاک میں مل رہے ہیں، بھلاب فرانس کو ایسے آدمی کہاں ملیں گے اولیوے خدا ہمیں انکا بدلہ لینے کی توفیق عطا کرے،

رولان۔ پیارا فرانس اجر ملے گا۔ اب بتاؤ کیا کریں؟۔  
اولیوے۔ میری سمجھ کچھ کام نہیں کرتی مجھے موت اس بات سے پسند ہے کہ میرے بعد لوگ میرا نام بے غمتی کے ساتھ لیں۔

رولان۔ کہو تو زنگھاجا دوں، شارل شاید ہماری مدد کو آجائے۔  
اولیوے۔ اب کر دے تو اپنے بزرگوں کے نام کو بٹہ لگاؤ گے اور ان کے ناموں پر ہمیشہ بدنامی کا داغ رہے گا جب میں نے تم کو کہا تھا تو تم نے زنگھاجا کیوں نہیں کیا، میں اب ہرگز اس بات کیلئے اپنی رضا مندی دینے کو تیار نہیں۔ اب اگر تم زنگھاجا کر دے تو بہادری میں شمار نہ ہوگا اگر شارل ہمارے ساتھ پہلے سے ہوتا تو اور بات تھی، اب تم مایا کر دے تو یاد رکھو میں اپنی دماغی کی قسم کھاتے کہنا ہوں کہ تم میری بہن ادد کے پہلوؤں میں کبھی نہیں بیٹ سکو گے۔

رولان۔ بھائی غصہ کیوں ہوتے ہو؟  
اولیوے۔ یہ سب تمہارا قصور ہے، دشمنانہ بہادری اور طاقت دو علیحدہ باتیں ہیں، اسی واسطے تھوڑے سے زیادہ ضروری ہے، فرانسیسیوں نے تمہاری طاقت کو جانیں ضائع کیں اب کبھی تم شارل کی خدمت نہ کر سکو گے اگر تم نے پہلے ہی میری بات مان لی ہوتی تو اس وقت شارل ہمارے ساتھ ہوتا اور ہم لڑائی جیت لیتے۔



# ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک

(۲)

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس نئی تحریک سے جو انقلاب پیدا ہوا وہ ایک تو ایک نئے تصورات و کائنات کی شکل میں اور دوسری طرف ایک جدید سیاسی و معاشی تنظیم کی صورت میں رونما ہوا۔ اگر نئی دنیا کے نظائر ملکوں پر سلسلہ وار نظر ڈالی جائے تو یہ جدید تصور کائنات و حیات مندرجہ ذیل واقعات میں نظر آئیگا۔

۱۔ انسان اور اس کی عقل کی قدر۔ ۲۔ زندگی اور دنیا کی طرف انسان کا رویہ۔ ۳۔ فرد اور جماعت کا تصور اور جدید ریاست اور نئی معیشت کے مظاہر میں ایک نئی سیاسی و معاشی تنظیم۔

## انسان اور اس کی عقل

قدیم ترکوں کا تصور کائنات، اسلامی تصور تھا، لیکن ختمانی ترکوں نے جب اسلام کو قبول کیا ہے تو یہ کافی تاریخی نشو و نما پا چکا تھا اور اپنی اصلی ہیئت سے بہت کچھ مٹ چکا تھا۔ اصل اسلام میں انسان کو کائنات میں سب سے بلند جگہ دی گئی تھی لیکن تاریخی نشو و نما کے دوران میں انسان کی یہ شانہ شوکت دم بچکی تھی قرآن میں دو بلند اور ابھارنے والے مقامات ہیں جہاں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم کے سامنے جہنمیت خلیفہ الہی سرسجدہ ہوں اور ایک دوسرے مقام پر ہے کہ آدم ہی کو علم اسماء عطا ہوا اور یہی اسماء علم رضی کی نشانیاں اعلان ہیں۔ اسی قسم کے مقامات قرآن میں متعدد ہیں۔ میں یہاں بس ایک اور مقام کا ذکر کر دوں جسے آج کل بہت نقل کیا جاتا ہے اور جیسا کہ ہم آگے چکر دیکھیں گے محمد عاکف نے اپنی معروف نظم ”انسان“ میں اسے استعمال کیا ہے یعنی وہ مقام جہاں انسان کو نجات دی گئی کہ خدا نے ارض و سما کی تمام چیزیں اس کی باجگذا رہنمائی ہیں۔

قدیم اسلام میں انسان کو کائنات میں جو تفوق دیا گیا تھا اور عالم کی جو حکمرانی عطا ہوئی تھی اس تاریخی اسلام نے بے پناہ بھلا دیا اس کی غلط تعبیریں کہیں قرآن کے تصور کائنات میں انسان کو جو بلند مرتبہ دیا گیا ہے

ایہ نہیں کہا جاسکتا اس کی تشکیل میں جماعتی اور سیاسی عناصر کا اثر ہے یا وہ نبی اسلام کے  
 نبی کا نتیجہ ہے لیکن اسے شک نہیں کہ بعد کو پھر اس پر سیاسی و جماعتی حالات نے اثر ڈالا، اس  
 کا اثر اسے بالکل مٹا ہی دیا۔ ایک طرف اسلامی ممالک کی جابرانہ حکومت تھی جس نے انسان کو  
 اتفاقات اور بادشاہوں کے مزاج کے لئے کھلونا بنا دیا اور سیاسی و معاشی انحصار کا دائمی  
 غدا اب اس کے سر ڈال دیا تھا اور دوسری طرف تمدن و تہذیب کے انحطاط نے اسے قدرت کی بے رحم  
 طاقتوں کا دست نگر کیا تھا۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی تھیں کہ عظمت بشری قرنی تخیل اس میں قائم رہ سکتا  
 ہاں خود ان نئے حالات میں قیام کی صلاحیت تھی۔ قدیم دنیا میں جب تک یہ قوت باقی تھی کہ اپنے اثر کو  
 قائم رکھ سکے اس وقت تک افراد کے لئے سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ رضا و تسلیم کے ساتھ اس  
 کے ساتھ ساتھ چلے چلیں لیکن جب پھر قوت آیا تو انسانیت نے اپنا حق حاصل کر نیکی کو شش کی۔  
 عثمانی سلطنت کے سیاسی انقلابات، مغربی تمدن سے تعلق اور یورپی انسانیت سے واقفیت ان سب  
 چیزوں نے ملکر ایسی مدد کی کہ مدت کا دبا ہوا سواد بھٹ پڑا۔

لیکن اس نئے تصور کائنات کی بنیاد خالص اسلامی تھی اور یہ قرآن کے صفحات میں اپنی ترجمانی  
 اور اپنی تصدیق کا متلاشی تھا۔ چنانچہ قرآن کے وہ مقامات اب یاد آنے لگے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے نبی شاعر کی  
 خطابت، وعظ، مدرسوں کی کتابیں سب کی سب اسی نئے تصور سے پر ہیں۔ میں یہاں صرف دو مثالیں  
 کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک توفیق فکر کی نظم ”آسمان سے زمین تک“ ہے جس میں وہ انسان کے تمدنی فتوحات  
 کی قصیدہ خوانی کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے۔

”..... تو تو بجائے خود ایک عالم ہے۔ فتوحات اور حسن کی دنیا۔ اے حیات، اے  
 روح عالم، اس کی عزت و عظمت کرو۔ انسان کی عزت و عظمت تمہارا فرض ہے کہ اس کی عزت کرو۔ یہی  
 خیر و شر کا خالق ہے۔ یہی خالق امکان!“

دوسرے محمد عارف کی نظم ”بلبل“

”انسان اپنی قدر نہیں پہچانتا۔ وہ تو فرشتوں تک سے بلند تر ہے۔ اس کے سینہ میں علم نہاں ہیں

اس کے قلب پر وجود باری اپنا پرتو ڈالتا ہے جہاں حیثیت سے دیکھو تو ایکنے ہی چیز ہیں لیکن کار سازی الہی کا مقصود یہی ہے۔ اور اسی لئے ابدی ہے اور بے قیود۔ قدرت اس کی خادمہ ہی۔ عالم اشیا، اس کا باجگزار ہے۔ دنیا اس کی مرضی اور اس کے آئین کی فرمانبردار ہے۔ یہ کائنات کا تاج ہے۔

انسان کی اس قدر کے ساتھ ساتھ اس کی عقل کی قدر بھی بڑھی ہے بلکہ اسی میں وہ بھی شامل ہے قرآن کے تصور میں انسان بھی دیگر مخلوق کی طرح ایک وجود ہے۔ جو چیز اسے ان پر فضل کرتی ہے اور کائنات سے متمایز اور خالق و مخلوق کی حد فاصل بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عقل اور ذہن ہے۔ انسانیت عقلیت کا نام ہے۔ انسان عقل ہے۔ اسلام جب انسان کو مخاطب کرتا ہے تو ایک قوت خیال اور عقل سے متصف ہستی کی طرح۔ قرآن اسے فکر و تدبیر کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن اور رسول اللہ دونوں انسان میں عقل و فکر کے یقین کو پہلے سے فرض کرتے ہیں (دیکھو احمد محمدی کی کتاب ”نونی و سلسلہ“)

عقل کی حقارت کا جذبہ تاریخی اسلام میں تصوفین کے یہاں پیدا ہوا۔ انہوں نے شریعت کی رسمی پابندیوں اور تسکین کی عقلیت کے خلاف علم بلند کیا اور دوسرے حلقوں میں عقل سے مراد یہ صلاحیت نہ رہی جس کا مطالبہ قرآن اور رسول نے کیا تھا کہ ہمیشہ از سر نو تخلیقی طور پر ایمان و عقیدہ کو تازہ رکھا جائے بلکہ اسے فرائض انسانی کی وجہ نہا کر چھوڑ دیا گیا۔ حکم اب یہ تھا کہ تسکین کے ذہنی کاغذاموں پر انسان کو عقیدہ رکھنا چاہئے چونکہ یہ عقل رکھتا ہے۔ اس کے فرائض متعین تھے اور ایمان پورا کرنا اس کے لئے ضروری تھا اور یہ بھی اس لئے کہ یہ عقل رکھتا ہے۔ ایمان کا اصلی اور ابتدائی اختصار جبر میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو دوبارہ انسانیت کا انکشاف ہوا اور اس نے اپنے حقوق اور سرفرازی حاصل کئے تو عقل کا بھی دن پھرے چنانچہ اس نئی تمدنی تحریک میں شروع سے آخر تک ایک عقلی روح دکھائی دیتی ہے اور جب مغرب سے تعلق پیدا ہوا تو۔ ترکوں کو زمانہ روشنیابی کے فلسفہ نے اپنی طرف کھینچا بلکہ عقل کی برتری پر شاہک ہوئی کہ مذہب کی مخالفت شروع ہو گئی لیکن اس کا جواب علمائے نظامہ کر کے دیا کہ اسلام میں نظام کا کس قدر بلند وجہ ہے۔ اس ضمن میں بھی میں فکر اور عاقل کی نقطہ نظر کا احاطہ نہ کر سکتا ہوں۔ مگر نے تو اپنی ایک نظم میں عقل پر ایمان رکھنے کو اساس ایمان قرار دیدیا ہے۔

## انسان اور کائنات

انسان میں اپنی خودی کا ذخیرہ ساتھ ہی ساتھ دنیا میں اس کی حیثیت کا احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن عہدِ ماضی نے دنیا کی طرف جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اس کی وجہ سے کچھ ترک اپنے اس دو گونہ احساس پر ذہنی اور روحانی پابندیاں عاید پاتے ہیں، اس لئے احساسِ نفس کے ساتھ رہبانیت، زندگی سے انکار اور بے چینی کیونکر نہہ سکتی ہے کہ یہ تو ذوقِ عمل سے اس سر تا پا پڑ ہے۔

قرآن اور ابتدائی اسلام کے تصور کے مطابق تو دنیا اور آخرت کے تخیل میں نہایت مناسب توازن تھا، اس میں صرف رہبانیت یا زندگی یا دنیا سے انکار کی کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ ذرا ان اقوال کو پڑھئے کہ خدا نے تجھ کو کچھ دیا ہے اس میں آخرت کو ڈھونڈ لیکن اس دنیا میں اپنے حصہ کو نہ بھول۔ ”تم میں سے سب سہ بہتر وہ نہیں ہے جو اپنی دنیا کو اپنی آخرت کی خاطر یا اپنی آخرت کو اپنی دنیا کی خاطر سمیٹ دے، بلکہ افضل وہ ہے جو دونوں کو ملا سکے کیونکہ دنیا آخرت کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور آدمی پر محض بوجھ نہیں۔“ ”دنیا کے لئے کام کرو، اس طرح کہ گویا ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے لئے کام کرو اس طرح کہ گویا کل مر جاؤ گے۔“ یہ زندگی کو قبول کرنے والا دلوں میں اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ جماعتی معاشی اور سیاسی حالات دنیا میں انسان کی فضیلت کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے ذوقِ عمل کے لئے کھلا میدان دیتے ہیں اور خصوصاً جب تک کہ انسان ایمان سے بے نیاز اعمال کے جوش میں اپنی ہمتی کو شائے رہتا ہے، ایسے زمانوں میں دنیا اور دنیا کی حیثیت معاش کی سی نہیں ہوتی لیکن جب سیدھے سادے ایمان کا عہد شباب گزر گیا، ذہنی دی ترقی رک گئی، اور عام تہذیب و تمدن کا زوال اپنے تمام نتائج کے ساتھ رونما ہونے لگا تو اس میں بھی تغیر پیدا ہوا جس نے یہ ہمت، ایمانیت، اور فلاحی فلسفہ کی صورت میں اپنے اظہار میں نکالیں۔ عربی اسلامی سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ اسلامی دنیا کی توحیدِ عقائد و شریعت مابین ہی فرقے اور فتنی مذاہب پیدا ہو گئے۔ غرض ہر طرف تباہی و انتشار کی شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ اسلامی حکومت کی شکل بدلتا رہا، استبداد قائم ہوا اور جبر و قوت کی حکومت چاروں طرف قائم ہو گئی، بیخیزوں نے وہ زمین تیار کی جس میں ایک سخی اور بھول تصور کائنات کا پورا ہونا، پورا کہ جبر ہو گیا۔

ترک جب میدان میں آئے، اور یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کو انہوں نے پھر قائم کیا تو یہ حالات تاریخی حقائق بن چکے تھے اور کم سے کم علی دنیا میں ان سے دو چار ہونا لازمی تھا۔ شروع شروع میں تو اس نوجوان اور حقیقت پسند قوم کے جذبہ حیات اور ذوق عمل نے ان چیزوں کو دیا یا لیکن آگے چلکر یہاں بھی وہی صورت حال پیدا ہو گئی یعنی زندگی سے نفرت دنیا کی حقارت اور تقدیر پرستی نے یہاں بھی خزانہ شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں نئی تمدنی تحریک نے پھر انقلاب پیدا کیا ہے جو نہایت شدید انہیات زندگی اس دنیا کے تخیل اور ارتقا کے تصور کی شکل میں رونما ہو رہا ہے۔

انہیات زندگی کے اس جذبہ کا سب سے پہلا قوی اظہار زماں کمال کی تصانیف میں ملتا ہے۔ مشہور مضمون ”سعی“ میں اور بے شمار دوسرے مواقع پر اس نے اس ناپائیدار اور فانی دنیا کی حقارت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ عبد الحمید نے اپنی تصانیف اور اپنی شخصیت میں اس نئے تصور کائنات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ مثال کے طور پر میں اس کی نظم ”برو عطر برو عطر“ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے مطالب کی نوجوان شعراء نے تقریباً حرف بحرف نقل کی ہے حتیٰ کہ توفیق فکر کے کلام میں بھی جس کو یاس مشرب سمجھا جاتا ہے اس ذہنی انقلاب کا اظہار موجود ہے۔ ضیا کوک اب کے ہاں تو یہ چیز باطل ہی بدیہی ہے اور یہی حال امیں کا ہے جس نے اس خیال کو متعدد نظموں میں ظاہر کیا ہے، وہ اپنی ایک نظم ”اُس دن“ میں اُس مبارک گیت کا آہ ہے جب اُس کی قوی امیدیں برآئیں گی۔ وہ دن جب ”انسان خداں ہوگا، زمین خداں ہوگی، آسمان و مہند خداں ہوں گے“ اور اس کا ہر قوی بھائی پکاراٹھے گا۔ ”میں دنیا سے محبت کرتا ہوں، میں زندگی سے محبت کرتا ہوں“، عارف نے اسی مضمون کو خالص اسلامی رنگ کی نظموں میں نہایت دلغریب الفاظ سے ادا کیا ہے میں اس موقع پر اس کی کتاب ”صنعت“ کے چوتھے حصے اور پانچویں حصے کی پانچویں اور چھٹی نظم کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

انہیات عالم کے ساتھ دنیا داری کا تصور بھی ملا ہوا ہے۔ کچھ لوگ اس کی کنٹریشن غیر شعوری طور پر کے ساتھ ہے اور کچھ شعوری اور واضح الفاظ میں اس کا اظہار ہو چکا ہے جیسا کہ تذکرہ بالا ظاہر ظاہر ہو رہا ہے، عارف یک اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اور وہ صنعت کے پانچویں حصے کی چھٹی نظم

خیال اُس کے بہاں بھی قوت کے ساتھ موجود ہے۔ امین کی نظم ایک نوجوان کے نام۔ اس سلسلہ میں بہت قابل لحاظ ہے۔ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے ”قدرت کی عظمت کو پہچان اور عرصہ عالم کو تنگ نہ بنا، اپنی محبوب کے لئے ہمیں ایک گھونٹ لانا ہے اور فرشتوں کی طلب نہ کر، تو مطن زمین کی اولاد ہے اسے نہ بھول، سلیمان نطیف نے جو عظمت جب وطن کے موضوع پر کہے ہیں اُن میں بھی اس مضمون کے مقامات ملتے ہیں تاہم اب تک دنیا داری کے اس تحیل کو مکمل شکل میں نشو و نما نصیب نہیں ہوئی اور اس کے اسباب ہر شخص خود آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اس انقلاب ذہنی کا تیسرا عنصر یعنی ارتقاء کا تصور اسلام اور ترکوں کے تصور کائنات میں بالکل نئی چیز ہے۔ پرانے خیال کے مطابق خدا کی مخلوق دنیا پوری اور مکمل ہے، جدید مضمون میں ترقی کا وہاں امکان نہیں ہے۔ یہاں ترقی صرف یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مدارج پر سے حاصل کرنے جائیں جنہیں افراد اور ریاستیں وغیرہ عہد ماضی میں حاصل کر چکی ہیں چیزیں وجود میں آتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں اور یہی دنیا کی زندگی کا وہ دائرہ ہے جو قدیم ریاضی و حکمت اور کائناتی تصور عالم کے مطابق ہے لیکن دنیا کی تعبیر نو نے ان خیالات کو بھی باہل کر دیا ہے اور یہ اس طرح کہ زندگی کی پرانی شکلوں کا وجود ختم ہو گیا اور لوگ ماضی کی پابندیوں کو چھوڑ چکے۔ اس صورت حال نے ایسی موافق تضاد پیدا کر دی کہ مغرب کے تصور ارتقاء کو نہایت جوش کے ساتھ شرف قبولیت بخشا گیا۔ چنانچہ آج ترکوں کی تمام ذہنی زندگی اس تصور کے زیر اثر ہے حتیٰ کہ مذہبی تصانیف میں بھی اس کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا گیا ہے شعراء میں سے صرف دد کی مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ فکرت اور عاکف نے تو اپنے کلام میں سلسلہ ارتقاء کو مذہبی حیثیت دیدی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”قدرت میں سلسلہ ارتقاء دائمی ہے اور اس تکمیل کا عقیدہ توریت، انجیل اور قرآن سب کے میرے اندر پیدا ہوتا ہے، عاکف کی مذکورہ بالا ”انسان“ ذہن بشری کی آرزوئے ترقی و ارتقاء کا سب سے دلغریب اظہار ہے لیکن فکرت ان ارتقاء ساری دنیا کا قانون ہے اور عاکف نے اپنی نظم ”انسان“ میں اسے صرف نبی نوح کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور یہ بات عاکف کی خصوصیات میں سے کیونکہ وہ اس نظم میں تعلیم قرآن

سے وابستہ ہر قدرت کو اعراض انسانی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بتلا دینی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص ان مصنفوں کی تصانیف کو پڑھو تو اس پر یہ اثر ہونا لازمی ہے کہ زندگی اور دنیا کا جو نیا تصور ہم نے اور بیان کیا ہے، ان کے جذبات و خیالات میں دامن اس کے پابند نہیں ہیں اور سب سے زیادہ یہ بات فکر و عاقل کے ہاں ملے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تغیر ابھی باطل نیا ہے اور عہد ماضی سے تمام رشتے اب تک نہیں کٹے ہیں بلکہ عاقل کا معاملہ تو یوں ہے کہ اثر و مقبولیت حاصل ہونے کے بعد یہ قدامت پسندی پر غالب آیا ہے اور نئے تصورات کا حامل بننا اسی وجہ سے اس کی شاعری کے ایک حصہ میں تمام و کمال عہد ماضی کی ذہنیت پائی جاتی ہے فکر کا معاملہ اس سے باطل جدا ہے یہ اصل میں مغرب پرست ہے اور اسی وجہ سے اس کے تصور عالم میں اعتدال چھپد گیاں ہیں۔ ان باتوں کی طرف اشارہ اس لئے کیا گیا ہے کہ انہیں نظر انداز کر کے ان شعرا کے ساتھ ادبی انصاف نہیں کیا جاسکتا

ذوقِ عمل

ذہنیت کے جس تغیر کا ذکر ہم پچھلے دو عنوانات کے تحت میں کر چکے ہیں وہ صرف قدیم ذہنیت ہی کا تھا نہیں بلکہ اس کے نتائج خصوصاً تقدیر پرستی کا بھی دشمن ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اسلام تقدیر پرستی کا مذہب ہے تو اس میں سب اسی قدر حقیقت ہوگی جتنی اس قول میں کہ اسلام محض عمل اور قانون کا مذہب ہے اس تقدیر پرستی کی جڑیں بھی جو قوت ارادی کو مہر و محو کر کے بے عمل پیدا کر دیتی ہے، اسلامی اور ترکی دور ماضی کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی حالات اور تمام تمدنی کیفیات میں ملتی ہیں۔

”مہر خند بختی علم الاخلاق کے اصول نیک اعمال کا مطالبہ کرتے ہیں تاہم انکی ساری افتادہ ہی و کہ آخر میں اگر تان اسی پر ٹوٹتی ہے کہ دنیا کی عام رفتار کے دور میں آدمی بلا شرط اپنے کو تسلیم و رضا کا خوگر بنائے۔۔۔۔۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ قوموں کی سیاسی آزادی مقدونی اور اس کے بعد یونانی حکومت کے ہاتھوں خون پور ہی نمی بلکہ خود زخمی فاتح سلطنت کے استبداد کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ جبکہ جبر و قوت ایک زندہ دیو کی طرح ہر قابل ذکر خود مختار پرستی کو نیست و نابود کئے دے رہی تھی

ایسے زمانہ میں ہر اُس شخص کے لئے جس نے اپنا مقصد شخصی اور انفرادی غلامی سے کچھ بھی بلند کر رکھا ہو سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ وہ دنیا کے چپے ہوئے کاروبار میں تقدیر پرست تسلیم کی خود ڈالے کہ اس پر ایک یا بہت سی توہین بھی کوئی قابل ذکر اثر ڈالتی نظر نہ آتی تھیں، مذہب و راقی نے اگر تقدیر پرستی کو ایک عقیدہ بنا دیا تو بس اپنے عہد کے اسی رجحان کی پابندی کی "سلسلہ (سہ ماہی Z) کے یہ الفاظ جو اُس نے رواقی مذہب کے متعلق لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بالکل تاریخ اسلام کو پیش نظر رکھ کر تحریر کئے گئے۔ اس قول کی صحت کو تسلیم کر نیکیے لئے بس اتنا ضروری ہے کہ اُدی اسلامی حاکم میں خود موجودہ حالات کو پیش نظر کر لے۔ افراد کی سیاسی آزادی اُن سے نہیں چھینی گئی تھی بلکہ انکا سارا مادی اور ذہنی وجود اتفاقات کے بنے بگڑنے، ٹھکرانوں اور بلا دستوں کے چشم کرم اور غیبت پر منحصر تھا اور پھر خود حضرات بالادست ان افراد کی نظروں میں تقدیر کے کھلونوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ ہر شخص کے لئے ایک نہایت تنگ اور غیر متیقن دائرہ زندگی تھا جس میں وہ مقید ہوتا اور کبھی کبھی تو یہ بھی نصیب نہ ہوتا تھا، نکل تمدن کی حالت ہی ایسی تھی کہ آزاد اور غیر محدود ذوق عمل کے لئے کوئی میدان کار نہ تھا، پھر کسی طاقت ہوگی کہ ایسے ناموافق حالات میں ذوق عمل اور کام کرنے کی خوشی اور خواہش پیدا ہو، یہ ضرور ہے کہ اسلامی تقدیر پرستی کے اسباب محض ان ہی حالات کو قرار دینا بہت یکطرفہ بات ہوگی اور تاریخی اعتبار سے مادہ پرستی کے مرادف، اور دوسرے مذاہب کی طرح اسلام نے بھی اپنے پیروں کو خدا پر بھروسہ کرنے اور رخصانے الہی میں اپنی مرضی کو مٹا دینے کی تعلیم دی ہے، لیکن منکوحہ بالا حالات میں یہ بات کہ اور تمام اخلاقی اور مذہبی مطالبات کو بھلا دے گئے اور یہی اپنے ارادہ کو بڑھا کر اپنے کی تعلیم پیش پیش ہو گئی۔ البتہ انہی حالات کا نتیجہ ہے۔ نئی تمدنی تحریک نے یہاں انقلاب ہی پیدا نہیں کیا بلکہ عہد ماضی کے اس بات کو یک قلم بند کر دیا، قدیم استبدادی حکومت تباہ کر دی گئی اور سیاسی آزادی از سر نو قائم ہوئی۔ اس سلسلہ میں بھی مغربی تمدن کے تعلق نے بہت سے نئے خیالات اور بہت سی توہینیں استعار دیں۔

لوگ اب ترکوں اور اسلام کے پرانے زمانوں کو یاد کرنے لگے یعنی اُس عہد ماضی کو جو دہلاؤ انگیز واقعات سے پر ہے۔ اب اسلام کے وہ اصول بھی سامنے آنے لگے جن میں عمل کا مطالبہ ہے، ذہنی سیاسی



اور جامع شریں جس طرح پوری ہوئیں تو اس نے تصور حیات و کائنات کا اخلاقی نتیجہ بھی لازمی طور پر نکالا گیا ان میں ذوقِ عمل نے اب بطور ذہنی تصور کے بھی جڑ بکڑ لی۔ لوگوں کی سمجھ میں اب یہ آیا کہ انسان کو فطرت پر جو فضیلت عطا کی گئی ہے اُس پر اُس کو اترانا نہ چاہئے، نہ اسکی وجہ سے دنیا سے نفرت کرنی چاہئے، فطرت پر اُس کی حکومت کا جو ذکر ہے وہ ابھی موجود نہیں ہے بلکہ وجود میں لائی جانی چاہئے کیونکہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى۔

اس سلسلہ میں بھی ترکی شاعری نے اپنے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا اور اُس کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے تقدیر پرستی اور غلط معنوں میں ہمارے بھروسہ کر نیکی مخالفت کو اپنا سب سے پہلا مقصد قرار دیا اور دوسرا مقصد یا پوسی اور کاہلی کے خلاف جہاد۔ یہاں بھی ہمیں سر شکر دی نامی کمال دکھائی دیتا ہے، وہ مضبوط ارادوں والا علی آدمی جس نے اپنے خیالات کی تمام قوت اس کاہلی اور خدا پر اس غلط بھروسے کے خلاف صرف کر دی اور محنت و عمل کے پیغام کی تبلیغ کی۔ عائد، فکر، امین اور عہد جدید کے تقریباً سب شعرائے اُس کی پیروی کی۔ لیکن اس ضمن میں شاعری کا سب سے عظیم اُشان کا زاہد عارف کا ہے ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور اُس کے وجہ بھی بتلا چکے ہیں کہ عارف کی مثال ہماری تحریک کے لئے نمونہ ہے۔ اسی وجہ سے میں یہاں اُسکی نظموں کے متعلق تفصیلی تبانیوں، ”صفات“ کے پہلے باب میں تو ہم عارف کو ہا حال میں باتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات سے اور اپنے قدیم ذہنی ماحول سے برسرِ پیکار ہے اس حصہ کی نظموں پر علیحدہ علیحدہ تاریخیں نہیں پڑی ہیں اس لئے صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ اُس کے خیالات میں کیسے کیسے نشو و نما ہوئی ہے اور کب کب تغیرات لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ پہلا باب دو عالموں کے تصادم کا منظر پیش کرتا ہے، اس کی پانچویں نظم ”قدم نہ رکے“ اس عارف کو ظاہر کرتی ہے جو باقی چار حصوں میں ہمارے سامنے آتا ہے، وہ آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کے شور و غوغا کو سنتا ہے اور اپنی قوم کو اسکی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے، ”انسانیت“ فوج فوج مستقبل کے مملکت میں داخل ہو رہی ہے جو انسانیت کی اس تبرک و حارسے وابستہ نہ ہوگا وہ کھو یا جائیگا۔ ”ماضی کی یاد میں نہ ابھو، یہ نہایت تکلیف دہ جھانک نہیں، آگے بڑھو، مستقبل تمام فطروں سے آزاد ہے اور اُس کی زمین کسی مٹھ سے

ہے اور کسی پاک۔۔۔ تماشائے ہستی کو دیکھو۔ اس کا ایک ذرہ بھی سیکا نہیں۔۔۔۔۔ اس محنت و سعی دوام اور اس لامتناہی ترقی سے کوئی معز نہیں، زمین کام کر رہی ہے، آسمان کام کر رہے ہیں، اگر تھک جو شرم نہیں آتی تو یونہی بیٹھا رہے۔ اس سلسلہ میں ماکف کو ایک نیا علم حاصل ہوا جس کو اُس نے بعد میں ترقی دی ہے۔ وہ سر تا پا انسان ہے ماسکا ایمان نہایت مضبوط اور پختہ ہے اور اُس کے عقیدہ میں ایک عجیب سادگی اور صفائی ہے لیکن اس پر بھی اسلامی دنیا کے مصائب اور ترکوں کے تکلیف دہ حالات کا اثر ہے اور نیا وجود اپنے عقیدہ کے یہ محسوس کرتا ہے کہ خود اسے اور اس کی اسلامی دنیا کو خدا نے چھوڑ دیا ہے اس تکلیف دہ خیال سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کا علاج یہ اس علم میں دھونڈتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی تیسرے باب کی پہلی نظم میں محنت و سعی کا نیا قانون پیش کرتا ہے۔ نظم کے شروع میں تو تسلیم اور رضائے الہی پر قناعت کے جذبات کا اظہار ہے لیکن آگے چل کر یہ ایک اسلامی اور ترکی دنیا کے تکلیف دہ حالات کا ذکر کرتا ہے اور خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ تیری مدد کہاں ہے۔ اس پر اس کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں جنہیں سن کر یہ خاموش ہو جاتا ہے ”اے نادان! خاموش دنیا کی گردش کبھی نہیں کھیتی تو کیا سمجھتا ہے کیا قوانین عالم شکوہ اور شکایت سے معطل ہو سکتے ہیں؟ مدد چاہتا ہے تو اپنے آپ سے مدد طلب کر، جا اور خود اپنی کوشش سے ظلم اور نا انصافی کو دور کر اور دیکھ دنیا کس قدر عزت کے ساتھ اس قانون سعی کی اطاعت کرتی ہے۔“

ماکف کے خیالات یہ ہیں نہیں رک جلتے بلکہ ”صفحات“ کے چوتھے باب میں جہاں اُس کا تخیل انتہائی مبالغہ پر پہنچ گیا ہے وہ دنیا کا ایک تصور سعی و عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے اور محنت کی فرضیت کو ثابت کرتا ہے۔ اس بات میں اُس نے اس دنیا کو عجیب ترالے انداز سے پیش کیا ہے ہر چیز مصروف عمل ہے، دنیا، زمان و مکان، یہ سب کیا ہیں، سعی و عمل ہے۔ عدم کا خود وجود نہیں عمل ہے۔ ماکف کمزوروں کی بے عمل شکوہ و شکایت کو بیزار ہے، اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ہے ”کیا تجھے یہی توقع تھی؟“ اور جو رسالہ امیل الرشاد میں ”شانع ہوئی ہے۔ وہ اس شکوہ و شکایت کو بہت کچھ برا بھلا کہتا ہے اور جاتا ہے کہ روہنے پیٹے سے کچھ حاصل نہیں، عمل کرو عمل۔“

# عنفوانِ شباب کی مجموعی نفسی سیرت

یہ مضمون اہل میں پروفیسر ایڈورڈ اشورڈرگرافٹاؤفٹھ و تعلیمات جامعہ برلن کی معرکہ آرا مکتب  
Psychologie der Jugendalter کے ایک باب  
 کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ مور ہا ہے اور اس سال کے آخر تک انشاء اللہ اردو کا دیکھا  
 جامعہ میکی طرف سے شائع ہو جائے گا۔

اگر ہم لفظ "سیرت" سے سادہ سادہ معنی میں "مذہبی زندگی" مراد لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عنفوانِ  
 شباب کی مجموعی سیرت یہ ہے کہ انسان کوئی سیرت نہ رکھتا ہو۔ واقعی عمر کے اس حصہ میں اور تمام حصوں سے  
 زیادہ ایک عمل تغیر، ایک زائد انقلاب کی شان پائی جاتی ہے جس میں کسی مستقل حالت کا تعین نہیں کیا  
 اگر نفسی پہلو سے دیکھا جائے تو یہ عمل کم سے کم موجودہ زمانہ میں جتنا ہم سمجھتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ طویل و  
 سال درماہ کی کوئی تعداد جس کا عام اطلاق ہو سکے نہیں بتائی جاسکتی۔ البتہ ایک مثال قائم کرنے کے لئے ہم  
 شمال جرمنی کے بڑے شہروں کی تعلیم یافتہ آبادی میں ارتقاء نفسی کا زمانہ لڑکیوں کے لئے ۱۲ سے  
 لیکر ۱۹ برس کی عمر تک اور لڑکوں کے لئے ۱۱ سے لیکر ۲۲ برس کی عمر تک مقرر کرتے ہیں۔

چونکہ ہم نفسی زندگی کے جزئیات کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ اس بات پر مجبور ہیں کہ انہیں کل کی نسبت ہو  
 دیکھیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم ابتدا ہی میں عہد شباب کے مجموعی سیرت کو بیان کر دیں۔ اس بیان کا مقصد  
 یہ ہے کہ ہم نظام نفسی میں اُس نقطہ کو تلاش کریں جہاں سے عہد شباب کی واردات اور اعمال کی خصوصیات  
 دیکھی اور سمجھی جاسکیں۔ اس غرض کے لئے یہ مفید ہو گا کہ ہم ابتدا میں عہد طفلی کے مجموعی طرز زندگی اور عنفوان  
 شباب کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دیں۔

البتہ جہاں ہم چاہتے ہیں کہ کچھ مجموعی طرز زندگی کو معروف سمجھ کر نظر انداز کر جائیں۔ وہاں موجود

(۱) ہندوستان میں ۱۲ سے ۱۸ برس تک سمجھا جاتا ہے۔

(۲) ہندوستان میں ۱۳ سے ۲۱ برس تک سمجھا جاتا ہے۔

علم النفس ہمارى بالکل مدد نہيں کيں تاوقتیکہ یہ مومنوع اس سے بھی زيادہ غير معروف ہر جس سے ہم اس کتاب میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ چند سرسری طور پر کھینچے ہوئے خطوط میں نفيات طفلى کا ایک خاکہ پیش کر دیں۔

ہمیں رفتہ رفتہ بچہ کے تصور و خیال، احساس اور ارادہ کے متعلق جزدی معلومات بڑھانے سے اس وقت تک بہت کم فائدہ ہوتا ہے جب تک ان مظاہر پر زندہ اور نامی کل یعنی بچہ کی مجموعی زندگی کی نسبت سے غور کر لیا گیا ہو۔ لیکن معدودے چند مضامین سے قطع نظر کہ آج کل کی نفيات طفلى میں یہ انداز خیال مفقود ہے۔ چونکہ بچے کے اندرونی ترکیب نفسی پر نظر ڈالنا ہمارے لئے بہت دشوار ہے اس لئے ہم محض اسی پہلو کا ذکر کریں گے جو بچے زیادہ نمایاں ہے یعنی بچہ کا تعلق اس چیز سے جسے واقعہ سمجھتا ہے۔ بخلاف نظریہ علم کے نفيات کے ہر شعبے میں یہ اصول موضوعہ ہونا چاہئے کہ نفس مدرک کے لئے ”واقعیت“ ہمیشہ ایک نہیں ہوتی۔ بلکہ اس ہر شخص کے نظام نفسی کے مطابق اور اس کے ارتقاء ذہنی کے مدارج کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اس مسئلہ کو تسلیم کرنا چاہئے کہ بچہ ہمارى دنیا میں نہیں بلکہ دوسرى دنیا میں رہتا ہے۔

ہم پر یہ امر اس وقت بہت واضح ہو جاتا ہے جب ہم طفلى کے دسلى حصہ یعنی اندازاً تین برس سے سات برس تک کی عمر کو پیش نظر رکھیں۔ ہم کہا کرتے ہیں کہ اس کی نشوونما کے اس درجہ درجین کی خصوصیت ایک خاص طور پر پرورش تخیل ہے جو اپنے ماحول کی ہر ایک چیز میں ڈوب جاتا ہے اور اسے ان لوگوں کی طرح ذی روح سمجھتا ہے۔ نفسی تصویر اس لئے غلط ہے کہ لفظ تخیل ہمارے لئے ایک خاص معنی رکھتا ہے جو بچہ کے نفسی تجربے میں موجود نہیں ہوتے یعنی تخیل کا ”واقعہ“ سے مختلف ہونا اس کا خواب آسا ہونا اور قابل اعتماد نہ ہونا۔ لیکن بچہ کی زندگی میں جسے ہم غلطی سے تخیل کی زندگی کہتے ہیں سب سے بڑی بات یہی ہے کہ انہیں تعریف نہیں ہوتی۔ جو ہیں تخیل معلوم ہوتا ہے وہ بچہ کے لئے ”واقعہ“ کی قدر رکھتا ہے اور اس کے لئے اسی قدر اہم ہے جتنی ہمارے لئے ہمارى ”واقعیت“ ہے (جس کے جاننے کو تصور اور مختلف معیار ہیں اور جس کے ادراک میں ہم ایک حد تک من مانے اصولوں سے کام لیتے ہیں)۔

جہاں بچے کے لئے تخیل اور واقعہ کا وہ فرق مفقود ہے جسے ہم اپنی دنیا سے بچہ کی نفسی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ناگزیر طور پر محسوس کرتے ہیں وہاں بچے کے تخیل کو ہم بڑوں کے ”دوئی“ آسا تخیل کے مقابلہ میں ”وحدت آسا“ تخیل یا بھولے تخیل کے مقابلہ میں جذبات پرست تخیل کہہ سکتے ہیں اس زمانہ میں جس کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں بچہ کی ساری باطنی زندگی بنوڑا اپنے ماحول کے انخاص اور اشیاء میں جو اس کے پیش نظر ہوتے ہیں محو ہوتی ہے وہ اب تک اپنے آپ کو شعوری حیثیت سے ان کے مقابلہ میں بطور ایک مستقل ہستی کے نہیں رکھتا۔ خواہ اس میں اسے ساعت بر ساعت ذلت نفس کا غم برداشت کرنا پڑے۔ لیکن یہ غم بنوڑ غم ”روزگاہ نہیں ہے۔ اپنی نفسی دنیا اور دوسروں کی نفسی دنیا اور غیر ذی روح دنیا ابھی تک ایک دوسرے سے جدا نہیں۔

لیکن یہ الفاظ بچہ کی خصوصیت کو پوری صحت کیساتھ ادا نہیں کرتے۔ انیس سالہ بچہ سے کام لیا گیا ہے تاکہ جو بچے ہم پہلو ہے وہ ابھی طرح نمایاں ہو جائے۔ درحقیقت میں بچہ کی زندگی اسی وحدت آسا نہیں کہ وہ اپنے ماحول کے اس حصہ میں جو اس کے لئے اہم ہے بالکل ہی گم ہو جائے۔ بچہ کو بھی ابتدا سے ایک تضاد کا احساس ہوتا ہے یعنی اس تضاد کا جو اس کے بھولے، ہر شے کو جاننا سمجھنے والے جلی تخیل میں اور عالم کے نام نہاد ”واقعی“ حالات میں یا اسکی دنیا میں اور بڑوں کی دنیا کے قواعد و قوانین میں ہوتا ہے جو طرح طرح سے اس کی زندگی میں دخل دیا کرتے ہیں اور یہ بھی صحیح نہیں کہ بچہ کو اس دوسری دنیا کے احساس سے محض تکلیف یا نفرت ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ اس دنیا کی طرف بڑھتا ہے اور روز بروز اس سے قریب ہوتا جاتا ہے مختصر یہ کہ اس احساس تضاد کو جسے ہم دل میں رکھتے ہوئے بچوں کی دنیا کی سیر کرتے ہیں اور جو جذبات پرست ہونیکے سبب سے ہیں ان کی نفسی کیفیات کا صحیح اندازہ نہیں ہونے دیتا جتنی جتنی ایک چیز خود بچہ کے دل میں بھی ہوتی ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ بچہ کو اس تضاد کا احساس دوسرے پہلو سے ہوتا ہے اور وہ روانی جذبات کے ماتحت ماضی کی یاد میں سر نہیں دھناتا بلکہ نئی چیزوں کے دریافت کرنے کے شوق میں مستقبل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اور یہ پوچھے تو یہ بھی نظر بات۔ اگر میں اپنے مکان میں کھڑا ہو کر کھجور کے اس طرف ہمایہ کے وسیع باغ کو دیکھوں تو طاہر ہے کہ

میں اس کی افلاک کو کسی اور نظریے سے دیکھوں گا اور اگر وہ میرے غریب خاؤ کی طرف جھانکے تو انہیں کچھ اور نظر ہوگی۔

مجموعہ پچھلے کی دنیا کا شام ہو کر نیا پچھلے میں تو جلد وہ سما جاتی ہے جس کے لئے کہ ان کا حال ہم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کی فکری کیفیت ہم سمجھ تو سکتے ہیں لیکن خود ہمارے قلب میں وہ کیفیت وجود نہیں ہوتی۔ اس رنگ میں باطل و دوسب جانا مسموم کے نام ممکن ہے کیونکہ بقول مولانا ریں کے ہمارے نفس میں ضرورت سے زیادہ پچھلی آگئی ہے۔

اگر ہم اس سسٹم پر مزید بحث کرتے تو سمندر جہاں اعداد و گنا میں بالکل نئی ترقی کر چکے موجودات کا ادراک کرتے وقت اس پاس کی چیزوں میں سے دسے سانس ہر دمک کے لئے خیال بن جاتی کی کوشش کرتی ہے لیکن چیزوں کو چھتا ہے۔ ہر جولان اس طرح کے انتخاب سے متاثر ہے جو قدر کے نقطہ نظر سے کیا جائے۔ یہی دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں ادراکیت دیتی ہیں جو ہمارے نزدیک محدود و محدود ہیں۔ اس طرح پچھلی نظریں بہت سی ایسی چیزیں محدود ہیں جن کا ہمارے خیال میں آنے سے مرعہ ادراک ہوتا ہے۔ مگر میں نفسیات عقلی کی تفصیلی بحث کرتے کا حق نہیں۔ ہم صرف چند باتوں کا ذکر کرینگے جو خاص طور پر اہم ہیں۔

موجودات کی ان تمام خصوصیات سے جو کائنات کے خیال میں ہر دمک کے لئے "مختار ہر دمک" کی بنیاد ہیں یعنی خیال اور مکان سے بچنے کے تعلقات ویسے نہیں ہوتے جیسے ہمارے بلکہ باطل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ میں نہیں معلوم کہ کس کے تصور میں مکان اعداد و ہوتا ہے یا نہیں لیکن ہمیں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے جہاں عقلی لوگوں سے ملے ہر گناہ کا قائل ہے کہ مکان کی دو خصوصیات ہوتی ہیں ایک تو وہ جانی بوجی مرکزی نفاذ خود اس کے گرد ہوتی ہے اور دوسری اس کی اشیاء میں شبہ کی گنجائش نہیں اور دوسرا وہ عظیم الشان کردہ

(۱) برٹنی کا ایک مشہور ہمدانی شاعر

(۲) صورت عیائی اصطلاح ہے جو عربی حارج میں موجود ہیں ان کا حسن علم یا ادراک کا مادہ کہا جاتا ہے اور جو تعریف مذکور ذہن اس میں کرتا ہے اسے صورت کہتے ہیں۔

جس میں تخیل حسب دلخواہ کشایا کا وجود فرض کر لیتا ہے۔ بچہ اُس مرکزی فضا کی بڑی گہری چھان بین کرتا ہے اس فضا کا چہ چہ دیکھا بھالا ہوتا ہے اور بچہ کے نفس سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ عمر بھر میں کسی مکان کو اسی گہری واقفیت نہیں ہوتی جتنی بچپن میں اپنے گھر کے ایک ایک کونے سے ہوتی ہے یہ سچ ہے کہ بچپن میں بار بار تبدل مکان کرنے سے نفسی نشوونما قبل از وقت ہو جاتی ہے لیکن گہری نہیں بلکہ سطحی ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے بچہ کو جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں زندگی کے ضروری اور مضبوط رشتے وقت سے پہلے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس سے کچھ مختلف اور کچھ شباب بچہ میں زیادہ کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کے ذہن میں زمانہ کا تصور اب تک یہ نہیں ہوتا کہ وہ خود اس کے نفس اور موجودات کی مربوط اور ناگزیر حرکت کا نام ہے جو ایک خط مستقیم میں واقع ہوتی ہے جس میں سے ایک نقطہ بھی گزرنے کے بعد لوٹ کر نہیں آتا اور جو کم سے کم ذی رشح کدڑا کے لئے ایک دن دفعۃً ٹوٹ کر عرصہ غفلت میں غائب ہو جائے گا۔ بلکہ وہ زمانہ کو لمحات کی ایک غیر مربوط اور نامحدود ڈنڈائی سمجھتا ہے جن میں سے ہر ایک کا وہ اس قدر گہرا مزہ لیتا ہے کہ اُس کے گزرنے اور پھر لوٹ کر آنے کا احساس تقریباً باطل جاتا رہتا ہے۔ اگر دفعۃً زمانہ کا احساس بچہ کے دل میں بدل جائے تو یہی ایک مافوق الطبیعی واردات اس بات کی علامت ہو سکتی ہے کہ بچپن کا زمانہ ختم ہو چکا اور نفس بیدار ہو گیا کیونکہ جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھنا اکثر اس طرح واقع ہوتا ہے جیسے دفعۃً بین پھٹ جائے اور ادھر کی تہ مٹ کر نیچے سے زیادہ گہری تہ نمودار ہو جائے۔ اسکی سب سے موثر مثال ہیں اڈلف اسٹارک کی ”نوجوانی کی یاد“ میں ملتی ہے، اُس کی ماں کلموت اُس کے چھوٹے نفس کی گریبان چاکی کی محرک ہوئی۔ وہ چیزیں جنہیں وہ پہلے صد ہا مرتبہ دیکھ چکا تھا اب اسے اور ہی رنگ میں نظر آئیں اگرچہ خود اُن میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ ”لوگوں کو سنکر تعجب ہو گا کہ میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا تھا کہ ہمارے اس باپ بھی مر جایا کرتے ہیں۔ اب دفعۃً میرے دل میں یہ خیال اور اسی کے ساتھ دنیا کی سب

(۱) کے بعد دیگرے ہوتا۔

(۲) یہاں بطور فلسفیانہ اصطلاح کے واردات قلب کی منی میں متعال ہوا ہے۔ جرمن لفظ *Transcendence* کا ترجمہ ہے

بیزوں کے فانی ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ پہنچتی وقت سے میرے قلب پر جس حیرت کا ہجوم تھا اُسے خوف اور دہشت نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ کوئی اور ہی روح فرسا کیفیت تھی جس کا جھک پوری طرح دل سے دھڑپیں کر رہا ہوں یہ کیفیت پہلی بار اُس موقع پر ظاہر ہوئی جب ہم لوگ والدہ کے انتقال کے کئی مہینہ بعد دوبارہ سیر کرنے... جارہے تھے جس کی مجھے بہت ناز تھی جب ہم ایک ناشپاتی کے بڑے درخت کے قریب سے گزر رہے تھے جہاں سے ہماری منزل مقصود آدمی دور رہ گئی تھی دفعۃً میرے دل کو یہ صدا آئی "آج شام کو تو وہاں ہی میں اسی درخت کے پاس سے گزرے گا اور اُس وقت ساری خوشی ختم ہو چکی ہوگی" میرے دل سے زمانہ کے نامحدود ہونیکا احساس جاتا رہا تھا جس پر بچپن اور نوجوانی کا اچھا ہے۔ میری نوجوانی ختم ہو چکی تھی و صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ اُس کا بچپن ختم ہو چکا تھا اور نفسی نقطہ نظر سے اب اُس نے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ اُس کے احساس میں اب بھولا پن نہیں رہا تھا اُس کے نفس میں وہ جذبات پرستی پیدا ہو گئی تھی جس کی ماہیت پر ہم اس کتاب میں غور کرنا چاہتے ہیں۔

جس طرح زمان و مکان کے طول سے کہیں زیادہ بچہ کو ان کی گہرائی اور نامحدود ہونیکا احساس ہوتا ہے اُسی طرح اس کی نظر میں جو تصویر دنیا دہانیہا کی ہوتی ہے وہ نوجوانوں کی دنیا سے بھل مختلف ہے۔ تو انین فطرت سے اُسے ابھی اتنی ہی واقفیت نہیں جتنی عوام کو تجربہ کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔ خود بینی اور دوسروں کی طاقت کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک بار سال کی عمر میں نیچرنگی سے یہ قصد کیا تھا کہ جب ہم لوگ جب معمول آئندہ گرمیوں میں بحیرہ بالٹک کے ساحل پر جائیں گے تو میں ریت کا جہاز قد آدم بناؤں گا جس میں بیج مچ کے کمرے اور زینے ہوں گے۔ لیکن جہاننگ یاد ہے مجھے اُس ارادہ کے پورا نہ ہونے کے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا، علاوہ اس کے بچوں کو اپنے اُس پاس کے گولیاں کی زندگی کے اُس پہلو کے سوا جو خصوصیت کی مانند انکی ننھی سی جان کی طرف (جو گویا دنیا کا مرکز ہے) اہل ہو کی اور پہلو سے مطلق سروکار نہیں ہوتا۔ وہ میدان سادہ فلسفہ جذبات اور وہ محرکات جن سے بچہ اپنا کام چلاتا ہے۔ شارٹوے بوہر کی کتاب "کہانیاں اور بچہ کا تخیل" میں بیان کئے گئے ہیں۔ خود اپنے نفس کے شعلہ بجاس سے بھی کم غور کرتا ہے بجز اس صورت کے کہ تصوف کے احوال نے اس پر خاص کر کے یا اثر ڈالا ہو



یا تہیت کے ذریعہ قبل از وقت مصنوعی طریقہ سے وہ غور و فکر پر مجبور کیا گیا ہو۔

ہم نے جبکہ بالخصوص بچپن کے پہلی حصہ کی نفسی زندگی کا ذکر کیا ہے تاکہ نوجوانی سے زیادہ گہرا تقابل ہو سکے لیکن عمر کے ان دونوں حصوں کے درمیان تحدیدناہ سے بارہ برس کی عمر تک ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے جس کی بنیادی خصوصیات بالکل مختلف ہوتی ہیں اور جس کے متعلق نفسیات کی تحقیقی ایک تقریباً صفر ہے۔ مذکورہ ایک اثر کی زندگی پر غور کیجئے۔ اس عمر کی خصوصیت عموماً ایک طرح کی طفلانہ واقعیت پسندی ہے جس کا رجحان خارجی دنیا کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد جسمانی زندگی کا ایک قوی احساس ہے طفلانہ زندگی کی جھڑپات ہیں ان سے اس عمر میں نظام نفسی بہت بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس سے اعتماد اور یقین پیدا ہوتا ہے۔ جو برابر استقامت سے بڑھتا جاتا ہے علاوہ اسکے لڑکوں میں اتنی فاضل قوت پنچ رہتی ہے کہ اسکا طرح طرح کی شرارتوں کی صورت میں ظاہر ہونا ضروری ہے بخلاف نوجوان کے جو ہمیشہ محسوس میں رہتا ہے لڑکا اپنے آپ پر اعتماد رکھتا ہے اور غیروں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے ادراک عالم میں اشیاء کو ذی زندگی سمجھنے کا عنصر بہت کم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حد تک اس چیز میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اعلیٰ معنی میں تخیل ہے۔ یعنی واقعی اشیاء کو حسب و نحوہ کسی رنگ میں رنگ دینا۔ یہ تخیل اب بے جان چیزوں (کھیلوں) میں مشغول رہنے کے مقابلہ میں ہم سن لڑکوں کے ساتھ کھیلے نہیں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان نئے کھیلوں میں جو واقعیت پسندی لڑکے دکھاتے ہیں اسکا اظہار اس طرح کے فقروں سے ہوتا ہے "واہ۔ یہ کھیل کہیں ایسے کھیلے جاتا ہے" یعنی اب تخیل خود ساختہ قاعدوں کا زیادہ پابند ہو جاتا ہے قطع نظر اس کے تو عمر زیادہ تر خارجی چیزوں کی طرف ہوتی ہے۔ خارجی عالم کے متعلق یہ اب جان بوجھ کر سوالی کرتا ہے اور ہر بات کا کھوج لگاتا ہے اس عمر کی ایک اور خصوصیت منہنی الجھپی کا بیدار ہونا ہے۔ وہ بچے میں جن میں اسکی صلاحیت نہیں ہوتی اس عمر میں کا فہم کی ناؤ اور ریت کے مکان بنایا کرتے ہیں۔ انسان اپنی نشوونما کی اس منزل میں واقعیت پسند ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک واقعیت صرف ان چیزوں تک محدود ہے جو اس کی طفلانہ دنیا میں موجود ہیں یا اس سے واسطہ رکھتی ہیں۔ اب گویا بچپن اپنی پختگی "کو پہنچ گیا ہے" جہاں تک موجودہ زندگی کا تعلق ہے تمام قوتوں میں صحیح توازن قائم ہو گیا ہے۔

اس امن و سکون کی زندگی میں نوجوانی کا عہد اس قدر شدید انقلاب پیدا کرتا ہے کہ لوگوں نے اسے دوبارہ پیدا ہونے لگا ہے اور بجا کہا ہے۔ اس کا پلٹ کا دفعہ واقع ہوتا یا آہستہ آہستہ رونما ہونا ہر فرد کی مخصوص نفسی کیفیت پر موقوف ہے جو پہلی صورت میں بھی ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس انقلاب سے پہلے ایک زمانہ ایسا گزرتا ہے جس میں بغیر ہمارے محسوس کے طبیعت اس کے لئے تیاری کرتی ہے اور اس میں تو ذرا بھی شبہ نہیں کہ خواہ دل کی گہرائی میں اترا جانے والی واردات قلب اس انقلاب میں محرک یا مدد قوت کا کام دے خواہ تربیت کے اثر سے یہ عرصہ تک روکا جائے ہر صورت میں یہ عمل اندر سے یعنی خود نفس کی نشوونما سے ظہور میں آتا ہے۔ اسے ہم کسی بیرونی چیز کا اثر نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی شدت میں مختلف صورتوں میں فرق ہوتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی صحیح دل و دماغ کے انسان میں یہ چیز بالکل ہی واقع نہ ہو۔ ہم یہاں ان مصلحتوں کی بنا پر جس کا ذکر اب اوّل میں ہو چکا ہے اس کے عضو باقی پہلو کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ اس نفسی تغیر زکیّت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو یہاں رونما ہوتا ہے۔

تجربہ کار نفسی (ماہران نفسیات) اس تغیر کو ایسی خفیف سی علامتوں سے پہچان لیتے ہیں جو ظاہر و دراز کا معلوم ہوتی ہیں بلا اس کے کہ وہ لڑکے کی نفسی کیفیت اور اس کے مرکز انقلاب پر علمی نظام کو تحت غور کریں۔ مجھ سے ایک لڑکی بارہ برس کی عمر سے خط و کتابت کرتی تھی۔ سترہ برس کی عمر تک اس کے خطوط میں نفسی بیماری کا شاید بھی نہیں تھا۔ جبانی و اعتبار سے وہ چودھویں ہی سال میں نوجوانی کی حد میں قدم رکھ چکی تھی۔ نفسی تغیر کی پہلی علامت سترہ برس کی عمر میں اس کے دو جملوں میں نظر آئی جو اس نے طالب علموں کی ایک دعوت کا محض ایک سرسری ذکر کرتے ہوئے لکھے تھے۔ دعوت کے بعد رات بھر ناچ ہوتا رہا۔ صبح چلے دو دو آدمی ایک ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سریر کو چلے۔ چاروں طرف بالکل سناٹا تھا۔ ہم سب پر سکوت طاری تھا۔ بچے کے کانوں تک سناٹے کی آواز نہیں پہنچا کرتی۔

(۱) physiological

(۲) ترکیب یہاں جس اصطلاح کا ترجمہ ہے اس کے معنی میں نفسی زندگی کا وہ شعبہ یا پہلو جو "منشاء" کہلاتا ہے۔

اب ہیں کوشش کرنا چاہئے کہ نئے نظام نفسی کی اہم ترین علامات کو معلوم کریں ایسی علامتیں

تین ہیں۔

(۱) نفس کا اکتشاف اور احساس۔

(۲) آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا

(۳) زندگی کے مختلف شعبوں سے گہرا تعلق پیدا ہونا۔

ان میں سے پہلی بات وہ بنیادی مافوق الطبعی احساس ہے جو انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایک جداگانہ فرد بنتا ہے۔ دوسری اس احساس کو عملی زندگی سے وابستہ کر نیکی مرادف ہے اور تیسری کے تحت وہ تمام کوششیں آتی ہیں جو انسان زندگی کے مختلف پہلوؤں کا محروم ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ یہ ابتدا میں ایک دوسرے سے بالکل بے ربط ہوتی ہیں، لیکن بہترین صورتوں میں شخصی قوت تشکیل ان میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے۔ ان تینوں باتوں کی میں مزید توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

ہم نے نوجوانی کے آغاز کی پہلی علامت جداگانہ فرد ہونے کے احساس کو قرار دیا ہے۔ اس سے نہ سمجھنا چاہئے کہ پہلے نفس کا احساس کبھی ہوتا ہی نہ تھا (۱)۔ کچھ بھی خودی نہ لکھتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ ایسی بدیہی چیز ہے کہ اس کا موجود نہ ہونا یا تسلیم نہ کیا جانا اس کے قیاس ہی میں نہیں آ سکتا اور اسی لئے اُسے اس کا گہرا شعور بھی نہیں ہوتا۔ ہم سب بچوں کی دل خوش کن لاشعوری امانیت سے واقف ہیں، لیکن نوجوانی کی علامات کا جو پہلا عنوان ہم نے قرار دیا ہے اُس کے معنی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ

(۱) نفعیات کو چاہئے کہ شعور کے مختلف مدارج کے اسے میں زیادہ جھانپیں کہے۔ ایک تو سادہ شعور ہوتا ہے جو احساس اور فعل کا جولا نکھار ہونے پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس شعور کا درجہ جو ان چیزوں پر جھانپنے لگتا ہے جو فکر کا پہلا درجہ، سب سے بلند وہ شعور ہے جو نفسی کیفیات کو معانی کی تحت میں لا رہا ہے اور شعور کا علم میں جاتا ہے۔ (فکر کا دوسرا درجہ) مثلاً فرض کیجئے ایک شخص جو بہاؤ پر چڑھتا ہے کہ ہستی دنیا کو محض غموس کر رہا ہے۔ اب غموس کی گونج ہے احساس کا بھی احساس مواد اس سے اس کا لطف دو بالا ہو جائے یا اس پر حسرت و ملال طاری ہو جائے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس احساس کی ترجمہ کرے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ کچھ شعور کی پہلی منزل میں ہوتا ہے اور جب وہ نوجوانی کی حد میں قدم رکھتا ہے تو دوسری منزل فکر کا پہلا درجہ شروع ہوتا ہے۔

اس تغیر کے ساتھ ہی بچہ کو اپنی ذات کا علم اس طرح ہوتا ہے جیسے ولیم انسر کو اپنے زمانہ تربیت کے ختم ہونے کے بعد اس سے بھی بڑھ کر اپنے زمانہ سیاحت کے اختتام پر حاصل ہوا تھا۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ نوجوانی کی حد میں داخل ہونے پر نئی بات یہ ہوتی ہے کہ بچہ کی نظر اندر کی طرف پھر جاتی ہے یعنی تفکر کا آغاز ہوتا ہے۔ مدرک اپنے آپ کو بجائے خود ایک دنیا سمجھنے لگتا ہے جو ہمیشہ کے لئے ایک چیز کے کی طرح عالم خارجی کی تمام موجودات سے خواہ وہ انسان ہوں یا اشیاء جدا ہوجاتی ہے اور اسی لئے اُسے بجد تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔

زیادہ صمیم الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ نفس یا خودی جس کی طرف بچہ کی نظر پھرتی ہے ابھی تک وجود نہیں ہوتی یا کم سے کم نظر نہیں آتی۔ بجائے اس کے ابتدا میں ایک طرح کا داخلی تنون ظاہر ہوتا ہے جس کے سبب سے انسان اپنی نفسی کیفیت پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس غور و فکر سے چند مخصوص مظاہر پیدا ہوتے ہیں جو غالباً سب نوجوانوں میں نظر آتے ہیں۔

ان میں سے پہلی چیز کو مینڈوس نے اپنی کتاب ”نوجوان کا نفس“ میں بحال طور پر طبیعت کا نزاع کہا ہے۔ اسٹینلے ہال نے بھی نوجوانوں کے نفس کے تنون کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ایک ہی شخص اپنے نفس میں متضاد کیفیات پاتا ہے جن میں سمندر کی موجوں کی سی پستی اور بلندیاں ہوتی رہتی ہے کبھی وہ انتہائی حسنی دکھاتا ہے اور ورزش یا کھیل میں دنیا بھر کے استادوں کو مات کرتا ہے اور کبھی اس قدر کابل ہو جاتا ہے کہ ہاتھ پیر ٹٹا بھی اُس پر بار ہوتا ہے کبھی وہ جوشِ مسرت سے کھلا ہوا پھول ہے اور کبھی طال و افسردگی سے مرجھانی ہوئی گلی۔ اُس کی دلچسپی بخوشی اور حد سے بڑھتا ہوا اثر سیلا پن ایک ہی بات کے دو پہلو ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ اپنے نفس کے اہم ترین اعمال کو وہ دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اس میں کبھی دنیا کی شان نظر آتی ہے، کبھی خود غرضی کی کبھی شرافت کی، کبھی کینہ پن کی، کبھی جذبہ انس کی، کبھی تنہائی پسندی کی، کبھی تعلید کی اور کبھی حریت پرستی کی، کبھی قوت عمل کی اور کبھی خاموش تفکر کی۔

مختصر یہ کہ جس قدر شدت و عفتوان شباب کا طوفان پر پامور اسی قدر اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس عمر میں نفس میں ہر چیز کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ غیر صبیح ہو یا نہ ہو۔ بہت گہرا فوق الطبیعی مسئلہ مگر اس ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس طرح ذاتواں ذول رہنے سے خود ہمارے نوجوان کی جان ہڈیاں میں ہوتی ہے شاد نادی یہ نفع میں آتا ہے کہ کسی کو شباب کے آغاز میں مسرت نصیب ہوتی ہو یا وجود یکساں زمانہ میں کبھی ایسے لمحات بھی گزرتے ہیں جب نفس انتہائی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن جب ہم اس واردات کو جو طلب پر گزرتی ہے نفیات کی خرید میں سے دیکھتے ہیں اور اس کے ”منشا“ کی جستجو کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ چیزیں نفس کے ارتقا میں کیا اہمیت رکھتی ہیں فطرت یہاں ہونے والے انسان کا انتخاب کا موقعہ دیتی ہے۔ وہ خود اپنے اوپر ہر طرح کا تجربہ کرتی ہے تاکہ آخر میں صرف ایک طرز زندگی کو جو سب سے زیادہ موزوں ہو اختیار کر لے۔ نفیات ارتقا کے دوسرے شعبوں میں بھی اس سے ملنے جلتے مظاہر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یکم موضوع انقلاباں ادا کرنے سے پہلے جو عموماً غاں کرتا ہے اسکا یہ مقصد ہے کہ ہر طرح کی باتوں کو جن میں سے بعض کا ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ایک ذخیرہ جمع ہو جائے تاکہ ان میں سے حسب ضرورت انتخاب کیا جاسکے۔ اسی طرح قوت ارادی کے ارتقا کی سب سے پہلی منزل وہ ہوتی ہے جس میں ارادہ کسی خاص مقصد سے نہیں کیا جاتا بلکہ محض اپنی نئی قوت یعنی اثبات خودی کی شوق کے لئے ہی طرح کھیل میں مختلف حالتوں اور طرزائے عمل کا تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن عفتوان شباب کا طوفان محض کھیل نہیں ہے۔ بلکہ بڑی بنیاد پر ہے یہاں فطرت انسان کی عین ذات کو سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے جو عمل وہ پہلے کھیل کے ساتھ کرتی تھی وہ اب واقعی زندگی کے ساتھ کرتی ہے۔

مناسب ہو گا کہ یہاں ہم بطور عملہ معرکہ کے ایک تعلیمی حکمہ بیان کر دیں۔ ہمارا نوجوان ان ماحولوں میں انقلابات میں اپنے آپ کو تجربہ نہیں سکتا۔ اسی لئے اس زمانہ میں کچھ جانکی خواہش انتہا سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی اسے سمجھ لے تو محض یہ سمجھ لیا بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ کیونکہ اس نے نفسی رجحانات کی بنیاد پر صورتوں میں سے بعض کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ تاہم کیا جاتی ہے اور ان کے نشوونما کی کوشش کی جاتی ہے اگر اس سمجھنے میں نفس کی بہت تر صلاحیتوں پر زور دیا جائے تو نوجوان قہرذلت میں گر جاتا ہے لیکن اگر

نفس کے فطری جذبہ ترقی کی پرداخت کیجائے تو وہ اوجِ شرف پہنچ جاتے ہیں اس زمانہ میں تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ سمجھنا اور ابھارنا ہے۔ عقلماند نے اپنے مخصوص انداز میں اسکی تدبیریں بتائی ہیں۔

نفس کی حالتوں اور کیفیوں کے اس دائمی تغیر میں بعض رجحانات زیادہ نمایاں ہیں اور سب نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان سب کا تعلق اُس چیز سے ہے جس نے نفس کا اکتان کیا ہے۔ ان سب احاسات میں خودی کی جھلک بائی جاتی ہے۔ یہ بچہ میں بھی موجود تھے مگر لاشعوری حیثیت سے اب ایک نئے جذبہ خودی کا دورہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ نفس اور غیر نفس کے درمیان ایک بہت بڑا فلیج مائل ہو گیا ہے، نہ صرف اشتیاء بلکہ انسان ہم سے بہت دور اور بالکل بیگانہ ہیں اور انسان تمام عالم میں بالکل یکہوتنا ہے۔ اس طرح وہ ذہنی "ہبوط" واقع ہوتا ہے جو مدُرک اور مدُرک کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ مدُرک اب بجائے خود ایک دنیا بن جاتا ہے: "ہمارے اندر بھی ایک کائنات ہے"۔ اب اپنے نفس کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ اسکا قدرتی تجربہ ہوتا ہے کہ انسان بیشمار مختلف صورتوں میں تجلی ذات پر غور کرتا ہے۔ ان میں سب سے پست وہ سطحی اڈھٹرن ہے جس میں انسان محض اپنے نفس کے بے مقصد جذبات کو گنگھماتا ہے، اور سب سے بلند فلسفیانہ تفکر ہے۔ اس عمر میں ایک حالت ایسی بھی ہوتی ہے جب انسان سوچا کرتا ہے مگر اُس کے ذہن میں خیالات نہیں ہوتے۔ گارڈ فیلڈ کیلبرنس اس قسم کی دوراں کا رُخور و فکر کا نقشہ اپنے اَدل *Das grüne Heinrich* میں کھینچا ہے۔ صناعتوں کے جلد و دعوت کے بعد بہت دن تک وہ میٹر میوں کے پاس بیٹھا رہتا ہے اور بے فائدہ میٹر میوں پر چاقو سے نشان کیا کرتا ہے لیکن یہ حالت کبھی زیادہ گہرا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور انسان ہنساتے تخلیق کے ہم ترین مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے "میں دنیا میں کیوں ہوں؟ سب چیزیں معدوم کیوں نہیں ہیں؟" "بچہ پوچھتا کہ "میں جب تک پیدا نہیں ہوا تھا تو کہاں تھا اور کیا تھا؟" مگر نوجوان یہ پوچھتا ہے "میرے ہونے کا سبب کیا ہے؟ میری قدر کیا ہے؟" اس اَنفوق الطبعی جنگ سے انسان جس کشش و پُنج میں پڑ جاتا ہے اور

جس اَنفط *Ständenfall* کا ترجمہ ہے جس سے مراد ہر حضرت آدم کا ہشت نے کھلا جانا یہاں مطلب ہے انسان کے نفس میں دوئی کا پیدا ہونا۔

اس سے جو خالص انونی طبیسی (کچھ ضروری نہیں کہ وہ اخلاقی ہی عالم نزاری پیدا ہوتی ہے اس کا نتیجہ انتہائی صورتوں میں نمود کشی ہونا بھی ممکن ہے۔ لوگ اکثر ان واقعات کا سبب خارجی چیزوں کو قرار دیتے ہیں جو نوجوان کے نقطہ نظر سے بالکل سلی ہوتی ہیں اور جن کا اس پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا لیکن عام طور پر اس تفکر سے جو ہمارے نوجوان اسراف نفس کے متعلق کرتے ہیں اس سے کم ہلکے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ روزنامے لکھے جاتے ہیں خط و کتابت کی جاتی ہے مگر اس کا مقصد تبادلہ خیالات نہیں ہوتا بلکہ خط بھیجنے کا خط پانے والوں میں ہمارا نوجوان اپنی ذات کا عکس ڈالنا اور دیکھنا چاہتا ہے۔ عکس اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ دل کے جذبات کا بخار نکلے۔ دوستی سے اس میں خود اپنے نفس کے شاہدہ کا کام لیا جاتا ہے بلکہ قدرتی طور پر انسان ان چیزوں کو تخیل کی بینک سے دیکھتا ہے جس سے اپنے نفس کی تمام کمیتیں بہت بڑھتی اور بہت اہم نظر آتی ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ اس عمر میں انسان اپنے آپ کو بالکل نیا پاتا ہے یہ ہے کہ لڑکیاں خود اپنے نام بدل دیا کرتی ہیں ہلینا ہیلیا بن جاتی ہے۔ ایانا انیتا ہو جاتی ہے اور لڑکے اپنے آپ کو کم سے کم لیزا کہتے لگتی ہے۔ بالوں کو روز نئے سنلرز سے باندھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسان اس زمانہ میں گویا ہر وقت تائینک کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ وہ ہر چیز کی طرف جو نفس کے لئے آئینہ کا کام دے سکے دوڑتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس طرح بھی ظاہر ہو سکتی ہیں کہ شہوت جنسی کا خیال تک دل میں نہ ہو۔ انکی صورت یہ ہوتی ہے جیسے کسی روشنی کے مرکزے شعاعیں نکل رہی ہیں لیکن مرکز ایک جگہ قائم نہیں ہے، ابھی تک وہ جاگتی ہوئی خودی نمودار نہیں ہوتی جس کے مرکب اثبات نفس، عشق، اور شہوت جنسی کا ہونا لازمی ہے۔ ہمارا نوجوان ایک ظلم تخیل میں ٹول ٹول کر چلتا ہے جس میں ایک کھیل کا رنگ باقی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دنیا اور زندگی کے دائمی قوانین کی ایک خفیف سی جھلک ضرور نظر آنے لگتی ہے

اب آپ داخلی زندگی کے اس عجیب و غریب تضاد پر غور کیجئے۔ ایک طرف انسان اپنے آپ کو بھگانا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی نفسی کیفیت میں دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً صاحت کا شوق جو ہمیشہ سے نوجوانوں کے دل میں ہے۔ اس اندرونی ہمبہنی کا اظہار ہے جس میں انسان گھر سے جو گیا اس کے پرانے نفس کا ایک ٹکڑا ہے ہزار ہوں کر بھلا ہوتا ہے۔ ایسی خودی

ڈھنڈھتا ہے جو بچپنی کی حد تک پہنچ جائے۔ نئے نئے خارجی حیات (ادراکات) کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اسی کے ساتھ خاموشی اور جمعیت خاطر بھی چاہتا ہے۔ عنوان شباب میں بہت سی باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیہوشی کی کیفیت پیدا کریں یا کم سے کم جوش شباب کی گرمی کو کسی حد تک ٹھنڈا کریں۔ اس جوش میں نشہ کی دونوں کیفیتیں موجود ہوتی ہیں صوفیوں کے ”حال“ کی خود نمائی بھی اور خود فراموشی بھی۔ زندگی کے اس طوفان خیز زمانہ میں انسان مضطربانہ کوشش کرتا ہے کہ ٹھک کر شل ہو جائے اور پھر خود یہ ٹھکن دھمکوں بن جاتی ہے۔ بخلاف اس کے بعض نوجوان تصنیف و تالیف کی خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اپنے جوش اضطراب سے ”نجات“ پانے کے لئے روزنامہ یا اشعار میں ظاہر کرتے ہیں نفسی کیفیت کا اظہار جب کوئی معنوی صورت اختیار کرے تو اس سے دونوں باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے آپ کو بالینا بھی ادر اپنے آپ سے نجات پانا بھی۔ نوجوانوں کو جو جمعیت اپنے روزنامہ سے ہوتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کے راحت والہ کم کارا زدار ہوتا ہے اس کا درد دل منتا ہے اور اُسے کھل کر بات کرنا کا ایسا موقع دیتا ہے کہ خاموشی کے لمحوں میں نوجوان کا راز دار دل جو کلی کی طرح سرستہ تھا پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے یقیناً یہ روزنامے نفسیات شباب کے اخذ کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اتنے اہم ہرگز نہیں جتنا اشار لوگے بولہ اہم نہیں سمجھتی ہیں کیونکہ عالم ذمی کو سمجھنا تو درکنار ہمارا نوجوان اب تک خود اپنی نفسی زندگی کا ترتیب اور ربط کے ساتھ شاہدہ نہیں کر سکتا بلکہ عموماً حیرت کے ساتھ اور کبھی کبھی تنفرت آمیز تحریر کے ساتھ اس پر نظر ڈالتا ہے۔ یہ گویا تشکیل سیرت کی پہلی کوششیں ہیں۔ ابھی احساس نفس کی پُرپر کیفیتیں اور جذبات بہت دور ہیں۔ اس عمر میں جو کوششیں اپنے نفس کا شاہدہ کرنیکی ہوتی ہیں انہیں دوسروں سے مانگی ہوئی عینک سے کام لینا پڑتا ہے۔

نفس کی بیداری نہ صرف شاہدہ نفس کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ زودحسی کی شکل میں بھی جو اس بات کی علامت ہے کہ احساس خودی بہت بڑھا ہوا ہے اور ابھی اسے غیس سے بچانے کی بہت ضرورت ہے۔ دوسروں پر خصوصاً نکتہ عمر کے لوگوں پر فرض ہے کہ نوجوان کے دل کی کھلتی ہوئی گلی کو نہ پھیریں کیونکہ وہ اتنی نازک ہوتی ہے کہ اُسے اپنے آپ سے صدمہ پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ اس عمر میں جس میں انسان



طفلی و شباب کی سرحد پر ہوتا ہے لازمی طور پر نفس کی مجموعی حالت بہت تغیر پذیر ہوتی ہے انسان محض ظاہری حیثیت سے یا محض نام کے لئے آدھا بچہ اور آدھا جوان نہیں ہوتا بلکہ اس عمر کے آغاز میں واقعی بعض اوقات وہ بالکل بچہ ہوتا ہے اور بعض اوقات اندرونی زندگی کے اعتبار سے اس میں بھنگی کی جھلک منظر آتی ہے لیکن اس پاس کے لوگ اسکا بہت کم لحاظ کرتے ہیں اس عمر میں نوجوان کی سب سے بڑی بدمستی ہے کہ اسے لوگ پورا انسان نہیں سمجھتے اگر اس کی زود جسی یوں نہ مجروح کیجائے تو اس سے تعلقات قائم کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے محض اتنی بات سے اس کی تربیت بہت اچھی طرح ہو سکتی ہے کہ اس سے روزمرہ کی زندگی میں وہی برتاؤ کیا جائے اور وہی توقعات کی جانیں جو بچہ عمر لوگوں سے ہوتی ہیں کم سے کم نوجوان لڑکیوں کے بارے میں تو یہ بات حرف بہ حرف صحیح ہے بخلاف اس کے اگر نوجوان کی نظر کو خواہش کہ انہیں لوگ مانیں اور انکی بات سنے، پوری نہ ہو تو وہ ”ترک تعلیق“ کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ اسی زندگی اختیار کرتے ہیں جو بڑی حد تک بڑوں کے معیار کی پابند نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو خود ساختہ پالیوں سے ناپتی ہے۔ بڑے شہروں میں گندڑوں یا شہدوں کے جو جتنے نظر آتے ہیں انکے قیام کی فکر محض بچہ نہیں ہے بلکہ اس میں یہ خواہش بھی شامل ہے کہ لوگ انکی عزت کریں بلکہ اکثر اوقات لوگ اپنی اس آرزو کے خاک میں مل جانے سے کہ انکے ساتھ محبت اور انکی ہدایت کیجائے۔ حالت یاس میں ان جتنوں میں مل ہو جائے

مثلاً نفس اور زود جسی کے بعد خود مختاری کی اٹھتی ہوئی انگ اس بات کی علامت ہے کہ نفیر کی گہرائی میں ایک نئی خودی نمودار ہو گئی ہے اس لئے اس عمر میں آزادی کی کوششیں، سرکشی یا بغاوت پر نہیں بلکہ ایک فطری ضرورت پر مبنی ہیں۔ ہمارا نوجوان اب اپنے لئے مقاصد قرار دینا شروع کرتا ہے ابتدا میں محض تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نوجوان اکثر خواہ مخواہ انتہائی تیزی سے منزلوں پر پیدل چلتے ہیں جس کی غرض صرف اس بات کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنی دور چل سکتے ہیں ابتدا میں انکی غرض منطرقہ کا لطف اٹھانا بالکل نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو محض ضمنی طور پر۔ انکی یہ انگ خواہ جہانی ورزش کی شکل اختیار کرے خواہ نادرجیزوں کے جمع کرنے کی خواہ مخواہ یا لکڑی کاٹنے کی نفسیات نقطہ نظر سے سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ کیونکہ ان سب باتوں میں اہم ترین عنصر یہ ہے کہ آدمی کے با

ایک چیز خود اپنی ہو جس میں کوئی دوسرا دخل در معقولات نہ دے سکے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی کہ اس طرح کے شوق اکثر دوسرے کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وقعتہ شروع ہو جاتے ہیں (دیکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انکی محرک کون چیز ہے) اور چند مفتوں یا ہمتیوں کے بعد وقعتہ ختم ہو جاتے ہیں بعض وقت یہ دوسرے باوجود بے معنی ہونیکے دائمی مرض کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ نفس کا ارتقا صحیح نہیں ہو رہا ہے۔ یہ خود مختاری کی انگ بھی جس کا ہم آگے تفصیل سے ذکر کریں جو مرنی کی تحریک شباب اور نوجوانوں کی آوارگی کے اسباب میں ہر ایک سبب ہے۔ اس سے ہم یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ایک ہی نفسی جڑ سے بہ اختلاف ماحول کتنے مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث خود بخود عنفوان شباب کی دوسری بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(باقی آئندہ)

# عزل

از سید غایت علی صاحب آغا زبر با پوری تمیز نواب فصاحت جنگ بہادری حلیل مظلم جانشین امیر مٹلی

خواب کیسا اور کیا تعبیر خواب زندگی	کھول آنکھیں دیکھ غافل تو کتاب زندگی
ہر حقیقت کے جو چہرے پر نقاب زندگی	رہ نہیں سکتا ہمیشہ یوں محراب زندگی
کیوں نہ ہستی میں عدم کا آئے ہر اک تشاب	کھینچتی ہے دور سے بوجہ سراب زندگی
یہ جہاں ٹوٹا دکھاری ہو گیا اس پر سکوت	نغمہ زن تانفس سے ہر باب زندگی
منہ سے یاران عدم کہتے نہیں تو کیا ہوا	ایک اک کو انہیں ہے ذوق شراب زندگی
ہر عمل تیرا گنا جائے گا تیرے سامنے	روز محشر کو سمجھ روز حساب زندگی
خود فراموشی کی تصویر سر سے پائوں تک	کس قدر بیکار ہے تو پی کر شراب زندگی
خیمہ تن گر کے رہ جائے گا اک دن خاک پر	موت آکر توڑ دے گی جب مناب زندگی
یاد ہے بھلکودہ رونق اور وہ صبح ازل	جلوہ گر جب ہو رہا تھا آفتاب زندگی
یہ سمجھ جس روز پامال قضا ہونا پڑا	پھر کہاں تو اس کہاں یہ آب تاب زندگی

گردش ایام کو آغا ز کیا سمجھا ہے تو  
اُٹے جاتے ہیں یہ وراق کتاب زندگی

# کوہِ مینی تال

کبھی کوئی نہ عمر بھرا اگر گیب پہاڑ پر  
 ہوا دہاں کی سردی، یہ کب عبا رو گردے  
 اٹھواٹھو کہ وقت ہے، ابھی تو ریل کا بہت  
 یہ سانپ کی طرح سہل جو کھا رہی ہو ریل اب  
 سماں یہ دیکھ کر ہوا، غیب دل پہ کچھ اثر  
 لباس سبز زیب تن، پہاڑ ہے کہ ہے جن  
 پہاڑ کے درخت کی تناسوری و دلکشی  
 گھول کی وادیوں میں بو، جھکے ہی ہو چار  
 لڑکھ رہی ہیں پے پے بنے ٹھیک سنگا جو  
 وہ ابر جو بلند تھا زمین سے ہزار گز  
 کھلی جگہ میں اُس نے کیا ہو جیسے شب کو نم  
 وہ دلِ نریب تال بھی نظر کے سامنے ہے اب  
 تباں شونخ و شک خود چلا رہی ہیں ڈنگیاں  
 درخت بید جا بجا کھڑے ہیں برکت رکھ  
 دھوا دھواں وہ زو قس کبھی جو دوڑ دیکھنے  
 کسی شکر پہ شام کو جو گھوٹے کو جانے  
 وہ نازنین پور پی کتاب ہاتھ میں لئے  
 اور اُس پر ادھر یہ ستم کہ بیٹھے کے واسطے

تو اُس نے اس جانیں کیا ہی کیا پھر انگر  
 ہر ایک چیز فرد ہے، عجب بہار ہو ادھر  
 چلو چلو کہ لطف ہے، ہوئے ہم آں ہم سفر  
 وہ چوتیاں پہاڑ کی، جو ا رہی ہیں اپنا نظر  
 کہ روح و جدیں کی، تن بدن کی کچھ نہیں خبر  
 جد ہر اٹھائے نظر، اُدھر تھبہ ہے یا حجر  
 سہی قدان باغ بھی، ہوں شرمسار کھل کر  
 کہ جس کو نہ ٹھکر عجب اٹھا تو لطف ہر شہر  
 دواں دواں ہے آب جو اسی کا ہی یہ شہر شہر  
 گھلے ملا وہ راہ میں مگر ملا کیم تر  
 بڑے ہم اس سہل کے جب تہی ہم بھی رہ رہ رہ رہ  
 کہ زور قوں میں نازنین ادھر ادھر ہیں گھر  
 نزاکت بدن پہ ہیں یہ جراتیں کہ افسردہ  
 وہ رنگ آب نیلگوں مگر انہیں ہے کیا خطر  
 ہنسی بیان میں لطف وہ جو دیکھتی ہے خود نظر  
 غمو نشی مہیب ہو ڈریں گے آپ بھی مگر  
 مطالعہ میں غرق ہے اُسے نہیں ہے کچھ خطر  
 نشست بھی تلاش کی تو اک بلند دہاں پہ

وہ تال کے شمال میں جگہ پر کیا ہی دلکشا  
 وہ قصبہ پر کہ بال ہے عجیب سبک حال  
 سنا تھا جس کو کان سے وہ آگہ بھی نہ کئے  
 گمان ہو ہر مزاج پر ستارگان چرخ کا  
 جگہ ہا ہے نغمہ طیور کو وہ اب ہیں  
 ادا فرغیہ سحر کرد تو سیر کو عیسیٰ  
 ہوائے سرو کی ایک لکڑی کی حسین جھک  
 ہر ایک چیز مقتدل خوشی کا ہر سبب ہاں  
 یہی ہوائے سرو جب یہاں پہ برف بازو  
 یہاں کی یہ بہار بھی خزاں سے جا بگی بل  
 کہ کھیلے ہیں سب وہاں ادا ہر ادھر کو ان کر  
 ذرا اٹھانکے دیکھنے جو رہ گزر سے ہو گزر  
 وہ بخودی وہ سرخوشی اٹھانکے دیکھنے نظر  
 جگہ جگہ وہ روشنی فردب آفتاب پر  
 صدائے ساز خوشنوا، ہوئی ہے مہر سحر  
 بہار صبح خوب ہے صدائے ساز خوب تر  
 نشاط روح کے لئے عجیب چیز ہے مگر  
 وگرنہ انبساط بھی بجائے خود ہو چڑھ کر  
 تو باد زمہریر کا ہر ایک شے میں ہو اثر  
 کہ برف کے سوا یہاں پڑے گا اور کیا نظر

# شادی کا پیغام

(آ۔ پے۔ جیوف۔)

(۱)

(چوبوکوف اور لوموف۔ لوموف بہت بڑے کیلے کپڑے پہنے ہے۔)

چوبوکوف۔ (آگے بڑھ کے مٹا ہے) ارے پیارے تم کہاں سے؟ تم نے بھی مجھے کیا فرحت وغیرہ بخشی! (ہاتھ مٹاتے ہیں) مگر تم بھی کیا آسمان پر سے پھانڈ پڑے! کہو کیا حال ہے؟  
لوموف۔ شکریہ۔ اور جناب کا مزاج شریف؟

چوبوکوف۔ ہم بھی اپنے چھوٹے بھائی پر چل رہے ہیں۔ تمہاری دعا سے۔ آدمیٹھو... ہاں دیکھو ہمایوں وغیرہ کو بھول جانا اچھی بات نہیں ہے... لیکن تم آخر اس قدر بٹمن کے کیوں آئے ہو۔ کیا کہیں شادی بیاہ میں جانے کا ارادہ ہے؟

لوموف۔ جی نہیں۔ میں تو صرف آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔  
چوبوکوف۔ لیکن یہ بڑے دار و پکن کیسی۔ تم کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ آج عید ہے۔  
لوموف۔ دیکھئے تو اصل بات یہ ہے اس کا ہاتھ بڑے کمزور میں آپ کی خدمت میں ایک بڑی گزارش لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کچھ دن ہوئے مجھے آپ سے مدد مانگنے کا فکر حاصل ہوا تھا... اور آپ سے بہت کچھ چاہئے... لیکن میں گھبرایا جاتا ہوں... مجھے ذرا پانی پی لینے دیجئے (پانی پیتا ہے)  
چوبوکوف۔ (الٹ) روپیہ مانگتے آیا ہے... نہیں دے گا (لوموف سے مخاطب ہو کر لیکن تباؤ تو بات کیا ہے؟)

لوموف۔ دیکھئے نہ... میرے بھی ہوش جو اس اور سے جاتے ہیں... کیا حالت بن گئی ہے... لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جس میں صرف آپ میری مدد کر سکتے ہیں... اگرچہ کہنا چاہئے کہ میں نے اپنے

آپ کو کسی طرح ہے اس کے قابل نہیں ثابت کیا ہے... اور مجھے کسی طرح سے اسکا حق نہیں۔  
 چوبلو کو ف۔ ایں ہاں سگر بھائی بات کو مقدمہ دل کیوں دیتے ہو؟ میں ایک بار کہہ دو۔ ہاں!  
 لوموف۔ جی ہاں۔ توڑا۔ ایک منٹ میں... بات یہ کہ میں آپ کی صاحبزادی کو بیخام دینے حاضر ہوا ہوں...  
 چوبلو کو ف۔ ایں بھائی پھر سے کہو۔ مجھے یقین نہیں آتا!  
 لوموف۔ میں نے اسکی جرات کی ہے کہ...

چوبلو کو ف بات کاٹ کر بھئی واہ! تم نے بھی میرے دل وغیرہ کو بہت خوش کیا... (اُس سے نگلے  
 ملتا ہے) میں تو بہت دنوں سے یہی چاہتا تھا... میری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی... (چند آنسو اُس کے  
 گالوں پر نظر آتے ہیں) اور مجھے تم سے اپنے لڑکے کے برابر محبت رہی ہے... خدا تم کو ہر طرح کی مسرت وغیرہ  
 بخشے یہی میری دعا ہے... ارے میں یہ کیا کھڑا ایک بک کر رہا ہوں میرے ہوش اڑ گئے... میں بھی  
 کیا بھلی ہوں... میں ابھی اندھا جا کر اُن کو بھیجتا ہوں۔

لوموف (بہت موثر ہو کر) کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ اس فقیر کو کرم کی نگاہ سے دیکھیں گی، کیا مجھے کسی قسم  
 کی امید ہو سکتی ہے؟

چوبلو کو ف۔ واہ۔ ایسے حسین اور پھر پوچھتے ہو کہ وہ راضی ہوگی یا نہیں۔ وہ تو خود تم پر عاشق ہو جائیں گی  
 میں ابھی ناخین بھیجتا ہوں۔ (باہر جاتا ہے)

(۲)

لوموف (نڈکیلا) سردی ہے نہیں اس طرح تھرا رہا ہوں جیسے معلوم ہوتا ہے امتحان کے لئے جا رہا ہوں  
 سب سے ضروری یہ ہے کہ معاملے ہو جائے۔ اگر میں اب بھی سوچتا رہوں، ارادہ نہ کر سکوں باتیں  
 بہت کروں یا کسی پری سے عشق عاشقی کے انتظار میں بیٹھا رہوں تو کبھی شادی نہ ہوگی۔ کسی  
 سردی ہے (نام اگھر کا انتظام چھانچا کر کہتی ہے، بد صورت نہیں ہے، تعلیم یافتہ ہے... اور مجھے کیا چاہو؟  
 لیکن گھبراہٹ مجھ پر ایسی سوار ہے کہ کانوں سے سنائی نہیں دیتا۔ (پانی پیتا ہے) اور شادی نہ کرنا یہ بھی  
 ناممکن ہے۔ اول تو میں ۳۵ برس کا ہو گیا ہوں اور یہ عمر کتنا چاہئے بہت خطرناک ہے، دوسرے یہ کہ مجھے

باقاعدہ خوشگوار زندگی بسر کرنا چاہئے۔۔۔ میرا دل کمزور ہے، ہمیشہ اختلاج بہتا رہتا ہے، میں غصہ ہو گیا ہوں، لحد ہر بات پر گھبرا جاتا ہوں۔ اس وقت میرے ہونٹ تھرا رہے ہیں اور سیدھی لپٹی کی رگ ٹھکر رہی ہے لیکن مجھے بڑی حالت میری سوتے وقت ہوتی ہے۔ چنگ پر بیٹھے ہسی آنکھ لگی کہ ایک بار لگی کوئی قہقہہ طرف جاتو بھونک دیتا ہے اور میں سڑکوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتا ہوں طبیعت ٹھیک ہوئی پھر لیتا کہ وہی درد پھر اٹھتا ہے۔۔۔ اور یہی رات کو کوئی بیس مرتبہ ہوتا ہے۔

(۳)

نالیہ۔ ارے یی آپ ہیں۔ اور وہاں انہوں نے اندر جا کر کہا کہ جاؤ سوداگر مال خریدنے آیا ہو۔ سلام عرض ہو۔  
لوموف۔ تسلیم۔ بندگی۔

نالیہ۔ معاف کیجئے گا میرے کپڑے ایسی نہیں کہ ایک غریب میان کے سامنے جاؤں، اس وقت حال آئی ہے اُسے صاف کر رہی ہوں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ اتنے دنوں تک تشریف کیوں نہیں لائے مگرے کیوں ہیں تشریف رکھنے دیتے جاتے ہیں، کہنے کچھ پیش کروں۔ آپ ناشہ کر چکے؟  
لوموف۔ تسلیم میں ابھی کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔

نالیہ۔ سگریٹ پیجئے گا۔ یہ لیجئے یا سلائی ہے۔ آج تو موسم اچھا ہے، لیکن کل ایسا پانی برسا کہ سنتے ہیں سب کسان کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن یہ کیا ہے۔ آپ تو بہت بڑھیا چکن بنے ہیں کیا کہیں تماشا دیکھنے جا رہے ہیں؟ آپ کی صحت گرا سکل کچھ ابھی ہو گئی ہے۔ مگر پیئے آپ یہ بتائے کہ آپ اس قدر بن مٹن کے کیوں نکلے ہیں؟

لوموف۔ (گھبرا کر) دیکھئے نہ بیگم صاحبہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اور میں سہو کر رہا ہوں کہ آپ میری بات بغور نہیں... جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو تعجب ہوگا، یہاں تک کہ آپ خفا ہو جائیں گی۔ مگر میں (الگ) اُف کتنی سردی ہے!

نالیہ۔ آخر کیا بات ہے (خاموشی) جی؟

لوموف۔ میں کوشش کروں گا کہ چند الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر دوں۔ میری بچپن سے آپ کے خاندان



سے واقفیت ہے۔ میرے چچا اور چچی سے آپ کے والد اور والدہ کی ٹری وڈ سستی تھی۔ اور اس کے علاوہ صبا  
 آپ خود جانتی ہیں، میرا چڑیا باغ آپ کے ڈھاک کے کھنڈل سے اصل ملا ہوا ہے  
 مثال یہ۔ معاف کیجئے گا قطع کلام کر رہی ہوں، آپ نے کہا ”چڑیا باغ میرا ہے“ کیا وہ باغ آپ کا ہے؟  
 لوموف۔ جی ہاں میرا ہے

مثالیہ۔ یہ دیکھئے۔ چڑیا باغ تو ہمارا ہے۔ آپ کا کہاں سے ہو گیا۔

لوموف۔ جی نہیں بلکہ صاحب وہ میرا ہے۔

مثالیہ۔ یہ تو میرے لئے ایک نئی بات ہے۔ وہ آپ کا کیسے ہو گیا۔ وہ تو ہمارا تھا۔

لوموف۔ جی نہیں آپ کا خیال غلط ہے۔ وہ میرا ہے۔

مثالیہ۔ ذرا سوچئے تو وہ آپ کا کب سے ہو گیا۔

لوموف۔ ”کب سے“ کیا؟ مجھے جانتا تھا کہ وہ تو ہمیشہ سے میرا تھا۔

مثالیہ۔ معاف کیجئے۔

لوموف۔ یہ تو کاغذات سے صاف ظاہر ہوتا ہے میری چچی کی دادی نے آپ کی بھیمس کے دادا کے کسانوں  
 کو یہ باغ دے دیا تھا، اس لئے کہ انہوں نے میری چچی کی دادی کے لئے اینٹیں جلائی تھیں۔ ان کسانوں  
 نے ۴۰ برس تک اس باغ پر قبضہ رکھا، لیکن جب...

مثالیہ۔ واقعات باطل اور ہیں۔ آپ نے جو فرمایا یہ بالکل صحیح نہیں، ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے اس باغ کو  
 اپنا سمجھتے آئے ہیں ہمیں آخر بحث کرنی کیا بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔  
 لوموف۔ میں آپ کو کاغذات دکھا دوں گا۔

مثالیہ۔ واہ۔ واہ ہم تیس برس سے ایک باغ کو اپنا سمجھ رہے ہیں۔ اب کیا رنگی ہم سے کہا جاتا ہے کہ وہ  
 باغ ہمارا نہیں۔ مجھے یہ باغ بالکل عزیز نہیں، لیکن مجھے اس نا انصافی پر غصہ آتا ہے۔

لوموف۔ خدا کے لئے میری بات تو سنئے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، میری چچی کی دادی کے لئے آپ کی  
 بھیمس کے دادا کے کسانوں نے اینٹیں جلائی تھیں اس کے بدلے میں چچی کے دادا نے...

نالیہ جچی پھسچی دادا دادی یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ باغ میرا ہے اور بس۔  
لوموف۔ میرا ہے!

نالیہ۔ ہمارا ہے! چاہے دو دن تک ثبوت دیتے رہیں، چاہے آپ پکس پکٹیں ہیں کرائیں باغ ہمارا ہے ہمارا ہے۔ میں نہ آپ کی چیز لے لیا جاسکتی ہوں نہ اپنی مفت میں دینا جاسکتی ہوں اور یوں جیسا آپ چاہیں۔

لوموف۔ مجھے باغ کی ضرورت نہیں، میں تو صرف اصولاً بحث کر رہا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو اسے میں آپ کے نذر کر سکتا ہوں۔

نالیہ۔ میں خود اسے لے سکتی ہوں، وہ تو میرا ہے۔ مگر آپ بھی خوب ہیں۔ مجھے میری چیز دے رہے ہیں یہ تو اخلاق کے خلاف ہے، بلکہ بے تمیزی ہے

لوموف۔ یعنی آپ مجھے ایک بے ایمان بھی ہیں جو آپ کی چیز دبا بیٹھا ہے، بگیم صاحب میں نے اب تک کبھی بے ایمانی نہیں کی ہے، اور کسی کی کیا جرات ہے کہ وہ مجھ پر اسکا الزام لگائے (پانی، پڑیا باغ میرا ہے!

نالیہ۔ جھوٹا باغ میرا ہے!

لوموف۔ میرا ہے!

نالیہ۔ جھوٹا ہے۔ میں آج ہی اسے ثابت کر دوں گی! ابھی آدمیوں کو بھیج کر اسے کٹوا ڈالوں گی۔

لوموف۔ اور میں اُن سب کی گردن کٹوا ڈالوں گا

نالیہ۔ آپ کی کیا حقیقت ہے؟

لوموف۔ (دل پر ہاتھ چڑایا باغ مجھیں آپ! میرا ہے!

نالیہ۔ آپ اپنے گھر پر چلے جتنا چلاتے ہوں، یہاں مہربانی فرما کر آدمیوں کی طرح سے بات کیجئے۔

لوموف۔ اگر مجھے استدعا اختلاف نہ ہوتا تو میں آپ کو دکھا دیتا (چلا کر) چڑیا باغ میرا ہے!

نالیہ۔ میرا ہے!

لوموف - میرا ہے!

نٹالیہ - میرا ہے!

(۴)

چوبوکوف - یہ آخر کیا ہے؟ آپ لوگ کیوں چلا رہے ہیں۔

نٹالیہ - بھئی ان صاحب کو بتا دو کہ چڑیا باغ کس کا ہے ہمارا ہے یا انکا۔

چوبوکوف - ہمارا ہے بھائی وہ تو۔

لوموف - جی نہیں آپ تو صرف مجھے یہ توف بھتے ہیں اور میرا مذاق اڑاتے ہیں، اچھر ہمارے اس طرح

سے پیش نہیں آتے۔ آپ ہمایہ نہیں ڈاکو ہیں۔

چوبوکوف - جی آپ نے کیا فرمایا؟

نٹالیہ - چڑیا باغ ہمارا ہے۔ میں کبھی اسے دینے پر راضی نہ ہوں گی!

لوموف - یہ تو ہم کبیری میں دیکھ لیں گے۔

چوبوکوف - اچھا! مجھے اب معلوم ہوا۔ آپ مقدمہ بازی کے لئے ایک بہانہ نکالنا چاہتے تھے۔ کیا فساد

طبیعت ہے! مگر تمہارا تو سارا خاندان ہی فساد یوں اور لغتوں سے بھرا ہے

لوموف - جناب میرے خاندان کو برا نہ کہئے۔ ہمارا خاندان بہت شریف ہے۔۔۔ کم از کم ہمارے یہاں کوئی

ایسا تو نہیں نکلا جو آپ کے دادا کی طرح علاقہ کو روٹ کر اسکے جیل خانہ میں بیٹھا ہو۔

چوبوکوف - مگر تمہارے یہاں تو سب پاگل تھے

نٹالیہ - سب سب!

چوبوکوف - تمہارا دادا شرابی تھا اور تمہاری چچی ایک برصی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

لوموف - آپ کی اس کبیری تھیں (دل پر ہاتھ) اے۔۔۔ پانی!

تمہارا باپ پیو تھا۔ جواری تھا۔

نٹالیہ - اور تمہاری چچی جیسی فساد کن بھی ہوئی ہی نہیں۔

لوموف - بایں پیر سو گیا... آپگ تنادی ہیں۔ .. ننگے ہیں... ہائے (دل پر ہاتھ) اور انتخابات  
 کے زمانہ میں... میری ٹوپی کہاں ہے  
 نالیہ - کینہ، بے ایمان، ذلیل!  
 لوموف - (دل - ٹانگ - ٹوپی)  
 چوبوکوف - کل جا میرے گھر سے اور پھر کبھی آیا تو خیر نہیں!  
 لوموف - ہر بھاگ جاتا ہے

(۵)

چوبوکوف - اور دیکھو تو اس بد معاش کی جرات - تمہارے یہاں شادی کا پیغام لے کر آیا تھا!  
 نالیہ - کیا پیغام؟  
 چوبوکوف - تمہارا داد بنا چاہتا ہے۔  
 نالیہ - اچھا! تم نے یہ پہلے سے کیوں نہیں کہا؟  
 چوبوکوف - سچ کہا کیا بکس کا - ہلکس کی چکن سینکر آیا تھا  
 نالیہ - (حسرت سے) پیغام لایا تھا! بلاؤ! بلاؤ! داپس بلاؤ!  
 چوبوکوف - کسے  
 نالیہ - بلاؤ! واپس بلاؤ۔

چوبوکوف - (پچھلے کر) خدا ان عورتوں سے بچائے۔

(۶)

لوموف - میرا دل بہت دھڑک رہا ہے - ٹانگ بائیں سن ہو گئی پٹیوں میں جیسے کوئی پھری بھونک رہا ہو۔  
 نالیہ - معاف کیجئے گا ہماری گفتگو ذرا گرم ہو گئی تھی... اب مجھے خیال آتا ہے... چڑیا بازع دافقی  
 آپ کا ہے...

لوموف - سینہ میں درد ہو رہا ہے کپٹنی پٹی جانی ہے۔

نالیہ۔ بازع باع آپ ہی کا ہے۔۔۔ تشریف رکھئے ہم غلطی پر تھے۔۔۔  
 لوموف۔ میں تو صرف اصولاً۔۔۔ مجھے بازع عزیز نہیں، صرف اصول۔  
 نالیہ۔ جی ہاں باطل بکا ہے۔۔۔ آئے اب کسی اور چیز پر گفتگو کریں۔۔۔  
 لوموف۔ میرے پاس تو کاغذات موجود ہیں، میری جی کی وادی نے آپ کی پھپھی کے دام کے کسانوں کو۔۔۔  
 نالیہ۔ جی ہاں، جی ہاں۔۔۔ اب آپ شکار کھیلنے کب جائیں گے؟  
 لوموف۔ شکار کھیلنے کیا جاؤں۔۔۔ میرا کتا سٹو تو مر گیا!  
 نالیہ۔ کیا انوس کی بات ہے۔۔۔ کیسے؟  
 لوموف۔ معلوم نہیں (ٹھنڈی سانس) کیا لا جواب کتا تھا۔ قیمت کو الگ چھوڑے۔۔۔ میں نے ۱۲۵ روپے  
 کو خریدا تھا۔۔۔ مگر کتا۔۔۔  
 نالیہ۔ آپ نے قیمت تو بہت دی تھی۔۔۔ دیکھئے ہم نے اپنے کتے کرن کو ۸۵ روپے میں خریدا اور  
 وہ آپ کے سٹو سے کہیں اچھا ہے۔  
 لوموف۔ کرن سٹو سے اچھا! آپ بھی کیا باتیں کرتی ہیں (دبھی) کرن سٹو سے اچھا ہے!  
 نالیہ۔ ارے! ایس کیا شک، اُس کا جواب تو نواب صاحب کے پاس بھی نہیں۔  
 لوموف۔ معاف کیجئے گا، وہ کا نا ہے اور کانے کئے کی کوئی قیمت نہیں۔  
 نالیہ۔ ارے! کا نا۔ آپ تو معلوم ہوتا ہے آج بحث پر تے ہیں پہلے تو چڑیا بازع اپنا بتایا۔۔۔ اب کہتے  
 ہو سٹو کرن سے اچھا ہے۔ آخر آپ ہر بات کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔  
 لوموف۔ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھے یا تو اندھا سمجھتی ہیں یا بوقوف مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ آپ کا  
 کتا کرن کا نا ہے  
 نالیہ۔ غلط ہے!  
 لوموف۔ کا نا ہے  
 نالیہ۔ (چلا کر) آپ جھوٹ بولتی ہیں!

لوموف۔ مگر خدا کے لئے چلوئے نہیں مجھے اختلاج ہوتا ہے (پلا کر) خدا کے لئے اب بھٹہ ختم کیجئے اور چپ ہو جائے۔

ننالیہ۔ جب تک آپ یہ زنائیں گے کہ ہمارا کرن آپ کے سٹو سے اچھا ہے۔

لوموف۔ برا ہے!

ننالیہ۔ اچھا ہے!

لوموف۔ ہزار گونہ بدتر ہے۔ خدا کرے یہ آپ کا کرن مجھے، ٹھنڈا ہو جائے!

ننالیہ۔ آپ کا سٹو دلیپے ہی سریل ہے، اس کے مرنے سے کیا فرق ہوگا!

لوموف۔ (رو کر) خدا کے لئے اب چپ ہو جائے مجھے اختلاج ہوتا ہے۔

ننالیہ۔ میں اور چلاؤں گی۔

(۷)

چوبوکوف۔ اب کیا ہوا؟

ننالیہ۔ ہاں اچھے آئے۔ ان کو بھادو۔ ہمارا کرن زیادہ اچھا لگتا ہے یا ان کا سٹو۔

لوموف۔ آپ یہ بتائے کہ آپ کا کرن کا نسہ کب نہیں۔

چوبوکوف۔ کچھ بھی ہو سکا جواب کہیں نہیں۔

لوموف۔ مگر میرا سٹو تو اس سے اچھا ہے؟ سچی بات کہئے۔

چوبوکوف۔ ہاں، تمہارا سٹو بھی اچھا ہے، مگر ذرا بڑا ہے اور ناگیس چھوٹی بڑی ہیں۔

لوموف۔ (اختلاج) واقعات دیکھئے واقعات۔ پارساں کے شمار میں میرا سٹو آپ کے کرن

سے کہیں آگے نکل گیا تھا...

چوبوکوف۔ جی ہاں اس بچے کو کسی نے اس کے لٹھی اردی تھی۔ اچھی چیز دیکھ کے سب ہی کو حد ہوتا،

پ خود حد کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آپ نے اس وقت یہ بحث چھیڑی ہے۔

لوموف۔ اور آپ خود کیسے ہیں۔ جانتے تو ہیں شمار کے نام سے، لیکن اصل مقصد نواب صاحب کے

یہاں فساد پھیلنا ہوتا ہے ... ہاے دل ... آپ فساد میں -

چوبوکوف - کیا میں فساد میں ہوں (چلا کر) منہ بند کر

اوموف - فساد میں !

چوبوکوف - بد ذات، سور -

لوموف - بڑھا چو ہا۔ بے ایمان

چوبوکوف - چپ رہ نہیں تو مجھے کتے کی طرح گولی اردوں گا، بد معاش -

لوموف - سب کو معلوم ہو جائے دل - آپ کی پہلی بیوی آپ کے کان کھینچتی تھی - آپ کو ٹھوکتی تھی ...

ہائے ہائے میں گرا جاتا ہوں ...

چوبوکوف - اور تجھے عشق کر نیکی لئے ایک چارن کے سوا کوئی نہ ملی -

لوموف - ہائے ہائے ... دل بھٹ گیا ... کندھا الگ ہو گیا ... میرا کندھا کہاں

ہے ؟ ڈاکٹر ...

چوبوکوف - سور چوٹا بد معاش ...

لوموف - کوئی جواب نہیں دیتا -

نٹالیہ - ارے وہ مر گیا ... مر گیا -

شور ذیل، پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے -

لوموف - آگ - آگ - آگ - پانی ... میں کہاں ہوں ؟

چوبوکوف - تم جلدی سے شادی کر لو اللہ ... اور جہنم میں جاؤ - (ہاتھ ہلا کر) سگیم صاحبہ لڑکی دینے

پر راضی ہیں :

لوموف - ہائیں ... کیا ... کس کا ؟

چوبوکوف - ارے وہ راضی ہیں !

نٹالیہ - (سانس) ابھی زندہ ہیں ... ہاں ہاں میں راضی ہوں -

لوموف۔ ہاں کس کو... (ہاتھ ہلا کر) مجھے بہت خوشی ہوئی... بتائے تو بات کیا ہے...  
 ہاں: جی ہاں میں سمجھ گیا... دل... مجھے بہت خوشی ہوئی ہے (ہاتھ چوم کر) انگ باطل سن ہو گئی  
 نتالیہ۔ میں... میں بھی خوش ہوں... مگر اب تو ان لیے کہ ہمارا کرن آپ کے سٹوے اچھا ہے۔  
 لوموف۔ جی نہیں میرا کتا زیادہ اچھا ہے۔

چوبوکوف۔ ہاں اب خانہ دانی خوشی شروع ہوئی... قاضی کو بلاؤ۔

لوموف۔ میرا کتا زیادہ اچھا ہے۔

نتالیہ۔ ہمارا کتا زیادہ اچھا ہے۔

چوبوکوف۔ قاضی کو بلاؤ! قاضی کو!

پردہ

(ردی سے)



# اقتباسات

ماورہند میں کثیران میں نے حال میں ایک کتاب "ماورہند" ۱۹۶۱ء کے نام سے شائع کی ہے جس پر انگریزی اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اور ہندوستان کے خلاف خیالات و جذبات پیدا کرنے کے لئے اس کتاب کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کا بڑا حصہ کھوٹا سا ہندوستانی لکھنا شروع کرنے کی ترغیب کرتا ہے۔ مصنف نے ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کو تعلیم یافتہ طبقہ پر حملہ کھول کر زہر اگلا ہے ایک ہندوستانی رئیس کا تول نقل کیا گیا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان سے گئے تو اس کے ۳ ماہ بعد ہندوستان میں نہ کوئی باکرہ عورت رہے گی نہ ایک روپیہ۔

تعلیم یا تنہا کی فکر معاش کی خوب ہنسی مازائی گئی ہے اور مصنف کو یاد نہیں رہا کہ اچھے وطنی مالوف اور دیگر ملک میں بھی یونیورسٹی میں تعلیم پانے والوں کی بڑی تعداد اخلاق حتیٰ ہی کے لئے تعلیم نہیں حاصل کرتی بلکہ دو گھنٹی والا دروازہ "اور اپنے نام کی تختی" ان طلبہ کی ذہنیت کا بھی جزو ظلم ہے اس میں شک نہ ہو۔ یعنی اور ٹیگور ہی کی قید نہیں ہارو ڈویل اور آکسفورڈ و کمبریج میں اس سے خالی نہیں۔ مصنف نے ہندوستان کی تاریخ کا بھی ایک مختصر سا خاکہ دیا ہے جو شاید کسی اسکول کی کتاب سے ماخوذ ہے نہایت فخر کے ساتھ مصنف نے مسئلہ کا وہ وعدہ پیش کیا ہے کہ "ہندوستان کا کوئی باشندہ اپنے مذہب وطن، نسل، رنگ، مذہب سے کہنی بہادر کی کسی نوکری یا کسی عہدے سے محروم نہ دکھا جائیگا" اور فرماتی ہیں کہ ذات کی قید میں یا بنیاد مظالموں کے شکار ہندوستان کی فضا میں یہ ایک انقلابی گولتھا جو کہینی نے چھپا اگر وہ وعدہ سچ ہوتا تو ممکن ہے ایسا ہی ثابت ہوتا لیکن مصنف کو شاید معلوم نہیں کہ اس وعدہ کی ضرورت بار بار ہی لئے پڑتی رہی کہ اس پر عمل کبھی نہیں ہوا مسئلہ میں یہ وعدہ دہرا لیا گیا، پھر مسئلہ میں سی کا اٹھا دیا ہوا مسئلہ اور مسئلہ میں خود مدرس کے گورنر سراسر مذہب کی شہادت موجود ہے کہ وہی ترین عہدوں کے علاوہ اور تمام ملازمتوں کا دروازہ باشندگان ہند کے لئے بند ہے۔ مسئلہ کے ہنگامہ

سے آٹھ دن قبل ہنری لارنس نے یہی دکھا دیا۔ اور ان لوگوں کی شہادت کی ایک ضرورت یہ ہم کو آج بھی خود کس رنگ و نسل کی تفریق کے مظاہر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔

عوض کتاب کے تقریباً ۲۵۰ آخری صفحات اسی قسم کے خیالات و جذبات سے ہمیں اور انگلستان اور ہندوستان کے انگریزی اخبارات ان کو خوب اجمال رہے ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ اگرچہ اس طرح متعلق کیا جا رہا ہے لیکن اس میں بعض وہ تلخ حقیقتیں ہیں جن سے انکار ناممکن ہے۔ عورت کے ساتھ ہندوستان میں جو سلوک ہوتا ہے وہ ہماری معاشرت کا تاریک ترین پہلو ہے۔ اور مصنف نے اس کے ثبوت میں ڈاکٹر ولز اور دیگر مشاہدوں کی ایسی تلخ شہادتیں پیش کی ہیں جن کے پڑھنے کے بعد زوگڑ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک ہندوستانی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شرم سے عرق عرق ہو جائے اور اگر اپنے اندر زندگی کی ذرا سی بھی چنگاری رکھتا ہے تو اس ظلم کو مٹانے میں اپنی پوری سعی صرف کر دے۔ کاش تعلیم یافتہ ہندوستانی ان ناگوار انصیوں کو پڑھ کر جو مصنف نے جمع کر دی ہیں شرمائیں اور دیکھیں کہ یورپ کی بد اخلاقی پرنسپلں بجانے کے بجائے اگر وہ اپنی معاشرت کی کمزوریوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں تو زیادہ مفید ہے۔ دوسرے کی آنکھ کے تنکے کی تلاش میں اس قدر نہ ہٹک ہو نیکی بجانے کیا اچھا ہو کہ ہم اپنی تنگہ نظریہ کی طرف متوجہ کریں۔

ایٹ انڈیا کی پریچندنی کتابیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں تاریک ترین زمانہ غالباً ایٹ انڈیا کی پریچندنی کی حکومت کا زمانہ رہا ہے۔ اس عہد میں خصوصاً صنعتی اور زرعی تباہی نے جو شکل اختیار کی اس نے ہندوستان کی معاشرتی زندگی کی بنیاد ہلا دی۔ لیکن افسوس کہ ہندوستانی جہاں اپنی قوم کے کارناموں سے ناواقف ہیں وہاں اپنی قومی مصائب کے علم سے بھی محروم ہیں۔ معاشی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے ہندوستانی طالب علموں کا فرض ہے کہ اس عہد کے عظیم کشمکش اور درد آمیز انقلاب کی تاریخ اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اپنے محاسن کے بیان میں بالذکر کا جتنا امکان ہے اس سے کہیں زیادہ مصائب کی ذکر بھری کہانی کے دہرانے میں اس نے علمی دینداری کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہیے۔

حال میں مختلف کتابیں اس دور کے تغیرات کے متعلق شائع ہوئی ہیں جن سے طالب علم کو ان کا غذات کا کچھ کچھ پہ چل جائے گا جن کے مطالعہ سے وہ اس عہد کی تاریخ میں مدد لے سکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اسکو لی اور فرنگزنگال کے انتظامات مالگڈاری پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ابھی اسکو فرڈیونیوٹی پریس نے سٹڈیوں میں کتاب *Studies in the Land Revenue*

Hi-History of Odungah 1769-87 شائع کی ہے۔ عطا دیوانی اور بندوبست دوامی کردین نیگال کی تاریخ کا سب سے اہم زمانہ ہے۔ اس کتاب میں انڈین، کرافٹ وغیرہم کی پوری مینی رپورٹ، مسٹرپریس کی رپورٹ بابت عہدہ قانونگو اور دوسرے عملی نسخوں سے اقتباسات درج ہیں۔

سراج فارست نے لارڈ کارنوالس کے سرکاری کا غذات کا مجموعہ مع تہید دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ کا غذات میں دوسرے دلچسپ واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ٹیپو سلطان سے انگریزوں کی جنگ اور کا نظام حکومت وغیرہ لیکن اس ضمن میں ہم ان کا غذات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو بندوبست دوامی سے متعلق شائع کئے گئے ہیں۔

ایک تیسری کتاب میں سرولیم نوٹرنے ایٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ قیام (۱۷۷۰ء سے اختتام ۱۸۵۸ء) تک پیش کی ہے

ان تینوں کتابوں کا بڑا حصہ چونکہ اصلی ماخذوں سے لیا گیا ہے اس لئے ان کا مطالعہ تحقیق کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

### انگریزی جاپانی معائنہ

جامعہ کے گذشتہ پرچم میں ایک مضمون نگار نے برطانوی سیاست خارجہ کے مسائل کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس میں بحر الکاہل اور امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے تعلقات کا سنجیدگی تھا کپتان م۔ ڈیکینڈی نے اگست ۱۹۰۷ء کے رسالہ *Nineteenth Century* میں باب ”شرق بعید اور انگریزی۔ جاپانی تعاون“ کے عنوان سے ایک طویل مضمون پر قلم فرمایا ہے جس میں انگریزی رائے عامہ کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ جاپان کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور عہد نامہ برطانیہ کے لئے اس وقت زیادہ ضروری ہے

اور امریکہ کی خاطر پانچ سال پہلے جاپانی معاہدہ کی تمنیخ سے متوقع نتائج نہیں نکلے۔ فاضل مصنون نگار لکھتا ہے کہ ہمارے بہت سے امریکن دوست صاف صاف اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اگر ہم نے پچھلے دنوں استعد ذلت سے وجہ کارویہ نہ اختیار کیا ہوتا تو وہ ہماری دوستی کی کہیں زیادہ قدر کرتے۔ اس بیان کی سچائی نے اپنا اثر دکھایا ہے اور آج وہ انگریزی اخبارات اور اہل سیاست بھی جو امریکہ سے دوستی کے بہت حامی ہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ بس اس کے آگے جانا بہت مشکل ہے۔ ہم بیشک آپ کی دوستی چاہتے ہیں اور آپ کی مدد اور آپ کے تعاون کے طالب ہیں لیکن ان چیزوں کی قیمت بھی ضرورت سے زیادہ گراں ہو سکتی ہے۔ مصنون نگار نے مسئلہ کے حالات کا جبکہ جاپانی انگریزی معاہدہ پر مد خط ہوئے تھے۔ موجودہ حالات سے مقابلہ کیا ہے اور ان میں یہ شبہت ظاہر کی ہے کہ اس وقت بھی بین ایک غیر متحد یورپ کی بھڑک سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور دوسرے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے اعراض حاصل کر سکی فکر میں تھا آج بھی چین ہی چاہتا ہے اور دوسرے اگر چہ جاپان یا ہندوستان کو فوراً کوئی فوجی خطرہ نہیں لیکن اس کے ملک سیاسی دشمنی کی تبلیغ سے اس کے نظام جماعت کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔

”جاپانی۔ انگریزی معاہدہ کی تمنیخ سے سوائے اس کے امریکہ سے تعلقات بہتر ہو گئے (اور لہذا) ایک اہم چیز ہے) اور کوئی فائدہ نہیں ہی سے ہوا۔ برخلاف اس کے اسٹریلیا پر اب ڈر رہا ہے، سنگاپور پر ایک بحری مرکز کے قیام کا گراں اور پر غارت گرد ویریش ہے جاپان کے احساس نفس کو صدمہ پہنچا ہے اور ہماری طرف سے اسے شبہات پیدا ہوئے ہیں چین میں حالت ابتر ہے جس سے تجارتی نقصان ہے، نو صیالگ بھیجی پڑ رہی ہیں، روسی خطرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور سلطہ کی تحریف کے مسئلہ میں حاصل ہونے والے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔“

”بہترین علاج تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں پھر سے معاہدہ کر لیا جائے لیکن یہ ناقابل عمل ہے۔ انگلستان اس کی تجویز اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ یہ معلوم ہوگا اس کی منوخی اور تجدید کی کوشش میں بس اپنے اغراض کا خیال کیا۔ جاپان بھی ایسا نہ کرے گا کیونکہ اس کا غور یہ اجازت نہیں دیتا کہ مسئلہ میں جو دولت ہوئی ہے اس کے متعلق ظاہر ہو کہ اس سے کچھ نقصان ہوا۔۔۔۔۔“

”چین اور شرقِ بعید میں امریکہ کے تعلقوں کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی جتنی جاپان کی مدد کی۔ لیکن امریکہ نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ وہ اپنا کچھ کسی ایسے رویہ کا پابند نہیں کرنا چاہتا ہے جو ان کی آزادی عمل میں حائل ہو۔ یہ جذبہ آزادی کتنا ہی قابلِ تعریف کیوں نہ ہو لیکن مدول کے اس اتحاد کے لئے سخت ہلک ہے جس کے بغیر چین ہر ایک بات میں مال جائے گا۔ اور اپنے خزانے کی ادائیگی کو ہمیشہ مالتا رہے گا۔“

”جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں دو فریقوں میں تعاون زیادہ آسان ہے بہ نسبت ۲ یا ۳ فریقوں کے۔ اور چونکہ چین کے معاملہ میں ۳ مدول کا تعاون شکلِ ثابت ہوا ہے اور چونکہ جاپان اور انگلینڈ کے اغراض اور دلوں کے بہ نسبت زیادہ ملتے ہوئے ہیں اس لئے یہی بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں قوموں میں زیادہ قریبی رشتہ تعاون کے قیام کی کوشش کی جائے۔“

اطالیہ میں فاشستی حکومت۔

مؤقرہ مصروفات Round Table نے اپنے جون کے پرچم میں اطالیہ کی گذشتہ پانچ سال کی حکومت پر ایک مضمون شائع کیا ہے جو مفید اور دلچسپ معلومات سے پر ہے۔ ہمارے ملک میں جب کہیں Dictatorship یا نام کی ضرورت پر کچھ لکھا ہوتا ہے تو اٹلی کے اصلی حکمران موسولینی کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ اس لئے اس حکمران اور اس کے سیاسی فرقہ کے اعمال کے متعلق اگر یہاں بھی لوگوں کو دقتاً فوقاً کچھ معلوم ہوتا ہے تو غیر مفید نہ ہوگا!۔

گذشتہ پانچ سال میں فاشستی پارٹی سیاسی اور معاشی حیثیت سے اپنی قوت کو برابر مستحکم کرنے میں مشغول ہے۔ موسولینی نے اپنی مخصوص صاف گوئی سے کام لیکر حال میں ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ ہمارا حکومت قوم کی مرضی سے قائم نہیں قوت سے قائم ہے۔ چنانچہ سیاسی قوت کو بڑھانے کے لئے شعبہ جات میں کوشش کی جا رہی ہے۔ فاشستی جماعت کا نشان (لکڑیوں کا ایک گٹھا) قومی نشان قرار دیدیا گیا ہے۔ سال بھی فاشست فرقہ کے برسرِ حکومت آنے کی تاریخ سے گنا جاتا ہے۔ چنانچہ اطالوی اخباروں پر آپ کو پانچواں سال لکھا ہوا دیکھا۔ تمام مدرسوں اور دفتروں میں فاشستی سلام لازمی۔ کوئی دیوانی یا بلوری ملازم مجاز نہیں کہ فاشستی عقائد کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالے۔ تمام معلولوں اور مدرسین کو فاشستی

عقائد سیاسی قبول کرنا پڑتے ہیں۔ کوئی شخص جو یہ عقائد نہ رکھتا ہو دوسری سہ نہیں بن سکتا۔ آج تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ غانگی مباحثہ و گفتگو میں فاشستی خیالات کی مخالفت کرنیکی وجہ سے، آج ہر طرف کردے گئے۔ اخباروں میں ایسی یکسانیت ہو کہ پڑھنے والے کو فوراً محسوس ہونے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات و رسائل زبان سے ”ہاں جی گویم“ کہہ رہے ہیں۔ فاشست جماعت کے علاوہ تمام سیاسی فرقہ توڑ دے گئے ہیں اور انکو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کے لئے تین سے پانچ سال تک کی سزا ہے۔

ظاہر ہے کہ ملک میں ”امن“ ہے!

## شذرات

جامعہ یکم اگست کو کھل گئی ہے۔ علاوہ پرانے طالب علموں کے اس سال نئے طلبہ بکثرت داخل ہو رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ کے طرز تعلیم اور طرز زندگی کے قدردانوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اہم زہد فرد

ہم تہ دل سے اُن سب ہم معصروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ازراہ حب قومی جامعہ کے مقاصد کو عظم دوست حضرات کے سامنے پیش کیا اور لوگوں کو اس دس گنا کی طرف توجہ دلائی۔ خداے تعالیٰ انہیں ایسا اجر دے۔ اور توفیق عطا کرے کہ پھر ضرورت کے وقت ہماری مدد کریں۔ دوستی اور چٹانگت میں دستور ہے کہ احسان کا شکریہ مزید احسان کے مطالبہ کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ کیا ہیں اس قسم کا شکریہ ادا کرنے کی اجازت ہے۔

ہم خصوصیت کو تو ہم معصرتیج کے ممنون احسان ہیں جس نے بجائے مایہ کے جامعہ اور اہل جامعہ پر نکتہ چینی کر کے سچی عہد دہی کا حق ادا کیا ہے۔ ہم نے بہت عورت سے جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے کے پاپیلاٹو اور دوسرا مفصل مضمون پڑھا اور اس میں سے ضروری باتوں کا انتخاب کر لیا کی کوشش کی جہانگ ہماری سمجھ کام کرتی ہے جناب مدیر کا اہل اعتراف یہ ہے کہ جامعہ کے اساتذہ ”دانا یا ان فرنگ“ کے فضل و کمال کو مرعوب ہیں اور ”تھنہ مغرب“ سے بچنے یا ”خالص“ اور ”بے آمیزہ“ ”اسلامیت“ کے حامل کر نیکی آئی کوشش نہیں کرتے جتنی خود جناب مدیر کا اپنے خیال میں کر رہے ہیں۔ موصوف ازراہ شفقت بزرگانہ کارکنان جامعہ کے خلوص اور لگی سرگرمی اور محنت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ انہیں یہ بات بھی مل رہی ہے کہ وہ بچانے سے مراد تنقید کے جس کی طرف رسالہ سچ گفتگو دہائی کرتا ہے ”میر می پگڈنڈی“ پر چل رہے ہیں۔

ہم جناب مدیر کی ان محبت آمیز تحریر کیوں کو اہل جامعہ کے لئے بہت مفید سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ باوجود اتھائی کوشش کے اہل جامعہ شیطان کے شر سے محفوظ نہیں اس لئے ہر سچے پبی خواہ کی نصیحت انکے لئے عبرت کا سامان اور خطایا مان کا سرمایہ ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں شیطان مشرق و مغرب کا پابند نہیں اس کے فریب کے جلال سب کہیں بھی ہیں اس کے فتنوں میں سے ایک فتنہ خطابت اور فتنہ لیڈری بھی ہے جس میں آج کل ہندوستان مبتلا ہے۔ ہم جناب مدیر سچ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے اس فتنہ سے بچنے کی بھی دعا کریں جس کی زد میں ہم ہر روز رہتے ہیں خدا کرے ہم اپنے قومی شاہکار کا یہ قول کہیں نہ بھولیں کہ عشق کا رے ست کہ بے آہ و فغاں بزرگ نند

جناب مدیر کے خیال میں انکے اور اہل جامعہ کے نقطہ نظر میں اصولی اختلاف ہے۔ موصوفیہ اسلام چاہتا ہے جس میں نہ علوم ہوں نہ فنون نہ کتب خانے نہ عجائب خانے وغیرہ لیکن جامعہ کے لوگ اس اسلام کے قائل ہیں جس میں یہ سب چیزیں موجود ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جامعہ کے اکثر اساتذہ اور بعض طلبہ "سچ" کا بہت غور سے مطالعہ کرتے ہیں لیکن ہے کسی دن اُن پر اس کے معنائیں کا اثر ہو اور وہ "میر" جی پگڈنڈی کو چھٹو کر "سید" جی شاہراہ پر چلنے لگیں۔

لیکن شکل یہ کہ مسلمان راہ حق پر آنکھ بند کر کے کلامی کے سہارے نہیں چل سکتا۔ اُس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ آنکھ کھول کر اس شمع ہمیں کی روشنی میں جاوہ پیمانی کرے جو خدا نے خاصانِ خدا کے ہاتھ ہمارے رہنمائی کے لئے بھیجی ہے۔ اس کے لئے ضرورت پڑتی ہے دانشِ نادر کی جس کے جذبات و احساسات سے جناب مدیر جناب ہیں اور عقلِ سلیم کی جس سے موصوفیہ نیز رہیں۔

ہم اس گفتگو کو زیادہ طویل نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے کہ یہ مسائل بحثِ مباحثہ سے حل نہیں ہوتے



بلکہ عقل و فکر اور وجدان سے بشرطیکہ توفیق الہی شامل حال ہو۔ البتہ یہ یقین دلانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ  
 ”دانا یا ان فرنگ سے مرعوب ہو ناؤ رکنا راستہ اور کارکنان جامعہ ان بزرگوار کے فلسفہ کو توڑنا اپنا سب سے  
 بڑا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دل سے اس خیال باطل کو دور کرنا چاہیں کہ یہ لوگ فوق العادہ قوتیں رکھتی ہیں جس  
 شخص کو لڑنا چاہئے لیکن ان کو اس میں زیادہ رکاوٹ وہ حضرات پیدا کرتے ہیں جو فرنگستان کی طاعوتی سطوت و جبروت  
 کا سکھ مخالفیت کے پردے میں لوگوں کے دل پر اس طرح بٹھاتے ہیں جیسے ناقابت اندیش و عظیم شیطان  
 کے دعب سے چملا کے دلوں کو دھلاتے ہیں یا نا سمجھ کھلایاں بھوت پریت کے ذکر سے بچوں کو ڈراتی ہیں۔“

جناب مدیر کایہ بھی بڑا احسان ہے کہ انہوں نے جامعہ والوں کو اکبر مرحوم اور اقبال مدظلہ کے کلام کی  
 طرف توجہ دلائی ہے۔ جامعہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اکبر کے سچے شیدائی ہیں لیکن وہ اُن کے کلام کو پڑھ کر  
 رونے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ خوب ہنستے ہیں اور حیرت و بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اکبر مرحوم  
 نے جامعہ کے ایک استاد سے جو اُس زمانہ میں عالمِ علم تھو کہا تھا کہ یوں اگر فلسفہ کے پہاڑ پر چڑھتے ہو تو وہاں  
 پہنچ کر نرک جانا جہاں مذہب نظر سے چھپ جائے بلکہ اس بندھی پر جا کر دم لینا جہاں سے وہ پھر نظر آنے  
 لگے۔ جامعہ والے علوم و فنون کے ساتھ ہی رویہ رکھتے ہیں جس میں انہیں خدا سے برتر مزد و کامیابی عطا کریگا  
 اسی طرح اقبال کی شاعری جامعہ کے بہت سے لوگوں کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ اسی  
 سے انہیں یہ پیغام ملتا ہے کہ ”معاشیات“ اور ”معاذیات“ کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنا موت کی دلیل ہے  
 اور مسلمانوں کی قوم کو مرنے کی کوئی جلدی نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ ابھی بہت دن خود زندہ رہے اور دنیا  
 کو اپنے قلب کی حرارت سے زندہ رکھے۔“

ماڈرن ریویو بابتہ ماہ اگست میں ج۔ ٹ۔ سنڈر لینڈ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس  
 میں انہوں نے امریکہ کے شاہیر کے اقوال ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید میں نقل کئے ہیں۔ اس  
 کے آخری حصہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل امریکہ کا جذبہ ہمدردی مسئلہ میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان

کے ایوان وکلائے سندھ ذیل تجویز منظوری تھی، ڈسینٹ نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ ایوان وکلائے  
قرار پایا کہ ریاستہائے متحدہ کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ اہل امریکہ کی مرضی کے مطابق اہل ہند کی جدوجہد کا جو  
وہ حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے کر رہے ہیں بلا مدخلت اس طرح اعتراف کرے جس سے انہیں  
آزاد ہونے میں مدد ملے۔

خدا جانے امریکہ کی پارلیمنٹ کی سب تجاویز ہندوستان کی انجمنوں کی طرح محض گہنی فصل کے لئے  
پاس کی جاتی ہیں یا اسی تجویز کی خصوصیت ہے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو اب تک اس کی تعمیل  
کی کوئی علامات نظر نہیں آئیں۔ انہوں نے اگر دیکھا ہے تو یہ دیکھا ہے کہ امریکہ کی ایک خاتون نے ”مادر ہند“  
جیسی ناپاک کتاب لکھ ہمارے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساری دنیا میں بدنام کر نیکی  
کوشش کی ہے۔ لیکن بے ایوان وکلائے اس کتاب کے خلاف بھی طوفان خطابت اٹھانے میں بخل نہ کرے۔

جس طرح ہندوستان میں یورپ کے پڑے ہوئے لوگ بائبل سے چند قابل مضحکہ بچے جاتے ہیں  
اسی طرح چین میں بھی چینی طلبہ ساختہ یورپ تفنن طبع کا سامان ہم پہنچاتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ  
صاحبزادے اپنے ساتھ محض مغرب والوں کی خفیف المھر کاٹی اور سطحی باتیں لاتے ہیں جنہوں نے غربت  
میں تعلیم پائی ہے وہ کیا لائے ہیں ہاتھ پیر کو مہلا ناکندے اچکا نا اور جند بالذات گناہ جو جرمنی سے آئے  
ہیں انکا مبلغ کمال بر شراب، فوجی رعب داب اور منڈا ہوا ہے۔ انگلستان سے آنے والوں کو ایک آنکھ  
کا چشمہ تو نہیں لیکن حرف کی کھڑی آواز اور آدمی ویسا نہ آوہی عالمانہ شان ہاتھ آئی ہے۔ امریکہ سے لوٹے  
ہوئے طلبہ سب سے زیادہ چلاتے ہیں اور رشتہ ہاوا اشاعت مقابلہ کی دعوت اور چلے ہوئے فقرہوں کی  
فکر میں رہا کرتے ہیں ان کی امریکی تیز روی محض اعصالی بے معنی کا نتیجہ ہے اور ان کی حایت نسوان کی  
حد ہے کہ عورتیں سر پر چھوٹے بال رکھیں، کوتاہ قبائیں پہنیں اور نئے نئے ناچ سیکھیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں یہ مرض کم ہوتا چلا ہے۔ جانے کو تو بہت سے لائق اور زالائق طلبہ

ہر سال بوپ جاتے ہیں لیکن وہاں سے واپس آکر ان میں سے کم بوپ کے طرز معاشرت کے اتنے دلعادہ ہوتے ہیں جتنے بظاہر چین کے نوجوان ہیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سہ ماہی رسالے نے اپنے آخری نمبر میں سوسائٹی کے سالانہ مجلس کی رپورٹ شائع کی ہے جو ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۰۷ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی آمدنی تقریباً ۳۲۰۰ پاؤنڈ اور مصارف ۳۰۰۰ پاؤنڈ تھے۔ پورے سال میں سوسائٹی کی طرف سے ۱۶ لکھ ہوئے جس میں پروفیسر کلن کا مضمون ”تیرہویں صدی میں ایرانی زندگی اور شاعری“ اور پادری گریم ہلی صاحب کا مضمون ”ہندی شعرا اور شاعری بیسویں صدی میں“ خاص طور قابل ذکر ہیں۔ تین کتابیں سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئیں جن میں سیر بیون کی کتاب ”گلبدن بگم کی سوانحی اور یادگار حالات“ اور شیری کی ”اکھیری“ بھی ہیں دو کتابیں زیر طبع ہیں جن میں ایک ڈاکٹر گلیئر کا ترجمہ الاساطیر ہے اور دوسری انسانیات کے لئے قبول کر لی گئی ہیں جو مصارف ہیما ہونے پر فوراً طبع کی جائیں گی۔

سونے کا معجزہ چمک اسکول کے لئے مخصوص ہوا انگلیم ہائی اسکول کے طالب علم کیتھ آڈم کو لکھے مضمون ”لارڈ کرزن کا عہد حکومت بحیثیت واسرے“ کے صلہ میں دیا گیا۔

عہدوں کے بغیر تبدل کے سلسلہ میں یہ بات دیکھ کر پروفیسر مارگولیتسکا زمانہ نائب صدارت ختم ہو گیا اور انکا انتخاب عہدہ ڈاکٹر کے لئے کیا گیا۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی ایک کامیاب جماعت ہے اور اگر نیکوئی میں خالص علمی مذاق کی کساد بائی دیکھتے ہوئے اس کا معیار فضیلت غنیمت ہے۔ لیکن پروفیسر مارگولیتسکا کے منصب لوگوں کے جوہر کے سبب سے مسلمانوں کو بلکہ ہر قوم کے ارباب علم کو اس کی طرف سے ایک گونہ بے اعتباری ہے خصوصاً اب جب کہ مارگولیتسکا صاحب اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے ہیں یہ بے اعتباری اور بڑھ جائیگی۔ کاش لوگوں کو یہ احساس پیدا ہو کہ علمی کام کرنے والوں پر باگاہ علم سے یہ ذمہ داری فائدہ کی گئی ہے کہ وہ کسی مصیبت اور کسی وجہ سے بھی

چھاپی سے مندر موڑیں۔

جامعہ کی اردو اکادمی نے جن کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا ان میں سے بعض وقت پر شائع نہ ہو سکیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دہلی میں لمبے کاتب کم ہیں اور جو ہیں وہ اتنے مشغول رہتے ہیں کہ متعدد کتابوں کی لکھائی ساتھ ساتھ نامکن ہے کوشش کی جا رہی ہے کہ دوسرے مقامات سے اچھے خطاط لکھائیں۔ اسے انشاء اللہ جلد کامیابی ہوگی اور اردو اکادمی اس کام کو جو اس نے اپنے ذمہ لیا ہو سرا انجام دے سکیگی۔

اگر بجائے پھر کے چھاپنی کے لوہے کے ٹاپ کی چھاپنی ہمارے ملک میں رائج ہو جائے تو یہ فوٹس جاتی رہیں۔ جامعہ علیہ کے مطبع میں ٹاپ کی چھاپنی کا بہترین سامان موجود ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ چھاپنی لوگوں کو مرغوب نہیں ہم اپنی کتابیں اب تک اتنی تکلیف دہ طریقہ سے چھپواتے ہیں بعض لوگوں کی رائے ہے کہ رسالہ جامعہ اتھنا ٹاپ میں چھپوایا جائے۔ ہم قارئین کرام سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر رسالہ رسالہ اس ٹاپ میں چھپے جس میں ابلا لکھتہ کا ایک حصہ چھپتا ہے تو وہ پسند فرمائیں گے یا نہیں۔

مطبع جامعہ علیہ اسلامیہ دہلی

۷

زیر نگرانی محمد محیب بی۔ اے (آکسن)

باتھام سید کرامت اللہ پٹر پبلشر شائع

کتبہ ایس ایم نصیر



# جہاز

۹ ماہ ربیع الاول ۱۳۴۶ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء نمبر ۳

## فہرست مضامین

۱۶۲	علامہ سر محمد نقشبالی بالقرابہ	فلسفہ خودی
۱۶۹	یوسف حسین خان صاحب بی اے (جامعہ شریعہ) پٹنہ	عرب ذرا سبھی اجبات ہیں (۴)
۱۸۳	ڈاکٹر سید عابد حسین	عشقوان شباب کی مجموعی نفسی سیرت (۱-۴۲)
۱۹۱	سید محمد عمر صاحب	۱- دورِ بین
۱۹۱	محمد مجیب صاحب بی اے (اسکس)	۵- ایک جھلک (فسانہ)
۲۱۱	سید انصاری صاحب بی اے (جامعہ)	۶- ہندوستان کا قدیم تمدن
۲۲۰	رپورٹ	۷- فرقہ وارانہ تعلیم
۲۲۳	حضرت شاقب کھنوی مدظلہ	۸- غزل
۲۲۴	ڈاکٹر سید عابد حسین	۹- کثیر شب ماہ میں نظم
۲۲۵	.....	۱۰- اقتباسات
۲۳۰	.....	۱۱- تنقید و تبصرہ
۲۳۶	.....	۱۲- شذرات

# فلسفہ خودی

ترجمہ دیباچہ اسرار خودی انگریزی ایڈیشن

”یہ مسئلہ کہ علم (تجربہ) محدود و مراکز سے حاصل ہوتا ہے اور پیشہ فیض ”یہ“ کے محدود و جامع میں بل بوتہ پر  
آخر میں جا کر ناقابل تشریح ہو جاتا ہے۔ یہ پروفیسر براؤن نے گئے الفاظ میں لیکچر جب وہ ان ناقابل تشریح مراکز علم  
سے آگے بڑھتا ہے، تو اس کو ایک وحدت نظر آتی ہے جس کا نام وہ ”مطلق“ رکھتا ہے، اور جس میں تمام محدود  
مراکز علم اپنی محدودیت کو کھود دیتے ہیں۔ اس بنا پر اس کی مانند ہیں محدود و مراکز محض ایک ظاہری شکل ہے جس  
کے نزدیک حقیقت کا ثبوت ہمہ گیری ہے (یعنی حقیقت وہی ہے جو کل کو محیط ہے) اور چونکہ تمام محدودیت ذاتی  
ہوتی ہے، لہذا اس سے نتیجہ نکلا کہ موخر الذکر محض فریب نظر ہے۔ میرے خیال میں (تجربہ) کا یہ ناقابل توجہ محدود  
مراکز کائنات کی حقیقت اساسی ہے۔ تمام زندگی انفرادی ہے۔ حیات کلی کا کس وجود نہیں۔ خدا خود ایک  
فرد ہے اور وہ سب افراد میں یکساں ہے۔ کائنات بقول سیکیگرٹ افراد کی ایک انجمن ہے۔ اس  
جم اپنی طرف سے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جو غلط و ترتیب ہم اس میں پاتے ہیں وہ ازلی نہیں ہے۔ اور تبدلات  
خود مکمل ہے۔ بلکہ یہ ہماری جلی اور شاعرانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

”ہم رفتہ رفتہ فساد سے کون کی طرف جا رہے ہیں اور اس کے حصول میں ہم خود ہی معین ہیں۔ اس انجمن  
کے ارکان معین نہیں۔ ہمیشہ نئے نئے رکن وجود میں آتے اور اس عظیم الشان کام میں تعاون کرتے ہیں۔  
اس طرح کائنات کا فعل (یعنی یکس تک نہیں پہنچا ہے۔ ابھی اس کی تکوین جاری ہے۔ لہذا کائنات کے متعلق  
کوئی کلی تصدیق نہیں قائم کیا جاسکتی۔ کیونکہ یہ (کائنات) ابھی ”کل“ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ تخلیق جاری  
ہے۔ اور انسان بھی اس میں بقدر اس کے حصہ لیتا ہے کہ وہ کم سے کم فساد کے ایک حصہ میں کہیں قائم کرنے

”طلحہ برٹسے غالباً ہیکل کے اثر سے فرد کی حقیقت کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فرد کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا۔ بلکہ  
وجود مطلق کا ایک جزو ہے۔ علامہ اقبال اس خیال کے سختی سے مخالف ہیں۔

علامہ اقبال احمد منیل کا بھی خیال تھا لیکن انتہائی شدت کے ساتھ۔

میں ادا کرتا ہے، تو ان کی اس آیت سے کہ تبارک اللہ احسن الراقیین خدا کے سوا اور خالقین کا نام لیتا  
ظاہر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کا یہ تصور فلسفہ مجمل کے جدید انگریز اربعین و تصوف و وحدۃ الوجود کی  
تمام اقسام کی مخالف ہے۔ کیونکہ انکی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا آخری نصب العین اور اس کی نجات اس میں  
ہے کہ اپنے آپ کو کائنات کی زندگی میں فنا کر دے۔ ہمارے خیال میں انسان کا مذہبی اور اخلاقی نصب العین  
نفس خودی نہیں ہے بلکہ اثبات خودی ہے اور جلی جلی اسکی انفرادیت اور یکسانی کی جڑ پکڑ جاتی ہے وہ اس  
نصب العین کے قریب تر ہوتا جاتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تخلو بخلق اللہ یعنی اپنے اندر خدا کی صفات  
پیدا کرو۔ اس طرح انسان جس قدر اس کی تارین ذات یعنی خدا سے ملالت حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ  
بے مثل و یکتا ہوتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے؟ حیات انفرادی ہے اور اس کی اعلیٰ  
شکل "اَنَا" (یعنی خودی) ہے، جس کا فرد ایک واحد مستقل مرکز ہوتا ہے۔ انسان جسمانی نیز روحانی حیثیت  
سے غیر شرک اور کافی بالذات مرکز ہے۔ لیکن وہ ابھی کامل فرد نہیں ہوا ہے جس قدر اس کو خدا سے  
بعد ہوتا ہے۔ اسی قدر اسکی انفرادیت کم ہوتی ہے۔ کامل ترین انسان وہی ہے جو اقرب الی اللہ ہو۔  
اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقرب الی اللہ خدا میں فنا ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے خود خدا کو وہ اپنے  
اندر جذب کر لیتا ہے۔ حقیقی انسان نہ صرف اس مادی دنیا کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے بلکہ اس کو  
محرک کے خود خدا کو اپنے "اَنَا" میں جذب کر لیتا ہے۔ حیات ایک آگے بڑھتی والی جاوہر حرکت ہے

۱۔ مولانا رومی نے اس خیال کو بہت واضح کیا ہے۔ ہمیں کے زمانہ میں ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں غائب ہو گئے  
حضرت علیہ السلام نے مارے غم کہ آپ کے بارگاہ میں جب آپ جنگل میں اور ہرادر سرگرداں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش  
پوری نہیں تو غیب سے ندا آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ماری دنیا میں گم ہو جاتا تھا۔  
حقیقی انسان دنیا میں گم نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔ میں اس سے ایک قدم آگے جا رہا ہوں اور یہ اضافہ کرتا ہوں  
درویش مریقی گم خود۔ اس سنی کے باور مرد بود۔  
اس مضمون کے متعلق سر کا شریعی خوب ہے۔ لگاؤ بزرگ شید احمد + سرمد گوندک + احمد شید



اس کو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح اپنا راستہ ہمیشہ صاف رکھتی ہے۔ اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ مسلسل خیالات اور خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اپنی توسیع اور بقا کے لئے اس نے کچھ آلات مثل جو اس دھن وغیرہ کے ایجاد، یا بذریعہ ارتقا پیدا، کر لئے ہیں جو اس کو رکاوٹوں کے جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یعنی پھر (فطرت) ہے لیکن پھر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کو توسیع دینے کے اظہار کے لائق بناتی ہے۔ "انا" کو آزادی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کے راستہ سے تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ یہ کچھ تو غما ہے اور کچھ محبور۔ (حدیث) سچا ایلن جبر و اختیار کے بین ہیں ہے اور کامل آزادی اس ذات و احد کی قربت سے حاصل ہوتی ہے، جو سب سے زیادہ آزاد ہے یعنی خدا۔ مختصر یہ کہ حیات عبارت ہے آزادی کی جدوجہد سے۔

خودی "انا" اور قل شخصیت

انسان میں مرکز حیات "انا" یا خودی (شخص ہے) شخصیت الطاب کی ایک حالت ہے اور اس کا تسلسل اس حالت کے قیام سے وابستہ ہے۔ اگر الطاب کی حالت قائم نہ رہے تو استرخا پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ خودی (شخصیت) یا حالت الطاب انسان کی سب سے گراں قدر کامیابی ہے، لہذا اس کو خبردار رہنا چاہئے کہ پھر استرخا کی کیفیت اسپرٹاری نہ ہو جائے جو چیز کشیدگی کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوتی ہے۔ وہی ہمارے غیر فانی بنے کا موجب ہوتی ہے۔ اس طرح شخصیت کا تصور ہمارے سامنے قدر قیمت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔ اس سے خبر و شر کا سلسلہ ہو جاتا ہے۔ جو خبریں خودی کو تسلیم کرتی ہیں وہ خبریں اور جو اس کو کمزور کر رہی ہیں وہ شر۔ آرت۔ مذہب۔ اور اخلاقیات پر خودی ہی کے نقطہ نظر سے رائے قائم کرنی

۱۵۔ آرزو و امید کا صدور اکند + ذکر افضل یا بغیر ازہند

۱۶۔ الطاب (Tension) کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اسے خودی کا احساس قوی ہو  
۱۷۔ استرخا (Relaxation) کا ترجمہ ہے اس سے مراد ہے نفس کی وہ حالت جب اس میں یہ احساس کمزور ہو

۱۸۔ توجہ از سرکار جسم و گشت بہ نفع و از ذوق عمل محروم گشت  
۱۹۔ آں شنیدنی کہ وہ جہد قیام دگر سخندان و تلف نادرے تیرم

جانب سے: اقل اقل پر جو میرے اعتراضات ہیں، وہ دراصل ان تمام غلط فہمیاں و نظامات پر وارد ہوتے ہیں جو زندگی کو چھوڑ کر موت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ جس میں زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بجائے اس کو یاد دلائی سحر کر کے اس سے بھاگنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس طرح "انا" کی آزادی کے سلسلہ میں مادہ کا عقد خیش آتا ہے۔ اسی طرح غیر فانییت کے سلسلہ میں وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بزرگان نے ہیں یہ بتلایا ہے کہ وقت کوئی غیر محدود و خط و خط مفہوم مکانی نہیں جس سے ہم سبھل کو خواستہ خواستہ گزرنا ضروری ہے۔ یہ تصور غلط و مزورج وقت کا ہے اور وقت کا ایک ناپاک تصور ہے، مخلص وقت کوئی طول نہیں رکھتا۔ شخصی لافانییت ایک آرزو ہے۔ تم اگر کو شخص کر دو تو اسے حاصل کر سکتے ہو۔ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس زندگی میں خیال و عمل کے وہ طریقے اختیار کریں جو اطباب کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوں۔ بلوہ مذہب بھی تصوف اور اس قبیلہ کے دوسرے نظامات اخلاقی ہماری غرض پوری نہیں کر سکتے لیکن یکٹنا بیکار بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک مدت دراز کی سعی و عمل کے بعد کم کو کچھ دیر کے لئے خواب آور و عداؤں کی حاجت پڑی جاتی ہے۔ اس قسم کے اعمال و انکار گویا ایم زندگی کی باتیں ہیں۔ پس اگر ہمارے اعمال اطباب کی حالت کو قائم رکھنے کے لئے ہوں تو اغلب یہ ہے کہ مرگ کے صدمے سے اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ مرنے کے بعد استرخا کا ایک زمانہ آج جیہ کہ قتل میں بزنح یا درمیانی حالت کا ذکر آیا ہے۔ یہ زمانہ مشترک رہے گا اس سلسلہ استرخا۔

۱۔ "عربی شاعر عربی ربی صلیم کے اعتراضات" کے زیر عنوان ۱۹۱۹ء میں ۲۰ پر علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں:۔ انسانی جدوجہد کا آخری مقصد حیات ہے جس سے مراد ایک شاندار طاقتور اور کثیر العمل زندگی ہے، تاہم انسانی آرٹ اسی آخری مقصد کے تحت ہوئے چاہیں اور مرثیے کی قیمت اس کی حیات بخش قوت کے لحاظ سے میں ہونی چاہئے۔ اعلیٰ ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خستہ قوت عمل کو پیدا کر دے اور محکوم زندگی کے مشکلات سے مولا متاثر کر کے لائق بنا دے۔ جو چیز خواب آور ہے اور ہم کو گرد و پیش کی اس حقیقت سے غافل کر دینے والی ہے جس کے سحر کرنے پر ہمارے زندگی، وہ زوال اور موت کو انجام ہے۔ آرٹ میں ایفون نوشی نہ ہونی چاہئے۔ "تھیل فی مفرق" کا حصول دور خطاط اور پستی کی ایجاد ہے، جو محکوم میں لاکر قوت و حیات سے بے بہرہ کر دینا چاہتی ہے۔ علامہ راب اول فلاسوف حکیم و ازرگہ کو غنڈان قدیم انجھ صبر باد و خاک پلک شامی، دلمے سرخ و رنگ شامی ۱۹

کی حالت کے بعد صرف وہی "انا" باقی رہیں گے، جو موجودہ زندگی میں بہت مختصر رہی ہیں۔ اگر چاہے اتنا۔  
 حیات میں تکرار و اعادہ کا گزرنے میں تاہم قبول و لذت کا، بگمان کے اصول کے مطابق مشربا ہی باطل  
 ممکن ہے۔ وقت کو محلوں میں تقسیم کر کے ہم اس ممکن کا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں اور اب اس کی تعمیر کو مکمل  
 معلوم ہوتی ہے۔ وقت کی حقیقی نوعیت ہم کو اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب ہم اپنے عمق تر خودی پر  
 غائر نظر ڈالتے ہیں۔ حقیقی وقت خود زندگی ہے جو بقا و دوام حاصل کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اس مخصوص  
 حالت و مقام کو قائم رکھے، جس کو اس نے آس و دم قائم رکھا ہے۔ ہم وقت کے محکوم اس وقت تک کہ بنے  
 ہیں، جب تک ہم وقت کو ایک مکانی چیز سمجھتے ہیں۔ مکانی وقت ایک ریخیر یا ہے جس کو زندگی نے اپنے دے  
 اس عرض سے انحراف کر لیا ہے کہ موجودہ ماحول کو جذب کر کے حقیقتہً ہم وقت کی پابندی سے آزاد  
 ہیں۔ اور وقت سے بے قیدی کا احساس دہم کو اس زندگی میں بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ احساس بالکاشفہ  
 محض ماضی ہوگا۔

### خودی کی تربیت

خودی عشق سے متکرم ہوتی ہے۔ یہ فطر عشق بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، مگر اس  
 سے مراد خواہش جذب و تخیل ہے۔ اسکی اعلیٰ ترین شکل تخلیق قدور و مقاصد رائے حصول کی سی ہے  
 عشق، مانتق و مشوق دونوں کو منفرد کرتا ہے (مذاکی) بے مثل و یکتا ترین ذات کے وصل و حصول کی  
 کوشش و طاقت کو شخص (منفرد) بناتی ہے۔ اور مینا یہ مفہوم مطلوب کی فردیت پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ  
 کوئی اور چیز طالب کی فطرت کو تسکین نہیں دے سکتی۔

جس طرح عشق سے خودی متکرم ہوتی ہے، اُس طرح سوالیہ ہے وہ ضعیف ہوتی ہے۔ یہ چیز جو  
 بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو سکتا ہے، ایک دو متناہی کا لڑکا جوائے والدین کی دیکھتا ہے۔

۱۔ میر و عشق و فردا در گھر ہر دل خود ملے دیگر مگر  
 ۲۔ نقطہ نور سے کہ تمام وجودی است، نہ پر فلک ماضی و زندگی است، انہ  
 ۳۔ لے فرام کہ ہاں شیاں غایب گشتہ، رہ بظلال انا متعلقہ انہ

میں حاصل کرتا ہے۔ وہ بھی سائل ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی جو دوسروں کے خیالات کو اپنے خیالات بنانا پس خودی کو مستحکم کرنے کے لئے کم کو چاہئے کہ عشق (راہل جاذبہ کی قوت) پیدا کریں، اور ہر قسم کے سوال یا فقدان عمل سے بچیں۔ نبی مسلم کی حیات مبارک سے کم از کم ایک مسلم کو تو عمل جاذبہ کا سبق مل ہی سکتا ہے۔

نہوی کے کسی دوسرے حصہ میں میں نے اشارہ کیا اسلامی اخلاقیات کے عام اصول بیان کئے ہیں۔ اور شخصیت کے تصور کے سلسلہ میں انکے معنی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خودی کو بے مثل دیکھا ہونیکے لئے تین مراحل طے کرنا پڑتے ہیں:-

(۱) اطاعت قانون۔

(۲) ضبط نفس، جو احساس نفس و خودی کا آخری مرتبہ ہے۔

(۳) نیابت الہی۔

نیابت الہی اس دنیا میں ارتقاء انسانی کی تیسری اور آخری منزل ہے۔ نائب حق خلیفہ اللہ علی الارض ہے۔ یہ کامل ترین ”انا“ ہے جو بنی نوع انسان کا نصب العین، اور زندگی کی روحانی و جسمانی سربراہ ہے۔ اس کے اندر ہماری حیات نفسی کے تمام انتشارات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ ترین قوت اس میں اعلیٰ ترین علم سے متحد ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں خیال و عمل اور عقل و جبلت ایک ہوتے ہیں۔ وہ عقل انسانیت کا مگر آخری ہے۔ اور ارتقاء حیات کی تمام صعوبتیں اور تنگیوں اس لئے گوارا ہو سکتی ہیں کہ اگلا آخری انجام اسکی شکل میں ظاہر ہو نہیوالا ہے۔ بنی نوع انسان کا وہ حقیقی حکمران ہے۔ اس کی حکومت، حکومت اللہ فی الارض ہے۔ وہ اپنی فطرت کے خزانے سے دوسروں کو زندگی کی دولت ملاتا ہے اور انکو اپنے قریب زلاتا جا رہا ہے۔ جس قدر ہم منازل ارتقاء طے کرتے جاتے ہیں اسی قدر اس کے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے قریب سے میزان حیات میں اپنے آپ کو بلند

لے نفس تو مثل شتر خود پر دست، خود پست خود مودر خود شتر، گھر خیرانی جہاں اپنی کنی، زیر ترانہ میلانی کھا  
عہ انی جہاں فی الارض خلیفہ، اخصائے کعبہ بنوا زید، فرخ انی جہاں، ساز و ترا۔

کہتے جا رہے ہیں۔ نوع انسانی کا ذہنی و جسمانی دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ ہونا اس کی آئینہ ایک لازم مقصد ہے۔ فی الحال وہ محض خیالی ہے۔ لیکن ارتقا مانسانی ایک آئینہ قوم کے وجود میں آنے کی خبر دے گا جس کے افراد کم و بیش ایسے بے مثل و یکتا ہونگے جن میں ہر انسان نابھ حق کے والدین ہوئی صلاحیت ہوگی جس حکومت اللہ علی الارض سے مراد وہ جمہوریت ہے جس کے افراد کم و بیش یکتا ہونگے، اور جس کا صدر <sup>بہت</sup> یکتا ترین فرد ہوگا جس کا امکان اس دنیا میں ہو سکتا ہے۔ نتیجتاً اس آئینہ قوم کی ایک جھلک نظر آئی مگر اس کی دہریت اور امارت پسندی نے اس کے سارے فلسفہ کو مٹ کر دیا۔

---

مترجمہ ارشاد الحق صاحب پور!

# عرب فرانسیسی ادبیات میں

## رولان کا گیت

(۴)

پادری ترپان نے جب رولان اور اولیوئے کی تو تومیں میں سنی تو اسنے پاسب آیا اور خدا کا واسطہ دیکھنے لگا خدا کے لئے رحم کرو، اب جھگڑ کر کھینچے کا وقت نہیں اگر تم اپنا زنگھما بجا بھی دو گے تو کیا اپنی جانیں بچا سکتے ہو، میں اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ شارل واپس آئے گا ہمارا بدلے لیگا اور عرب خوش خرم اپنے گھروں کو نہیں لوٹے پانچ بار یہ بھائی فرانسیسی ہماری جھڑپیں کو ختم کریں گے، ہمارے لئے روئیں گے اور ہماری لاشوں کو ماتم کرتے ہوئے فرانس واپس لے جائیں گے یہیں کلیساؤں میں دفن کرینگے اس طرح ہمارے شہیدوں کو معززے اور سونہر نہیں کھانا نہیں گے۔

یہ کہہ کر زنگھما ہونٹوں پر رکھا اور اس زور سے بجا یا کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا، پہاڑیوں اور اس پہا کی وادیوں میں آواز گونج اٹھی، یہاں تک کہ شارل نے اس کو اس کے فاصلہ پر رولان کے زنگھے کی آواز سنی، شارل اور اس کے ساتھیوں میں یوں باتیں شروع ہوئیں۔

شارل۔ یہ آواز مجھے رولان کے زنگھے کی معلوم ہوتی ہے، شاید اس پر کچھ مصیبت پڑی ہے اور وہ ہمیں واپس بلانا چاہتا ہے۔

گیٹلون۔ نہیں یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے، آپ بڑھے ہوئے لیکن بچنے کی باتیں ابھی تک نہیں گئیں آپ رولان کو ابھی طرح جانتے ہیں، وہ بڑا مغرور آدمی ہے، آپ کے کہے بغیر اس نے عربوں کو شکستیں دیکر نوبل تک بنا دیا۔ کسی وہ ایک خالی محکوش کے لئے دن دن بھر زنگھما بجا کر تھے، آج بھی میرے خیال میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے، بھلا عرب اس سے لڑنے کی کیا ہمت کرینگے؟ آسمان کے تلے اسکا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ آپ گھوڑے پر سوار ہو جائے، وہم میں نہ پڑئے، یہاں بیکار ٹہرنے سے کیا فائدہ

اب ہم اپنے بزرگوں کے وطن کے باہل قریب پہنچ گئے ہیں۔  
 رولان بڑی دیر تک نہ ٹٹکھا بچا تا رہا، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گیا، شارل نے پھر دوبارہ نواب نام سے  
 مخاطب ہو کر کہا۔

شارل۔ سنتے ہو کسی لمبی سانس سے کوئی آدمی نہ ٹٹکھا بجا رہا ہے،  
 نام معلوم ہوتا ہے ہمارا کوئی بہادر مصیبت میں ہے، میں یقین سے کہتا ہوں کہ ضرور ہمارے آدمی ہیں وہیں  
 مدد کے لئے بلا رہے ہیں، جو آپ سے اس کام میں سستی کرنے کو کہے وہ آپ کو دغا دیتا ہے، آپ فوج کو  
 مسلح کر کے جواب میں اپنے فوجی نہ ٹٹکھے بچائے، آپ سنتے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں یہ رولان ہے جو اٹیک  
 میں دم توڑ رہا ہے۔

شارل نے فوج کے سارے نہ ٹٹکھے بچائے کا حکم دے دیا۔ آپس میں سب لوگ کہنے لگے وہ معلوم  
 ہمارے آدمی کیسی مصیبت میں ہیں، رولان زندہ لیٹا کہ نہیں، اگر زندہ ملا تو اسی کے ساتھ ذرا عربوں پر  
 تلواروں کے دھندلاتے چلائینگے بعضوں کی آنکھیں نہج میں آنسوؤں سے ڈبڈب رہی ہیں، شارل نے ذہلاً  
 گینٹون کو حراست میں قید کر دیا ہے، بگنون اس پر یقین ہے اس نے گینٹون کو باورچی خانہ کے  
 نوکرانوں کے ساتھ رکھا ہے جو رقت اسے اس کی دغا بازی کی سزا میں محسوس کرتے رہتے ہیں کبھی داڑھی بونچے  
 ہیں، کبھی بوجھیں اکھڑتے ہیں، کبھی کھونے مارتے ہیں اور کبھی ریحہ کی طرح اس کی گردن میں زنجیر ڈال کے  
 اوپر اوپر گھماتے ہیں۔

ملک گینٹون کی دغا بازی اور اسے حراست میں دئے جانے کا مضمون ایک دم یہاں سے شروع کر دیا گیا ہے، اس کی  
 تصور واری کا کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی تفصیل، خطقیہ مسلسل کا اسی لئے غالباً محاط نہیں رکھا گیا کہ مفصل واقعات سب  
 کو معلوم ہوں گے، ان گنتوں کا یہ مقصد نہیں کہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو بلکہ گیت انہیں روایتوں کو منظم شکل  
 پیش قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں جنہیں ہر ایک جانتا ہے اور جو بچہ بچہ کی زبان پر ہیں ان روایتوں کو پیچھلنے والے کو  
 تھوڑا! اس سوال کا جواب میں قطعیت کیساتھ صرف کلیسا کا نام پیش کیا جاسکتا ہے جس نے اپنی تمام قوتیں عربوں کے خلاف  
 فرانسیسیوں کی نئی قوم کو ابھارنے میں صرف کیں۔

شارل اپنے ساتھیوں کے ساتھ غصہ و رنج میں بھاڑا ہوا رولان کی مدد کو واپس جا رہا ہے، یہاں  
روادیاں ملے کر رہا ہے، ہر کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا ہے، ہر شخص دم میں ہلک رہا ہے کہ اے  
والہ رولان کو اس وقت تک جتنا چھکا رکھو جب تک کہ وہ اس کی مدد کو اس کے پاس نہ پہنچ جائیں، یہاں  
روہوں کو ہلاک کرنے کا عہد کر رہا ہے۔

رولان بچا رہا ہزاروں اور میدانوں کو انکھیں بھاڑ بھاڑ کے دیکھ رہا ہے، جدھر دیکھتا ہے اپنے  
ساتھیوں کی لاشیں دکھائی پڑتی ہیں، لاشوں کو دیکھ کر وہ یوں کہتا ہے۔  
”پیارے ساتھیو! خدا تمہاری روحوں کو بہشت میں جگہ دے“ پاک پھولوں میں ہتھیں لٹاتے  
بھلا تم جیسے وفادار ساتھی کہاں ملیں گے؟ تم نے ہمیشہ میری مدد کی اور تمہاری مدد ہی کے بھر دوسرے پر میں نے  
شارل کے لئے سیکڑوں ملک نفع کر ڈالے، واقعی تم سب کو فرانس کی پیاری زمین سے محبت تھی، میں  
تمہیں دم توڑتے دیکھتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا، اے کسی بے بسی ہے؟ پیارے بھائی ادنیوے! میں تمہیں  
کبھی وفاداروں کا اگر کسی نے مجھے جان سے مارا تو تمہارے غم میں جان دے دوں گا۔ دوستو! بڑے چلو  
ایک دفعہ اور میرے کہنے پر دشمنوں کو نیزوں پر دھرو۔“

رولان صرف اپنی تلوار و درندال چلا رہا ہے، ملادروں والی پونی اور عربوں کے چوہیں بنے  
ہوئے بہادر روں کو ان کی آن میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ دنیا میں کبھی کوئی ایسا بھڑور بدلہ لے گا  
جیسے حکماری کتے کے آگے جنگلی ہرن بھاگتے پھرتے ہیں، وہی حالت عربوں کے سوراؤں کی رولان کے  
سامنے ہے۔ بھلا کوئی بہادر ہو تو ایسا تو ہو، جو گھوڑے پر سوار ہو کر چڑھے اور آنا بھی نہ کر سکے تو اس کی عینیت  
چار دینار کے برابر بھی نہیں، بہتر ہے کہ وہ خانقاہ میں بیٹھ کر ہمارے گناہوں کی معافی مانگا کرے اور وہاں  
کیا کرے بلے

۱۵۱۰ء میں پہلا لڑائی ہوئی ہے لیکن اس کے نزدیک زہد و عبادت کا پیشہ نکلے اور بیکار لوگوں کے لئے ہر جگہ  
جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے کے قابل ہو وہ خانقاہ میں بیٹھ کر اللہ کے خیال بہت خوب سے مسلمانوں  
کی بہادری کا انداز بھی یہ ہے کہ کسی عابد نے میدان جنگ و غصیل ابن عیاض کو آئی تم کی باتیں کہلو بھوائی تھیں



بادشاہ ہاریل اپنے گھوڑے ٹیگنوں پر سوار ہے، جھینر لگاتا ہوا اپنے گھوڑے کو فرانسیسیوں پر چڑھانے لارہا ہے، بیدن والی دیوہوں پر حملہ کرتا ہے اور اس کی ڈھال اپنی تلوار کے دوسرے کاٹ کے اُس کے دھمکے کر دیتا ہے، اس کے بعد یوں اور آوار، جیرار اور روسلون اس کے ہاتھ سے شہید ہوتے ہیں۔ رولان نے جو یہ دیکھا تو اس طرح سیکڑوں لغتیں بھیتا ہوا مارسل کی طرف بڑھا۔

”خدا تجھے ذلیل کرے، تو نے میرے اتنے ساتھیوں کو شہید کر ڈالا، بیشتر اس کے کہ میں اور توجہ ہوں تجھ سے ان مقتولوں کی قیمت لوں گا اور تجھے اپنی تلوار کا نام تباؤں گا۔ یہ بیکہر کڑک کے جو ہاریل پہ وار کیا تو اس کا سیدھا ہاتھ شانے سے کٹ کر زمین پر جا پڑا، اُس کے بیٹے جرفا کو اس کے بعد رولان نے قتل کیا۔ یہ دیکھ کر سارے عرب چلا اٹھے۔

اے محمد مصلی اللہ علیہ وسلم، ہماری مدد کرو، اے ہمارے دیوتا و شارل سے ہمارا بدلہ لو اس نے ہمارے مقابلے کے لئے ایسے آدمی بھیجے ہیں کہ چاہے ان کی جانیں چلی جائیں لیکن میدان نہیں چھوڑتے۔  
انہیں سے ایک بولا، یاربھاگ چلو، سننے ہی ہماری فوج میں جھگڑی مچ گئی، اب کوئی کتنا ہی بلائے وہ لوٹنے والے نہیں۔“

لیکن عربوں کی اس سپاہی سے ہمارا بہت فائدہ نہیں ہوا، ہاریل کے آدمی بھاگ گئے لیکن اس کا چچا ہارگامیس والی کا رنج و غش ابھی میدان میں موجود ہے، اس کے ساتھ جھینوں کی فوجیں ہیں انکی ناکس چوڑی اور کان لمبے لمبے ہیں، وہ کم و بیش پچاس ہزار ہوں گے، وہ سب اپنے گھوڑے فرانسیسیوں کی طرف بڑھتے ہیں اور پھر کھینچ اپنی بولی میں چلا چلا کے کہتے ہیں، رولان نے انہیں آتے دیکھ کر اپنی فوج سے یوں کہا۔

رولان۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم سب آج یہاں شہید ہوں گے، ہم میں سے کوئی زندہ واپس نہ جائیگا۔ لعنت ہو اس پر جو اپنے کو دنیا کا نبی سمجھے، لڑو، مارو، آج موت اور زندگی کی کشمکش کا تماشہ ہو، دیکھو پیارے فرانس کے نام پر کہیں وہ بزدل لگنا، جب شارل یہاں پہنچ کر دیکھے گا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ خوب انصاف کیا اور جب وہ دیکھے گا کہ ہماری ایک لاش کے پہلو میں دشمن کی پندرہ لاشیں ہیں، تو وہ ہم پر رحمتیں بھیجے گا۔

دلیوے۔ اس پر لعنت ہو جو ذرا سی بھی سستی کرے۔

عربوں نے جب فرانسیسیوں کی تعداد بہت کم دیکھی تو بڑی گھنٹہ میں حملہ کے لئے بڑے ارگانیس اپنے کیت گھوڑے پر سوار تھا، سوئے کی ہمنیوں سے اسے آگے بڑھا رہا تھا، اولیوے کو دیکھ کر اس نے بڑی بھرتی سے اس پر وار کیا، اس کی تلوار اولیوے کے سینہ کے پار ہو گئی، اولیوے کو گرنا دیکھ کر یوں کہنے لگا ”تو نے برا زخم کھایا، تیری بھیبی میرے مقابلہ کے لئے تجھے لائی مشارک نے بیکار تم لوگوں کو بھانگو کی رکھوالی کے لئے یہاں بھوڑا“

اولیوے زخم کھانے لگا مگر پرائیکن اس نے پھر عبت کی اور کھڑا ہو کے مارگانیس کو یوں جواب دیا۔  
اولیوے اسے بے دین، تجھ پیرعت، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ شارل نے کچھ کھو یا نہیں، لیکن تو بھی اپنی سلطنت کے صحیح سلاطنت نہیں داس جاسکے گا، اور یہ نہ ہو گا کہ تو اپنے دس میں بیچکر ہر عورت کے سامنے شہنشاہ کے لئے کہ تو نے مجھ جیسے بہادر کو مارا ہے۔ یہ کہنے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دشمنوں میں محسوس جاتا ہے اور دوہتی تلوار چلانا شروع کرتا ہے، اگر کوئی اس وقت بے دینوں کی لاشوں پر لاشیں گرتے دیکھے تو بول اٹھے کہ ہاں اس بہادر اسکا نام ہے، پھر اولیوے باطل تک کے رولان کو اپنے پاس بلاتا ہے اور کہتا ہے ”دوست میرے قرب آؤ میرا اب آخری وقت ہے، دو گھڑی میں تم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائی گے“  
رولان یہ سن کر گھبرا جاتا ہے اور کہتا ہے۔

”ہائے خدایا! اب کیا کروں، پیارے فرانس کے کیسے کیسے بہادر ہمیشہ کے لئے آج فطرت ہوڑ ہیں یہ کہہ کے اسے گھوڑے پر غش آگیا۔

رولان کا یہ حال ہے اور اولیوے زخمیوں سے چور چور ہو رہا ہے، اس کے بدن میں اب خون نہ کو بھی باقی نہیں رہا، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا ہے، دوزر دیک کی کوئی چیز سے صاف نہ دکھائی دیتی اسی حالت میں اس نے رولان کے قریب جا کر اس زرد سے اس کے خود پر ہاتھ مارا کہ وہ نہ ناک کی جڑی تک دھس گیا۔

رولان کیوں بھائی، میں نے تمہارا کونسا قصور کیا ہے؟

اولیوے۔ معاف کرو میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، مجھے ابھی طرح دکھائی نہیں دیتا، بھلا میں نے اپنی تمام عمر میں کوئی بات تمہارے خلاف کی ہے؟

رولان۔ مجھے چوت نہیں لگی، میں نے تمہیں یہاں اور خدا کے یہاں معاف کیا، یہ کہلے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، اولیوے پر بالکل مردنی چھا چکی تھی، وہ گھوڑے سے اتر کر زمین پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے یوں زور سے دعا مانگنے لگا،  
 ”اے خدا! میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں، مجھے اپنی پاک روحوں کیساتھ جنت میں جگہ دے  
 شارل اور رولان کو اپنی رحمت کے سایہ میں رکھ۔“

اولیوے نے یہ دعا ختم کی اور ساتھ ہی اپنی زندگی کی آخری سانس لی، رولان یہ دیکھ کر رونے لگا اور اولیوے کی لاش کے پاس جا کر یوں کہنے لگا۔

”پیارے دوست! تم تمہیں سے ساتھ کھیلے، ہماری دونوں کی عمر بالکل ایک تھی، کبھی تم نے مجھے تکلیف پہنچائی اور نہ کبھی میں نے تمہیں دکھ دیا، آج تم مر گئے، میری زندگی اب دنیا میں بے کار رہے، کیونکہ اسے اپنے گھوڑے پر غش آگیا، سوئے کی رکابوں نے اسے زین پر سیدھا رکھا اور نہ وہ قریب تھا کہ گر پڑے، جب ہوش آیا تو اسے فرانسیسیوں کو مرا ہوا پایا، اس کے سب ساتھیوں کو عربوں نے ختم کر دیا تھا سب ایک پادری تریان باقی رہ گیا تھا، وہ عربوں کا بڑی دیر سے مقابلہ کر رہا تھا اور برابر دای کی طرف ہٹتا جا رہا تھا لڑائی کو دیکھ کر یوں مخاطب ہوا

”اے شریف! بغضِ مردار! اے ہمارے بہادر سوار! تو کہاں ہے؟ میں نے آج تک ڈکو اپنے دل میں جگہ نہیں دی ہے کیونکہ تو میرے پاس رہتا تھا میں نے اپنی بہادری سے تیری محبت حاصل کر لی تھی، اب تیرا میرا نیزہ بالکل ٹوٹ گیا، میری ڈھال چھلنی ہو چکی، زورہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اب میں کیا کروں، ہاں میں مرد ہو گا لیکن اپنی جان دشمنوں کے ہاتھ بہت ہنگامی ہو چکی گا۔“

تریان یہ باتیں کرتا ہوا گھوڑا بڑھانے کے رولان کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے، رولان فریخ اور عصیر غرق ہے، ایک دم سے دشمن کی طرف جو گھوڑا کھینچ کر کے بڑھتا ہے تو اٹھائیس عربوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ہر ایک

ترپان نے اس گئی گزری حالت میں بھی چھپرے کو قتل کر ڈالا، عربوں نے یہ رنگ دیکھا تو سب مل کر کہنے لگے ”دیکھنا کہیں یہ دونوں بچکے نہ جاتے پائیں، اب جو ان پر حملہ کرے وہ دغا باز ہے اور جو انہیں جتیا جانے دے وہ یزدل ہے، ان دونوں کو ہر طرف سے عربوں نے گھیر گیا۔“

رولان اور پادری ترپان چالیس ہزار عربوں کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں کوئی پشت دکھانیکا نام نہیں لیتا، عربوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ انکے پاس پھینک تو جائیں، دور ہی دور سے تیر، نیزے اور تلواریں پھینک پھینک کے مار رہے ہیں، ترپان کی ڈھال میں چھید ہو گئے ہیں اور اس کے سر کی خود بالکل ٹوٹ گئی ہے، باوجود ہر طرف سے یزدل اور تلواروں کے حملوں کے اس نے اب تک ہار نہیں مانی، اس کی آنکھیں رولان کو ڈھونڈ رہی ہیں، اسے دیکھ کر اس کے دل کو ڈھارس بندھ جاتی ہے، لڑتے لڑتے اس کے پاس جا کر اس سے یوں کہتا ہے۔

”میں نے اپنی پیاری تلوار الماس سے ہزاروں کو ٹھنڈا کیا ہے، شارل اب اگر ہمیں مردہ دیکھ گیا بھی تو یہ کہے گا کہ ہم نے عربوں کے ساتھ دروغایت بالکل نہیں رتی۔ وہ دیکھے گا کہ ہزاروں عرب میدان جنگ میں مرے پڑے ہیں اور بہت سے زخمی پڑے ہیں جن کے بدن ہمارے یزدلوں سے چھدرے ہوئے ہیں ہا ہی قوم میں جو گیت جائیں گے ان میں یہ سب باتیں بیان کجائیں گی۔“

رولان کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی ہے، جس وقت سے اس نے ترنگھا بجا یا ہے اس وقت سے اس کی کینٹیاں بھٹی جا رہی ہیں، وہ اب تک شارل کا انتظار کر رہا ہے پھر آخری دفعہ ڈروڈ سے ترنگھا بجا تا ہے لیکن اس کے بدن میں اب پہلی سی طاقت باقی نہیں۔

شارل نے ترنگھے کی آواز سنی اور ساتھیوں سے کہا ”ہائے ہماری نصیبی میرا پیارا بھتیجا رولان آج ہم سے ہشیہ کے لئے جدا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس طرح کہ اس نے اس دفعہ ترنگھا بجا یا ہے اس سے

ملاقات ختم میں حضرت خالد کے متعلق جو کہانیاں بیان کی گئی ہیں ان میں بھی اتنا سبالتہ نہیں، وہاں لیک آدمی در ہزار کے لئے کبھی سچی ہمت کر جاتا ہے، لیکن یہاں دو فرانسیسی چالیس ہزار عربوں کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب بہت دیر زندہ نہیں رہے گا، چند لمحوں کا اور زمان معلوم ہوتا ہے، اچھا اب  
فوج کے سارے جمل اس کے جواب میں بجاؤ۔“

ان بگلوں کی آواز سے نزدیک نزدیک کی سب پہاڑیاں اور وادیاں گونج اٹھیں عربوں  
نے جب یہ گونجی ہوئی آواز سنی تو انہیں خیال ہوا کہ شاید شارل پھر دوسری دفعہ ان سے لڑنے کا  
آ رہا ہے، انہیں بڑی پریشانی ہوئی، انہوں نے سوچا کہ اگر رولان زندہ ہی گیا تو شارل سے ملکر بڑا  
نقصان پہنچا سکتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ بہت جلد رولان کا خاتمہ کر دیا جائے اس کے بعد جو کچھ ہو سو ہو  
یہ ارادہ کر کے چار سو چھ ہونے عرب رولان کے مقابلہ کو نکلے، رولان نے انہیں اپنی طرف آتے  
دیکھا اور خوب تن کر گھوڑے پر بیٹھ گیا، جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک بھلا ان سب کی اس پر  
ہاتھ ڈالنے کی کب ہمت ہو سکے گی، اس نے اپنے گھوڑے ویاٹنٹ کو ہمیز لگائی اور عربوں کی  
طرف بڑھایا، پادری ترپان میں اتنی تھوڑی بہت جان باقی تھی کہ اس کے کھڑا ہوا اور رولان کی مدد  
کو چلا اور رولان کے پاس جا کر کہنے لگا۔ ”شارل اب باطل قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بگلوں  
کی آواز اس دفعہ پہاڑیوں میں بڑے زور سے گونجی ہے۔“

رولان۔ پادری کی طرف دیکھ کر، ہم دونوں ملکر عربوں کا مقابلہ آخری وقت تک کریں گے، جو گذرے گی وہ  
پس گھمڈ کرے گی، کسی عرب کی بھلا مجال ہے کہ اس وقت تک وہ ہمیں چھو بھی سکے جب تک کہ میں  
زندہ ہوں، دیکھو ایک دفعہ اور دو رولان کے جوہر دکھا دوں گا۔

ترپان۔ شارل اب آیا ہی چاہتا ہے، وہ ہمارے شہیدوں کا عربوں سے خوب دل کھول کر بدلہ لیتا۔  
عربوں میں آپس میں یوں باتیں ہو رہی ہیں۔ ”شارل اب نزدیک آن پہنچا یہ معلوم ہمارے کیا  
گت بنا گیا، ہمارے بھیمی نہ جانے کیا برسے دن دکھائیگی، اس کے فوجی بگلوں کی آواز نضائیں ہر  
طرف زوروں سے گونج رہی ہے، رولان کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو اپنے پاس پٹکنے نہیں دیتا، کوئی  
اومی جس کا بدن گوشت سے بنا ہے لڑنے کی تاب نہیں لاسکتا لیکن میں چاہے کہ شارل کے آنے سے  
پہلے ہی پہلے کسی نہ کسی طرح اسے ختم کر ڈالیں اور پھر میلان چھوڑ دیں۔“

یہ خود سے کہے کہ وہ سب کے سب رولان پر فوٹ پڑے، اسکی ڈھال توڑ ڈالی اور اس کے خود میں پڑو سے پھید کر دئے، لیکن ابھی تک اس کے زخم پر کوئی بو اڑ نہیں کر سکا، تاہم وہ تھوڑا بہت زخمی ضرور ہو گیا ہوگا۔ اسکا گھوڑا تیس زخم کھائے گر پڑا ہے، گھوڑے کے گزتے ہی جھلیش میں آسکے اس نے تلوار چلائی تو عرب بھاگ اٹھے، اسے اپنے گھوڑے ویا تنف کے مرنے کا بہت رنج ہوا، افسوس کہ وہ عربوں کا چھاپا نہیں کر سکتا، وہ ترپان کو مدد دینے کو بڑھتا ہے۔

ترپان نے دیکھا کہ رولان اس کی طرف آتے آتے کمزوری سے زمین پر گر پڑا، اسکا ارادہ ہوا کہ کسی پاس کے چتر سے جا کر پانی لائے اور اس پر چتر کے شاید کسی طسرح سے کچھ ٹکینیں پہنچے، وہ یہ ارادہ کر کے اٹھا لیکن چونکہ اس کے بدن سے بہت خون نکل چکا تھا وہ دو قدم بھی نہ چل سکا، اس نے پھر دوسری دفعہ بہت کی اور پھر زمین پر گر پڑا اور اس دفعہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا، یہ اس کی آخری کوشش تھی، رولان کو ہوش آیا تو اس نے ترپان کو مرا پایا، اس کے قریب جا کر لاش سے یوں مخاطب ہوا۔

”اے پاک انسان! تو نے سچی دین کی حمایت میں اپنی جان تک کھپا دی، حواریوں کے بعد تو ہے جس نے ہمارے مذہب کی تبلیغ میں ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں تو شارل کے بہادروں میں فرو تھا، تو نے ساری عمر عربوں کے خلاف بغض کھا اور ان سے جنگ کی، اب خدا تیری روح کو بہشت میں جگہ دے۔“

رولان ابھی طرح بھور ہوا کہ وہ خود بھی بہت دیر زندہ نہ رہے گا، اس نے اپنے زنگے تلوار پر دو زخموں کو اپنے پہلو میں رکھ لیا تاکہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اسے بزدلی کا الزام نہ دے سکے، جہاں

اسکی بھاٹ کو رولان کی شہادت بیان کرنے میں اس بات پر اصرار ہے کہ کوئی عرب بہادر اس کا جسم نہیں چھو سکا، ہٹلا رہا کہ دشمن جب اسکا بدن چھو بھی نہیں سکے تو اس کو مار کیوں کر سکتے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد چونکہ اس کی موت کا حال بھی پتہ کرنا ہے اس لئے بادل خواستہ اور ڈی سرسری طور پر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ہاں دشمنوں نے اسے زخمی کر دیا یہ بات بالکل اپنی ہی جوتی کہ جیسے کوئی کہے کہ ان رولان کے چند زخم مزور لگ گئے ہیں لیکن بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کے پاس تو بیٹھ سکے اس قسم کی جٹ و حرمی اور اپنی بڑائی کو بالافہ سے بیان کرنا دنیا کے سارے قوی منافقوں پر خرمک ہے۔

وہ پڑا ہوا تھا اس کے قریب ایک بھاڑی میں ایک خوبصورت نوجوان عرب کی لاش تھی، یہ عرب محل میں زنا تھا وہ مردہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رولان کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی تلوار اٹھانی مار دیں کہا۔ ”سارل کا شہرہ آفاق بیٹیجا بارمان گیا، اس کی تلوار پر اب میں قابض ہوں، اسے اب میں پیسہ لے جاؤں گا۔“ یہ غلط سنتے ہی رولان بے ہوشی سے چونک پڑا اور اس زور سے اس نے اپنا زنگھلا اس عورت نوجوان کے سر پر مارا کہ اس کی میچا اور دونوں آنکھیں کل پڑیں اور اس کی طرف یوں مخاطب ہوا،

”ابے غلام زادے! تیری اور یہ محبت کہ تو میری تلوار پر قبضہ کر نیکارا دہ کرے، میری تلوار پر قبضہ آسان نہیں، چاہے وہ لڑکر ہو یا دھوکے سے ہو، میرے زنگھے کا سارا سونا بھر گیا۔“

رولان میں اتنی طاقت باقی نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے، اس کی آنکھوں کے تلے اندھیرا آجاتا تھا، اس کے چہرے کا رنگ باہل حق ہو گیا تھا، غصے میں اگر سامنے کی چٹان پر تلوار کے وار دار کر ڈالے گا تو تلوار کسی طرح سے ٹوٹ جائے، لیکن وہ زماں توٹنے کا نام نہیں لیتی جب اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹی نہیں تو یوں کہنے لگا۔

”میری پیاری درد نالہ تو میری محبوبہ ہی، تیرے قبضہ میں تبرک تو یوں پوتہ ہیں، بطرس کا ایک پاگوانت ہے، ہینٹ ہائل کا خون ہے، بی بی مریم کے لباس کا ایک ٹکڑا ہے، اور سینٹ ڈینس کا بال ہے، لیٹا نہیں کہ کوئی عرب تجھے قبضہ کرے، یہ تو سچوں کا حق ہے کہ وہ تیری خدمت گزاری کریں، خدا کو اسے ایسی ٹوٹا کبھی نہ آئے کہ کوئی بزدل تجھے اپنے ہاتھ میں لے تجھ ہی سے تو میں نے سیکڑ دی ملک فتح کئے، تو کیسی خدمت چکرا را اور سفید ہے، تو سوچ کی روشنی میں ایسی جگہ ہے کہ دشمنوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، شارل جب لوئزین کی دایلوں میں تھا اس وقت خدا نے اپنے فرشتے سے اسے کہلوایا بھیا تھا کہ وہ تجھے میرے حوا کرے، تجھ سے میں نے اتوار اور پانچ، اتوار اور پانچ، اتوار اور پانچ، اتوار اور پانچ، اتوار اور پانچ، اتوار اور پانچ، اور فلانڈ، بورگن، اور فلنڈ، اور کوس اور انگلستان فتح کئے، اب میرا اور تیرا ساتھ چھوٹا ہے، خدا فرانس

میں بعض حقیقت مند دل کا خیال ہے کہ یہ چٹان جس پر رولان نے اپنی تلوار توڑنے کی کوشش کی تھی ایک پتھر کا پہاڑی سلسلہ میں روہینوس کے قریب موجود ہے۔ ذرا سی چٹان پر اس کی تلوار کے نشانات بھی ملتے ہیں۔

ہی بذلت نہ دکھائے کہ وہ کسی عرب کے ہاتھ میں جائے۔

یہ کہہ کر ولان ایک سبز جھاڑی پر گر پڑا، اس کی تلوار اوڑھ لیا اس کے پاس رکھے ہوئے تھے وہ بچھا  
 تاکہ اب اس کا آخری وقت ہو، اس نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے سیدھے ہاتھ کا دستار  
 سامان کی طرف اٹھایا، اس آخری وقت میں اُسے بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں، وہ سب ملک جو اس نے  
 بی در و نال سے فتح کئے، اپنے بہادر ساتھی، پیارا فرانس، بادشاہ شارل کی محبت جس نے بچپن سے اس کی  
 پرورش کی، سب کے سب اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں وہ سر و آہن بھرا ہے اور پھر اپنے گناہوں  
 کی معافی ان لفظوں میں مانگتا ہے۔

”اے ہمارے پیے باپ! تو نے کبھی جھوٹی بات نہیں کہی، اے وہ جس نے مرنے کے چار دن بعد  
 سینٹ لزار کو زندہ کیا، اور دانیال کو شیر کے منہ سے بچایا، ان سب کے طفیل میں اے خدا میرے سب گناہ  
 بخش دے۔

اس کا سراپی کے بازو دل پر گر پڑا، اس نے دم توڑ دیا، آسمان سے میکائیل اور دوسرے فرشتے  
 اس کی روح کو جنت لے گئے۔

شارل روٹو پہنچ کر ولان کو ہر طرف ڈھونڈتا ہے، قدم قدم پر عربوں اور فرانسیسیوں کی لاشوں  
 کے ڈھیر لگے ہیں، جب کسی طرف اس نے ولان کو نہیں دیکھا تو یوں چلایا۔

پیارے بھتیجے، تو کہاں ہو؟ ترپان اور اولیوٹ کہاں ہیں؟ میرے اور سب ساتھی کہاں ہیں؟ انہیں  
 میں اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے ڈراپلے کیوں نہ پہنچ گیا، ”وہ اپنی وارمی اس آدمی کی طرح مڑتا ہے  
 جو بڑے ہی سنج اور سوچ میں اس کے سب ساتھی اسی کے ساتھ رہنے لگے ہیں کوئی اپنے بھائی اور کوئی  
 اپنے بیٹے کا تم کو رہا ہے، بہت سوں کو تو قتل کر لیا ہے، نواب آئم جو بڑا بھدار اور جہانگیر آدمی ہے، شارل

سینٹ لزار، ارتھا اور مریم کے بھائی ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ نے مرثیہ چار دن بعد مجروحہ سے زندہ کیا، انجیل  
 جان (۱۱-۱۲)

۱۲۔ غالباً سمیٹنی فائز کی طرف اشارہ ہے جس میں دانیال کو زندہ کرنا کا عزم قرار دیا گیا اور بعد میں وہ بے گناہ ثابت ہوئے



سے یوں کہتا ہے۔

”آسان پر خباہچا رہا ہے معلوم ہوتا ہے عربوں میں ہمارے آپس کی خبر سے جھگڑائی گئی ہے وہ اب ہم سے دو کوس سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہوں گے۔ اب ہمیں چاہئے کہ صلح ہو کر اپنے گھوڑوں سے ان پر فوراً دھاوا بول دیں اور اپنے شہیدوں کا جی کھول کر بدلائیں، اس کام میں اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہئے۔ شارل۔ انوس میرے فرانس کے مارے پھول پڑ مرده ہو گئے، میرے دوستوں اور سرداروں میں سے کوئی باقی نہیں رہا، اچھا اب ان لاشوں کو جیسا کہ تیرا چھوڑے عربوں پر حملہ کی تیاری کرنی چاہئے، نزدیک کے ٹیلوں اور پہاڑیوں کو گھیر لیا جائے۔“

اس نے مکمل دیا کہ فوج کے سارے رنگے بجائے جائیں اور سب فوج حملہ کے لئے تیار ہو جائے رات زیادہ جا چکی تھی وہ گھوڑے سے اتر کر ایک بھاڑی کے پاس عبادت میں مشغول ہو گیا اور دعا کی کہ سوچ غروب ہوا اور دن باقی رہے تاکہ وہ روشنی میں دشمن پر حملہ کر سکیں، ایک فرشتہ آسمان سے اتر کر اس کے پاس آیا، یہ فرشتہ ہمیشہ اس کے پاس آیا کرتا ہے، اس نے شارل کو یوں مخاطب کیا:

”اے شارل گھوڑے پر سوار ہو جا، روشنی کی تجھے کمی نہیں ہوگی، تو نے فرانس کے سب پھول کھودے تو چاہے تو اس نقصان کا بدلہ لے سکتا ہے۔“

شارل کی خاطر سوچ جہاں تھا وہیں ٹہر گیا، عرب بری طرح فرانسیسیوں کے سامنے بھاگ رہے تھے، فرانسیسی انہیں دھکیل کے سارا گوس کی دادی تک لے گئے اور وہاں ان پر ہر طرف کا راستہ بند کر دیا، ایک طرف پہاڑ اور فرانسیسی فوجیں تھیں اور دوسری طرف دریائے ایبر پر کوئی کُل موجود تھا اور نہ کوئی کشتی انہوں نے اپنے خداؤں سے بہت التجائیں کیں لیکن کوئی دعا کارگر نہیں ہوئی اسوقت کوئی نہیں جواہیں اس مصیبت سے بچا سکے، فرانسیسیوں نے چن چن کے سبوں کو قتل کیا جو ان کی تلواروں سے بچے وہ دریائے ایبر میں ڈوب ڈوب کے مر گئے۔

جب شارل نے دیکھا کہ سب عرب مرکب گئے تو اس نے گھوڑے سے اتر کر خدا کا شکر ادا کیا گھوڑے  
 نکلے ہوئے تھے سب نے زمینیں اتار کے انہیں قریب کی چراگاہوں میں چھوڑ دیا، سپاہیوں نے وہیں  
 ڈیرے ڈال دئے، رات اتنی جا چکی تھی کہ وہ انہیں واپس نہیں جاسکتے تھے، شارل کی ساری سپاہ گھوڑے  
 چھوڑ چھوڑ کے سو گئی، شارل مسلح ایک چراگاہ کے پاس ایک سبز جھاڑی سے ٹیک لگا کے لیٹ رہا اس  
 نے دانستہ اپنے سر کے خود اور بدن کی زرہ کو اتارا نہیں، وہ ردلان کے غم میں ڈوبا ہوا تھا، اس کے  
 دل پر اسیوے اور ترپان کی موت کا بڑا صدمہ تھا، کبھی روتا تھا کبھی ٹھنڈی سانسیں لیتا تھا، کوئی آہ یا  
 گھوڑا نہیں جتھکن کیوجہ سے زمین پر دراز نہو گیا ہوا اور خراٹے نہ لے رہا ہو شارل کی ذرا دیر کو آنکھ لگی  
 حضرت جبرئیل اس کے سر پر اس کی حفاظت کو موجود تھے۔

شارل نے خواب میں دیکھا کہ بڑے زور کا طوفان آرہا ہے، آندھی چل رہی ہے، ہر طرف فضا  
 میں شعلے نکل رہے ہیں، پھر اس نے اپنے آدمیوں کو بڑی مصیبت میں دیکھا کبھی رینگے بھڑکے اور سب  
 اور کبھی شیطانوں کے گردہ انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ حال دیکھ کے اس نے کوشش کی  
 کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کو جائے لیکن وہ اس نے اپنے میں اتنی طاقت نہیں پائی کہ ایک قدم بھی اٹھا سکے  
 اس کے بعد اس نے خواب میں ایک گناہنگل دیکھا جہاں شیر غصہ میں بھرے ہوئے اس کی طرف جھپٹے ہیں  
 اس سے اور ان شیروں سے کشتی ہوتی ہے، اسے یہ معلوم نہیں کون جیتا ہے اور کون ہارتا ہے۔ پھر کیا دیکھا  
 کہ ایکس میں محل کی سیڑھیوں پر ایک رینگہ زنجیروں میں بند ہوا بیٹھا ہے، اردین کی طرف سے تین اور رینگہ  
 کو آتے دیکھتا ہے، ہر رینگہ انسان کی بولی بولتا ہے، وہ ب شارل سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

”حضور والا! اس رینگہ کو ہمیں حوالہ کر دیجئے، یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ اسے قید میں رکھیں۔ وہ  
 ہمارا جہاد محمد ہے اس کے وجود سے ہم سبوں کی تسلی ہوتی ہے، اسی آئنا میں اس نے ایک تسکاری کتا  
 دیکھا جو محل کی طرف سے دوڑ کر آتا ہے اور سب سے الگ ہری جھاڑی کے پاس سب سے بڑے رینگہ،  
 حملہ کرتا ہے، شارل ان دونوں کی لڑائی بہت دیر تک دیکھتا رہا اسے اسکا کچھ بہ نہیں لگتا کان دونوں  
 لڑ گھوڑے جھپکی بجائے ان لوگوں نے گھوڑے چھوڑ دئے ہیں۔“

میں کوئی غالب رہتا ہے؟ اہل میں یہ خواب حضرت بھرتیل نے شامل کو دکھایا ہے۔

بادشاہ مارسیل ساراگوس بھاگ کر چلا گیا تھا، ایک زیتون کے درخت کے سایہ میں وہ اپنے گھوڑے پر سے اترا، اپنے ملازموں کو اپنے سر کا خود، زرہ اور تلوار حوالہ کی اور ایک بھاڑی کے پاس ٹھکا ماندہ لیٹ گیا، اس کا سیدہ ہاتھ جڑے کٹ گیا تھا، اس کے بدن سے آنا خون کل چکا تھا کہ کمزوری سے وہ بائبل بے ہوش تھا، اس کے سامنے اس کی بیوی بڑا میوند روہی تھی اور بیٹے نور زور سے چھین مار رہی تھی، اس کی پیچوں سے عربوں کے دل ہل رہے تھے، وہ سب شامل اور اس کی فوج کو کوستے تھے، وہ کیا زبان میں اپولو کے بت کی طرف گئے اوصاس کی بے عزتی کی اور کہنے لگے

”اے نحوس خدا! تو نے ہماری اس مصیبت میں کوئی مدد نہیں کی، تو نے ہماری یہ ذلت کیوں کوئی کرانی ہمارے بادشاہ کو کیوں تباہ کر لیا؟ جو تیری خدمت کرتے ہیں انہیں کو تو خوار کرتا ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اس کے سر سے تاج اتار لیا اور اس کے ہاتھ سے عصا چھین لیا اور اسے الٹا اذنب سے منہ زمین پر گرا دیا اور ڈنڈوں سے کمرے کمرے کر ڈالے۔ پھر محمد علی اللہ علیہ وسلم کے بت کو انہوں نے ایک گڑھے میں ڈال دیا جہاں کتے اور سورا سے کھاتے تھے۔

مارسل کو جب ہوش آیا تو اسے محل کے آراستہ کمرے میں لے گئے، رانی برا میوند ہاڑیں مارا کہ روہی تھی اور اپنے بال نوچتی تھی اور کہتی تھی کہ عربوں کے سارے خداؤں نے انہیں دھوکا دیا۔

# عنفوان شباب کی مجموعی نفسی سیرت

(۲)

آہستہ آہستہ زندگی کا دستور العمل مرتب ہونا۔

اگر ہم یہ سمجھیں کہ عمل پیشہ کے انتخاب تک محدود ہے تو بڑی غلطی کے مرتکب ہوں گے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہمارا نوجوان ایسا دستور العمل بنائے جس میں سوچ سمجھ کر زندگی کا کوئی مقصد عین کیلگیا ہو یہاں مراد صرف یہ ہے کہ اندرونی نفسی زندگی، فطری رجحانات اور بیرونی دنیا کے اثرات کے تعامل سے ایک نکل سمت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح تپ کے نیچے نفس کی لاشعوری بھول جلیاں میں انسان کی سیرت نشوونما پاتی ہے ان سب تغیرات کی بنیاد اس پر ہے کہ نوجوان زندگی سے نئے قسم کا تعلق قائم کر رہا ہے، سمجھ کے نزدیک عموماً زندگی غیر مربوط لحاظات کی توالی کا نام ہے وہ نئے لطف اٹھا آواز نئی دیکھیاں پیدا کرتا رہتا ہے اور زندگی کو ایک نئے سمجھ کر عمل کرنے کا اُسے کبھی خیال تک نہیں آتا زاد اس کی نظر میں نامحدود ہے۔ وہ فی احساس میں فکر کا کوئی حصہ آتا طویل نہیں معلوم ہوتا جتنا بارہ برس سے تیرہ برس تک کا زمانہ۔ یہ بھی سب جانتا ہے کہ یہ گزرتا ہوئے عرصے جذبات و احساسات بہت کم یاد رہتے ہیں۔ وہ ابھی مرکز زندگی کے لئے آئے اہم نہیں ہوتے جتنے آگے چلکر ہوتے ہیں جب بلوغ کا زمانہ قریب آتا ہے تو بہت ہی آہستہ آہستہ سال یہاں یہ نیا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے۔ تیسرے عمل کا موضوع ایک کل ہے۔ تیسرا عمل اس کل کا جز ہوتا ہے اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا یہ خود تیری ذات کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے۔ خود اپنی زندگی میں تسلسل کوڑھوٹنے والا گزرتا ہوئے زمانہ کی یاد کو قائم رکھنے کی جو کوشش نوجوان کرتا ہے اس کی ایک اہم علامت روزنامہ ہے۔ اس میں اکثر یہ چیزیں کی یاد دہانیاں حصہ دیتی ہیں لیکن قدرتی طور پر ان کے مد نظر زیادہ تر ان خیالات ہوتے ہیں نہایت خاموشی کے ساتھ خود بخود ایک نصب العین زندگی بن جاتا ہے مستقبل کی اس تصویر میں ابتدا میں وہ چیز ہے ہم واقعت کہتے ہیں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ واقعات کے قطعوں کے درمیان جو کچھ

خلو ہوتا ہے اسے خلاق تخیل پر کر دیتا ہے۔ تخیل کا عنصر آئندہ زندگی میں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ یہ رشتہ رشتہ واقعات کی صورت اختیار کر لیتا ہر طرح کمپوری میں کڑی رشتہ رشتہ سر کی ہڈی بن جاتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے تھکن میں عید کی پیدا ہوتی جاتی ہے اور اس کے مختلف شعبے متعلق صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ بلوغ کے قبل کا زمانہ طویل ہوتا جاتا ہے، خارجی تھکن میں جو پہلے سے ایک صورت اختیار کر چکا ہے جو بڑھ کر آتا، اس سے صحیح تعلقات قائم کرنا اس میں اپنی مناسب جگہ ڈھونڈنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اصل سوال اس کا ہے کہ بہت سی زندگیوں میں سے جنہیں انسان اختیار کر سکتا ہے وہ ایک زندگی اختیار کرے لیکن اس مقصد کی خبر ہمارے نوجوان کو نہیں ہوتی۔ فطرت ہر اس کام کو جس کا تعلق تو الوداد تخلیق سے ہے پر وہ کچھ کرتی ہے۔ الفرڈ آڈلر نے سچ کہا ہے: "زندگی میں ادا انسان کی نشوونما میں جس قدر پوشیدگی نصب العین حیات کی تعمیر میں برقی جاتی ہے کسی چیز میں نہیں برقی جاتی۔ اس بچوں کے نصب العین کی معلوم کر نیکی کے لئے جو اعداد و شمار ضیائے جاتے ہیں ان سے محض غلط نتائج نکلتے ہیں جن لوگوں کی زندگی کو بچے اس نے مثال قرار دیتے ہیں وہ عموماً بڑے آدمی نہیں ہوتے بلکہ اکثر وہ معمولی آدمی ہوتے ہیں جن سے تعلق خاطر ہو جیسے اپنا چاچا یا بی مہائی کا لڑکا جو سن میں تین برس بڑا ہے

ہم نوجوانوں کے تخلیق نصب العین کی حقیقت پر آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ ریوٹر کا مشہور قول باطل سچ ہے کہ "اس عمر میں ہر شخص کے پیش نظر اس زندگی کی تصویر ہوتی ہے جسے وہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصویر کانٹ کے قطعی امراض کی بھرپور شکل میں نہیں ہوتی بلکہ خود اپنے نفس کی مکمل صورت چشم تصور میں نظر آتی ہے اور یہ قانون صورت جس کی تعمیل میں سب اعلیٰ اندرونی قوتیں صرف ہوتی ہیں، اندر اور باہر کی رکاوٹوں کے متبادل میں قانون عمل بن جاتا ہے۔

لیکن یہ دکاوش اکثر انحراف، انحرابی بلکہ دماغی اور نفسی امراض کا باعث بن جاتی ہیں پیتا لوزی کا یہ قول باطل صحیح ہے سلفسان اچھا ہے اور اچھا بن کر جاتا ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ وہ اچھائی کے ساتھ

(۱) قانون صورت محض بیانی قانون ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی شے کا نشوونما نظر نا کیونکر ہوتا ہے۔

وہ قانون عمل کی قانون ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کسی شے کی نشوونما کیونکر ہو کر چاہیے۔

ہا بھی طالب ہو۔ اگر کوئی انسان برا ہے تو یقیناً اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے اسے اُس طرح اچھا بننے دیا جس طرح وہ چاہتا تھا۔

طبی تحلیل نفس کے اُس مذہب نے جس کا بانی افریڈا ڈلر ہے نفس کی ان گہرائیوں پر خوب روشنی ہے۔ اگر کسی کو اس کے نظریہ کے کل حصوں سے اتفاق نہ بھی ہو تو بھی اس کے بہت سواہم اور صحیح بات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آڈلر نے اس بحث کا آغاز عضویاتی سہلو سے کیا ہے اگر کسی عضو میں پیدا شدہ ہو تو ساری قوت حیات اسی عضو میں جمع ہو جاتی ہے اس طرح نہ صرف کافی بلکہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آڈلر بہت تفصیل کے ساتھ نفسی زندگی کے مظاہر کا ذکر کرتا ہے نفس کا احسا ان کو اس بات پر آدہ کرتا ہے کہ وہ (لوگوں کے طعن تشنیع سے) بچاؤ کا راستہ ڈھونڈے۔ کیونکہ ان کی یہ جلی خواہش کہ وہ نیچا نہ رہے بلکہ اونچا رہے جسے ہم اثبات خودی کی انگ یا حصول قوت کا ارادہ کہتے ہیں زندگی کی بنیادی جبلت ہے۔ اگر یہ جبلت مید سے راستہ سے اپنی منزل پہنچ جائے تو شخصیت کی تعمیر صحیح یا دیر ہوتی ہے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو بلکہ یہ جبلت کسی وجہ سے دب جائے تو یہ لاشعوری حالت اپنے چپکے کام کرتی رہتی ہے اور اونچا رہنے کے لئے انسان میں گڑبٹ تصورات سے کام لیتا ہے اور کسی دور راز راستہ سے منزل پہنچا چاہتا ہے۔ یہی من گڑبٹ تصورات عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری بھر میں آجائیکا کہ بعض لوگ کیوں زندگی کے بے سرو پا دستور العمل بنایا کرتے ہیں یا اس خط میں مبتلا رہتے ہیں کہ شخص انکا دشمن ہے اور اُن پر ظلم کرتا ہے یا عصابی دوروں میں گرفتار ہوتے ہیں یہاں تک کہ اپنی دلیل کرنے میں بھی انہیں قوت کا مزہ ملتا ہے، اس طرح کی صورتیں اپنی ابتدائی حالت میں روزمرہ زندگی میں بھی پیش آتی ہیں۔ عورتیں غش میں آکر وہ کیفیت حاصل کرنا چاہتی ہیں جو انہیں تصورات سے نہیں حاصل ہوتی۔ وہ جان بوجھ کر غش نہیں کھاتیں لیکن انکے نفس کے تحت شعوری حصہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو انہیں اس پر مجبور کرتی ہے کیونکہ وہ مید سے راستہ سے جبر شاکر میڑ سے راستے پر لگا دی گئی ہے بکثرت کھانسی پھونکا جھوٹ موٹ کھانسنے کا کتب جانے سے بچ جائیں (کو نفس بالا راہ حفاظت اور مدافع کی غرض

(۱) جرمن ترکیب WILHELM ZUR MACHT کا ترجمہ ہے اگر نیری میں WILT. POWER کہتے ہیں۔

سے پیدا کرتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ سچ سچ کی کمانی بن جائے۔ مرض اختناق میں جو اندھا بن ۱۱ بہر اپن ہو جاتا ہے اس کی اصل تحت شعوری عالم میں ہے کہ انسان خود متناہد دیکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس کتاب میں ہیں مرصعوں کا ذکر کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس قسم کی بالواسطہ محرکات اور زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں جسے ہم معمولی (یعنی صحت کی) زندگی کہتے ہیں اور دو خاص معجزوں میں شامل ہوتی ہیں نقص کا احساس خود اپنی تلانی کی صورت پیدا کر لیتا ہے۔ یہ تلانی کبھی کبھی اسی شعبہ ذہنی میں ظاہر ہوتی ہے جس میں نقص ہو لیکن اکثر دوسرے شعبوں میں رد سونے جس کے دل میں آرزوئے اور محبت کا طوفان موجزن تھا لیکن اس آرزو کے پورا کرنے کی قوت نہ تھی۔ اس کی شاعرانہ تلانی کے لوح قلب پر E M I L کا نقشہ کھینچا جو شخص خود درویش سے زندگی کا لطف اٹھاتا ہے وہ منہ نہ نہیں کرے۔ تھیر کا احساس یعنی اپنے نفس میں نقص کا وہ احساس جو لوگوں کی ناقدری اور بے اعتنائی سے پیدا ہوا ہے تو اسے ذہنی کا نزع اس طرف پھیر دیتا ہے جہر کوئی دکا وٹ نہیں ہے۔ دل میں جو انگ اپنے آپ کو منوانیکی ہوتی ہے وہ یا تو ساج (سوسائٹی) کے کسی دوسرے طبقہ کی طرف رجوع کرتی ہے یا اعتراض نفی کے جذبہ میں تبدیل ہو جاتی ہے یا انسان کو تنہائی، لہذا زندگی کا لطف اٹھانے پر رائل کر دیتی ہے اس کا مثال نیلے کی زندگی میں ملتی ہے جس کا یہ حال تھا کہ ایک طرف واقعی زندگی کا پیمانہ اس کے ہاتھ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ اپنی داخلی زندگی کی شراب عالم آشوب میں سرشار ہو رہا تھا۔ لہذا اس کے نصب العین زندگی کی حیرت انگیز بے اعتدالیوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس عمل کے لیب و فراز سے خوب واقف ہو جس سے نفس میں نفس کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچہ کا مادہ اس قدر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام اعمال کو جو قلب کی گہرائی میں واقع ہوتے ہیں، سمجھا لیتا ہے۔ بظاہر جو چیز وہ میں نظر آتی ہے وہ محض خود سری مخالفت خدا اور مردم بیزاری ہے۔ ان تھیلوں کا ان میں موجود ہوا اس قدر عجیب و غریب ہے کہ اس کی توجیہ کے لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ زاد کا جبر و سختی اٹھانے سے (مثلاً ۱۱) جس شخص کی جان تھیر کرتی ہے وہ ذہنی تلانی کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے عزت حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ زیادہ غور و افہام کو اسے زندگی اختیار کرنا پڑ رہا ہے جس کے لئے وہ بالکل مناسب نہیں بہت سی نا کامیاب زندگیوں کا یہی راز ہے۔

پرانے عقائد، اپنے محبوب دوستوں سے جدا کر لئے جانے سے، مانوس مقامات سے چھڑا لئے جانے سے، ان میں نئی ہارات کی مخالفت کرنے کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ عالم بزاری کے قہقہے نظر آتے ہیں، سب کی تہ میں وہی خیال ہوتا ہے جسے القرینہ ڈالنے ان الفاظ میں خوب ادا کیا ہے ”مجھے ایسا یہ اختیار کرنا چاہئے کہ آخر میں عیدان میرے ہی ہاتھ رہے“ کبھی کبھی داخلی کشش نے جوانی ہی میں ایسی خراب ویریں اٹھیا کر لیتی ہے کہ انسان محض دوسروں کو اذیت پہنچانے کے خیال سے خود کوئی تک کر گذرتا ہے، مدح احساس خود کی اپنی ذلت کی تلافی اور اپنی عزت کو کسی حد تک دوبارہ قائم کرنے کے لئے ہر تدبیر اختیار کرتا ہے خواہ کچھ ہی انجام کیوں نہ ہو۔

جرمنی کی تحریک شباب میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو کوئی مثبت نصب العین نہیں رکھتے۔ انہیں اسکا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے آپ کو بالغ سمجھیں۔ اس لئے انہوں نے وہ راہ اختیار کر لی ہے جو ان کے لئے کھلی تھی۔ ہم اب بالغ بننے کی کوشش نہیں کریں گے ہم اپنے آپ کو بالغ سمجھیں گے اور ہمیشہ سمجھے رہیں گے، دوسری صورت یہ کہ موجودہ مغربی تمدن کے مطالبات اپنی نوجوانوں سے روز بروز سخت ہوتے جاتے ہیں اس لئے ان کے نفس نے حفظ مقدم شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرتے کہ وہ اس تمدن میں حصہ لینے کی قوت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنا بچاؤ یہ کہہ کرتے ہیں ”ہم اس تمدن میں حصہ نہیں لینے کی کسی کام نہیں ہے“ تحریک شباب کی بدولت یعنی زندگی کی کارزار سے منہ پھپھانا ہمارے تمدن کی باری کی علامت ہو گئیں جیسا ہم آگے چل کر بیان کریں گے اس تحریک میں دوسری قوتیں بھی پہلاں ہیں۔

مختصر یہ کہ عقائد ان شباب کی آرزوئیں جو دل میں جڑ بکڑ لیتی ہیں۔ انہیں اگر زمانہ پورا ہونے کا موقع نہ ملے تب بھی وہ بے اندازہ قوت کے ساتھ آئندہ زندگی میں باقی رہتی ہیں یہ وہ فحیدہ محرکات کی شکل میں انسان کے اعمال پر اثر ڈالتی رہتی ہے اور کبھی کبھی ساٹھ برس تک کی عمر میں (جس کی ایک بار خود مجھے معلوم ہے) زندگی میں دفعۃً انقلاب پیدا کر دیتی ہیں اب خواہ یہ انقلاب نشاۃ ثانیہ (یعنی بلوغ میں جو کسی رگبتی قہمی اسکا بہت دن کے بعد جاگن پورا ہوا جو ہمیشہ مفید ہوتا ہے) کی صورت میں



ہو یا کسی افسوس ناک حادثہ کی صورت میں جس میں بچوں کے جبر کا ظلم ٹوٹ جاتا ہے اور اُس کے ساتھ خود انسان کا ظلم حیات بھی۔

تشکیل ذات کے عمل میں جو عنوان شباب میں شروع ہوتا ہے۔ علاوہ نفس کے بیدار ہونے اور آہستہ آہستہ ایک مربوط تحریک زندگی پیدا ہونے کے ایک تیسرا عنصر بھی ہوتا ہے اور ان تینوں کے ملنے سے نئے ساز حیات کا زیر و بم بنتا ہے۔ تیسرا عنصر یہ کہ جہاں مدد کے اپنے نفس کا شاہدہ شروع کرتا ہے وہاں مددگار میں بھی اُسے نئی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں خارجی حیثیت سے تو یہ چیزیں ہمیشہ اُس کے ماحول میں موجود تھیں لیکن انکی مخصوص ماہیت کے ادراک کے لئے اُس میں کوئی حس نہ تھی۔ اب یہ جس اس طرح پیدا ہو جاتی ہے گویا وہ پھول کا کٹورا جواب بخیز نفس کو اپنے اغوش میں چھپانے کا مکمل گیا اور اس کی ایک ایک پتی الگ ہو گئی ہے

چندوں میں نشا پید کرنے یا اٹکانشا سمجھنے کی جو مختلف صلاحیتیں نوجوانوں میں ہیں وہ بچہ میں بھی ہوتی ہے۔ وہ جالی قدر علمی قدر اور مذہبی قدر کا احساس رکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا اور حکومت کا نشا سمجھتا ہے۔ لیکن ان قدر سے بچوں اور نوجوانوں کے تعلق میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بچہ یہ شعور نہیں رکھتا کہ یہ زندگی کے شعبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو فروہل کی باریک میں نظر نے خوب سمجھا تھا۔ چنانچہ اس نے فطرتی ذرائع تعلیم کا تعین اسی حقیقت کی بنیاد پر کیا تھا کہ بچہ کے نفس کی خصوصیت زندگی کی وحدت ہے اُس نے بچوں کو مشغول رکھنے کے لئے ایسے کھیل نکالے جن کی بنا ادراک کے نقطہ وحدت پر ہے جہاں علم کی ٹکڑیاں جہاں کی صورتیں اور فائدہ کی صورتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کیونکہ خود بچہ اب تک اُس ازلی وحدت سے غافل نہیں ہوا ہے جو وہ ماں کیساتھ فطرت کے ساتھ اور مائع فطرت کے ساتھ رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے نوجوان کو زندگی کے مختلف شعبوں

(۱) صورت سے مراد ہے وہ سانچہ جس میں ذہن انسانی حواس خمسہ کے ذریعہ پہنچنے والے حیات کو ڈھانکنا علم بناتا ہے۔

کا احساس کسی اور ہی رنگ میں ہوتا ہے۔ اس احساس میں مدرک کی نفسی کیفیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور مدرک کی واقعی حالت پر بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ بڑی خصوصیت نوجوان کے ادراک و احساس میں یہ ہے کہ یہ احساس اسے بذات خود اپنے مخصوص انداز میں ہوتا ہے۔ اب خارجی محسوس اشیا کو وہ بلاچوں پر جیسی وہ نظر آتی ہیں ویسی تسلیم نہیں کرتا بلکہ سب سے اہم بات یہ کہ اب ان میں وہ اپنے ذاتی احساس سے رنگ آمیزی کرتا ہے۔ اب جا کر اُن پر غور کیا جائے، انکی قدر کا تعین ہوتا ہے اور وہ واردات نفس کی متعدد اختیار کرتی ہیں۔ (جبکہ یعنی بچپن میں) زیادہ سے زیادہ صنعتی کاموں میں ایک خاص طرح کا انہماک تھا لیکن تین قدر کا دم دگان بھی نہ تھا کیونکہ صنعت و معرفت میں تو قدر کا تعین نہیں ہوا اگر تاہم انسان پہلے سے مقرر کی ہوئی قدر کو بجا متعیدان کر کے حاصل کر نیچے ورائے تلاش کرتا ہے۔ لیکن اب انسان خود قدر کا تعین کرنے لگتا ہے کیونکہ اب وہ اپنا ذاتی ادراک اور اپنی ذاتی قوت حکم کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عقلمندانہ شباب کے پہلے انسان فاعلی حیثیت سے تمدن میں حصہ نہیں لے سکتا۔ بچہ کا تعلق تمدن سے محض فاعلی ہے اگر وہ خود کچھ کرتا ہے تو اُس کی وقت و دوسروں کی نقالی سے زیادہ نہیں۔ وہ خود کسی شعبہ میں کوئی تخلیقی کام نہیں کرتا بلکہ تمدن کو جس طرح وہ موجود ہے اسی طرح قبول کر لیتا ہے اور اُس میں اپنی پابند فطرت ملاشعوبی وحدت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جب اس کے امور کائنات کے درمیان یہ رشتہ وحدت قطع ہو جاتا ہے تو ایک نئے تواسے شعبہ اُسے تمدن کی کثرت کا احساس ہونے لگتا ہے اور دوسری طرف وہ خود اس خزانہ میں انہی حیثیت کے مطابق اضافہ کر نیکی کو شش کرتا ہے۔ اب آغاز ہوتا ہے اپنی صناعتی کا، اپنے غور و فکر کا اور اپنے غم سہی احساس کا۔ علاوہ اس کے ہمارا نوجوان موجودہ تمدن کی دولت میں خود بھی کچھ اضافہ کرتا ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اُس کا یہ بدلہ ہوا رویہ سب سے زیادہ اقتصادی شعبہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ بچے اگر کھاتے پیتے خاندان کے ہوں تو انہیں کسی اس کی فکر نہیں ہوتی کہ ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوتی ہیں بلکہ ان میں جس کے والدین تعمیر میں تماشہ کرتے اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک بار اس سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اُس نے جلد اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ روزنام کو تانے کے بعد آسمان والے پردے سے ایک دلفانی گر کر آتی ہو۔ خود کلمے کی خواہش مل میں پیدا ہوا اور اُس کی اپنا بطور کوشش بھی اس بات کی علامت

ہے کہ نفسی مشابہات شروع ہو گیا۔

لیکن جب شبہ ہائے تمدن سے یہ تعلقات پیدا ہونے لگے ہیں تو ساتھ ہی زندگی کی دشواریاں بھی محسوس  
کنا کش بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ منہ نہیں کہ ابتدائی سے آدمی مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق  
تفکر اور اس مسئلہ پر غور کرنے لگتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو خود اس کی زندگی کی تشکیل میں کہاں تک دخل  
ہونا چاہئے۔ یہ ثابت اگر ہوتی بھی ہے تو بہت دن کے بعد اور شاید ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو جان  
بوجھ کر اپنی تربیت آج کرتے ہیں ان لوگوں کی زندگی میں یہ عمل بوجھ کے بعد بھی سالہا سال تک جاری  
رہتا ہے۔ نوجوانی کے ابتدائی زمانہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کے محض ایک جزو کا شور ہوتا ہے۔  
لیکن دشواریوں کا ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے تمدن کے مختلف شعبوں میں وحدت  
موجود نہیں ہے بلکہ طے طرح کا تضاد اور کشاکش پائی جاتی ہے چونکہ ذہن خارجی (تمدن) بہت سی شاخوں  
میں تقسیم ہو گیا ہے اس لئے ہمارے نوجوان کی داخلی ذہنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی ابتدا میں کوئی  
رابطہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایسے تناقض ہوتے ہیں (اس سے مراد منطقی شائقین نہیں ہے بلکہ اخلاقی تعین  
قدر کا تناقض) جو ہمسفرہ نہیں کئے اور جن کو پوشیدہ قوت تشکیل سیرت کبھی نہ کبھی ضرور دور کر دیتی ہے۔  
اسکل مختلف ذہنی شعبوں کا غیر مربوط ہونا عقداں شباب کی ایک اہم نفسی خصوصیت بھی جاتی ہے۔  
اس لئے مناسب ہے کہ ہم نظام نفسی کے ان مختلف پہلوؤں پر جو کہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور  
کہیں مل جاتے ہیں ایک ایک کر کے غور کریں اور اپنی نفسیات شباب کی تقسیم انہیں کی بنا پر کریں۔ اس سے  
خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ عموماً اس عمر میں کونسا شعبہ ذہنی علیحدہ کھتا ہے۔ آخر میں یہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔  
کہ اس غالب شعبہ کی پیدائش ایک ایسی چیز سے ہوتی ہے جو نفس کی گہرائیوں میں رہتی ہے اور غور سے دیکھنے  
تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی وہ جو ہر ہے جو سیرت کی تشکیل اور عہد شباب کی ذہنی زندگی کی تہذیب کرتا ہے۔

## دوربین

انسان کو عقل و ہوش آنیکے بعد جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ اجرام فلکی اور ان میں خصوصیت کے ساتھ آفتاب تھا۔ اُس کی روشنی اور گرمی نے اسے وہ رتبہ دیا جو حیوانوں کے لئے مخصوص تھا۔ ایرانیوں نے اسے خدا بھلا اور یونانیوں نے بھی اسے اپنا سب سے بڑا دیوتا مانا۔ مشرقی ممالک کی صاف آب و ہوا نے اور گرمی کے دنوں میں آسمان کے نیچے پسرا لینے والوں نے جب نظر اٹھائی تو نیلی چمٹ پر تاروں کا کیمت دیکھا فطرتی طود پرست فلسفی اور عود کر نیوالے باغوں نے شاہدہ کرنا شروع کیا اور اجرام فلکی کے مختلف قوانین دریافت کئے۔ جو تارے روز نظر آتے تھے اور زیادہ نمایاں تھے جنکی چالیں آسانی سے دیکھی جاتی تھیں۔ اُنکے نام رکھے گئے۔ اُنکے دور معلوم کئے۔ ان تمام واقعات کو قبل تاریخ یعنی واقعات کہہ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ سبع یا رہ کس نے کس زمانہ میں اور کہاں دریافت کی کئی نہیں بتا سکتا۔ جہات اور لاملی نے ان اقوام میں یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ان تاروں کی چالیں انسان کی تقدیر اور کاموں پر اثر پڑتا ہے۔ موجودہ سائنس باوجود اپنی انتہائی علمی اور غیر مذہبی رویہ کے اس خیال کو اب تک یورپ کے دماغ سے نہ نکال سکا۔ ایشیا والوں کا تو کیا کہنا۔ ابتدا میں علم ہیت اصل نجوم تھا۔ اور آسمان کی سپر صرف اس لئے کی جاتی تھی کہ ہر اور سار کے راز کھجنا کہرا نہیں ٹھکا جائے۔ اُن کی تقدیر بتا کر اُنکے منحوس دنوں کا شمار کیا جائے اور اُس کی روک تھام کے ٹوٹھکو سٹے بتائے جائیں۔

ان اجرام فلکی کی خدائی کو تو حضرت ابراہیم نے سب سے پہلے لا احب الا فلین کہہ کر توڑا۔ اور یہی سب سے پہلے بت تھے جو بغیر تبرک کے اس خدا پرست کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے۔ مگر عرب میں صابئی گروہ زمانہ رسالت تک رہا۔ ہندوستان میں ان یاروں کی پوجا ہوتی رہی اور اب تک ہوتی ہے۔ یونان کے فلسفیوں نے راز خداوندی کو نہ پہچانا حضرت عمر کی تلوار نے آتش کدہ ایران کی آتش عیشیدی کو سرو

کیا کر دل سے آفتاب و آتش بستی کو نہیں نکالا۔ جب ایرانی سلطان ہونے لگے تو اگرچہ عقیدہ چھوڑ بیٹھے تھے مگر  
 حل کے اخراجات کا کیا کرتے اسلامی ادبیات میں ایسا ہی خورشید ہوا جس طرح یہودیوں میں موجود ہے اور جب  
 اسلامی قانون کے مطابق نجوم اور آئندہ کے واقعات کی پیشین گوئی ممنوع قرار پائی تو اب علم ہیت کی طرف  
 توجہ کی چنانچہ خلیفہ مامون کے زمانہ میں عرب کے ریگستانوں میں سب سے پہلے زمین کے نصف دائرہ کے لمبے  
 کی کوشش کی۔ ایک درجہ کو میلوں میں اپنے اپنے کاسب سے پہلا کام مسلمانوں کے ہاتھ انجام پایا اس وقت کے  
 آلات کا تیسرا وقت ہم کو نہیں ملتا۔ اصطراب نے علم ہیت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یہی علوم اور یہی  
 آلات نے جسکی مدد سے عرب تمام دنیا کے سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے جس طرح آج "برطانیہ سمندوں پر  
 حکومت کرتی ہے" ایک زمانہ مسلمانوں کی حکومت کا گزر چکا ہے۔ ریاضی اور ہیت مسلمانوں کے مشاغل میں  
 شاعری کے بعد سب سے زیادہ پچھلے مشاغل تھے مگر جہانگیر کے حالات سے علم ہوتا ہے دور میں سولہویں  
 صدی کی ایجاد ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے اقبال کا آفتاب مغرب میں ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔

گلیلو پیزا PISA میں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۲ء میں پہلی دوربین ایجاد کی۔ جو نظام عطاردی  
 کو زمین کی کائنات کا مرکز ہے۔ آج تک مسلم نامیاد ہاتھ وہ کوپرنیکس نے باطل ٹھرا دیا۔ اس کے شاگرد گالیلو پیزا  
 TYCHO BRAHE نے یورپ میں اس خیال کو پھیلایا اس اصول کے مطابق نظام شمسی میں مرکز  
 آفتاب کو ٹھہرایا۔ اور زمین کو جو عدد کی جگہ دی گئی تھی وہ چین گئی بلکہ زہرہ مشتری وغیرہ کی طرح ایک سیارہ  
 تسلیم ہوئی اور سیارہ بھی ایسا جو اکثر سیاروں سے چھوٹا۔ چاند کو سیارہ کے درجہ سے گوارہ کر کے درجہ ہوا  
 گلیلو نے جب ان قوانین کی تعلیم دی تو پھلپاوریوں کی جماعت کو کتب برداشت ہو سکتی تھی انہوں نے  
 اپنے محکمہ حساب کی زد میں لا کر اسے سزا دی اور اس سے توبہ کھائی کہ وہ اس طرح کا کفر نہ کہے کہ زمین گرد

ملہ موجودہ صحیح آفت سے پھر اس زاویہ کو ناپا کر مامون کے زمانہ کے آپ سے بہت کم فرق نکلتا ہے۔

سیارہ تو وہ ہے جو کسی قائم ستارہ کے گرد چکر لگائے۔ جسے انگریزی میں PLANET کہتے ہیں اور جو  
 اجرام کی سیاروں کے گرد گھومیں انہیں SATELLITE کہتے ہیں۔ اور اب اصطلاح میں انہیں کہتے ہیں جیسے تھا  
 مشتری یعنی دماغرام مشتری کے گرد گھومتے ہیں۔

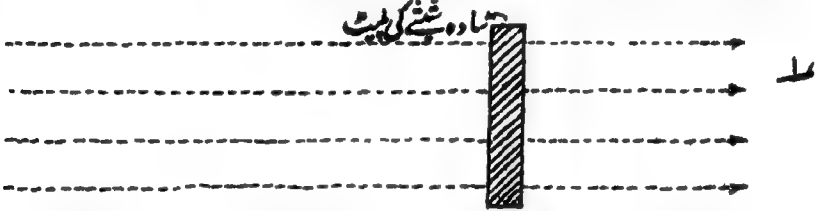
کرتی ہے۔ اپنی جہالت کو بخیر سمجھو نہ یہی پیشواؤں نے مذہب کی آڑ لیکر چھپا یا ہے اور چونکہ عوام کا طبقہ انکے ساتھ ہوتا ہے اس لئے انہیں فی الجملہ اقتدار رہتا ہے اور جن تعلق کو یہ نہیں سمجھ سکتے اُسے کفر لکھ کر اپنے مریدوں میں سرخوردہ بننے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ انکا یہ انجیر چلا اور گلیلو نے توبہ کی مگر حق کا اثر ایسا تھا جو زائل ہو جاتا اور اس نے دور بین کی ایجاد کی کہ اجرام فلکی کو غور دیکھ سکے۔ اور اُس کے نظریہ کو شاہدہ کر کے مسلم مائیں۔ اندلس کی فتح نے یورپ پڑا احسان کیا تھا۔ اور یورپ اُس احسان سے کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ موجودہ شان و شوکت اگرچہ یورپ کو بھلا دے کہ اُس پر علی احسان کر نیوالے کون تھے اور اُس نودولت احسان فراموش کی طرح ہو جائے جو اپنے اس بے مایہ عن کو بھول جائے جس نے اپنی ثروت کے زائد میں اس شخص کو کس سپر سی کی حالت سے ہاتھ بڑھا کر گرنے سے بچا یا تھا۔ مگر اہل انصاف جب کبھی تاریخ لکھتے ہیں یا ممکن ہے کہ مسلمانوں کا ذکر نہ کریں۔ چنانچہ آپ کسی علم المرایا (opinions) کی کتاب کو دیکھی اندلسی مسلمان اہلیم کا نام ضرور ملے گا۔ گویا کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس شخص لافانی کا نام نہ آجائے۔ مگر چونکہ ہم کو اس وقت مسلمانوں کی یا اہلیم کی تاریخ لکھنی نہیں ہے بلکہ دور بین کے متعلق لکھنا ہے اس لئے ہم یہ صرف اس قدر لکھ کر اکتفا کرتے ہیں کہ جو قوانین اہلیم نے دسویں صدی میں دریافت کرنے تھے۔ باطل اسی طرح جیسے نر نے اصول لاسکی پلانز لیس دریافت کرنے تھے مگر علی سکل میں مار کوئی نے اُسے آلات شکی سکل میں بنایا اسی طرح اہلیم کے اصول کو دور بین میں تبدیل کرنا گلیلو کا کام تھا جو مار کوئی کی طرح اٹالوی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم دور بین کی ساخت کو بیان کریں تھوڑا سا ذکر انسان کی آنکھ کی ساخت کا ضروری سمجھتے ہیں انسان کی آنکھ میں ایک تیلی یا قزحیہ ہے جو خود بخود روشنی کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے کم زیادہ ہوتی جیتی ہے جب روشنی تیز ہوتی ہے تو یہ تیلی سکڑ جاتی ہے کہ زیادہ روشنی آنکھ میں نہ داخل ہو سکے جب روشنی کم ہوتی ہے تو یہ پھیل جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ یہ روشنی کو آنکھ میں داخل ہونے فوٹو کے گیرہ میں اسی اصول پر بنانے کے علاوہ ایک مددہ جو حکم شعلہ ایسی ہوتی ہے۔ اس مددہ میں یہ بھی قابلیت ہے کہ دور و نزدیک کی چیز دیکھنے کے

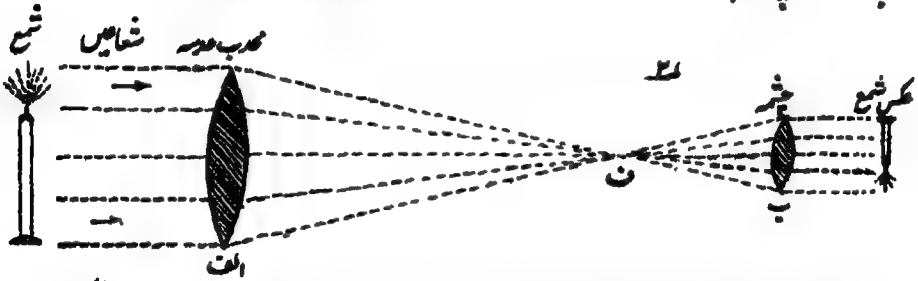
یہ خود بخود موٹا اور پستلا ہوتا رہتا ہے کہ اس کا فکس لاسک ( قائم ہو جائے کیرہ میں ہاتھ سے آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ یہ خود بخود ہوتا جاتا ہے۔

یہی اصول دوربین میں ہے کہ اول تو زیادہ سے زیادہ روشنی دوربین میں داخل ہو کر ہماری آنکھ میں پہنچے، مگر ہماری آنکھ کا عدسہ تو زیادہ سے زیادہ ایک انچ کا ۱/۲ حصہ مکمل کتا ہے اور اسی قدر روشنی فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے ہم نے دوربین سے فائدہ اٹھایا۔ کیونکہ دوربین میں اس قدر روشنی داخل ہوگی جس قدر بڑا اس کا عدسہ نظر *eyepiece* ہوگا۔

اب یہاں ہم دو قسم کے عدسوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر روشنی شیئی کی ایسی پلیٹ میں گزرے جس کی سطح باہل ہوا ہو تو شعاعیں سب برابر سے گزر جائیں گی دیکھو شکل نمبر ۱۱



مگر جب آئینہ کی سطح محدب ہو یا مقعر ہو تو وہ کسی طرح سیدھی نہ جائیگی بلکہ ایک طرف سے تو متوازی آئے گی اور دوسری طرف مخرن ہو کر نکلتی گی۔ دیکھو ذیل کی اشکال



اگر شیشہ مقعر ہوگا تو پہلے مرکز پر جمع ہونگی پھر اپنی اپنی جانب کو مخرن ہو کر پھیلیتی ہوئی چلی جائیگی۔



ان دو اصولوں کے سمجھنے کے بعد ہم دو درجہ کے اصول کو بیان کرتے ہیں۔

دو درجہ میں ایک لمبی پٹلی کی نالی میں ایک شیشہ الف جو اصطلاح میں محدب عدسہ

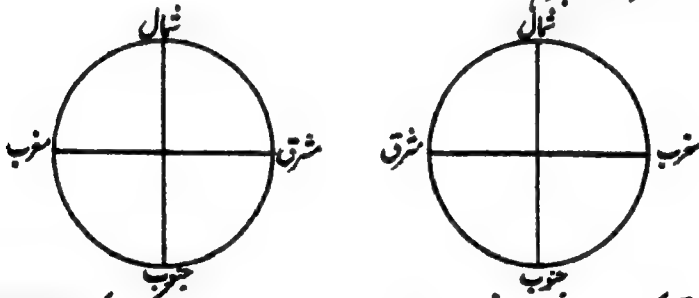
کہلاتا ہے رکھا جاتا ہے اس کے دائرہ پر دو درجہ کی طاقت منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر بڑا شیشہ ہوگا اسی قدر بڑے رقبے پر روشنی پڑے گی۔ اور چونکہ یہ محدب ہے اس لیے وہ ب روشنی ایک مرکز پر جمع ہو کر دوسری جانب نکلیگی، جس فاصلہ پر یہ روشنی ایک نقطہ کی شکل میں پڑتی ہے اسے مقام نوکس نامک کہتے ہیں۔ شیشے سے لوگ کبڑا جلاتے ہیں۔ اُس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ روشنی اور حرارت جو پورے آتش فشانیہ پڑ کر ایک نقطہ جمع ہوتی وہ بحالت مجموعی اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ کبڑا دیسے دھوپ میں نہیں جلتا مگر جس وقت اس نوکس کے سامنے آتا ہے تو فوراً جل جاتا ہے۔ جب روشنی نقطہ یعنی نوکس تک آگئی تو چونکہ وہ ایک نقطہ پر ہوتی ہے اس لیے ہم کسی جسم کا شاہدہ ایک چھوٹے سے نقطہ کے سوا نہیں کر سکتے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس نقطہ کو ذرا اور بڑا لیں جس کے واسطے دوسرا شیشہ جسے چنیمہ کہتے ہیں لگا کر ان شعاعوں کو جو اب تک مخروط تھیں اب پھر متوازی ہو گئیں اور اب ہر کوئی نظر نہایت واضح اور صاف نظر آنے لگا۔ محدب شیشہ کو آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح اس میں روشنی ایک طرف سے آتی ہے اور صرف ہو کر شیشے کی دوسری جانب برآمد ہوتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ اسی نظر آتی ہے (دیکھو شکل نمبر ۲) دو درجہ کو ہاتھ سے گھٹا بڑھا کر ہم اُس نوکس کو تھیک جلاتے ہیں۔ تاکہ روشنی چنیمہ پر متوازی اور ہوا پڑے۔

اب جب کسی ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں تو الف شیشہ اپنی تمام روشنی کو جو ستارہ سے متوازی خطوط پر آ رہی ہے جمع کر دیتا ہے اور یہاں سے منظر الٹا نظر آئے گا یہاں تک کہ یہ ب شیشہ پر پہنچ کر پھر آنگہ پڑا۔ اس معنی یہ ہوئے کہ جس قدر روشنی الف پر پڑی تھی وہ اگر منتشر ہوتی تو ہم کو ایک بھوئی سی چیز نظر آتی اس کا ایک چھوٹا سا جزوی ہماری آنگہ پر پڑتا۔ مگر اب یہ سب جمع ہو کر ب کے رقبہ پر تقسیم ہو گئی۔ اور اب رقبہ ایسا ہے جس کی تمام شعاعوں کو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلی دو درجہ جو گلیلیو نے بنائی وہ صرف عین گئی طاقت کی تھی۔ پھر آگہ گئی طاقت کی بنی۔ اُس کے بعد ترقی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ امریکا



مونٹ دس رصد گاہ پر جو دو بین ہے اس کا فیصد تقریباً پونے تین گز کے قطر کا ہے۔ صرف شیشہ کی قیمت کئی لاکھ روپیہ آتی ہے۔ دو بین کا وزن ۶۰ ٹن کا ہے۔ مگر ایسی بڑی جسم اور وزنی چیز کو ہلانیکے اور ٹھیک کسی ستارہ کی سمت جانیکے آلات اس قدر نازک اور صحیح ہیں کہ ایک آدمی اسے باسانی جس ستارہ کی طرف چاہے لگا سکتا ہے۔ اس کے زاویہ نما یا ورثا لٹھ تک کے معلوم کر سکتا ہے۔ جب ضرورت تمام فرش کو مع دو بین اونچا نیچا کر سکتا ہے۔ چاند جبکہ فاصلہ زمین سے دو لاکھ ۴۰ ہزار میل کے قریب ہے۔ وہ صرف ایک میل کے فاصلہ پر نظر آتا ہے۔

مثال نمبر میں ہم دیکھ چکے ہیں دو بین میں روشنی مغرب بالمقابل ہو جاتی ہے یعنی خطراتنا نظر آتا ہے اس کے ذریعہ سے ہم کسی چیز کو دیکھیں تو سر نیچا اور ناگیں ادا پر نظر آتی ہیں۔ مگر ستاروں کے دیکھنے کے لئے اس میں کوئی جج نہیں ہوتا۔ صرف یہ فرق رکھتے ہیں کہ اگر شمال اور پکی جانب رکھیں تو بجائے بائیں ہاتھ کے کے مغرب رکھنے کے مشرق دیکھیں گے اور مشرق کو بائیں ہاتھ پر رکھیں گے۔ زمین پر اس کا بالکل برعکس ہوگا جو شکل نمبر سے ظاہر ہوگا۔

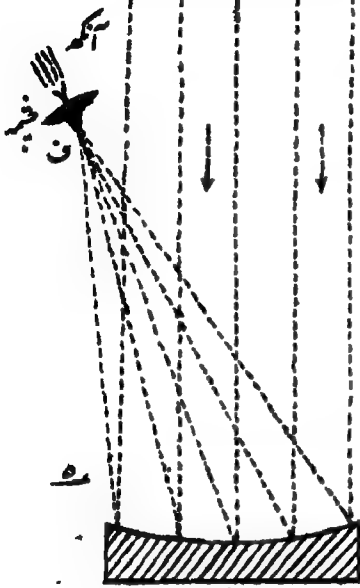


اس قسم کی دو بین میں روشنی براہ راست آتی ہے اور اسے سطح کہتے ہیں *Refractor* جن لوگوں نے دوربینوں سے دیکھا ہے انہیں معلوم ہوگا دو بین کو دیکھنا کس قدر ٹھکانے والا کام ہے۔ بجز خصوصاً جبکہ رات رات بھر نظر جائے گردن اونچی کئے کسی ستارہ کو دیکھنا منظور ہو۔ اس لئے ٹھیک ہوئی کہ کسی طرح نیچے کی طرف دیکھ کر ہم کو ستارہ نظر آنے لگے۔ چنانچہ دوسری قسم کی دوربین جسے *Reflecting* کہتے ہیں۔ سرولیم ہرشل نے ایجاد کی۔

منطق میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ نظر دور سے بہت بڑا ہونا چاہی تھا اور بڑا فیصد بنائیں قیمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس کی ادائیگی تقریباً ناممکن ہو گئی تھی

چنانچہ سر ولیم نے جن اصول پر یہ دوربین بنایا اس نقشہ سے ظاہر ہو جائیں گے۔ اس

کسی تاہم شاخیں متوازی



اس اصول سے بڑے شیشے کی ضرورت بھی جاتی رہی روشنی ایک بڑی لمبی ٹکی کے ذریعہ رصد گاہ میں داخل ہونی اسی ٹکی کے آخر میں مقرر عکسی آئینہ لگتا ہے جو روشنی کی شعاعوں کو جمع کر کے توجھا کر کے اور اپنا نوکس ایک نقطہ پر جاتا ہے۔ یہاں پر دوسرے شیشے کے ذریعہ یہ پھر متوازی شکل میں شاخیں جلتی ہیں اور آنکھ پر اثر کرتی ہیں۔

گھلایلو کے زمانہ سے اس وقت تک کئی بھلیں بدلیں۔

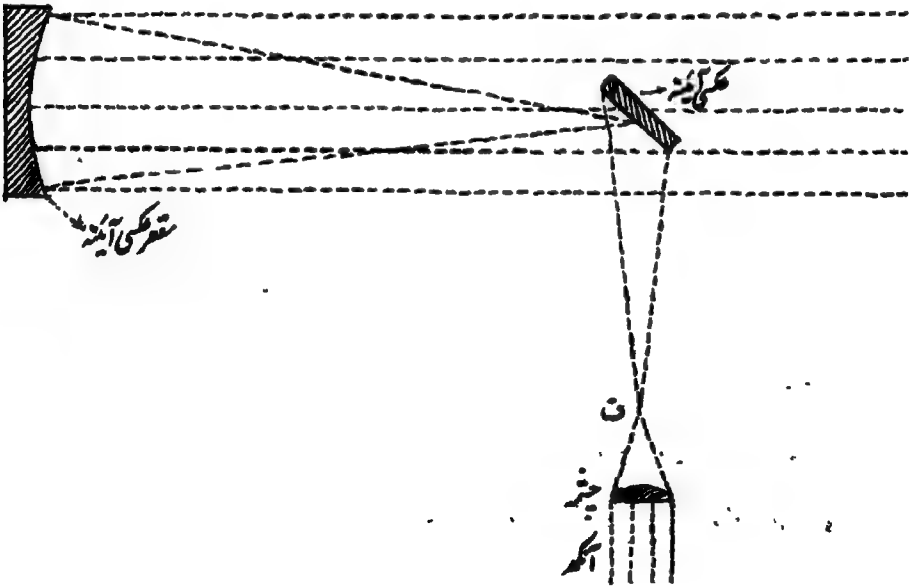
سب سے ابتدائی اور پہلی شکل تو نمبر ۱ ہے اور اب بھی بڑی دوربینیں

اسی اصول پر بنتی ہیں۔ دوسری دوربین جو زیادہ تر مریخ ہے

نقشہ ۱ ہے جس کا اصول شکل نمبر ۲ سے ہوگا

ایک تو ٹونین کے نام سے مشہور ہے۔ جسے نیوٹن نے بنایا تھا۔ اس میں ایک عکسی آئینہ اور ایک گونہ

نیشہ کے ذریعہ روشنی کو جمع کیا تھا۔ اس کا اصول ذیل کی شکل سے واضح ہوگا۔



ان دونوں کھلوں سے طامع ہوگا۔ اپنی اصول کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ نیوٹن کی دو درجین اور ہرل کی دو درجین کا تفسیر یا اصول ایک ہی ہے۔

یہاں تک تو خاص خاص اصول دونوں کی ساخت کے ہم نہ بیان کئے۔ اب صد گاہ میں ان کے طریقہ استعمال کی بنا پر مختلف نام ہیں۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ جرم فکلی کو اس طرح دیکھیں کہ کم سے کم بارہ گھنٹے تک اسے مسلسل دیکھتے رہیں تاکہ اس کی مختلف کیفیات اور اس پر جو کچھ مناظر ہیں وہ ہیں نظر آتے رہیں۔ اس دو درجین کو اس طرح اسس جرم پر جاتے ہیں کہ وہ نظر آئے اور صد گاہ میں کبھی کی موڑ ملے سے اس دو درجین کی رفتار کو بالکل اس طرح صحت کیساتھ متحرک کرتے ہیں کہ زمین کی گردش کا کچھ اثر نہیں ہوتا جیسے جیسے زمین گردش کرتی ہے دو درجین بھی زمین کی حرکت کے خلاف سمت حرکت کرتی ہے اور اس جرم فکلی کو اپنے صد گاہ سے باہر نہیں جانے دیتی۔ اس دو درجین کو اصطلاح میں گھومنا (rotation) یا استوائی کہتے ہیں۔

بڑی دو درجینوں میں منقطع قسمی سے یہ کام لیا جاتا ہے اور اس کی مدد سے چاند وغیرہ کے تو ایسے صحیح نقشے بنائے گئے ہیں جیسے خود زمین کے اور دیگر ستاروں کی سیاروں کے حالات بھی بہت سے معلوم ہو گئے ہیں۔

طریقہ استعمال کی اصول پر دوسری دو درجین مخصوص ہوتی کہلاتی ہے۔ یہ دو درجین اکثر صحیبتی ہوتی ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی جرم کے کسی خاص مقام پر پہنچنے کا صحیح وقت بتا دے مثلاً گہن کے وقت ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس وقت گہن لگنا شروع ہوا ہے اور کتنی دیر میں گہن ختم ہو گیا۔ اس وقت استوائی کے برخلاف اس دو درجین کو ایک جگہ جاؤنگے اور اس جرم کو دیکھینگے کہ وہ دو درجین کی زمین کس وقت آیا اور کس وقت کل گیا۔

اس دو درجین میں سب سے زیادہ قیمتی چیز شیشہ نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا کڑا ہوتا ہے اور جس جگہ دیکر یا صلیب کی جہتی ہیں وہاں ایک نہایت باریک نقطہ ہوتا ہے۔ نقطہ نہایت صحت کے ساتھ چرخ میں جایا جاتا ہے اور اس سے مختلف ستاروں اور سیاروں کے زاویہ اپ کو ایک جدول کی شکل میں مرتب کر لیتے ہیں چنانچہ جہت ہر گاہ گہن جو کئی سو سال کے بعد ہوتا ہے اور ایک دفعہ ہونیکے آٹھ برس بعد ہو کر پھر کئی سو برس کے بعد

ہوتا ہے۔ وہ اسی دور میں سے اُپاگیا اور اس سے بعض اہم نتائج مرتب کئے گئے ہیں۔  
 دورِ بین سے جیک انسان کی نظر کو بڑی حد تک مدد ملی کہ اُس نے فضا کے عالم کے سب سے پیشہ  
 اجسام کو دیکھ لیا۔ مگر پھر بھی انسان میں تھکنے اور غلطی کو نہ کیا اور وہ موجود ہے۔ کوئی شخص رات رات بھر جیکر  
 آسمان سے نظر بازی نہیں کر سکتا۔ اس لئے فوٹو کے کیمرہ نے خاص مدد دی۔ اگرچہ آسانی فوٹو کا کیمرہ  
 خاص ساخت کا بڑا قیمتی ہوتا ہے مگر جب سے سینا سدا اور اسکا استعمال دورِ بین کے ساتھ ہوا ہے اُس  
 وقت سے بہت سے تاروں اور اقمار کا انکشاف ہوا کیونکہ بعض وقت بہت خفیف روشنی تو نظر سے  
 بچ سکتی تھی مگر فوٹو کی پیٹ نے اُس کے عکس کو فوراً قبول کر لیا اور بتا دیا کہ یہاں ایک لاشعوم تارہ بھی موجود  
 ہے۔ یہ کیمرہ اکثر استوائی کے ہمراہ لگایا جاتا ہے تاکہ وہ کسی خاص یا تارہ یا ستارہ کی پوری حالت بتا سکا  
 چنانچہ پچھلے ہفتہ امریکہ کے ایک ملکی ذی ایک ستارہ فوٹو کے عکس سے معلوم کیا جکا فاصلہ آٹھ ہائیگ میل سے  
 جس کی روشنی کو زمین تک آنے میں ایک کروڑ تینتیس لاکھ برس لگتے ہیں جبکہ روشنی کی رفتار ایک کیناٹ  
 ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل یا ایک سال میں ۱۰ ہکریل ہے

اس آلے کے علاوہ طیف پہلے پہلے ہر مادہ کی بھی بڑی مدد دی یہ آلہ خود یا تو ایک علیحدہ  
 مضمون کا محتاج ہے مگر مختصر اہم یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے تحلیل شعاع ہوجاتی ہے اور  
 سفید رنگ کو تحلیل کر کے یہ اس کے سات رنگ نمایاں کر دیتی ہے۔ یہ مختلف دھاتوں اور گیسوں کے رنگ  
 بنا کر ہکویہ بتا سکتی ہے کہ سوچ میں کون کون سے عناصر موجود ہیں۔ اور کون کون سے عناصر اس میں نہیں  
 ملتے۔ چنانچہ بعیدین اجرام کے تمام عناصر کے ذریعہ ہکویہ معلوم ہوجاتے ہیں۔ اور ہم زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمان  
 کے اُن اجرام کا تجزیہ کر سکتے ہیں جکی روشنی کو یہاں تک آنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگ جاتے ہیں۔

# ایک جھلک

ہر کے ازمن خود شنایارمن و ز دردن من بخت اسرارمن

شاب کا زمانہ جستجو کا ہوتا ہے، نوجوان چاہتے ہیں کہ اپنی فطرت کے بھید دریافت کریں، اور ایسے لوگوں سے انکی دوستی ہو جو انکی طبیعت کو سمجھ سکتے ہوں اور ان سے محبت اور ہمدردی کریں۔ یوسف محمود ایک تعلقہ دار کا بیٹا جب کالج پہنچا تو تعلیم سے زیادہ اُسے دوستوں کی تلاش تھی۔ اُس کے باپ کو اپنی پچیسویں سے کبھی فرصت نہیں ملتی تھی، ملل کا اتنا حال ہو گیا تھا، ورنہ وہ بھی اپنے باپ دادا کے راستہ پر چلتا اور تعلیم کا اُسے خیال بھی نہ ہوتا۔ لیکن اُس کے چچا کو باپ کی بے پروائی اور ماں کی موت کی وجہ سے اُسے تعلیم دلائی کا موقع مل گیا۔ اور جب وہ سکول سے نکلا تو اُسے کالج بھی بھیج دیا، اور یوسف محمود بڑی خوشی سے گیا، اس لئے کہ اُسے اپنے ہم عمر لوگوں سے ملنے کا اور انکی صحبت سے فائدہ اٹھانے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پورے دنگ میں یہونچنے کے کچھ روز بعد ہی اُس نے معلوم کر لیا کہ وہاں کس کس قسم کے لوگ ہیں، ایک خاص طبقہ تھا جو دوسروں سے الگ الگ رہتا تھا، اور اپنے آپ کو کسی وجہ سے دوسروں سے برتر بھی سمجھتا تھا۔ یوسف محمود نے دیکھا کہ لوگ دہلی آوازیں کسی عورت کا نام لیکر آپس میں پھیسپانے لگتے ہیں، اور اگر کوئی انکی طرف غور سے دیکھتا تو کچھ جھینپ کر اپنا منہ پھیر لیتے ہیں۔ اس رویہ نے خواہ مخواہ یوسف محمود میں ان لوگوں سے ملنے کی خواہش پیدا کر دی، انسان کی خاصیت ہے کہ جو چیز اس سے چھپائی جاتی ہے اُسے دیکھنے اور سننے کا شوق ہو جاتا ہے، اور وہ ہر راز کو اسی وجہ سے ایک غلط اور غیر ضروری اہمیت دیدیتا ہے۔ اس لئے جب یوسف محمود نے دیکھا کہ کچھ طالب علم بان زیادہ کھاتے ہیں، آپس میں بہت آزاد اور خوش رہتے ہیں، دوسروں کی موجودگی انکے چہروں کو رد کھا، انکی گفتگو سٹیسی کر دیتی ہے تو اُس نے طے کر لیا کہ ان لوگوں کا بھید کسی یکسی طرح سے ضرور معلوم کرے گا اور انکے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ اُسے ابھی تک اپنی طبیعت کے اصل رجحان کی خبر نہ تھی، اور اُسے امید تھی کہ اگر وہ کسی طبقہ میں شامل ہو گیا تو اُسے دوست مل جائیں گے

اور ایک چھوٹی سی دنیا جس میں وہ خوشی اور غم کی ساری دنیا کا وقت کاٹ سکے گا، اور اس کی طبیعت میں جو چھینی تھی وہ جاتی رہے گی۔ مگر اس دنیا میں داخل ہونے سے پہلے اسے بہت دقتیں پیش آئیں۔ پہلے تو وہ لوگ جن سے وہ بے تکلفی پیدا کرنا چاہتا تھا اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتے رہے، اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ دراصل ان کی صحبت چاہتا ہے تو اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنے جیسے شہری گنوار کے ساتھ، یا ماہر فن نوکھنے کے ساتھ۔ مگر رفتہ رفتہ اسے انکی خاص گفتگو سننے کی اجازت مل گئی، اور اُنکے بھید اُسے معلوم ہونے لگے، جن عورتوں کے نام انکی زبان پر رہا کرتے تھے اُن سے بھی اُس کی ملاقات ہو گئی یوسف محمود کا خیال تھا کہ جب وہ اُنکے فن میں ماہر ہو جائے گا تو اُسے وہی تسکین ہوگی جو کارگر کو ایک اعلیٰ کام ختم کرنے پر ہوتی ہے۔ مگر اُسے اس طرح سے مایوسی ہوئی۔ اُس کے ساتھی اپنی مشقتوں کے حسن میں غرق ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ انہیں اپنی ادا شناسی پر فخر تھا۔ لیکن اُن کی آشنائی صرف ایسی عورتوں سے تھی جو پیٹ پالنے کے لئے انکی خاطر کرتی تھیں۔ یوسف محمود نے سوائے لاچار ری اور بزار ری کے انکے چہرہ پر کبھی کوئی ادا نہیں پائی، اور یہ ادا بجائے دلربا ہونے کے تکلیف دہ تھی لیکن اُس نے اپنے دوستوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنی رائے کبھی اُنکے سامنے ظاہر نہیں کی اور انکا جیسا رہنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کی آنکھوں سے دیکھنے لگا کبھی کبھی جب اُسے اس کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کے اور دوسروں کو جان بوجھ کر دھوکا دے رہا ہے تو وہ شرمندہ ہو جاتا ایک دو دن الگ الگ رہتا، لیکن پھر گھبرا کر انہیں لوگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا۔ اُس کی طبیعت میں آپ ہی آپ ایک جینی ہی پیدا ہوا کرتی تھی اور اس جینی کو اُس کے خیال میں صرف عورت دور کر سکتی تھی فطرت نے اپنے نظام کو قائم رکھنے کے لئے جو طریقے نکالے ہیں اُن میں سے یہ بھی ایک ہے مگر اس میں معصوم نوجوان مردوں اور عورتوں کو ایک بے رحم دنیا کے پھندوں سے بچانے کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے۔ شباب کے ساتھ ہی نوجوانوں پر کوئی جادو سا کر دیا جاتا ہے، اور نظرت کو اس سے کوئی مطلب نہیں رہتا کہ اسکا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور کتنی زندگیاں اس کی وجہ سے تلخ ہو جاتی ہیں، لیکن جو نوجوان اس پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی، اور جب وہ اس راستہ پر ایک مرتبہ

قدم اٹھاتے ہیں تو پھر کھارو کنا یا رکنا مشکل ہو گیا ہے۔ یوسف محمود پر جب کبھی افسردگی یا ایسی طاری ہوتی تھی تو اسے یقین ہو جاتا تھا کہ جن عورتوں کی صحبت میں وہ اپنی طبیعت کی ڈنگائی کشتی کے لئے سہارا دھونڈ رہا تھا وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ہیں اور اسے صرف ایک دہم کی صحبت میں خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔ اس کی بے مینی صرف دہی دور کر سکتی تھی جو خود بے چین ہو۔ ان بچا پروں کو نہ چین کی خبر تھی اور نہ بے مینی کی ان کے دلوں میں آرزو رکھنے کی جرات نہیں رہی تھی۔ زندگی کی ساری تمنائوں سے وہ ہاتھ دھو چکی تھیں صرف اپنی بھوک پیاس کے مٹانے کی فکر باقی رہ گئی تھی۔

ابھی تک یوسف محمود کا کہنا چاہئے صرف یہی تھا، وہ گرا نہیں تھا۔ اس کے ساتھی اکثر اسے چھیڑا کرتے، کہیں نہ کہیں اس کے لئے وقت مقرر کرتے، لیکن وہ کسی بہانہ سے اسے ٹال دیتا۔ اس کی طبیعت میں ایک جھجک سی پیدا ہو گئی تھی جسے دور کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے اسے اکثر تنفر اور پھٹپھٹاؤ سننا پڑتی تھیں، لیکن انہوں نے اس کی جھجک سنانے کی بجائے اور بڑھادی جب کبھی وہ ملاقات کے لئے جاتا تو ہمیشہ کسی کے ساتھ، اور تھوڑی دیر میں اس پر ایسا خوف طاری ہوتا تھا کہ وہ کسی بہانے سے نکل بھاگتا۔ اس کے ساتھی اس عشق پر تعجب کرتے تھے جو دیدار کے شوق میں معشوق کے دروازہ تک پہنچا کر وصل کے ڈر سے پھر واپس بھاگتا تھا، مگر کچھ دنوں کے بعد وہ اس کے عادی ہو گئے، اور دوستانہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کیا۔

کالج اور تعلیم سے فارغ ہو کر یوسف محمود مکان واپس آیا۔ اس کا باپ اپنی عیش کی زندگی میں بدلتا ہوتا تھا، اور سوائے ”اٹھا یوسف کہو کیسے ہو؟“ دونوں میں اور کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ یوسف محمود کے بلوغ کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس کے دل میں وہ بے باقی اور بے مینی نہیں رہی تھی۔ وہ خوش مذاقی کی حد سے کبھی نہیں گندا تھا اور اس وجہ سے اس کے مزاج میں ابھی نرمی باقی تھی مظلوموں پر اس نے ظلم نہیں کیا تھا، نہ بیوہ فاذ کے ساتھ بے رحمی، اس لئے اسے تلخ تجربہ کی جھوٹی نیکایت بھی نہیں تھی اور عورتوں کی گنجائش میں ان بچوں میں نہیں شامل ہو گئی تھیں جنہیں ہم خوشبودار بھکر شوق سے توڑتے ہیں اور جب ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوتی ہے تو بے پروائی و حطرت چاہیں ہاتھ اٹھا کر جھینک دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں

وہ رہتا تھا اُنکے اثر سے بچے رہنا نامکن تھا، اور اس کے علاوہ خود اُس کے دل میں اکثر عورتوں کی محبت میں بیٹھنے اور انکی باتیں سننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا، اور وہ یہ کہ انہیں عورتوں کے پاس جائے جہاں اُس کے جان بچان کے لوگ جایا کرتے تھے۔ وہ بہت دنوں تک بچکا تارہا، کیونکہ کہ اُسے اُسکا یقین نہیں تھا کہ اُس کی صحبت دور ہوگئی ہے، اور وہ اس پر نہیں تیار تھا کہ لوگوں کی مہنی اور اُن کی پھتیاں دوبارہ نہ۔

آخر کار یوسف محمود، ایک مرتبہ جن پرستی کا ارادہ کر کے اپنے گھر سے نکل پڑا کسی دوست نے اُسے اطلاع دی تھی کہ اُسے معمولی نالی گانے کی مجلسوں میں شریک ہو کر رفتہ رفتہ ان عورتوں سے پیہ و آفتیت پیدا کرنا چاہئے، اُس کے بعد تب تکلفی جب ایک مرتبہ تب تکلفی ہوگئی تو اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا ہوگا۔ اُس طرف ر خود ہی اشارہ ہوگا۔ یوسف محمود کو یہ ترکیب پسند آئی، اور وہ ایک رات کو چند دوستوں کے ہمراہ وہاں پیدا کرنے کا قصد کر کے چلا۔

موٹر پر بیٹھ کر سب اُس سڑک کی طرف گئے جو عیاشی کے لئے مخصوص تھی، اور ایک مکان کے سامنے ٹہر گئے جہاں غالباً پہلے سے اُنکے ایسی ایک اطلاع کر دی گئی تھی۔ یوسف محمود موٹر پر سے اتر کر دوسروں کے پیچھے پیچھے زینہ پر چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا وہاں شہد کی مکھیوں کے کئی چھتے ہیں اور کسی نے انہیں پھیر دیا ہے جب وہ کمرہ کے اندر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے جان بچان کے لوگوں کا بہت بڑا مجمع دو عورتوں کو گھیرے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس مجمع میں ہر شخص جانتا تھا کہ کم از کم ایک عورت کو اپنی طرف متوجہ کر لے، اس لئے ہمیشہ کئی آدمی ایک ساتھ بول اٹھتے تھے اور اکثر ایک ہی مرتبہ گہرا کر خاموش بھی ہو جاتے تھے۔ صرف چند لوگ جو علم مجلس سے واقف تھے۔ وہ بلند آوازیں بولتے تھے اور وہ عورتیں جواب میں مکرراتی تھیں اکثر لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مگر اُنکے خیالات ایسے اُبھے تھے اور ایسی دہنی آوازیں ادا کئے جا رہے تھے کہ کوئی کسی کی بات نہیں سمجھ پاتا تھا اور سب صرف ادھر ادھر دیکھتے اور بکے جاتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو بالکل خاموش دوسروں کی گفتگو سن رہے تھے، اور خود کبھی کبھ کہنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔



جن دو عورتوں کو مجمع گھیرے ہوا تھا ان میں سے ایک نوجوان تھی، اسکا رنگ تو ذرا کالا تھا مگر چہرہ کی ٹیکنی اور آنکھوں کی شوخی نے اُسے کافی خوبصورت بنا دیا تھا۔ دوسری کی عمر قریب تیس سال کے تھی، رنگ صاف تھا اور صحت بھی بہت اچھی تھی مگر اُس کے چہرہ پر عیاشی اور شراب خواری نے اپنی جہر لگا دی تھی، یعنی اُسے دیکھتے ہی ہر شخص یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کا ڈھنگ کیا ہے، اور اسی لئے ان لوگوں کو جو دیسی ہی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اُس کی صورت بہت پسند تھی۔ موٹے ہونٹ، اندر کو گھسی ہوئی آنکھیں تیس برس کی عمر۔ اس سب کا خیال کسی کو نہیں ہوتا تھا جس نے اُس کی باتیں سنیں اسکی نگاہوں کے نشتر کو مست ہو چلا۔ اور اس سے مطمئن رہا کہ اُسے کسی بے موقع یا بے نیکی جیسا سے سابقہ نہیں ہوگا۔

نوجوان عورت غالباً اس مجمع میں پہلی مرتبہ آئی تھی، کیونکہ وہ سہمی ہوئی اور ہر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ جب کوئی اُس سے خاص طور سے مخاطب ہوتا تو وہ گھبرا کر سکرا دیتی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتی۔ بخلاف اس کے دوسری عورت بہت اطمینان سے گفتگو کر رہی تھی تجربہ بنے اُسے سکھا دیا تھا کہ ایسے مجمع کو کیسے سنبھالنا چاہئے اور غور کرنے سے اس وقت یہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جو کچھ ہوتا تھا وہ اُسی کے حکم سے اور جو باتیں ہوتی تھیں وہ اُسی کی فرمائش پر اُس کی نظر ہر شخص پر تھی، ہر ایک کو یہی خیال ہوتا تھا کہ وہ اُس پر فدا ہے، اور جو خاموش دیوار کے پاس بیٹھے تھے اُن کو بھی یہ یقین ہوتا تھا کہ کبھی بھی اُن کے منہ پر ایک بہت لمبائی فرحت بخش ہوا آکر لگ جاتی ہے۔

جب یوسف محمود اپنے چند ساتھیوں کے پیچھے کمرہ میں داخل ہوا تو مجمع میں ایک صاحب جو ہر بات میں بہت آگے آگے رہتے تھے کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے یوسف محمود کو دونوں عورتوں کو ملایا۔ ”یہ ہمارے تعلقدار صاحب کے فرزند ارجمند ہیں، ابھی کالج سے فارغ ہو کر نکلے ہیں۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے آدمی کا مزاج خشک ہو جاتا ہے، انکے مزاج کو پھر ذرا تروتازہ کر دیجئے“ وغیرہ وغیرہ۔

نوجوان عورت مسکرا کر رہ گئی، دوسری نے بغیر اُنھے ہاتھ ملایا، اشارہ سے یوسف محمود کو اپنے پاس بٹھایا اور باتیں شروع کر دیں۔ کالج کا نام پوچھا، تعلیم کی حالت پر اپنی رائے ظاہر کی، کتابی علم کا اُس علم سے مقابلہ کیا جو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ایسی طرح ہنستی مسکراتی شرماتی رہی کہ جو

دور سے دیکھتا وہ ضرور سمجھتا کہ دونوں میں خاص طور سے رحیلی باتیں ہو رہی ہیں، یوسف محمود پر اس انداز کا بہت اثر ہوا، اس نے بہت دل کھول کر بغیر ہچکچائے یا شرمائے اُس کے سوالوں کا جواب دیا اور اپنی طرف سے نئے مصنوعات پر گفتگو چھیڑی، اُس کے آنکھیں کچھ دیر بعد ہی کسی نئے گمان کی فرمائش کی، طبعی مانگی سارے والے آئے، نوجوان عورت جو شاید اسی لئے بلانی گئی تھی سر ملانے لگی، مگر یوسف محمود کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوئی، وہ اپنے محکام کی صورت تک رہا تھا تھا، اور اُس کی زبان چل رہی تھی۔ اور اُس کے محکام نے کسی طرح سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ میں کوئی اور بھی ہے اور کچھ اور بھی ہو رہا ہے جب مجلس گرم ہوئی تو لوگ شراب بھی پینے لگے۔ یوسف محمود نے کمی شراب چکپی تک نہیں تھی لیکن جب اس کے محکام نے سکر اگر گلاس پیش کیا تو وہ اُسے اسی طرح پی گیا جیسے کوئی پرانا شرابی جس کے رنگ نشہ میں آنا نشہ سراپت کر گیا ہے کہ اُسے مست ہو چکا کوئی اندیشہ نہیں۔ اور لوگوں نے اس کی حالت کو محسوس کیا اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے، بلکہ ایک نے کافی بلند آواز میں کہا۔

”ہماری آرزو تھی کہ کسی کو عاشق ہوتے ہوئے دیکھیں، سو وہ بھی آج پوری ہو گئی، لیکن یوسف محمود نے کچھ نہ سنا۔۔۔

جب رات کے دوپہر گزر چکے تو سب اپنے اپنے گھر جانے لگے۔ یوسف محمود کو اتنا ہوش نہ تھا کہ وہ بھی گھر جا کر خیال کرے، اور نہ اپنے اوپر اتنا قابو کہ خود اٹھ سکے جس نشست پر بیٹھا تھا بیٹھا رہا، نگاہ جہاں پر آگئی تھی اُنکی رہی، نہ پہلو بدلا۔ نہ نگاہ ہٹی۔ آخر کار اُس کے دوستوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا، اور آخری آواز جو اُس کے کان میں آئی یہ تھی۔

”اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ ہم حیدر کی روزی آپ ہی کے ہاتھ میں ہو“ اور یہ کہ کسی نے بہت خلوص کے ساتھ اُس سے ہاتھ لایا۔ یوسف محمود پر اس آخری التجا بہت گہرا اثر ہوا، لیکن بیوقوفی میں وہ صرف اتنا کر سکا کہ اُس کے ہاتھ میں جو ہاتھ تھا۔ اُسے زور سے دبا یا۔۔۔

جب وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہنچا تو لیکن ایک طرف پھینکی، ٹوپی ایک طرف اور بڑی شکل

سے جتا اور روزے اتار کر لپٹک پر گر پڑا۔

شراب میٹھی ہوتی ہے، نشہ کی پہلی منزلوں میں برسوں کی بندھی ہوئی گریں کل جاتی ہیں، یعنی جو بھی کلامِ طہ سے انسان کو خاموش رکھتی ہے یا پوری بات نہیں کہنے دیتی، جو شک و شبہ اس کے خیالات کو اسی کے دل میں بند رکھتا ہے، یہ بے دو گلاس شراب میں دہل جاتی ہیں انسان کو اپنی لیاقت اور اپنے ذہن پر بھروسہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی موجودگی کی پروا نہیں رہتی، اس حالت میں دراصل انسان کی لیاقت کا بہتر انداز ہو سکتا ہے، بہ نسبت اُس وقت کے جب اُس نے اپنی پیاس صرف ٹھنڈے پانی سے بجھائی ہو۔ یہ تو بے معنی ہے، لیکن جس کسی نے رات کو شراب کا مزا چکھا ہے وہ دوسرے دن اپنے سر کو بھاری اور اپنے دماغ کو خالی پاتا ہے۔ یوسف محمود جب اپنی پہلی بے ہوشی کی نیند سے کوئی چار بجے کے قریب جگا تو اس کے سر میں بہت سخت درد ہو رہا تھا، گڑھی بھینسا رہی تھی، گردن اکڑ گئی تھی، آنکھیں بانہر چلی پڑی تھیں، لیکن اس حالت میں بھی جو بات اُسے سب سے پہلے یاد آئی وہ اُس عورت کی پردرد والو داغ تھی۔

”ہم جیہوں کی روزی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

یوسف محمود ان الفاظ پر غور کرتا رہا۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن جس لمحہ میں وہ کہے گئے تھے اُس نے انکے معنی اور مطلب کو بالکل بدل دیا اور وہ بجائے طوائفوں کے ایک عام نقرے کے ایک لڑکے کی نوا بن گئے۔ کون جانتا ہے، اُس نے سوچا، مٹا یا ایک شریف طبیعت کی عورت ایک ذلیل پیشہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ اُس سے صرف کینہ لوگ ملنے جاتے ہیں، اُسے فطرتاً بد اخلاق سمجھ کر علاوہ بیڑہ باتوں کے نہ اس سے کچھ کہتے ہیں اور نہ سنا جاتے ہیں۔ اسے وہ برداشت کرتی رہتی ہے۔ اپنی عزت کا اسے خیال نہیں ہوتا، لیکن جب کبھی ایک اچھی خصلت کا آدمی اسے مل جاتا ہے تو وہ یچین ہو جاتی ہے۔ یوسف محمود کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے، وہ ایک درد کے دریا میں غوطہ کھانے لگا، اور درد کی شدت بھی اس خیلی دنیا کی آفتوں سے اُس کی توجہ نہ ہٹا سکی، اُس کے دماغ میں بہت دیر تک غلیں چہروں کی تصویریں مٹی رہیں جن کے آنسو پونچھنے کے لئے کبھی کسی نے اپنا ہاتھ اٹھا ہی نہیں کیلئے گوارا نہیں کی تھی۔

دوسرا دن اُس کا بہت مشکل ہو گیا۔ لوگ اُس سے ہنس ہنس کر رات کے واقعات پوچھتے تھے اور

اُس کے سر میں درد تھا اور دل میں غم۔ لیکن غلطہ کر کے رات آگئی، اُسے اپنی کالی کُمی میں لپیٹ کر دنیا سے چھپا لیا۔ اور اُس کی دن بھر کی آرزو کہ کہیں جلد اکیلا چادر اوڑھ کر پڑے اور اپنے تنگین چہرے کو دیکھ کر پھر روئے پوری ہو گئی، نیند کی لٹے نہ خواہش تھی نہ امید، مگر وقت سے بہت پہلے ہی اُس پر ایک خار سا بھا گیا۔ اُس کی تصویریں دہندھلی ہو گئیں، اور نیند نے اگر اسے اپنا اور پر یا غم بھلا دیا اُس کی آنکھ پھر سویرے کھل گئی، اور وہ ایک نیم بیداری کی حالت میں دیتک لیٹا رہا، لیکن نیند نے ایک اور حکم کیا اور اپنے ساتھ ایک خواب بھی لے آئی جب وہ اٹھا تھا تو اُس نے ہر طرف اندھیرا پایا تھا۔ مگر اب ایک بارگی اُس کے سامنے سے ایک پردہ سا اٹھ گیا کہ وہ میں روشنی سی ہو گئی اور اُسے آپ ہی آپ اس کا خیال ہوا کہ یہ روشنی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ روشنی کو کیا تھی، شمع، زنگوں کی لہریں تھیں جن میں سُرخ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یوسف محمود نے جب غور سے دیکھا تو اُس کے پیچ میں اُسے ایک صورت نظر آئی جو ان زنگوں سے بنی تھی لیکن اُن سے بالکل بے تعلق تھی، ایک کوئی اٹھارہ برس کی لڑکی کی صورت جس کے نقشہ کو زندگی کی لپیٹوں نے نہیں بگاڑا تھا، مگر جس سے ہوشیاری، تجربات، بکری اور دشمنی برتی تھی۔ ایک عجیب سا چہرہ، جو کبھی اپنی ناک کے نازک بانے کے پیچھے چھپ جاتا، کبھی اپنی اپنی ہڈیوں کے پردہ میں غائب ہو جاتا، کبھی پیچھے ہٹ کر زنگوں میں ایک دھندلا دھابا بن جاتا، کبھی یوسف محمود کے سر کے بالکل پاس آ جاتا۔ وہ بڑی دیر تک اس صورت کو گھومتے پھرتے، اُس کے برہمنی پیچھے ہٹے دیکھتا رہا، پھر اکیلا رہی کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز آئی، وہ صورت جو ابھی تک کچھ بچان تھی سوئی سی معلوم ہوتی تھی، جگ پڑی، ہنٹ مکرانے لگے، آنکھیں شوخی سے چمکنے لگیں۔

”نہیں بھائی!“

یوسف محمود نے دیکھا کہ وہ چہرہ جو وہاں اُڑتا ہوا ہوا نظر آ رہا تھا دراصل ایک نوجوان لڑکی کا سر ہے، اور وہ ایک ہاتھ سے ٹیک لٹکائے اُس کے سر ہانے لگی ہوئی اُسے تک رہی ہے اور مکرانی جاتی ہے۔

”ارے یوسف، تو نے مجھے نہیں پہچانیا؟“

یوسف محمود نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی لیکن نہ ان شوم شریرانہ کھوں سے وہ نظر اڑا سکا نہ وہ سرٹلی پر جوش آواز سن کر اس کی زبان میں ہٹنے کی قوت باقی رہی۔

”میں تو یہیں کی رہنے والی ہوں!“

”کہاں کی؟“ یوسف محمود نے دبی آواز سے پوچھا اور پھر آپ ہی آپ ڈر گیا اور انہیں غبی کر لیں۔

”یہیں کی، تیرے ملک کی، تیرے شہر کی، تیرے مکان کی، مگر وہ کی۔ اب اور پوچھ کہاں کی رہنے

والی ہوں“

یوسف محمود خاموش رہا۔

برسوں سے تو تو مجھے تلاش کر رہا ہے۔ میرے انتظار میں بے چین ہے، اب جو میں خود آگئی تو تو پوچھتا ہے کہ کہاں کی ہوا در کون ہو؟ یوسف، یہ بھی کیا انہیں ہے۔۔۔“

لڑکی کی آواز سے سارا کرہ گونج رہا تھا، یہاں تک کہ اگر کوئی اُس کے ہنٹوں کو ہٹے نہ دیکھتا تو وہ نہ بتا سکتا۔ آواز کس طرف سے آرہی ہے۔ آخری جملہ کے بعد یوسف محم۔ دسے دیکھا کہ اُس لڑکی کا چہرہ پیلا پڑ گیا، آنکھوں کی چمک کم ہو گئی اور وہ صورت بالکل ایک معمولی لڑکی کی سی ہو گئی، لیکن اس سے اس کی کشش بڑھ گئی اور جن دو گونہ ہو گیا۔

”یوسف اگر میری سبقتی مقصود تھی تو دوسروں کی طرح مجھے یاد ہی نہ کیا ہوتا میں اپنی در و کو لے بیٹھی تھی تجھے کچھ معلوم نہ ہوتا مجھے کوئی امید ہوتی لیکن تو مدت سے میرا نور دوسری عورتوں کے چہروں پر، میری محبت اُنکے تراؤں میں، میری انگاری اُن کی توجہ میں تلاش کرتا رہا ہے جب کبھی میری جھلک تو نے نہیں دیکھی تو تیرا دل بھل پڑا جب کبھی تجھے میرے دیدار سے یابوسی ہوئی تو ساری رات سر جھٹکتا رہا۔ بیچتا، تو ان بازار کی عورتوں سے کیوں مٹنے جاتا ہے تیرے دل میں یہ بے چینی کیسی تھی، کل کے غار میں تیری آنکھیں آنسوؤں سے کیوں بھر گئیں، ہر جگہ تو مجھے ڈھونڈتا پھرتا رہا ہے، اب انکار کرنے سے کیا مطلب ہے؟ مجھے پھر سے دیکھ اور پہچان لے۔۔۔“

لڑکی پنگ سے ہٹ کر بچ کر وہ میں کھڑی ہو گئی۔ یوسف محمود نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ ایک شریر

مسموم لڑکی جس کی ہر اداس شوقی محبت اور خلوص، یہی طبیعت، اس کے خوشنما کپڑے۔ آبی دوپٹہ  
گلابی پانجامہ، اس پر کالی آنکھیں اور ساناؤ لا رنگ۔ یوسف محمود ایک پاک دلی محبت کے جوش میں لپٹک  
پڑ بیٹھ گیا، کچھ دیر اس سکرے پکٹے چہرہ کو تکتا رہا، پھر حلا اٹھا۔  
”ہاں میں پہچان گیا!“

”یوسف، تو کیسے پہچانتا۔“ لڑکی پھر اس کے ہلنگ کے پاس آگئی، اس نے بہت گھٹورے دکھاؤ  
سکرانی، یوسف کے ہر رگ وریشہ میں ایک نئی جان سی آگئی، اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً ہلنگ سے کود  
پڑے اور ساری دنیا میں اعلان کر دے کہ . . .

”نہر یوسف، تو نے مجھے پہچان تو لیا، مگر تیری زبان میں ابھی بولنے کی طاقت نہیں ہے، آبی ڈو  
گلابی پانجامہ اس پر کالی آنکھیں اور ساناؤ لا رنگ۔ اس سے کوئی کیا سمجھے گا؟ میری تعریف زبان سے نہیں  
ہو سکتی، اور مجھے تو صرف دیکھ سکتا ہے، دکھلا نہیں سکتا۔ . . مگر دیکھ، یہ یاد رکھنا۔ میری آنکھیں ڈیڑ  
ہفت روزہ پہلے تو بند کر رہی تھیں، مگر اب وہی کپڑے وہی۔ تو نے برسوں جو اپنے دل میں ایک عورت کی تصویر بنکر  
رکھی تھی، وہ میری ہی تھی۔ . . آبی دوپٹہ گلابی پانجامہ، اس پر کالی آنکھیں اور ساناؤ لا رنگ۔ مسکراتا ہوا  
چہرہ، شونخ باتیں، دل میں صرف تیری محبت، زندگی کا مقصد صرف تیرا ساتھ، تیری نگہ ساری۔ ایسی ہی  
عورت کی تجھے جستجو تھی کہ نہیں؟ مگر تو کسی کو کیا سمجھاؤ گے۔ میری صورت تو ہر شخص نے بنائی ہے، اور ہر شخص  
نے بنا کر اپنے دل میں رکھ لی ہے۔ . . لیکن میرے بھاری، میری آرزوؤں کو پورا کرنے والے میرے  
سچے عاشق بہت کم ہیں۔ سب مجھے جاتے سناتے ہیں اور پھر مجھ پر کچھ بھینکتے ہیں، مجھے بدنام اور ذلیل کرتے  
ہیں۔ . . یوسف مجھے دنیا نے بہت ذلیل کیا ہے!“

یوسف نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جب کچھ دیر بعد اس نے پھر  
نظر اٹھائی تو وہ لڑکی کمرہ میں نہیں تھی، ہر طرف اندھیرا تھا، جو باہر کے پردے سے چھن ڈرا سی روشنی  
آ رہی تھی اس میں ہر طرف بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑی ہوئی کرسیاں، زمین پر کھجورے ہوئے کپڑے  
دیکھ سکتا تھا، خواب کے منظر کے بعد دنیا کی یہ پریشان تصویر اسے بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی، باہر کوئی منہ

بولا، اور اُس کے کانوں میں اُس لڑکی کی پردہ سر پہلی آواز گونج رہی تھی۔ یوسف محمود نے کانٹھ کر کر پٹ بدل لی اور دل میں یہ فریاد کی کہ اُسے پھر اس صورت کے دیکھنے کی عزت بخشی جائے، پردہ آبی دوپٹہ گلابی پانچامہ، کالی آنکھیں، سانولا رنگ اُسے اپنے نشہ میں مست کر دیں۔۔۔

اس خواب کے بعد یوسف محمود پر جو گزری اُسے بیان کرنا مشکل ہے، اُس کے جیسے خواب بہتر لو نے دیکھے ہیں، اور کسی نے شاعری کی ہے، کسی نے انسان کی خدمت میں اپنی جان دیدی ہے، کسی نے انسان کو خدا کی شان دکھائی ہے۔ زیادہ تر یوسف محمود کی طرح صرف عاشق ہوئے اور اس عشق کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ وہ سوا اپنی ہستی کو کھودینے کے اپنی معشوقہ کے سامنے اور کوئی تحفہ نہ لاسکے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یوسف محمود ایک رات کو چند دوستوں کے ساتھ ایک رنگیلی مجلس میں شریک ہوا، ایک طوائف پر عاشق ہو گیا اور اُس کے چند روز بعد ہی باوجود بہت مضبوط اور ندرت ہونے کے اس کو ایک عجیب سا بخار آنے لگا جس کو حکیم ڈاکٹر کسی طرح سے دور نہ کر سکے۔ کبھی کبھی رات کو اُس کے تیار دار اُسے کسی لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے سنتے تھے، مگر اُس کی گفتگو بالکل اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔

# ہندوستان کا قدیم تمدن

(جدید معلومات کی بنیاد پر)

اب تک بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے جو تہذیب و تمدن کے کسی قدر آشنا تھے، وہ آریہ تھے۔ لیکن جدید اکتشافات اور تحقیقات نے ثبوت کیا ہے کہ ان سے پیشتر بھی یہاں جو لوگ آباد تھے، وہ اپنا ایک مخصوص اور مستقل تمدن رکھتے تھے۔ لیکن اس جدید نظریے کے ذرائع معلومات ابھی اس درجہ نامکمل اور غیر متعلق ہیں کہ ان پر کسی خیال اور اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا پتیلی زمین پر ایک ٹیلین عمارت بنانا ہے۔ اس کے متعلق کم و بیش جو معلومات ان ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں کہ یہاں کے لوگ جو آریہوں سے پیشتر اس ملک میں آباد تھے، ایک ہند اور تمدن حالت میں رہتے تھے۔ مرتب اور باضابطہ صورت میں ان کو کسی نظام زندگی کا ہیں تہ نہیں چلتا۔

برعکس اس کے آریہوں اور ان کی زندگی کے ایک ایک مہینہ کے متعلق اس قدر مرتب اور باضابطہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کہ اگر انہی کے تہذیب و تمدن کو ہم ہندوستان کا قدیم تہذیب و تمدن قرار دیں تو یہ صحت سے کچھ زیادہ بعید نہ ہوگا۔ ان کے ذرائع معلومات قدیم کتابت یا آثار نہیں ہیں جن سے ہم محض قیاسی نتائج اخذ کر سکیں، بلکہ ان کے تاریخ و تمدن کا دار و مدار ان صحائف اور کتب پر ہے جو اگر ایک طرف الہامی اور آسمانی مانی جاتی ہیں تو دوسری طرف وہ دنیا کی قدیم ترین کتب میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتابت یہ دید بھی اسی طرح مہربان محسوس طرح آثار و کتابت مدفونہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی مقدس آسمانی کتاب مانی جاتی ہے لیکن کتنے ہندو ہیں جو اپنی اس کتاب آسمانی کا ایک حرف بھی پڑھ سکتے ہیں؟۔ سیکڑوں اور ہزاروں پندت ہیں جو اپنے ہم مذہبوں کے لئے عبادات اور دیگر رسوم مذہبی ادا کرتے ہیں لیکن کیا انہوں نے کبھی ان کتب مقدسہ کی شروع سے آخر تک ورق گردانی کی بھی زحمت گوارا کی ہے؟ ان کے دُکے جو سنسکرت زبان کے کسی حد تک واقف بھی ہیں، انہوں نے کیا کبھی اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے اور اس سے تاریخی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت زبان و ادب



کامطالعہ علمی نقطہ نظر سے اٹھارویں صدی سے قبل باطل مفتوح تھا خدا بھلا کرے گلشنہ ہائیکورٹ کے اس چیف جسٹس کا جس نے سب سے پہلی بار اس زبان و ادب کے مطالعہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ میری مراد سروتیم جو نس سو ہے جس نے ایشیا تک سوسائٹی بنگال کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”سنسکرت ایک عجیب و غریب سنت کی زبان ہے۔ یہ یونانی زیادہ مکمل ہے، لاطینی سے زیادہ وسیع ہے اور ان دونوں سے زیادہ ہشتہ و زنتہ ہے۔“

ان الفاظ نے علمی دنیا میں ایک ٹپل مچا دی جس کے بعد سے سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ روز بروز ترقی کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یورپین مستشرقین کی ایک ایسی بڑی جماعت پیدا ہو گئی جنہوں نے اس زبان و ادب کے مطالعہ میں اپنی زندگی ختم کر دی۔ انہی کا مفیل ہے کہ آج ہندوؤں میں بھی دو چار نفوس ایسے نظر آتے ہیں جو اپنے اس کھام ربا نی اور کرب آسمانی سے علمی نقطہ نظر سے بھی واقف ہیں۔

زمانہ حال کے انہی مستشرقین میں ایک ذات ای۔ جے رین کی ہے جو آج کل کیسبرج یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر ہیں۔ اس شخص کو سنسکرت کے عالم ہونے کی بنا پر ہندوستان کے قدیم تاریخ و تمدن سے جو دلچسپی ہے، اس کا ثبوت اس سے پیشتر وہ ایک چھوٹی سی کتاب ”ہندو قدیم“ کے نام سے لکھ کر بے چکا ہے لیکن اُنہی حال میں کیسبرج یونیورسٹی نے قدیم ہندوستان پر ایک نہایت ضخیم کتاب شائع کی ہے جو انہی کی ادارت میں مرتب ہوئی ہے۔ تقریباً آٹھ سو صفحوں کی کتاب بڑی تقطیع پر صرف اشوک کے حالات پر مرکوز ختم ہو جاتی ہے، لیکن اس وقت کتاب پر کوئی تبصرہ کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اب سے تقریباً ہزار برس پیشتر ہندوستان میں کس قسم کا تہذیب و تمدن رائج تھا آریہوں کو ابھی ہندوستان میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور وہ دریائے سندھ کے سرسوتی سے آگے نہیں بڑھے تھے کہ انہوں نے اس محدود زمانہ و مکان کے اندر تہذیب و تمدن کی ایک نہایت عظیم شان عمارت کھڑی کر دی جو آج اپنے دلچسپ غریبوں کی آنکھوں کو بھی خیرہ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آئے ذرا دیکھیں کہ اس واقعہ کی کہانیاں حقیقت پر اور اس عمارت کے مختلف حصہ اور کمرے کس حیثیت کے تھے۔ سب سے پہلے خانگی زندگی کو پیجئے۔

خانگی زندگی اگر نہیں بڑا بوزر حجاب سمجھا جاتا تھا۔ وہی گھر کا مالک ہوتا تھا۔ گھر کے اندر کی مالکہ ماں ہوتی جو اپنے

نور کی حد درجہ مطیع اور فرمانبردار ہوتی تھی باپ کو اولاد کی تنبیہ کا ہر طرح سے حق ہوتا تھا، اولاد بھی اپنے والدین کی نہایت اطاعت گزار ہوتی۔ شادی وغیرہ کے معاملہ میں اگر چاہا اولاد کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی لیکن ان معاملات میں والدین کا بھی بڑی حد تک دخل ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بیٹا اکثر باپ ہی کے ساتھ رہتا تھا ہواپے سسر کا بہت لحاظ رکھتی تھی لیکن جوں جوں والدین کبرسنی کو پہنچتے، بیٹے اور بہو کے اختیارات وسیع ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ اخیر عمر میں بیٹا اور بہو گھر کے اندر اور باہر دونوں کے پورے پورے مالک ہوجاتا۔ کنہیا بڑا بوڑھا ساری جائداد کا مالک ہوتا منقولہ جائداد مثلاً مویشیوں کے گھنے، فصلوں کی پیداوار وغیرہ میں ہر کن خاندان شریک ہوتا یکیت عموما ہر بالغ اور ہوشیار کن کے عیوہ علیحدہ ہوتے، اس لئے کہ ملک خدا، ان توانا اور تندرست آریںوں کے لئے تنگ نہ تھا۔ تقریباً تین پشت تک یہ اسی طرح کھجائی زندگی بسر کرتے لیکن اس کے بعد ایک کنہیں اتنے افراد ہوجاتے کہ قدرتنا ان سب کے لئے گناہن کافی نہ ہوتی اور وہ تقسیم خاندان کے لئے مجبور ہوتے، پھر بھی وہ سب کے سب پاس ہی پاس رہتے اس طرح ایک کنہیا بڑھتے بڑھتے ایک گاہوں یا قریہ ہوجاتا۔

عاشقانی زندگی | اس ناگہانی زندگی کے علاوہ ان کی معاشرتی زندگی بھی نہایت باضابطہ اور منظم تھی اور اس سے بھی ایک اعلیٰ تہذیب و معاشرت کا ثبوت ملتا ہے۔ بہت سے عادات و رسوم جو آج کل ہندو سماجی کے پیشانی پر بنیاد سے ہیں، اس زمانہ کے آریںوں میں انکا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مثلاً بچپن کی شادی کا ان میں کوئی دستور نہ تھا۔ لڑکا جب سن شعور کو پہنچتا تو اپنی شادی کا انتخاب آپ کر لیتا لیکن والدین کو بھی ان معاملات میں بڑی حد تک دخل ہوتا تھا۔ طلاق کی نوبت بہت مشکل سے آتی تھی۔ شادی پر لڑکی کی طرف سے کافی جہیز دیا جاتا تھا اور دلہن باقاعدہ رخصت ہو کر اپنے گھر آتی تھی۔ آریںوں میں عموماً ایک شادی ہوتی تھی ایک سے زیادہ شادیاں یا تو راجہ کرتا یا اس کی تقلید میں وہ لوگ جو صاحب دولت ہوتے۔ مردوں کے لباس میں عموماً دو یا تین کپڑے ہوتے جو روئی کے علاوہ بھڑکے ادن سے بھی بنتے تھے۔ اکثر بوڑے کی پستین بھی بطور پوشاک کے استعمال کی جاتی۔ وہ اپنی امارت اور تعیش کا اظہار زرری کے کپڑوں سے کرتے۔ مرد اکثر زیورات بھی پہنتے تھے مثلاً بالے، جوشن اور کوئی چیز گلے میں تھوہاروں کے موقع پر

وہ ہار پہنتے تھے۔ مرد بالوں میں تیل ڈالتے اور نگھیاں کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر سر سے دائیں جانب باندھ لیتے۔ وہ عموماً دارمیں بھی رکھتے تھے۔ ان کی غذا میں زیادہ تر دودھ، گھی اور کھن ہوتا تھا۔ وہ غلہ سے آنا بنا جانتے تھے اور اسے گھی، دودھ میں ملا کر طرح طرح کی مٹھائیاں تیار کرتے تھے۔ انکے کھانوں میں بٹری اور پھل بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ قربانی کے موقع پر تو وہ ذبح کرتے ہی تھے لیکن احباب کی ضیافتوں میں بھی وہ بلا کھلف فریہ بھڑوں کو ذبح کرتے تھے۔ انکے نزدیک اسے گائے کے احترام میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ بھڑا بکری کا گوشت بھی کھتا تھا، علاوہ اس کے انکے ہاں گھوڑے کی قربانی بھی ہوتی اور اس کا گوشت کھایا بھی جاتا۔ گوشت کے پکانے کے طریقے تھے ایک تو اسے بالکر بجاتے دوسرے انکے کباب بناتے تھے۔ شروبات میں دو چیزیں داخل تھیں جو شراب کی قایم مقام تھیں، ایک کانام 'سوم' تھا جو کسی پودے کے عرق سے بناتا تھا، اور دوسرے کانام 'سورا' تھا جو غلہ سے تیار کیا جاتا اور اس میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ نشہ ہوتا تھا۔

تفریحی شغل | کسی قوم میں معمولات زندگی کے علاوہ تفریحی شغل کا پایا جانا تمدن کی ایک بہت بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس سے کم سے کم قیہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کے کاموں کے علاوہ جو بقائے زندگی کے لئے لازم ہیں، کچھ ایسے شغل بھی رکھتے ہیں جو زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے ضروری ہیں جیسا کہ آریوں کے اس دور تمدن میں بھی بہت سے ایسے شغل پائے جاتے ہیں جو محض خطنفس اور سرور قلب کے لئے کئے جاتے تھے۔ مثلاً رتھوں کا دوڑانا۔ یہ انکے ہاں کی ویسی ہی اعلیٰ سواری تھی جیسے آج کل ہمارے ہاں گھوڑے کی سواری ہے اور جس طرح اس زمانہ میں گھوڑ دوڑ ایک بہت بڑا تفریحی شغل سمجھا جاتا ہے اسی طرح انکے ہاں رتھوں کا مقابلہ بھی اسی دلچسپی اور شوق کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قمار بازی کا رواج بھی پایا جاتا تھا۔ ایک حد اعتدال تک نکلن ہر کسی قدر دلچسپی اور تفریح کا باعث ہو لیکن جب اپنے پورے سراپچا کے ساتھ بازی کھیلی جائے تو یہی شے مذموم ہو جاتی ہے۔ آریوں کے اس ابتدائی عہد میں کہیں حد اعتدال سے گزرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ قص و سرود کا بھی رواج ہو چلا تھا۔ آج ابتدائی سے ابتدائی تمدن رکھنے والی جماعتوں میں بھی یہی شے کسی نہ کسی حالت میں پائی جاتی ہے، لیکن آریوں کے ہاں اس فن

میں کافی ترقی ہوگئی تھی۔ بچے میں عمو انکواری لڑکیاں ہوتی تھیں لیکن عجیب بات یہ کہ اس زمانہ میں مرد بھی ناپتے تھے۔ سو سیتی میں تو انہوں نے بہت خاصی ترقی کر لی تھی، بامدی کی ہر ساقام بانی جاتی تھیں۔ مثلاً منڈھی ہوتی شکل کے جیسے جلد وغیرہ، تار سے بنے ہوئے جیسے سارنگی، ہستار وغیرہ، اور پھونک کر بجائے جانیوالے جیسے یا نسری وغیرہ وغیرہ دوسروانکے ہاں سخن سمجھا جاتا تھا جی کہ ان کی عبادت میں بھی داخل تھا۔

**عاشی زندگی** | جب کچھ لوگ یکجا رہتے رہتے ہیں تو انہیں ہم داد و ستد کے مخصوص طریقے رائج ہو جاتے ہیں اور وہ پیدا نش دولت اور ان سرائش مال کے پیر خاص طور طریقے بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ زندگی کا یہ پہلو معاشی پہلو کہلاتا ہے۔ دیکھنا یہ کہ آریوں میں یہ پہلو کما شک نایاں تھا۔ ان میں آپس میں دین کا طریقہ یا تو دان پن کے ذریعہ تھا یا خرید و فروخت کے ذریعہ۔ مستطیع ان خاص خیرات و زکوٰۃ کے طور پر مویشی، غلہ، اکیٹ بہت کچھ دے ڈالتے تھے اور برہمنوں کو اس طریقہ پر بہت کچھ مل جاتا تھا۔ خرید و فروخت میں سکوں کا رواج نہ تھا۔ تمام لین دین اجناس میں ہوتا تھا۔ گائے ایک بہت بڑی جنس مبادلہ بھی جاتی تھی۔ عموماً، اگایوں کے بدلے ایک اندر کی موڑتی آتی تھی۔ لاشک، ایک قسم کا زیور ہوتا تھا جو بطور سکہ کے چلتا تھا۔ بعد میں یہی اگر ایک طلائی سکہ کا نام ہو گیا۔ ان میں درخت کا بھی دستور تھا اور لیکر کن خاندان کے مرنے پر ورثا کو جانا دوارا نہ ملتی تھی لیکن بشرطہ اپنی قوت بازو سے حاصل کرتے انکے ہاں قرض کے لین دین کا بھی دستور تھا جسوہ ریٹر کہتے تھے۔ بہ صورت عدم استطاعت مقروض کو بہ ذات خود اپنے قرضخواہ کے ہاتھ بک جانا پڑتا تھا۔

انہوں نے صنعت و حرفت میں بھی کافی ترقی کر لی تھی اور انکے ہاں مختلف قسم کی مصنوعات کا ذکر ملتا ہے۔ تھول اور گاڑیوں کی مرمت اور انکو بنانے کے لئے بڑی کام نہایت خوب ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ لکڑی کی اور دوسری چیزیں بھی بنتی تھیں۔ پہلے کہیں آجکے کہ وہ چمڑے کا لباس بھی پہنتے تھے۔ اس لحاظ سے چرم سازی کا کام بھی ہوتا تھا اور اس سلسلہ میں چمڑے کی مختلف چیزیں بنتی تھیں۔ پھر کپڑے بننے کا کام تو لازمی ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، ریاست و امارت کے اظہار کے لئے زری کے کپڑے

استعمال کئے جاتے تھے، ایسی صورت میں یہ پیشہ بہت کافی ترقی کرتا تھا، ساتھ ہی اسکے خیانت کا ہونا بھی ضروری ہے اور زرعی کے کام کے ساتھ اس فن کا ترقی پذیر ہونا ناممکن ہے۔ علاوہ اس کے چھوٹے چھوٹے کام مثلاً چٹائیاں وغیرہ بنانے کا دستور بھی تھا۔ طبع طرح کے مٹی کے برتن بھی بنتے تھے اور اس فن نے کچھ عرصہ بعد جو ترقی کر لی تھی، وہ آج کل کے اکتشافات سے ظاہر ہے اور جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ فن کچھ بہت زیادہ پیچیدہ رہا ہو گا۔ ان سب باتوں میں ایک بات جو سب سے زیادہ عجیب و غریب پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ابھی تک کسی پیشہ کو ذلیل اور حقیر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بات یہ کہ جس طرح بعض دوسری ابتدائی قومیں مثلاً یونانیوں اور رومیوں میں غلامی کا رواج تھا اور غلاموں ہی سے تمام کام لئے جاتے تھے، انہوں میں اس قسم کا کوئی دستور نہ تھا۔ سارا کام آریں خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، زراعت و کاشتکاری صنعت حوت غرض تمام کام وہ خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ کوئی غیر قوم یا غیر قبیلہ کا شخص مزدور یا نوکر نہ ہوتا، جو انکے بجائے ان کے سارے کام کرتا، پھر وہ ذلیل یا حقیر سمجھتے تو کسے؟

سیاسی نظام | اس سے یہ مفہوم ہرگز نہ لینا چاہئے کہ تمدن کے اس دور میں انکے ہاں کوئی بہت بڑا سیاسی و ملکی نظام ہو گا۔ لے دے کے صرف ایک بادشاہ ہوتا تھا جو جنگ میں فوج کا سردار ہوتا اور امن کے زمانہ میں انکے تمام امور کا نگران رہتا۔ چھوٹی چھوٹی قوموں پر راجہ خود نہ جاتا بلکہ کسی دوسرے کو فوج کا سردار بنا کر بھیجتا۔ امن و امان کے زمانہ میں اسے کچھ بہت زیادہ کام نہ ہوتا، اکثر عبادت و قربانی کے موقعوں پر وہ انکا امام ہوتا۔ اس کے علاوہ مال اور فوجداری کے تمام معاملات اسی کو طے کرنے ہوتے قانون رشتہ و مال کا جھگڑا نہ تھا جو مقدمات میں پیچیدگی ہوتی ہر شخص بالعموم اپنی قوت بازو کی کمائی کا مالک ہوتا۔ چوری و عور کے معاملہ میں چور کو کچھ کرنا پڑتا تھا تو تھیکہ دہ اپنے جرم کا اقرار نہ کر لے اور اس کے اعزہ اگر مال سرودہ کی تلافی نہ کر دیں۔ پولیس کا بھی کم بیش انتظام تھا اور بالعموم ان سے سراغ رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ پنجاب میں دغوجی کے نام سے آج تک ایک ذات ہے جو اس کام میں بڑی جہارت رکھتی ہے۔ سبھا، یاہیتی، کے نام سے ایک مجلس بھی تھی جس کا کام بادشاہ کو مشورہ دینا ہوتا یہی جماعت آگے چل کر بہت با اختیار ہو گئی اور شلین مقدمات کے فیصلہ کرنے میں اس سے جوڑی کا کام لیا جاتا تھا۔

جنگ میں قبیلہ کا قبیلہ شریک ہوتا۔ پروہت، اس کے لئے لوگوں کو آمادہ کرتا تھا۔ لڑائی غلہ رتھوں پر سوار ہو کر ہوتی تھی۔ جنگ کے دوران میں کوئی خاص نظام و ترتیب نہ ہوتی۔ تیر انداز راجہ کے پاس جانب کھڑا ہو جاتا اور دواں سے تیر چلاتا۔ سلحہ میں تیر و کمان کا خاص طور پر استعمال تھا۔ تیر کا اہل حصہ ہڈی یا کسی دھماکا ہوتا تھا جو کسی پتلی لکڑی میں لگا ہوتا۔ بعض وقت تیر زیر میں بھلے ہوئے استعمال ہوتے تھے اس کے علاوہ نیزے، بلم، تلواریں، تیغے بھی استعمال ہوتے تھے۔ مدافعاۃً ایلچوں میں زورہ اور پکتر پہنے جاتے۔ جنگ میں سواری کے لئے گھوڑوں کا استعمال نہ تھا۔ میدان جنگ عموماً دریا کا ساحل منتخب کیا جاتا تاکہ پانی وغیرہ کی آسانی ہو اور کم سے کم ایک جانب تو دشمن کے حملہ کا خوف نہ رہے

مذہب و فلسفہ آریں تہذیب کے مختلف شعبے اگرچہ ایک بلند معیار پر پہنچ چکے تھے، پھر بھی ان میں ایک طرح کی سادگی اور بے تکلفی باقی تھی لیکن ان کے مذہب و عقائد میں بہت زیادہ جمیدگی اور طوالت نظر آتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب غالباً مذہبی جماعت کا وجود ہے جس کا کام مذہب کے معاملات پر غور و فکر کرنا اور مذہبی عبادات کا انجام دینا ہوتا تھا۔ ان کا مذہب ایک بالکل فطری مذہب تھا۔ کائنات فطرت خلقت سورج، چاند، تارے، آسمان، ہوا، زمین، دریا، پہاڑ ان سب سے انکا روزانہ کا سابقہ پڑتا تھا اور یہی ان کے معبود تھے۔ وہ سورج سے روشنی اور گرمی پاتے تھے، وہی زمین سے غلہ اگاتا اور ان کی فصلوں کو پکاتا تھا، زندگی کے نفع و بقا کا اس پر بہت حد تک دار و مدار تھا، لامحالہ اس کا ایک احترام و وقار دل میں پیدا ہو گیا اور وہ معبود بن گیا چاند اور تاروں سے رات کی تاریکی دور ہوتی، ان کی ٹھنڈی اور دھیمی روشنی ان کے قلوب پر ایک اثر و کیفیت پیدا کرتی، اس لحاظ سے ان کے ساتھ انہیں ایک طرح کا تعلق خاطر اور لگاؤ پیدا ہو گیا اور یہ بھی ان کے معبودوں میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح زمین جس پر وہ دن رات چلتے پھرتے اور اپنے مکانات بناتے اور جوا انہیں اپنی بچائی سے غلہ اگا کر دیتی، ان کے ادب و احترام کی ایک شے ہو گئی۔ اس طرح کائنات عالم کی وہ تمام چیزیں جو ان کے نفع و سود کا باعث ہوتی ہیں ان کی معبود بن گئیں چنانچہ رگ وید کے اندر ان کے دیوتاؤں میں ہم درگن (آسمان) برتھوی (زمین) سوریا (سورج) وایو (ہوا) اندر (بھد) اشتر (سحر) اسوین (صبح و شام کے دو ستارے) اگنی (آگ) کے نام پاتے ہیں

جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔

انکے علاوہ ان میں بعض غیر مرئی معبودوں کا تخیل بھی پایا جاتا ہے مثلاً وہ اعتقاد (شرعہ) اور غمہ (منیو) کے متعلق بھی ایک طرح کا ادب اور خوف اپنے دل میں رکھتے تھے۔ انہوں نے بعض دیوتاؤں کو اپنے خیال کے مطابق بعض جانوروں کی شکلوں پر ڈھال لیا تھا۔ مثلاً اندر (رعد) اور دیانوسٹر (آسمان) ایل کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ سوریر (سورج) ایک گھوڑے کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ نیلن یہ جانور بذات خود نیک معبود نہ تھے اور اس کی وجہ سے انہیں بت پرستی نہیں پائی جاتی تھی۔  
'خیر' کی ان قوتوں کے ساتھ انکے ہاں بعض 'شر' کی قوتوں کا مظہر بھی پایا جاتا ہے جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ عبادت و قربانی کے راستے سے انہیں روکتے ہیں مثلاً 'اسورا' اور 'کیشتر' ان کے ہاں بمنزلہ شیطان کے مانے جاتے تھے۔

دیوتاؤں کے ساتھ ان کا تامل و بامید و توقع کا تھا۔ وہ ان کا ادب و احترام اس بنا پر کرتے تھے کہ ان کے ساتھ محبت و عقیدت اس وجہ سے رکھتے تھے کہ ان سے انہیں نفع و سود کی توقع ہوتی تھی۔ قربانی بھی وہ اسی امید پر کرتے کہ اس سے ان کے دیوتا خوش ہونگے ان کا عقیدہ تھا کہ قربانی کی چیزوں میں ان کے دیوتا بذات خود شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں قربانی میں دودھ، گھی، غلہ، گوشت اور سرسوم شامل تھے جواز قسم، ماکولات و مشروبات انکے ہاں کی بہترین چیزیں ہیں۔ ان کے قربانی کا طریقہ نہایت باضابطہ و بہت طویل ہوتا تھا بااوقات سات سات برہمن شریک قربانی ہوتے تھے کچھ منتر پڑھتے بعض کام میں لگے رہتے اور کچھ گانے بجانے میں مصروف رہتے۔

کائنات فطرت سے محبت و تعلق ہونے کے ساتھ ان میں ایک صنایع کل (دشوکرمن) کا تخیل بھی موجود تھا۔ جہاں ان کے متعدد دیوی اور دیوتا تھے، وہاں انہیں ایک معبود حقیقی کی تلاش بھی تھی اور وہ ان الہیاتی سائل پوچھنا ضرور فکر کرتے رہتے تھے تخلیق عالم کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا مدہ سے وجود میں آئی۔ اس عالم کی تخلیق پہلے پانی کی شکل میں ہوئی۔ پھر گرمی کی لیکن حیات بعد المات کائنات کے ہاں کوئی خاص تخیل نہیں پایا جاتا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح یا تو پانی پر چلی

جاتی ہے یا پودوں پر رہتی ہے۔ وہ ایک دوسری زندگی کے قائل ضرور تھے اور اس کے تعلق وہ صرف اتنا  
 یقین رکھتے تھے کہ اُس عالم کی زندگی پر کس علم و نیا کے افعال و اعمال کا اثر ہوتا ہے۔

---



# فرقہ دارانہ تسلیم

## بطرز اشتیغی لی کاک

اسیلی۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء۔ آج عام جلسہ میں مسودہ قانون تعلیم کی دفعہ ۲۴۳۲ پر بحث ہوئی۔ آنریبل ممبر تعلیم نے تحریک کی کہ ”اسیلی کی رائے میں جس خلت کے دو اضلاع مساوی ہوں اس میں ان اضلاع کے مقابل زاویہ مساوی ہوتے ہیں اور اگر یہ اضلاع آگے کو بڑھانے جائیں تو دونوں بیرونی زاویے بھی مساوی ہوں گے۔“ آنریبل ممبر نے اپنی تقریر میں حکومت کے انصاف پسندی اور معدلت گستری پر زور دیا آپ نے فرمایا کہ اگر کالفاظ اس تحریک میں محض احتیاط کی غرض سے ہے ورنہ اصل میں حکومت تمام اضلاع کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور سب کو مساوی سمجھتی ہے اسی طرح سب زاویے بھی حکومت کے زاویہ نگاہ سے برابر ہیں۔ دوسرے حصہ کی بابت آپ نے فرمایا کہ حکومت کو معلوم ہے کہ اضلاع کا بڑا ہانا قدامت پسندوں اور ترقی کے مخالفوں کو ناگوار ہے لیکن ایسی حالت میں کہ زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور ترقی کی راہیں سب سے کھلی ہوئی ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ حکومت جو ترقی کی علم بردار ہے اضلاع کو آگے نہ بڑھائے اور بیرونی زاویے نہ بنائے آپ نے کہا کہ بیرونی زاویوں کی برابری کی انجمن اقوام ذمہ دار ہے اس لئے اسیلی کو ان کی طرف سے بالکل مطمئن رہنا چاہئے۔ مخالف پنجوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے یقین دلایا کہ حکومت اضلاع کو بڑھانے کے معاملے میں نہایت حزم و احتیاط سے کام لے گی اور اسیلی سے مشورہ کر کے آہستہ آہستہ باقسط اس جہم کو سرانجام دے گی۔

جب آنریبل ممبر نے تقریر ختم کر چکے تو ہوم رول پارٹی کے لیڈر اٹھے اور آپ نے بہت زور شور سے اس تحریک کی مخالفت کی پچھلے ڈیڑھ سو سال کی سیاسی تاریخ پر بغیر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے فرمایا کہ حکومت نے کسی زمانے میں بھی اضلاع کو مساوی نہیں سمجھا بلکہ کبھی ایک کو بڑھا رکھا کبھی دوسرے کو اور زاویوں کو جب موقع ملا وہیں تقسیم کر دیا یہاں تک کہ موجودہ تحریک میں بھی صرف دو ضلعوں اور زاویوں کی برابری کا ذکر ہے اور دوسرے ضلع اور زاویے کی طرف سے جان بوجھ کر ختم پوشی کی جا رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ اس سے صاف بدینتی اور خیانت نہیں بلکہ ظلم و استبداد ثابت ہوتا ہے اضلاع کو بڑھانے کی بابت آپ نے کہا کہ یہ

ملک اور قوم کے لئے نہایت مہلک تجویز ہے جب اضلاع بڑے جانیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اور تیسرے ضلع سے دور ہوتے جائیں گے۔ علاوہ اس کے شلت سے باہر نکلنے کے بعد اضلاع پر بیرونی دنگ غالب آجائے گا اور ان سے جو زاویے بنیں گے وہ بھی بالکل بیرونی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مجموعی حیثیت سے یہ تحریک "ساوات، حریت، اخوت" کا گلا گھونٹنے کے لئے پیش کی گئی ہے اس لئے اسے اسی کو چاہئے کہ خود اس تحریک کا گلا گھونٹ دے۔

اس کے بعد مولانا مظہر اسلام کھڑے ہوئے اور اپنے آنراہیل متبرعلیم کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے یہ ضروری تحریک ایسے پر آشوب زمانے میں بلا خوف و خطر پیش کر دی آپ نے فرمایا میں خوشامدی نہیں، لیکن میرے خیال میں یہ کارنامہ آنراہیل مسٹر ستم اور آنراہیل مسٹر اسفندیار کی شجاعت کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ افسوس ہے کہ مجھے اس تحریک میں ایک ترمیم پیش کرنیکی ضرورت ہے۔ مجھ سے زیادہ اتفاق و اتحاد کا حامی کوئی نہیں لیکن موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے میں میرے اپنے ضلع کی مساوات کا ذمہ دار ہوں اور اسی کو بڑانے کی رائے دیتا ہوں، مساوات میرے ضلع کی بلا شرکت غیرے ملک ہر اس میں کسی کو حصہ دینا مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ اسی طرح بڑھنے کا مستحق صرف میرا ضلع ہے۔ دوسرے ضلع رجعت پسندی جس سے وہ میرے ضلع کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھا جاتا ہے اس کی زد دلی جس سے وہ میرے ضلع کو ہر قدم پر ٹپکت دیتا ہے۔ اس کا آپس کا ففاق جس سے وہ میرے ضلع کی مخالفت میں کھیل اور یک زبان ہو گیا ہے ظہر بن اشس ہے اس لئے اس کے مقابل زاویہ کبھی میرے مقابل زاویہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دوسرا ضلع اگر بڑھایا جائے گا تو بیرونی زاویہ کے بے گاد اور اس سے اسے دشت ہوگی اس لئے اسے ہرگز بڑھانا نہ چاہئے۔ دوسری ترمیم آپ نے یہ پیش کی کہ بیرونی زاویہ اور اندرونی زاویہ کی تفریق میرے ضلع کے لئے نہیں کیا جاسکتی۔ میرے یہاں مساوات کی روح اس طرح سراپت کر گئی ہے کہ بیرونی اور اندرونی زاویے آپس میں بالکل برابر ہیں بشرطیکہ وہ میرے ضلع سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لئے میں اس تحریک کو مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتا ہوں "اس اسبلی کی رائے میں چونکہ میرا ضلع اپنے شاندار ماضی اور قابل فخر ولایات کی بنا پر سادی ہے اس لئے اس کے مقابل

زاویہ بھی مساوی ہے اور اگر نہیں بلکہ مزدور اس زاویے کو بڑھانا چاہئے مگر بیرونی زاویہ بذات خود مساوی ہوا اور اپنے بجائی اندرونی زاویے کے برابر ہو۔

مولانا کی تفسیر اچھی طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ پندت بمع لال اٹھے اور اپنے حکومت اور نیریل ممبر تعلیم کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ آپ نے کہا کہ چالوسی میری عادت نہیں لیکن اس نازک وقت میں ایسی دلیرانہ تحریک پیش کرنا اتنی جڑی شجاعت کا کام ہے کہ مجھے بے اختیار آریل بل جہاں شے ارجن یاد آگئے۔ آئینے تحریک سے اصولی اتفاق ظاہر کیا لیکن اس کے بعض الفاظ سے اختلاف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اتحاد و اتفاق میرا دھرم ہے لیکن آج کل ہوا ایسی بگڑی ہوئی ہے اور دوسرے ضلع والے ایسے قوی اور خوتاگ ہیں کہ میرے خیال میں اس تحریک میں صرف میرے ضلع کا ذکر ہونا چاہئے اگر تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ کہ یہ شلت پہلے میرے ہی ضلع سے گہرا ہوا تھا۔ باقی دو ضلعے خدا بھائے کہاں سے آن کو دے ان میں سے ایک ضلع اس قدر شورہ پشت اور ظالم ہے کہ اس کے نام سے میرا دل کا تپتا ہے جب کبھی متقابل ہوتا ہے خواہ پہل اس کی طرف سے ہو یا نہ ہو خواہ اسے محسوس ہو یا فتح لیکن ظلم اور زیادتی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اس لئے یہ ضلع اصل میں شلت میں رہنے کے قابل نہیں ہے جانیگا اس کے متقابل کا زاویہ میرے متقابل کے زاویے کے برابر ہو۔ اب رہا اضلاع کو بڑھا کر بیرونی زاویے بنا تو خدا کے لئے کہیں لیا غصب بھی نہ کیجئے گا ورنہ دوسرے ضلع کا بیرونی زاویہ میرے زاویہ کو فوراً مسل ڈالے گا لہذا میں تحریک کو ذرا سے تغیر کیا تھا ان الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

شلت کے ایک ضلع سے کچھ بحث نہیں دو دھرم اظالم ہے البتہ میرے ضلع کے متقابل کا زاویہ مساوی ہے ضلع کے بڑانے کا میں مخالف نہیں بڑھائے مگر اس کا خیال رہے کہ بیرونی زاویہ ہرگز نہ بننے پائے پندت جی۔ یتھے ہی تھے کہ خانہ سال داخل ہوا اور اس نے جناب صدر کی اجازت سے تحریک کی کھلبے چائے کے لئے ملوثی ہو۔ یہ تحریک باتفاق رائے منظور ہوئی۔

# غزل

مصور جذبات حضرت آق ب لکنوی مدظلہ العالی

نالہ و فریاد آہ و کاش جس جاں دیکھنا  
قلب صد پارہ مرا اب تک ہو تصویر وفا  
مخیر بے نوا کا ساز دساں دیکھنا  
ٹوٹنے پر بھی نہ ٹوٹا دل کا پیاں دیکھنا  
لاکھوں رانوں کو اپنی گھر میں ہساں دیکھنا  
ہوش ارٹا دیا ہے آئینہ کا حیراں دیکھنا  
دشت والوں کی نضا ہو اب نہاں دیکھنا  
در نہ کیا آسان تھا ویں بیاں دیکھنا  
دل کی توت دیکھ لے پھر رکو جاناں دیکھنا  
دل نہ یوسف کا نظر آئے تو داماں دیکھنا  
دو رہی سرسراں اشکو کا طوقاں دیکھنا  
اک زرا محبت کر مرا جاگ گریاں دیکھنا  
کارا دل ہی سرکل کو آساں دیکھنا  
اس نہیں نے کیا اثر پیدا کیا ہاں دیکھنا  
درد اگر کم ہو تو تم سوئے نکلاں دیکھنا  
اک قیامت ہو کسی بستی کو ویراں دیکھنا  
ورنکب منظور تھا خواہ پریشاں دیکھنا  
ذبح میں ہولوں تو پھر زنگ گستاں دیکھنا  
تم کسی دن عالم گم نہ غریباں دیکھنا  
عمر بھر آسان ہے تاج کو پریشاں دیکھنا

نالہ و فریاد آہ و کاش جس جاں دیکھنا  
قلب صد پارہ مرا اب تک ہو تصویر وفا  
مخیر دل تو پھر بھی دل ہو کیوں نہ ہو مجروح حسن  
تنگی دل بعد وسعت آہیں سکتی کہیں  
حسرتوں کو آگ دیکر تم نے شکل سہل کی  
پس ڈالا خواہش بجائے کوہ طور کو  
بغیر جس کا نہیں وہ جاکن ہو بہت چین  
تم جو بیجا و تو بھی ہے محروم فراق  
کھل گیا داغ بکرا کچھ کسرا باقی رہی  
موت کی خواہش سوا میر کسی کو بھی نہیں  
ایک خیر ہو گیا دل کے لئے نکار وصل  
کائنات موت امن میں ہو میں دل کے زخم  
ہم نہ مر جاتے تو کیوں نہ تھا کوئی فریاد و مو  
ہستی فانی پاک اصرار تھا تقدیر کو  
جی جی سے نہ خوں اے تو مجسم جانا  
سوجھانوں کو مٹا کر ایک زمیں آباد ہے  
گریہ پہلو ہی دل اور ہی ہے تو پھر

# شب کشمیر میں

مژدہ ہو آرزو کے بسل کو  
 مژدہ ہو حیرت تماشا کو  
 جلوہ طور ہے مقابل آج  
 بے نقاب آج ماہ انور ہے  
 یہ سہا نساں یہ پیاری زمیں  
 حسنِ فطرت کی دلربا تصویر  
 سبز و شاداب وادیِ جمیل  
 دونوں جانب پہاڑ کی دیوار  
 ہے محکم و قار و شوکت حسن  
 بہہ رہا ہے نشیب میں دریا  
 نالہ بیقرار ہے ہر موج  
 نغمہ پیدا ہے آبشاروں سے  
 آج اس بزم میں ہے صدر نشین  
 دل کو بھاتی ہے سلجھیں  
 موجیں آپس میں لڑتی جاتی ہیں  
 کچھ عجب دلکشی ہے پانی میں  
 ماہِ کامل کے روئے روشن سے  
 رات کو اس نے دن بنایا ہے  
 دیکھو اعجازِ لذت دیدار  
 ہاں مگر محو خواب ہے سبزہ  
 مژدہ ہو دردِ آشنا دل کو  
 مژدہ ہو چشمِ حسنِ پیا کو  
 زیبِ گردوں ہے ماہِ کامل آج  
 کس قدر نفسِ ریب نظر ہے  
 کیوں نہ کہئے اسے بہت بریں  
 جانِ نظارہ خطِ کشمیر  
 آج کی شب ہے شکِ باغِ ارم  
 سرِ افلاک چوٹیوں کی قطار  
 بیکر استبار و عظمت حسن  
 گو گنجی ہے فضا میں جس کی صدا  
 ساز ہستی کا تار ہے ہر موج  
 راگِ جھرتا ہے کوہِ ساروں سے  
 شاد بہ کا عار من سیمین  
 صاف شفاف نور کی چادر  
 شکنیں اس میں پڑتی جاتی ہیں  
 چاندنی بہہ رہی ہے پانی میں  
 حسنِ فطرت کو حیا چاند لگے  
 سونے سنار کو چنگا یا ہے  
 ذرہ ذرہ زمیں کا ہے بیدار  
 کیا امتِ شباب ہے سبزہ

# اقتباسات

## فاشیستی تحریک

جنگ عظیم نے دنیا کے نظام میں بہت کچھ تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ وہ اصول جو جنگ سے قبل قطعی و زنا قابل تردید سمجھے جاتے تھے آج شکوک و گماہوں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مغربی نظام یا ست میں جمہوریت ایک ضروری عنصر تھا۔ لیکن آج روس، چین، ترکی اور اطالیہ کے سیاسی حالات کسی اور سمت کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اطالیہ میں فاشیستی تحریک جن کا لیڈر موسولینی ہے۔ اس نئی تحریک کا سب سے عجیب منظرہ ہے لیکن بعض اہل فکر اس تحریک سے بالکل خائف نہیں ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک عارضی شے ہے جو فی الحال کتنی ہی مدد و عیب کن کیوں ہو لیکن آخر کار فنا ہو جائے گی۔

مشرکسٹوارٹ جین جو ابھی اپنے سفر اطالیہ سے واپس آئے ہیں اپنے اخبار ڈیلی نیوز میں رقمطراز ہیں کہ مجھے اس بات کا قطعی یقین ہے کہ فاشیستی تحریک کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر میں یہ ان سب جرائم کے سبب جو اس کے نام سے کئے جاتے ہیں اور نہ ان جذبات کے سبب جن کا اظہار اس کے مدعوں پر کیا کرتے ہیں تباہ ہوگی بلکہ اس کی تباہی اس لئے قطعی ہے کہ یہ دہشت اور دروغانی بنیادوں پر استوار نہیں ہو۔ اس کی محرک صرف ناعاقبت اندیشانہ قومیت ہو۔ میں نے فلورنس میں ایسٹو پوڈریو کے تصنیف کردہ چند مضمون دیکھے جنہیں اطالیہ کے نوجوان بہت ذوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ ایسٹو پوڈریو میرا خیال ہے کہ نائب وزیر تعلیمات ہیں اور بذاتہ ایک نہایت ایماندار اور عقیدہ آدمی ہیں۔ میں ان کی کتابوں سے چند اقتباسات درج کرتا ہوں جنہیں میں اس تحریک کی مدح سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اخوة ایک نامکن الحصول نصب العین ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ نصب العین ممکن الحصول ہو تو ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم جمود سے ہلاک ہو جائیں جو کہ حقیقتہً ان کی خوشی کا انحصار اس کی جدوجہد اور اس کی

جنگوں ہی پر ہے۔

تمام طلبہ اپنے دلوں میں انہیں خیالات کو لئے ہوئے ہیں۔ ایک اس قدر معراور خمیدہ شخص کا ایسے نظریہ کو پیش کرنا اس تحریک کے طفلانہ پھوپھو کا فی روشنی ڈالتا ہے۔ انسانیت کے متعلق آپ فرماتے ہیں انسانیت وہ ہے جس میں ہم فاشستی یقین رکھتے ہیں۔۔۔۔ ہمارے لئے انسانیت صرف ۱۲ اہلین ملکی ۱۰ اہلین باہر رہنے والے اٹالین پر مشتمل ہے باقی دنیا کی ہیں کوئی پروا نہیں ہے۔

سن قسینوں نے بھی اپنے اتہائی جنون کے زمانہ میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کی مثال دے متعصب یہودیت ہی مگر متعصب یہودیت کی داستان کو چراغ ہدایت نہ بھنسا چاہئے بلکہ شمع محدود چاہئے۔

جمہوریت کا مستقبل

موجودہ جمہوری نظام حکومت کے خلاف جو شورش برپا ہے اسے پروفیسر رٹبروک ویس نسبتاً معاصرین کے زیادہ سمجھتے ہیں وہ اس کو جمہوریت کے منافی نہیں بلکہ معاون سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ ”واقعہ یہ ہے کہ لوگ پارلیمنٹری طرز حکومت سے عاجز آگئے ہیں اور اس کی بجائے ایک نئی طرز حکمران کے خواہشمند ہیں جہاں تک اس زمانہ کی تحریک کو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی اب نظام حکومت چاہئے جس کی باگ باہران حکومت کے ہاتھوں میں ہو جسے وہ کامیابی ہو بلا کیوں مگر وہ بذات خود عوام الناس کے سامنے جلب دہ ہوں۔ کلینہ اور سکرٹریٹ باوجود اجتماعی سیاست کے نئیب و فرار کے ایک عرصہ تک برقرار رہتی ہیں اس لئے زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ یہ رجحان زیادہ نمایاں ہے کہ حکومت کے لئے باہران فرار کئے جائیں اور انہیں روزمرہ کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیدئے جائیں۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ پارلیمنٹری حکومت سے یزاری اور جمہوری خیالات سے اختلاف ہم ہمہ اظہار نہیں ہیں کوئی شخص گذشتہ زمانہ کے استبداد کو اب دیکھنا نہیں چاہتا یہ ایک تاریخی اتفاق ہے کہ اس وقت پارلیمنٹری ادارے اور جمہوریت ہم معنی بھی جا رہی ہے۔

مضطرب کا عام جذبہ جمہوریت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس نظام حکومت کے خلاف ہے جو رائے د

کی فوری اور صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ سیاسی مدیرین پارلیمنٹری نظام حکومت میں تبدیلیاں کر لیں اور وہ زیادہ بوجھ اٹھانیکے قابل ہو جائے ممکن ہے کہ ہیں سوویٹ نظام حکومت کے خلاف قدرتی نظام حکومت اختیار کرنا پڑے۔ میں ان امور کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا تاہم اس کا مجھے کلی یقین ہے کہ رائے عامہ کا اثر اس اضطراب کے سبب خطرہ میں نہیں ہے۔ لوگ جو چاہتے ہیں وہ صرف یہ کہ اس کو اور زیادہ موثر بنایا جائے۔

## زوال مغرب

اس خیال کا اکثر اعادہ کیا جاتا ہے کہ یورپ کا موجودہ تمدن تباہ ہو جائیگا چونکہ اس کی بنیادیں مادیت پر قائم ہیں اور اس کے خمیر روحانی اجزائے باطل خالی ہے۔ اور قطعی ہے کہ حیات اجتماعی میں یہ عدم توانائی ہمیشہ تباہی کا پیش خمیر ہوتا ہے۔ لیکن یورپ کے موجودہ نظام میں ایک جدید عنصر کا اضافہ شروع ہو گیا ہے اور یہ اخلاقی اور روحانی عنصر ہے جس نے جنگ عظیم کے بعد کافی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اگر یہ عنصر موجودہ طمع اور خود غرضی پر غالب آگیا تو یورپ کے زوال کی بدبین گویاں محض خواب ثابت ہونگی لیکن یہ طے کرنا کہ یورپ ان اصولوں کی تسلیم کر کے خود کو تباہی سے بچائے گا یا نہیں اس کا بہتر جواب صرف مستقبل دیکھتا ہے۔

مہر و فقر و لاک یورپ میں اس روحانی تحریک کے وجود کے قائل ہیں چنانچہ CURRENT THOUGHT میں آپ اس کے تعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت مغرب تباہی سے صرف اس لئے بچ سکتا ہے کہ وہاں ایک زبردست روحانی تحریک جاری ہے۔ تمام خارجی انقلابات ضرور رونما ہونے چاہئیں لیکن اگر ہم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کا اصلی محرک اس خواہش کو ہونا چاہیے کہ ہم انسان کو آزادی اور ترقی کے زیادہ مواقع دیں۔

یورپ کی جدید روح صنعت اور حرفت میں تعاون چاہتی ہے تاکہ کام میں خوشی حاصل ہو۔ وہ مساویہ تقسیم دولت چاہتی ہے تاکہ لوگ غربت اور بے روزگاری کی تفکرات سے آزاد ہو جائیں۔ وہ دنیا دولت کا ایک معقول نظام چاہتی ہے تاکہ لوگوں کو علوم و فنون کے لئے وقت حاصل ہو جسے موجودہ تجارتی زندگی نے تباہ کر دیا ہے۔ وہ خارجی تعلقات میں ایک انقلاب چاہتی ہے تاکہ خود غرضانہ قومیت کا جسے اس وقت حب الوطن کہا جاتا ہے خاتمہ ہو جائے اور تمام دنیا کے لوگ قریب تر ہو جائیں۔



مختصر یہ کہ یہ روح تخریبی اصول طبع کی جگہ تعمیری اصول محبت کو دینا چاہتی ہے۔ اس انقلاب کو اس وقت شروع کر دینا چاہتی ہے چونکہ اس وقت حرص و آرزو نے دنیا کو کٹھڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جنگ دشمنی غربت اور نفرت کا دور دورہ ہے۔ سائنس کے تمام انکشافات تباہی کے لئے آلہ کار بنائے گئے ہیں۔ یہ باطل نمایاں ہے کہ محبت یا شوق خدمت ایک اعلیٰ اصول ہے چونکہ تعمیری اصول انسان میں سب سے قوی محرک ہے۔ وہاں کون کام کے لئے آادہ ہوگا جہاں تعلقات خوشگوار ہوں جہاں انصاف کا دورہ ہو اور جہاں محنت کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود ہو جبکہ خوف و طمع نے پیدائش دولت پر اس قدر اضافہ کر دیا ہے تو محبت اور آزادانہ خدمت کس قدر حیرت انگیز اضافہ نہ کرے گی؟

تعاون اور محبت کی روح اور خدمت کی خوشی موجودہ تمدن میں جاگزیں ہو کر تاریخ انسانی کا سب سے بڑا انقلاب کر سکتی ہے۔ یہ انقلاب یقیناً ایک جدید تمدن کا پیش خیمہ ہوگا جس میں ذاتی خود غرضی اور انفرادی ملک کی بجائے فلاح عامہ اور مشترکہ ملک کا خیال غالب ہوگا۔ یہ ہر ایک اہل فکر پر واضح ہوگا کہ قلیل مشترکہ کوشش سے تمام انسانوں کی احتیاجات پوری ہو سکتی ہیں۔ اس سے نجات حاصل کئے بغیر انہیں اپنے جذبات اور خیالات کو فنون کے ذریعہ اظہار کا کافی موقع مل سکتا ہے۔ سوشلسٹ کے اس روحانی نظام میں انسان اپنی منافع شدہ قوتوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرے گا اور ایک قرن کے اندر وہی دنیا حیرت انگیز ترقی کرے گی۔

### ہندوستان کی زراعت

ہندوستان کی ترقی کا انحصار زراعت کی ترقی اور کسانوں کی فلاح و بہبود پر ہے لیکن جو بدتر حالات ہمارے ہاں کی زراعت اور کسانوں کی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ زراعت کے متعلق تمام حالات کی تغیر کے لئے حال ہی میں رائل کمیشن زراعت کا تقرر ہوا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے پہلے حصہ کی دوسری جلد میں سے جس میں گورنمنٹ ماہران زراعت کی آراء درج ہیں۔ ہم مندرجہ ذیل اہم اقتباس درج کرتے ہیں۔

تمام حالات کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کاشتکار کی تباہی کا بہت بڑا سبب

اس کی جہالت اور توہم پرستی ہے۔

ایک شہادت سے جو پوسا میں لگی تہ چٹا ہے کہ غریب کاشتکاروں کو اپنی جہالت کے سبب دلالوں سے کاروبار کرنے میں بہت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ رعیت کو جعلی پانیوں اور روزنوں سے دھوکا دیا جاتا ہے۔ مسٹر ڈبلیو اسمتھ نے جو امپیریل ڈائری بنگلور کے ماہر فن میں فرمایا کہ ہندوستان میں مویشیوں کی پرورش جاہل قبائل کے ہاتھوں میں ہے جو مویشیوں کی بندش اور پرورش کے اصولوں سے محض ناواقف ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سال ہزاروں گزروں پر پیدا ہوتے ہیں جن میں نہ تو رکھیتوں میں کام کر سکتے ہیں اور نہ مادہ دودھ دے سکتی ہیں لیکن چونکہ ایک بار وہ پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے مہندو حیوانات کے سبب انہیں قتل نہیں کیا جاتا اور ہندوستان کو انکی موت تک انکے بیجا اعتراضات اٹھانے پڑتے ہیں بغیر کسی فائدہ کے وہ اس غذا کو سہم کر جاتے ہیں جسے مفید مویشیوں کو کھانا چاہئے تھا کسی دوسرے ملک میں یہ مویشی غذا کا کام دیتے۔ ہندوستان میں فصل کے زمانہ میں انہیں کافی غذا ملتی ہے مگر اس کے بعد آٹھ نومبر تک یہ بھوکے مرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے مر جاتے ہیں۔ مسٹر اسمتھ نے کہا کہ ایسی موثر تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں جن سے مویشیوں کی پیدائش پرورش اور غذا کے اصولوں کی ترویج ہو سکے۔ نیز انکے لئے غذا کا کافی انتظام کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ بالخصوص جادو کی لائین اور کچروں کے ذریعہ نہایت باضابطہ تبلیغ کی ضرورت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ کھیتوں میں عملاً مفید مویشیوں سے کام لیا جائے اور بتایا جائے کہ کاشت کے ہمراہ کس طرح مویشیوں کی بھی پرورش کیا جاسکتی ہے۔

## تنقید و تبصرہ

تاریخ فلسفہ اسلام مصنفہ ج۔ ج۔ دو بوز مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین پرنسپل فلسفہ و تعلیمات و انظم اردو اکادمی جامعہ علیہ اسلامیہ دہلی۔

اس موضوع پر اردو کا تذکرہ کیا اور کسی زبان میں بھی تھوڑا عرصہ پہلے کوئی مستقل تصنیف موجود نہ تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں مشہور مشرق دو بوز نے متفرق کوششوں سے مستفید ہو کر یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب اس موضوع پر پہلی تصنیف ہونے کی وجہ سے بہت مفید ہے اگرچہ بہت سی خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ اس موضوع پر فاضل شرم کے ان الفاظ کا جواب انہوں نے دیا ہے میں لکھ رہی ہوں اعادہ مناسب ہوگا فاضل مصنف خود اعتراف کرتا ہے کہ جس قدر تحقیقات فلسفہ اسلام کے متعلق ہو چکی ہے اس میں سے بعض چیزیں اس کی نظر سے نہیں گزریں۔ وہ اپنی کتاب کا مقصد محض اس بحث کا چھیڑنا قرار دیتا ہے نہ کہ اس عظیم الشان کام کی تکمیل۔ اسپر لحاظ رکھتے ہوئے کہ یورپ کے متفکرین کے لئے عربی غیر زبان ہے اور وہ مشرقی طرز خیال سے بیگانہ ہیں۔ اگر اس کتاب میں کوئی اعلاط پائی جائیں تو تعجب نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اسلامی فلسفہ پر ان چند کتابوں میں سب سے زیادہ مستند ہے جو اس عہد میں لکھی گئی ہیں اور یوں تو اصل میں یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ اپنے تمدن کے متعلق خود اپنی قوم کے لئے اور ساری دنیا کے لئے صحیح معلومات بہم پہنچائیں لیکن جو کوئی اس سلسلہ کو شروع کر گیا اسے دو بوز کی کتاب سے یقیناً معقول مدد ملے گی۔

ہیں مصنف کے بعض خیالات سے اختلاف و مثلاً مصنف پر تحریر ہے کہ ”اُسے (یعنی مدینہ مکہ) اس پر اکتفا کرنا پڑا کہ ایک حد تک یہودیت اور عیسائیت کے زیر اثر ثقہ اور حدیث کی تدوین کرے“ فقہ اور حدیث کی تدوین میں یہودیت اور عیسائیت سے کیا کیا اثرات قبول کئے گئے۔ اس کی تشریح کی ضرورت تھی بغیر دلیل کے یہ دعویٰ سمجھ نہیں ہو سکتا بظاہر تو یہودیت اور عیسائیت کا کوئی

اثر کم از کم تھا اور حدیث پر نظر نہیں آتا۔

اسی طرح صفحہ ۷ پر ہے کہ ”منصور ہی کے عہد سے یونانی ادب کا ترجمہ عربی میں زیادہ تر شامی زبان کے واسطے شروع ہو گیا تھا۔ حالانکہ عربوں نے یونانی ادبیات کا ترجمہ باطل نہیں کیا اس لئے کہا نہیں گئے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی نظم و شعر کا خود انکا ذخیرہ اتنا دافرا در بے پایاں تھا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہیں تھے ہاں فلسفہ اور دیگر علوم میں انکے پاس کچھ زیادہ نہیں تھا اس لئے انکا ترجمہ انہوں نے کیا اور یہ منصور سے پہلے یعنی بنی ہاشم کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا۔

صفحہ ۶ ”صرف شام کے شہر حیرہ میں قدیم عہد اسلامی تک وثینت عیسائیت سے غیر متاثر رہی اول تو یہ کہ حیرہ عراق میں واقع ہے شام میں نہیں دوم یہ کہ حیرہ کا عیسائیت سے غیر متاثر ہونا اہل بحث و عباد کا خاندان جو بلوک حیرہ کا سریشی اور خاص مصاحب تھا عیسائی تھا اس کے علاوہ عمان بن منددا در اس کے بعد قبضہ جو کسری کی طرف سے وہاں کا دالی ہوا عیسائی کہنے جلتے ہیں۔

صفحہ ۱۱ ”زردانی نظام دندان عربی میں زمانہ کو کہتے ہیں“ لفظ زردان عربی کی کسی لغت میں نہیں ملتا معلوم نہیں مصنف نے کہاں سے یہ تحقیق کی ہے حوالہ بھی نہیں دیا کہ کچھ تہہ چلتا۔

صفحہ ۱۳ ”سب سے پہلے ضرب الاشبال حکیمانہ اقوال خطوط و صیت نامے اور عوامی تاریخ فلسفہ کے متعلق کتابیں جمع کی گئیں اور انکا ترجمہ ہوا“ یہ صحیح نہیں ہے پہلے جن چیزوں کا ترجمہ کیا گیا وہ آئین جنگ اور سیر ابطال ہیں یہ تراجم اکثر زبانی تصویروں کی صورت میں تھے مگر کچھ کتابیں بھی موجود تھیں اس کے بعد طب کا ترجمہ ہوا کیونکہ یہی زیادہ ضروری چیز بھی گئی پھر اور چیزوں کا۔

صفحہ ۱۴ ”کفار کو یقین تھا کہ وہ کتاب مقدس میں زبان کی اغلاط دکھا سکتے ہیں“ یہ غلط خیال ہے کفار نے قرآن کی زبان یا اس کے محاورے پر کبھی اعتراض نہیں کیا بلکہ اکثر شہادتیں اسی مٹی ہی پر لگائیں نے بادل ناخواستہ اس کے معجزات پر نادا کا اعتراف کیا۔ اسی سلسلے میں مصنف لکھتا ہے کہ ”اس لئے پہلے اشعار و بدویوں کے رد و ترس سے شائیں جمع کی گئیں تاکہ قرآنی عبارت کی صحت ثابت کی جائے“ یہ بھی صحیح نہیں۔ اشعار جاہلیتہ سے تعاسیر و غیرہ میں جو شہادہا دی گئی ہیں۔ اسکا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کی

صحت زبان کی دلیل ہم پہنچانی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی لفظ یا محاورے کے معنی اور مفہوم کا یقینی تعین نہجاً  
صفحہ ۲۷۰ کہا جاتا ہے کہ پرانے رومی صوبوں یعنی شام اور عراق میں بہت دن تک زیادہ تر روم  
کا قانون چلتا رہا۔ یہ دعویٰ بے دلیل ہے اسکا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ مسلمانوں کے قبضے کے بعد ان صوبوں  
میں پرانا قانون باقی رہا ہو۔ بخلاف اس کے مسلمان جہاں جاتے تھے فوراً قرآن اور سنت رسول پر عمل شروع  
کر دیتے تھے اور حسب ضرورت اجتہاد بھی کرتے تھے۔

صفحہ ۸۸ کی دھڑیوں کی صحت کے جانچنے کے اصول مدون کئے گئے لیکن ان اصولوں کی  
ترتیب میں روایات کی خارجی صحت اور سودمندی پر بہت منطقی انتقامت اور تاریخی صحت کے زیادہ  
زور دیا گیا۔ یہ صحیح نہیں تاریخی صحت کا تو امادیت کی جانچ میں خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور فن  
اسمارالرجال کی بنیاد اسی طرح پڑی۔

اس صفحہ پر علم الفقہ سے بحث کرتے ہوئے قیاس کی جو دو صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ واضح  
نہیں ہیں عموماً قیاس کی وہی صورت ہے جسے منطقی قیاس (قیاس اعلیٰ) کہتے ہیں یعنی کسی ایک یا چند  
چیزوں سے علت تلاش کر کے اس کی بنیاد پر حکم عام کیا جائے۔ دوسری صورت قیاس الشبہ، یا مثل  
کی ہے یعنی علت عام نہیں نکالی جاتی بلکہ محض شبہت کی بنا پر حکم لگایا جاتا ہے۔  
یہاں تک تو خود مصنف کو بعض خیالات کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ترجمے اور کتابت کی بھی بعض غلطیاں  
رہ گئی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

صفحہ ۲۰۰ آخر کا رشتہ دو میں شیعوں کی سلطنت ایران میں قائم ہونے کے بعد سینوں کی اور  
ان کی دائمی شکست کا خاتمہ ہوا۔ ”صحیح غالباً مستحکم ہے ایک ہندسہ کتابت میں چھوٹ گیا ہے۔  
صفحہ ۲۰۱ (حکما ترجمہ منصور کے زمانہ میں فرازی نے ہندی علماء کی مدد سے کیا) ”غالباً صحیح  
فرازی ہے۔

صفحہ ۱۰ ”برس غم کی کتاب الخیرہ“ غالباً کتاب الخیر صحیح ہے۔

صفحہ ۱۲ ”غیر طبعیات“ ”صحیح طبعیات“ اسی طرح ”طبعی“ کے بجائے ”طبی“ ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۱ ”دی تحریم جو محمد (صلعم) اپنے زمانے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ کی کرتے تھے مسلمان علما یونانی علمی تصانیف کی کرتے تھے۔“ یہاں لفظ تحریم کے بجائے لفظ احترام ہونا چاہئے لریاق و سباق کا لحاظ رکھا جائے تو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ان کتب مقدسہ کا پڑھنا حرام سمجھتے تھے حالانکہ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی عزت کرتے تھے۔

صفحہ ۲۲ ”لیکن یہ بھی اُس کے ساتھ ہے کہ مرادف الفاظ کی کثرت کے سبب سے (عربی زبان) ربط کے اصول کی، کہ علوم صحیحہ میں مرادف الفاظ کا استعمال جائز نہیں ہے، خلاف درزی کرتی ہے۔“ مرادف کے بجائے مترادف کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ سمجھ میں نہیں آتا کہ علوم صحیحہ میں مترادف الفاظ کے استعمال سے کیا نقص واقع ہو سکتا ہے۔ غالباً مصنف کا مطلب شرک الفاظ سے ہے جو متواظی بھی کہلاتے ہیں۔ مترادف الفاظ تو وہ ہیں جو ایک ہی معنی کے لئے استعمال ہوں بخلاف اس کے شرک یا متواظی وہ الفاظ ہیں جو ایک سے زیادہ معانی اپنے اندر رکھتے ہوں ان کا استعمال البتہ علوم صحیحہ میں التباس کا باعث ہو سکتا ہے لیکن یہ عربی زبان میں ہی کوئی خاص بات نہیں ہے دوسری زبانوں میں بھی یہ صورت موجود ہے اور یاق و سباق یا مخصوص ترکیب سے انکے معنی کا تعین ہو جاتا ہے۔

صفحہ ۳۰ تفرہ صحیح طفرہ۔ صفحہ ۳۰ معر؟

صفحہ ۴۸ ابوالعلاء المرئی صحیح المعری۔ صفحہ ۴۹ د۔ ۵۰ ”حریری کا ہیر و نقیر اور سیاح ابو سعید

زردی“ صحیح ابو زید سر دجی۔

صفحہ ۵۰ تعلو الناس علی قدر عقولہم، صحیح علو الناس۔

صفحہ ۵۰ ابولہب بنہ صحیح ابولہب بن یونس۔ صفحہ ۱۲۵ بجاری صحیح ابہری۔

صفحہ ۱۲ عبد اللہ بن ماسرہ صحیح مسرہ۔ صفحہ ۱۲۹ فیض صحیح فاس عربی میں اس شہر کا نام فاس

ہے جسے انگریزی میں Fہ کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۲۹ ”وئے بر حال انطا طول اور قراط کے“ آخر میں کے زائد ہے یوں ہونا چاہئے دے

برجال افلاطون و سقراط  
صفحہ ۱۴۸ ابن سینا صبح ابن سینا۔

انکھو | یہ ماہوار رسالہ مدنیۃ العلوم دیوبند سے بیا دگار شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ زیریادت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مولوی محمد یحییٰ صاحب صدیقی تھانوی کی ادارت میں ماہ گذشتہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اسکا پہلا نمبر دیوبند کے لئے موصول ہوا۔ حجم دو جز لکھائی چھپائی اچھی اور کاغذ وسط درجہ کا ہے قیمت سالانہ چار روپے محصول لاک۔ مقام اشاعت کتب خانہ عثمانیہ دیوبند۔ اور مقصد علم۔ دین اور اصلاح ہے۔

دیوبند تقسیم بنیاد نصف صدی سے جب سے وہاں کا مدرسہ قائم ہوا ہے اچھے اچھے علماء و فضلاء کا مرکز رہا ہے اور ہے۔ ایسے علمی مقام سے مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی کے لئے ایک اچھا رسالہ نکالا جاسکتا تھا۔ مگر ملک کی قسمتی سے وہاں سے جو رسالہ نکالا گیا یعنی القاسم اس نے اہل علم کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہ پیدا کی۔ اور طالب علمانہ حوصلے آگے نہ بڑھ سکا۔

اب اسی مرکز یعنی دیوبند سے یہ دوسرا رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ سابق تجربہ کی بنیاد پر اس سے بھی کچھ زیادہ توقعات قائم کرنا مشکل ہے لیکن مولانا شبیر احمد صاحب کی سرپرستی بیشک کچھ امید دلاتی ہے کہ یہ کوئی کام کرے گا اور کچھ نفع و دائروں میں پیدا کرے گا۔ چنانچہ اس پہلے نمبر میں مولانا کا لکھا ہوا ایک مضمون ارباب حیات کے عنوان سے اچھا خاصہ درج ہوا ہے۔

لیکن مضمون نگاری اور مفید مضمون نگاری جس سے امت اسلامیہ کو صحیح علمی فوائد پہنچیں آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت تحقیق و فکر کی ضرورت ہے اور کتا بوں سے صرف روایات کا دُرج کر دینا کافی نہیں چنانچہ مضمون مذکورہ بالا میں مولانا موصوف نے قریش عرب کی تفصیل پر ایک حدیث کتب سیر سے درج کی ہے کہ نبی نوع انسان کی جبریل نے تقسیم کرتے کرتے قریش کو چن لیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کیا۔

مولانا کا فرض تھا کہ نگینے سے پہلے وہ اس حدیث کی صحت کو جانچ لیتے۔ اس کے بعد ان روایات

بھی دیکھتے جن سے تمام انسانی برادری کیساں ثابت ہوتی ہے اور قرآن کریم کی تعلیم بھی پیش نظر رکھتے کہ  
 صن اب دہل پر کسی قبیلہ یا انسان کے شرف کا مدار رکھا گیا ہے یا تقویٰ پر جن کتب میرے انہوں نے  
 بد روایت نقل کی ہے انہیں سرور عالم کا خطبہ بھی درج ہے جو حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ  
 افضل بعربی علی ملا بھی ملی عربی الناس | نہ کسی عربی کو بھی فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر سارے آدمی آدم  
 ظہم من آدم و آدم من المراتب | ہے پیدا ہوئے ہیں اور آدم خاک سے۔  
 دراصل آنحضرت کی بدولت قریش کو شرف حاصل ہوا ہے نہ کہ قریش کی بدولت آنحضرت کو۔ پھر  
 کسی آیت یا روایت سے جبریل کا یہ شیوہ بھی نہیں ثابت ہوا کہ وہ انسانی اقوام اور قبائل کی جانچ کر کے  
 منتخب قبیلہ کی تعین کریں کہ اس میں سے رسول پیدا کیا جائے۔ الغرض اس روایت میں بہت کچھ نازل  
 کی ضرورت ہے۔



## شذرات

آئندہ جیلہ کا جامعہ "تائیس نمبر کے نام سے خاص اہتمام سے کالاجائے گا۔ انشاء اللہ قارئین کرام مضامین نظم و نشر کے لحاظ سے اور ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے اسے بہت پسند کریں گے۔ حجم ۸ جز کے قریب ہوگا۔ اور چھپائی آپ میں ہوگی تاکہ آپ کی عمدہ چھپائی کا ایک نمونہ نظر کے سامنے ہو اور یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ رسالہ آئندہ آپ میں چھپے گا یا تقویمیں۔ بعض مضامین کے ساتھ نقشے وغیرہ بھی ہوں گے جن کا ہلاک بنوا یا جائیگا۔ ہمارے قارئین کے علاوہ جو حضرات اسے خریدنا چاہیں گے۔ ان کے لئے قیمت ایک روپیہ ہوگی۔

جناب مدیر پرنس اپنے ۲۲ ستمبر کے پرچہ میں شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ان کی خیر خواہی کو نکتہ چینی سمجھا اور جواب تعریض کی صورت میں دیا۔ ہم پر منحصر نہیں جامعہ کے اندر اور جامعہ کے باہر اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جناب مدیر کے پچھلے مضامین سے جامعہ پر نکتہ چینی اور تعریض ہی نہیں بلکہ اس کی کلی ہوئی مخالفت ظاہر ہوتی ہے اسی لئے "جواب" کی ضرورت ہوئی اور جواب میں تعریض کا پہلو بھی رہا لیکن چونکہ جناب مدیر فرماتے ہیں کہ آپ جامعہ کے مخالف نہیں اور بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مورد ستائش فقط جامعہ کے دو ایک اساتذہ اور طلبہ ہیں اس لئے ہمارے رسالہ کو اس بحث میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر جناب مدیر جامعہ ملیہ کی نسبت وہی خیالات رکھتے ہیں جو آپ نے ۲۳ کے پرچہ میں ظاہر فرمائے ہیں تو ہمیں باوجود اختلاف خیال کے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں۔

بیا کہ نوبت صبح است و آشتی و صفا

کہ با تو نیت مرا جنگ و اجرا حانظ

جناب مولانا سید سلیمان ندوی مدیر معارف ہمارے دلی شکر یہ کہ ستمی ہیں کہ آپ نے قوم سے جامعہ کی سفارش کی ہے اور اس کی مدد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مولانا کو صرف یہ وہ اندیشہ ہے کہ جامعہ کے عام طلبہ میں جنہیں عربی اور علوم اسلامی کی محض ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے مجتہدی کا شوق نہ پیدا ہو جائے۔ ہم مولانا کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اس جہل مرکب کی مثال اگر تلاش کی جائے گی تو جامعہ کے اندر نہیں بلکہ جامعہ کے باہر ملے گی۔ انگریزی خوانوں کا جو نیا ناپ پچھلے دس سال میں پیدا ہوا ہے جسے مذہبی تعلیم کا شوق ہے مگر اس کے بوجھ اپنے ذہن کا مرکز ثقل قائم نہیں رکھ سکتا بلکہ علمی معلومات کی بنا پر مذہبی مسائل میں علمائے دین سے کج بحثی کیا کرتا ہے وہ جامعہ میں معدوم ہے۔

اب رہا ہندویت سے متاثر ہونیکا اندیشہ اس کی اصلی صورت یہ ہے کہ جامعہ کے مخالف جس چیز کو۔ ”ہندویت“ کہتے ہیں وہ اصل میں ”ہندیت“ ہے، ملکی آزادی کی خواہش، ملکی مہر دی ملکی لباس کا شوق یہ جامعہ کا طرہ امتیاز ہے مگر ”ہندویت“ کا اثر جامعہ پر آج کیا اس وقت بھی نہیں تعجب بادہ بیات کے نشے میں مدھوش شخص حضرت ہندوؤں سے اتحاد رکھنے کے زبانی دعوے اس انداز سے کیا کرتے تھے جو سراسر خود داری کے منافی تھا۔ جامعہ والے جس نقطہ اعتدال پر اس زمانے میں قائم تھے آج بھی ہیں۔

ہم مولانا سے اس معاملہ میں بالکل متفق ہیں کہ مغرب کا ذہنی ہتھیلا اس کے سیاسی استیلا و زیلہ ہلاک ہو چکا ہے کہ مولانا نے اس نقطہ کے زیر اثر یہ ہیت مجموعی جامعہ کو نہیں پایا بلکہ جامعہ کے ایک طالب علم کو جو یورپ میں مقیم ہے ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں اس معاملہ میں جامعہ کے طلبہ جو یورپ میں مقیم ہیں بصحت کے متقی ہوں مگر شبہ کے نہیں کیونکہ ان کے دل میں اپنے مذہب کی سچی وقعت اور محبت موجود ہے اس لئے باوجود غیر دل میں رہنے کے وہ نیش مار لہنے رہیں گے۔

ہیں امید ہے کہ مولانا باوجود اپنے کثیر شغل کے کبھی کبھی جامعہ میں تشریف لاکر یہاں کے حالات خود ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا کا دہلی کے قریب کے شہروں میں بعض تعلیم گاہوں میں آنا اور ہمارے یہاں نہ آنا ہمارے لئے سخت کمایت کا باعث ہے۔ مگر مولانا کو دوسروں سے بھی تعلق ہے لیکن جامعہ سے جو رشتہ ہے اس کی کچھ اور ہی شان ہے۔

آسام میں ایک انجمن علمی تحقیقات خصوصاً تاریخی تحقیقات کے لئے کام روپ انورنمنٹ میں قائم ہے اس کے سکریٹری پروفیسر۔ ک۔ بھون صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایل ہیں۔ یہ انجمن ۱۹۱۲ء میں بمقام گوانی قائم ہوئی تھی۔ پہلے کام روپ کے منسج میں پرانی پوٹھیاں پتھروں کے کتے ایسی بندھیں اور توہیں جن پر عبارت کندہ ہو جمع کرتی رہی اور اب دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کی قدیم چیزیں جمع کر رہی ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک عارضی عمارت میں رکھ دی گئی ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک مستقل کتب خانہ اور عجائب خانہ کی بنیاد پڑ جائے۔

کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈون۔ ر۔ الف سیگلان کی زیر نگرانی علوم اجتماعی کی ایک معلم تیار ہو رہی ہے۔ اس میں تاریخ اقتصادیات حیات مدن، اجتماعیات، علم الانسان، تعلیمات، علم الاخلاق، علم طبیعتیات، جمالیات، فلسفہ مذہب اور فلسفہ قانون کے تقریباً اسی لاکھ الفاظ کی تشریح کی جائے گی اور مذہب کیاجاتا ہے کہ دس سال میں یہ کام ختم ہو جائیگا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ایسی قاموس کی بہت سخت ضرورت ہے جس میں علوم اجتماعی پر جنہیں علوم مذہبی کہنا زیادہ مناسب ہوگا تبصرہ کیا جائے اور ان علوم پر ارباب حکونے جو خیالات ظاہر کئے ہیں انہیں یکجا کر دیا جائے اس لئے پروفیسر سیگلان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے لیکن معاملہ کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ علوم مذہبی کے مسائل یا یہ قطعی اور معینہ قوانین کے ماتحت نہیں ہیں پر کل ارباب فکر

کا اتفاق ہو سکے یہ چیزیں محض عقل سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ اکثر صورتوں میں ان کا دار و مدار وجدان اور روحانی احساس پر ہے اس لئے انہیں مختلف قومیں اپنی ذہنی خصوصیات اور تاریخی روایات کی بنا پر مختلف طریقوں سے حل کرتی ہیں۔ خود یورپ میں جس کا تمدن ایک لحاظ سے ہم رنگ ہے اس قدر اختلاف خیال ہے کہ کوئی ایک کتاب علوم ذہنی کے مسائل پر جامع اور مانع بحث نہیں کر سکتی اب ہمیں ایشیائی قومیں اگر وہ اپنی آزادی فکر اپنے سیاسی حاکموں کے ہاتھ بیچ نہ چکی ہوں تو ایسی کتابیں ان کے لئے محرک خیال ہونے کی حیثیت ضرور قیمت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی ذہنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ یہ سائنس کا میدان ہمیں جس میں دوسروں کی زلہ خواری سے ہمارا کام چل جانے ان مسائل کو اگر حل کرنا ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ ہم خود غور و فکر کی زحمت گوارا کریں۔

علاوہ ازیں یوں بھی قانوس اور معلم صرف ان لوگوں کے لئے مفید ہیں جو انہیں محض وسعت معلومات کے لئے استعمال کرتے ہیں اپنا مادی اور رہنما نہیں بناتے جو لوگ علم کے راستہ کو تعلیم کے سہارے طے کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں یہ کتابیں ذہنی کاہلی اور وجود پیدا کرتی ہیں اور ان کی کثرت ترقی کی علامت نہیں بلکہ تنزل کا پیش خیمہ ہے۔

ماڈرن ریویو میں بحوالہ رسالہ ”بودہ مذہب بھارت میں“ اس عام جہات کی ایک ایک بچہ مثال عقل کی گئی ہے جو ایشیاء کی بابت یورپ میں پائی جاتی ہے۔ لندن میں بودہ مذہب والے ایک جلسہ کرنا چاہتے تھے جس کے لئے انہیں ایک ہال کی تلاش تھی انہوں نے ”غیر متعلقہ“ عیسائی فسر ق کی ایک عمارت اس مقصد کے لئے مانگی۔ پادری صاحب نے جو اس عمارت کے مگراں تھے دریافت کیا کہ یہ بودہ لوگ عیسائیوں کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہا گیا کہ یہ عیسائی نہیں ہیں تو انہوں نے ہال کے دیئے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہم کیتھولک عیسائی

تک کو اپنے خیال میں جلسہ نہیں کرنے دیتے۔ اسی طرح لندن کے ایک دوکان میں ایک چینی دیوتا کا بت بکتا ہے جس پر لکھا ہے ”چین کا لڑائی کا دیوتا بودہ“۔ بودہ کو لڑائی کا دیوتا سمجھا دینا یہ تمام ظریفی قابلِ داد ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی  
سے

باتمام محمد مجیب بی۔ اے (اسکن) پرنٹر و پبلشر شائع ہوا

(مطبوعہ مجتہدہ برقی پریس لیمیا لان دہلی)

# جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم حیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ام، ای بی، ایچ، ڈی

جلد ۹	حمادی الاول و حمادی الثانی سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱ اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۲۷	نمبر ۴، ۵
-------	---	-----------

## فہرست مضامین

۱	مولوی سید طلحہ صاحب	بلاغت قرآن
۳۲	مولانا اسلم صاحب حیراجپوری	حصرت اوس قرنی
۴۳	یوسف حسین صاحب، بی ای (جامعہ)	لاہور کی ملاقاتیں
۶۵	مولوی محمد محی صاحب، تنہا	مولوی محمد حسین آزاد
۷۹	سید بدر بٹاری صاحب، بی ای (جامعہ)	عربی رسم الخط
۱۰۶	حضرت ثاقب، لکھنوی مدظلہ العالی	عزل
۱۰۸	محمد مجیب صاحب، بی ای (آکسر)	پہر (افسانہ)
۱۲۰	جناب پروفیسر اکبر منیر صاحب	سرود مستانہ
۱۲۳	مراسلہ از پیرس	یدام اتحاد
۱۲۷	مولانا صفی صاحب، لکھنوی مدظلہ العالی	عزل
۱۲۹	جناب نصر الدین حسین صاحب، نصیر	رباعیات
	عظیم آبادی، بی سٹر	
۱۳۰		تنقید و تبصرہ
۱۳۹		شذرات



# بلاغت قرآن

قل ائں اجتماعت الالہی والجن علی ان نأتوا بمثل هذالقرآن لاماتون مثله ولو کذب بعضہم لبعض طہرا۔  
(ای پیغمبر ان لوگوں میں کہو کہ اگر آدمی اور جنات اس باب پر تل جائیں کہ اس قرآن کی مثل اور کلام سائلانہ نامہ اس جیسا نہیں لا سکی اگرچہ ان میں سے ایک کی پیشی پر ایک کیوں ہو)

علمائی متکلمین کی اس امر میں بہت سی اقوال ہیں قرآن میں وہ کڑوں کی صفت ہی جسکی بناء پر وہ دعویٰ کیا گیا ہے، ان اقوال کی دیکھی سی معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش فصاحت و بلاغت سب کی بردہ نری اعمرت رکھتی ہے

## نزول قرآن کی وقف غیر مسلموں کی رائی۔

وقۃ من بول حصرت خدیجہ کی اس عم جز ابک معمر عرابی بررگ۔  
نہی جاہلیت ہی میں شرک سی تائب ہو چکی تھی حب قرآن کی اول اول آیات سنیں تو کہا کہ کلام اس طررکا کلام ہی حسی موسیٰ پر اترا تھا۔ ولدس مغرہ حالانکہ کافر رہا اور کفر ہی بر مرا اسک الماط دل کتب ادب میں منقول ہیں۔

ان اعلاء لمورق، وان اسفلہ امعذق، وان له لطلاوہ، وان علیہ لحلاوہ  
(اس کا اوپر کا حصہ پتہ والا درسبر ہی اور اسکا حصہ دریں پھل والا ہی اس میں ایک دروق پائی حانی ہے، اور اس پر ایک شبریری ہے)

صحاحہ میں جو نہایت سلم الفطرت لوگ تھے ان میں سے اکثر کا حلقہ نگوش اسلام ہو نیکا سبب صرف اس کلام مقدس کی آیات کا سننا اور اس کی انتہا درجہ کا متاثر ہوا ہوا ہے۔ قرآن مجید کی بیشمار صفات میں سے یہاں ہمارا مودوع بحث صرف فصاحت و بلاغت ہے۔ اس لئی ایک نہایت مختصر سی فصاحت اور بلاغت کی تعریف مناسب معلوم ہوتی ہے۔



فصاحت۔ کلام کا ہر مفرد لفظ ثقل اور اہمیت سی پاک ہو مفردات الفاظ کی ترکیب و بندش اسقدر درجہ محل و موقع ہو کہ الفاظ نگینوں کی طرح جڑی ہوں اور غر مناسب تقدیم و تاخیر نہ ہو جو مغل بالمہم ہو۔

بلاغت۔ کلام میں وصف فصاحت کی بعد یہ صفت بھی پائی جائی کہ وہ محل و موقع کی مناسب ہو، مثلاً کہیں کلام میں ابجار ہو کہیں اطناب (مشرح و مفصل گفتگو) ارسطو کی کتاب ”بلاغت“ میں جو معیار بلاغت کا لکھا ہے اسکی دیکھی سی معلوم ہوتا ہے گویا نہ کتاب قرآن کو دیکھکر لکھی ہے

سبب میں قرآن کی بلاغت پر اکثر لوگوں نے حامی و سائی کی ہے قاصی ابوبکر باقلانی کی کتاب ”اعجاز القرآن“ جو اہل مصر نے اتفاق للمسوطی کی حاشیہ پر چھاپی ہے اس موضوع پر نہایت اچھی ہے اگرچہ بہت مختصر ہے اور مصنف نے کہیں کہیں اساطیر بلاغت کی کلام پر تعصب سی حرج کی ہے۔ امام رازی لکھتی ہیں کہ میں نے ”دلائل الاعجاز“ ان کتاب اس موضوع پر لکھی ہے

ومغشری کی تفسیر کشاف قرآن مجید کی اسی تفسیر ہی حسن میں تقریباً فصاحت و بلاغت کا مضمون مد نظر رکھا گیا ہے اس حلدوں کی رائی ہے اور ہماری نزدیک ٹھیک ہے کہ فن بلاغت کی بیشمار کئی کشاف سی ماحرہ ہیں اس حلدوں کی رائی میں اہل مشرق کی نظر اس فن میں رائد عمیق ہے کشاف میں اعتراض کا رنگ۔ ہے حسکا ایک حد تک تدارک بیضوی نے کر دیا مگر کشاف کی دیگر حصوں کا تفسیر بیضوی میں پتہ بھی نہیں۔ علامہ طوسی کی کتاب ”الذمان“ ہے قرآن مجید کی بلاغت کئی ایک عمدہ دحیرہ ہے۔

قرآن مجید کا مقابلہ کرنی والی۔

ضر بن حارث نے معیار حسن کلام داستان گوئی قرار دکر رستم اور اسفندیار کی قصوں کو مقابلہ میں پیش کیا، ابن المقفع نے کلیلہ و دمنہ و دیگر مزخرفات، بنی کین، قابوش و شمگیر اور معری کا نام بھی اس فہرست میں ہے، مؤخر الذکر کا

ایک شعر ایک آیت کی معارضہ میں آخر مضمون میں آئنگا، مختصر یہ کہ قرآن مجید کی معارضہ میں جس جس کی جو کہا وہ قرآن مجید کی سامی مصحکہ حیر اور ہر لیان سی کم بہیں، ناوجود اسکی کتب ادب میں محفوظ ہی۔

مسلمہ کذاب کی عبارت ناظرین کی دلچسپی کی لئی درج کجانی ہی اسی طرز کی معری کی بعض فقری بھی کتب ادب میں منقول ہیں

انا اعطیناک الحراہر، اصل لربک وحاہر\* والطاحنات طحنا، والخاراب حرا  
(ہم نے تمکو حواہر دی اسی رب کی لئی بار پترہ اور اعلان کر، قسم ہی بی بی والیوں کی اور قسم ہی روئی پکائیوالوں کی)

ادک اور عبارت ہی جو کلام اعلیٰ سی کلام ادنیٰ کی مقابلہ کی لئی بطور ضرب المثال مستعمل ہی

الفیل ما الفیل و ما ادراک ما الفیل، لہ حرطوم طویل و دب اثیل  
(ہا، ہی! کیا ہی ہا، ہی اور بھی کیا حیر کہ کیا ہی ہاتھی، اوس کی لائی سوڈ ہونی ہی اور کچھی دارہ)

عبارت میں نحو کی غلطی نہیں، الفاظ کی سندس اور طرز قرآن کا سا ہی مگر روح بلاغ مفقود، فکر ہر کس قدر ہمت اوست، نہ گونا الحاقہ مالحاقہ اور الفارعة کا جواب ہی وما ادراک کی لفظ سی پوچھنا اور بھر تفصل کرنا شان قیامت کی مناسب ہی نا ہاتھی حسنی مشہور اور متدل چسر حسکو کم و بیش عرب کا بچا بچہ حانتا تھا

صفحات ذیل میں ایک نہایت مختصر سا خاکہ قرآن کی بلاغ ۵ ہدہ ناظرین کا جانا ہی افسوس کہ ہم نے نہ مضمون ایسی مقام پر لکھا ہی جہاں ہماری پاس کافی کیا معمولی سا سامان بھی نہیں

امام زاری لکھتی ہیں کہ چونکہ قرآن میں وہ امور نہیں سان کئی گئی جس میں متکلم اپنا زور کلام اور حس سان دکھلائی ہیں مثلاً کوئی سان ناندھنا جہگ کی جزئیات کا خاکہ کھینچنا کسی کرتب یا ما فوق العادت واقعہ کی تفصیل،

فصاحت: کلام کا ہر مفرد لفظ نقل اور اجنبیت سی پاک ہو مفردات، الفاظ کی ترکیب و بندش اسقدر بر محل و موقع ہو کہ الفاظ نگینوں کی طرح جڑی ہوں اور غیر مناسب تقدیم و تاخیر نہ ہو جو مغل بالفہم ہو۔

بلاغت: کلام میں وصف فصاحت کی بعد یہ صفت بھی پائی جائی کہ وہ محل و موقع کی مناسب ہو، مثلاً کہیں کلام میں ایجاز ہو کہیں اطناب (مشرح و مفصل گفتگو)۔ ارسطو کی کتاب 'بلاغت' میں جو معیار بلاغت کا لکھا ہے اسکی دیکھنی سی معلوم ہوتا ہے گویا یہ کتاب قرآن کو دیکھکر لکھی ہے۔

سلف میں قرآن کی بلاغت پر اکثر لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ قاضی ابوبکر باقلانی کی کتاب 'اعجاز القرآن' جو اہل مصر نے اتقان للسیوطی کی حاشیہ پر چھاپی ہے اس موضوع پر ہایت اچھی ہے اگرچہ بہت مختصر ہے اور مصنف نے کہیں کہیں اساطین بلاغت کی کلام پر تعصب سی جرح کی ہے۔ امام وازی لکھتی ہیں کہ میں نے 'دلائل الاعجاز' ایک کتاب اس موضوع پر لکھی ہے۔

زمخشری کی تفسیر کشاف قرآن مجید کی ایسی تفسیر ہے جس میں تقریباً فصاحت و بلاغت کا مضمون مد نظر رکھا گیا ہے ابن خلدون کی رائی ہے اور ہماری نزدیک ٹھیک ہے کہ فن بلاغت کی بیشمار نکتی کشاف سی ماخوذ ہیں اس خلدون کی رائی میں اہل مشرق کی نظر اس فن میں زائد عمیق ہے کشاف میں اعتزال کا رنگ ہے جسکا ایک حد تک تدارک بیضاوی نے کر دیا مگر کشاف کی دیگر خوبیوں کا تفسیر بیضاوی میں پتہ بھی نہیں۔ علامہ طیبی کی کتاب 'التبیان' بھی قرآن مجید کی بلاغت کیلئے ایک عمدہ ذخیرہ ہے۔

قرآن مجید کا مقابلہ کرنی والی۔

نضر بن حارث نے معیار حسن کلام داستان گوئی قرار دیکر رستم اور اسفندیار کی قصوں کو مقابلہ میں پیش کیا، ابن المقفع نے کلیلہ و دمنہ و دیگر مزخرفات بش کین، قابوش و شمگیر اور معری کا نام بھی اس فہرست میں ہے، مؤخر الذکر کا

ایک شعر ایک آیت کی معارضہ میں آخر مضمون میں آئیگا، مختصر یہ کہ قرآن مجید کی معارضہ میں جس جس کی جو کہا وہ قرآن مجید کی سامنی مضحکہ خیز اور ہزلیات سی کم نہیں، باوجود اسکی کتب ادب میں محفوظ ہی۔

مسئلہ کذاب کی عبارت ناظرین کی دلچسپی کی لٹی درج کجانی ہی اسی طرز کی معری کی بعض فتری بھی کتب ادب میں منقول ہیں۔

اما اعطیناک الجراہر، اصل لربک و جاهر\* والطاحنات طحنا، والخارات خنزا (ہم ہی تمہکو جواہر دئی اپنی رب کی لٹی باز پترہ اور اعلان کر، قسم ہی یی والیوں کی اور قسم ہی روئی پکا بوالیوں کی)۔

ادک اور عبارت ہی جو کلام اعلیٰ سی کلام ادنیٰ کی مقابلہ کی لٹی بطور ضرب المثل مستعمل ہی

الفیل ما الفیل و ما ادراک ما الفیل، لہ خرطوم طویل و دنب ائیل۔  
(ہاتھی! کیا ہی ہاتھی اور بھی کیا خبر کہ کیا ہی ہاتھی، اوس کی لائی سوئی ہوتی ہی اور کچھی داردم)۔

عبارت میں محو کی غلطی نہیں، الفاظ کی نندش اور طرز قرآن کا سا ہی مگر روح بلاغت مفقود، فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ یہ گویا الحاقہ مالحاقہ اور القارعة کا جواب ہی۔ وما ادراک کی لفظ سی پوچھنا اور پھر تفصیل کرنا شان قیامت کی مناسب ہی یا ہاتھی جسی مشہور اور مبتذل چیز جسکو کم و بیش عرب کا بچہ بچہ جانتا تھا۔

صفحات ذیل میں ایک نہایت مختصر سا خاکہ قرآن کی بلاغت کا ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہی۔ افسوس کہ ہم نے یہ مضمون ایسی مقام پر لکھا ہی جہاں ہماری پاس کافی کیا معمولی سا سامان بھی نہیں۔

امام رازی لکھتی ہیں کہ چونکہ قرآن میں وہ امور نہیں بیان کئی گئی جس میں متکلم اپنا زیر کلام اور حسن بیان دکھلائی ہیں مثلاً کوئی سمان باندھنا جنگ کی جزئیات کا خاکہ کھینچنا کسی کرتب یا ما فوق العادت واقعہ کی تفصیل،

بلکہ اکثر اس قسم کی امور میں جو عموماً فصاحت اور بلاغت کی منافی ہوتی ہیں۔ مثلاً ترک دنیا، توجہ الی الاخرۃ وغیرہ، اجتناب قبائح، پابندی احکام جیسی خشک امور میں۔ شعر میں فصاحت کی لٹی تو جھوٹ آب و نمک کا کام دیتا ہے جس سے قرآن بالکل مبرا و منزہ ہے۔ چنانچہ بعض شعرا مثلاً لبید بن ربیعہ او حضرت حسان بن ثابت نے جب سے اسلام قبول کیا اسوقت سے ان کی شعر میں وہ لطف باقی نہیں رہا۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ مذہبی لوگ بہت کم فصیح و بلیغ ہوتے ہیں، قرآن کی فصاحت اول سے آخر تک یکساں اور ہر آیت و جملہ جان فصاحت و روح بلاغت ہے، برخلاف دیگر بلغاء کی کلام کی کہ ان کی یہاں بعض حصہ تر یا پہنچا ہوا ہے، بعض متوسط اور بعض بہت ادنیٰ۔ عموماً فصحا و بلغاء خاص خاص اصناف سخن میں جو ہر فصاحت دکھلائی ہیں دوسری اصناف میں بعض اوقات عوام سے بھی فرو تر ثابت ہوتے ہیں۔ سعدی، خواجہ حافظ، خسرو، نظیری غزل کی مرد میدان ہیں تو خاقانی ابوری عرفی قصیدہ میں بی نظیر۔ سودا قصیدہ میں ہمسر نہیں رکھتی تو میر غزل میں سب کی سر تاج ہیں یہی حال عرب کی شعرا کا ہے، امراء القیس عورت اور گھوڑی کی بیان میں سب سے بڑے چڑھ کر اعشیٰ فخریات اور ممدوح سے صلہ طلب کرتی اور لبھانی میں، زہیر کو جب کسی سے امید ہوتی تو اعلیٰ سے اعلیٰ شعر اس سے نکلتی ہیں۔ ہر خلاف اس کی قرآن مجید میں جو مضمون ادا کیا گیا ہے اس کی قریب پہونچتی ہے یہی بشر عاجز ہے کہیں ملاطفات اور شفقت کی بابت ہیں۔ کہیں زجر و توبیخ۔ کہیں قصہ ہے تو اس کا بیان مجید العقول جس طرز کی بات ویسا ہی بیان: یہی سب ہے کہ اکثر یورپین مستشرقین مثلاً کارلائل وغیرہ کہتی ہیں کہ روایتی و یکسانی نہیں ہے۔

بہر حال کلام بلیغ میں تین جہتوں سے بحث کی جا سکتی ہے: انتخاب مفردات، بندش و ترکیب، تیسری اسلوب و طرز ادا۔ ایک مختصر سا نمونہ تینوں امور کا آئندہ صفحات میں دینگی اور آخر میں کلام عرب کا تھوڑا سا وہ نمونہ دیتا ضروری سمجھتی ہیں جہاں قرآن کا مضمون کسی دوسری کلام میں بھی پایا جاتا ہو۔ ناظرین کی ادبی دلچسپی خود فیصلہ کر لی گی

## انتخاب معردات

بعض جگہ قرآن میں کسی چیز کو بطور خطاب کی کسی خاص لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اس لفظ میں اس قدر زور اور اس شی کی حقیقی اور ذاتی صفات کا اس طریق پر بیان ہے کہ بہت سی جملوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔

متاع : چند روزہ فائدہ اٹھانی کی چیز (دنیا کی لٹی استعمال ہوا ہے)۔

سکن : چین۔ اور جس چیز سے چین حاصل ہو۔

ان صلاتك سکن لهم : (تیری دعا اون کی لٹی اطمینان کی چیز ہے)۔ مسلمانوں کی لٹی رسول اللہ صلیم کی لٹی دعائی خیر جیسی کچھ اطمینان بخش ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

من بیوتکم سکننا : (تمہاری گھر کو چین کا (ذریعہ) بنایا)

جعل اللیل سکننا : (رات کو چین (کی چیز) بنایا)۔

لباس : ظاہری معنی معلوم ہیں۔ قرآن مجید میں بطور استعارہ کئی چیزوں کو اس خطاب سے یاد کیا گیا ہے جن میں پردہ پوشی اور بعض جگہ تلازم وجہ مناسبت ہے۔ لطف اس کا اہل ذوق خود سمجھیں گی۔ ملاحظہ ہو :

جعلنا اللیل لباساً : (ہم نے رات کو پردہ بنایا) ایک لطیفہ یاد آگیا۔ بعض علماء فی اس آیت پر یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ رات کو اگر کوئی شخص ملا کپڑوں کی نماز پڑھے تو پڑھ سکتا ہے۔

لباس الجوع والخوف : استعارہ استعمال ہوا ہے عرب بولتی ہیں ندرع الفقر (فقر کا کرتہ پہنا) ولبس الجوع (فقر کی رزہ پہن لی اور بھوک کی پوشاک بنالی) عرب کا محاورہ ہے راعب کفتی ہیں : جعل الجوع والخوف لباساً علی التجسم والتشبیہ تصویرالہ (سہان باندھنی کی لٹی اور مشکل بنانی کی لٹی بھوک کو لباس قرار دیا ہے)

رحمة : باران کو رحمت کا خطاب عطا ہوا۔ اسکی ساتھ لفظ ينشر پھیلا دیتا ہے۔ وسعت رحمت اور صفت جو دکا نبوت ہے ملاحظہ ہو: ورحمۃ وسعت کل شیء (میری رحمت ہر چیز کو سمائی ہے)۔ لیکن باران رحمت کا عموم و شمول لفظ نشر ہی کا مقتضی ہے مخلوقات میں سے بہت بلکہ اکثر اشیاء کو باران رحمت سے استغنا ہے لیکن رحمت کی حاجت سبکو ہے۔

ہنٹی مری: (رچتا پچتا) دونوں لفظ ساتھ استعمال ہو گئی ہیں، هموزن و تقریباً ہم معنی ہیں۔ عربی میں مری اس نالی کو کہتی ہیں جس سے معدہ میں غذا جاتی ہے، لہذا مری وہ چیز جو اس نالی میں نہایت آسانی سے چلی جائی ہے وہ چیز جو کھائی کی بعد خوب ہضم ہو اور مضر نہ ہو۔ یہ لفظ اس موقع پر استعمال ہوئی ہیں کہ اگر عورتیں کچھ خوش دلی سے مہر معاف کر دین تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا۔ زمخشری کہتی ہیں۔ فکلو هنذا مربا وهداء عبارة عن تحليل والمبالغة في الإباحة وإزالة التيممة (اس سے حلال قرار دینا مراد ہے اور حلت میں مبالغہ مقصود ہے کہ کسی قسم کا حرج نہیں) گویا آخرت تو کیا دنیا میں بھی اس میں کوئی عیب نہیں۔

قیام: (دار و مدار) مال و دولت کو فرمایا گیا اس لفظ کا اشتقاق قام یقوم سے ہے قیام و قوام وہ چیز جس سے کسی جز کا وجود وابستہ ہو۔

امام راغب کہتی ہیں والقوام اسم لما يقوم به الشيء ای ثبت (اس کا نام ہے جس سے کوئی شی قائم رہے) اسی طرح ایک جگہ مال کو خبر سے تعبیر کیا دولت کو اس سے بہتر خطاب نہیں مل سکتا۔ کعبہ کو بھی قیاما للناس فرمایا جعل الله الکعبة قیاما للناس، کیونکہ اس سے دین و دنیا کی امور وابستہ ہیں، قیامت کی اسماء بیشمار ہیں مثلاً قارعه: کھٹکھٹائیوالی، حاقه: شدنی واقعہ وغیرہ کس قدر اپنی مسمی کی اوصاف پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح فرشتوں اور ہواؤں و دیگر مناظر قدرت وغیرہ کو مختلف صفات سے اخیر کی سورتوں میں یاد کیا گیا ہے۔ والذاریات، والمرسلات، والصفات وہاں یہ حقیقت واضح لوریہ نمایاں ہے۔ قرآن کو نور، ہدیٰ رحمة کہا گیا۔

چند مرکبات اضافی و توصیفی ملاحظہ ہوں۔ اس میں بعض ایسی ہیں:

جو اسم ذات کی طرف مضاف ہیں۔

فضل اللہ : مراد قرآن شریف

رحمۃ اللہ : " (کہیں جنت کو بوی کہا گیا ہی)

زینۃ اللہ : تمام زینت والی چیزوں کو زینۃ اللہ کہنا لفظ اللہ کا لگجانا گویا

ان کی حلت کی کارنئی ہی چنانچہ ارشاد ہوتا ہی : من حرم زینۃ اللہ (کس فی

اللہ کی زینت کو حرام کیا) کلوا من رزق اللہ : (اللہ کی رق کو کھاؤ۔)

قرۃ العین : (آنکھوں کی ٹھنڈک) جنت کی لئی فرعون کی بوی (حضرت

آسیہ) فرمائی ہیں کہ یہ بچہ قرۃ العین لی ولك (میری اور تیری آنکھ کی ٹھنڈک

ہی) اس کی مقبولیت محتاج سان نہیں۔

اردل الامر : (مدترین حصۃ عمر) (اخسہ واحقرہ) (کشاف)

مقعد صدق : سچی (عزت کی) جگہ۔

قدم صدق (بڑی پایگاہ)۔

ابن السبیل : راستہ کا بیٹا (مسافر)

احسن تقویم (بہتر سی بہتر ساخت)

احسن الحدیث : (بہتر سی بہتر بات)

مختصر جملی مع کثرة المعانی ملاحظہ ہوں۔

اس عنوان کی تحت میں کچھ لکھنی سی پہلی یہ بات ذہن نشین رکھنی

چاہنی کہ قرآن مجید میں احکام و مسائل جزئیات قصہ کی سان کئی میں عموماً

ایجاز (اختصار) سی کام لیا جاتا ہی برخلاف اس کی وعظ و عبرت اندوزی تحویف

و تبشیر و تفصیل جنت و نار و حشر و نشر کا بیان اطناب (تفصیل) سی کیا جاتا

ہی طویل اور مسائل قصہ کی دوران میں اکثر وعظ و انذار کی آیات لازم و

ملزوم کی طرح لگی رہتی ہیں، قصہ کی صرف وہی جزئیات بیان ہوتی

ہیں جنسی سبق آموزی مقصود ہوتی ہی (ایک شبہ کا ازالہ) یہ یاد رہی

کہ بلاغت کی لئی ہمیشہ ایجاز و اختصار ہی ضروری نہیں ہیں بلکہ محل

و موقع کی مناسب کہیں ایجاز بہتر ہوتا ہی کہیں اطناب۔

ذیل میں چند آیات درج کی جانی ہیں۔ کمال درجہ کی ایجاز کی ساتھ



مقصود پر غایت درجہ ذلات کرنی ہیں۔

عزیز مصر یوسف علیہ السلام کو خرید کر اپنی بیوی سی کہتا ہی  
اکرمی مٹواہ: (اچھی طرح رکھو)۔ لفظی معنی ہیں کہ اس کی قیام کی عزت  
کرنہ۔ یہ اس قسم عبارت ہی کہ من حضرة فلاں یا من جنبہ ان کی درگاہ  
سی حکم ہوا ہی مقصد انہیں کی ذات سی ہوتا ہی اور تعظیما یوں بولتی ہیں۔  
قد شغفہا حباً: (محبت اس کی دل میں بیٹھ گئی)۔ مصر کی عورتوں کی  
زبانی زلیخا کی فریفتگی کا ذکر ہی

فیہ شفاء للناس: (اس میں لوگوں کی لٹی شفا ہی)۔ شہد کی تعریف میں۔  
فاستقم کما امرت: (جیسا تمکو حکم دیا گیا ہی ویسی ہی رہ راست پر رہو)  
لفظ استقامت کس قدر معانی پر مشتمل ہی کما امرت: (جس طرح تمکو حکم  
دیا گیا ہی) معیار استقامت بتلایا ہی

رب زدنی علماً: (ای خدا میری علم میں ترقی دی)۔

جاء الحق ورہق الباطل ان الباطل کان زھوقاً: (دین حق آیا اور باطل نیست  
و نابود ہو گیا باطل نیست و نابود ہوئی والا تھا)۔ یہ مختصر جملہ بطور  
ضرب المثل استعمال ہوتا ہی

فصر جمیل: (لہذا صبرو شکر ہی بہتر ہی) حضرت یعقوب اپنی صاحبزادی  
کی جدائی پر فرماتی ہیں۔

واللہ المستعان: (خدا ہی مدد کی امید گاہ ہی)

ولا تزلوا وازرة وراخری: (اور نہیں بوجہ اٹھانا بوجہ اٹھانی والا کسی  
دوسری کا بوجہ)۔ افظ وازرة فی اتنی الفاظ کی معنی سی مستغنی کر دیا اگر کوئی  
گنہ کریگا اور اپنا قائم مقام دیگا تو قبول نہ ہوگا۔

ومن تزکی فانما یتزکی لنفسہ: (اور جو شخص سدھرتا ہی تو اپنی ہی  
لٹی سدھرتا ہی)

اس طرز کی مختصر جملی پیشہار ایسی ہیں جو ضرب المثل ہیں اور عبارت  
میں لکینہ کا کام دیتی ہیں اور ازلی صداقت کی حامل ہیں۔ ذیل میں چند ایسی  
مختصر جملی طرح کی جاتی ہیں جن میں سی بعض نہایت نازک معاملات مثلاً

زنا شوئی وقار و متانت کا دامن نہ چھوڑتی ہوئی تمام ضروری و اہم معاملات پر روشنی ڈالتی ہوئی بیان ہوئی ہیں۔ ہن لباس لکم واتم لباس لہن (وہ تمہاری لٹی دامن کی طرح ہیں اور تم چولی اون کی لٹی) ترجمہ میں چولی دامن کا ساتھ صرف تلازم پر دلالت کرتا ہی جو صرف یورپ کی زن و شوئی کا خاکہ ہو سکتا ہی۔ برخلاف اس کی آیت میں انتہائی فی تکلفی فی حجابی وغیرہ وغیرہ سب پر کس خوبی سی روشنی ڈالی گئی ہی۔ اردو میں ایک محاورہ ہی کہ فلاں شخص فلاں کی لٹی مثل ڈھکن کی ہی، یعنی عیب پوش ہی، وہ مضمون ہی اس جملہ میں موجود ہی، مفسرین فی اس کی طرف ہی اشارہ کیا ہی، اس داپچسپ تعلق کی دیگر حقوق و فرائض ذیل کی مختصر جملوں میں ملاحظہ ہوں:

ولہن مثل اللذی علیہن بالمعروف (اور جیسی مردوں کا حق عورتوں پر ویسی ہی دستور کی مطابق مردوں پر عورتوں کا)

وللرجال علیہن درجہ: (ہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہی)۔  
واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجاً۔ (اور تم ہی میں سی اللہ فی تمہاری لٹی تمہاری بیبیوں کو پیدا کیا)۔

لتسکنوا الہا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ: (تم اس کی پاس چین کرو اور تم (میاں بی بی) میں رقت و محبت رکھی)۔

ستر عورت اور لباس سی تن ٹھیک کی کا جہاں ذکر ہی وہاں اولاً تو لباس کو لفظ ریش سی جس کی معنی پرندہ کی پر کی ہیں جو اس کی لٹی باعث زینت و سائر جسم ہی پھر لفظ زینت اللہ زینتکم سی تعبیر کرنا اور آخر میں فرما نا:

ولباس التقوی ذالک خیر: (اور پرہیزگاری کا لباس سب سی بہتر ہی)۔  
ستر عورت بھی تقوی میں داخل ہی، یعنی مقصد اصلی تو تقوی ہی، اسی سلسلہ میں ایک اور لطیفہ ہی۔ دوسری آیت قابل لحاظ ہی جو ان لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہی جو بلاخرچ سفر حج کرتی تھیں: وتزودوا فان خیر الزاد التقوی (توشہ لی لیا کرو کہ بہترین توشہ تقوی ہی) اور منجملہ اون امور کی جن سی تقوی حاصل ہوتا ہی سوال کرتی سی احتراز بھی ہی اور یہ بھی سمجھا گیا کہ مقصود اصلی تو تقوی ہی اور وہی توشہ کہلانی کا مستحق ہی اسی طرح ایک حدیث کا

مضمون ہی کہ پہلوان وہ ہی جو غصہ کی وقت قابو رکھے ان دونوں آیتوں میں شانِ بلاغت اس وجہ سے زائد نمایاں ہے کہ کسی چیز کو کسی ایسی صفت یا نام سے موسوم کیا گیا جو صفت عموماً لوگوں کی ذہن میں اس شے کی لٹی ثابت نہ ہو جیسی اوپر والی حدیث ہے، تھوڑی سی توشہ و لباس کھوٹی نہیں کہتا لیکن یہاں کہا گیا اور کس خوبی سے نباھا گیا۔

اس سلسلہ سے ایک کونہ تعلق رکھنے والی آیت اور درج ذیل ہے حوغزوه بنوك میں منافقین کی نہ جانی اور معذرت کرنی کی جواب میں نازل ہوئی منافقین نے ایک دوسری سے کہا: لا تنفروا فی الحر (اور وہ لوگوں کو سمجھا لی لگی کہ اتنی گرمی میں گھر سے نہ نکلو۔) جواب میں ارشاد ہوتا ہے قل نار جہنم اشد حرا (ای پیغمبر اون سے کہ دو) کہ جہنم کی گرمی بہت سخت ہے۔

بغیر اس طرح کبھی یہ حقیقت منافقین جیسی بلید لوگوں کی سمجھ میں کب انیوالی تھی آگے ارشاد ہوتا ہے: لو کانوا یفقهون (ای کاش اون کو اتنی سمجھ ہوئی)۔ اس کی بعد ہی متصل یہ آیت: فلیضحکوا قلیلاً والیکوا کثیراً (چاہے کہ ہنسن کم اور روئیں زیادہ) میں بھی یہی سلسلہ ہے۔

### حسن بیان مع الایجاز

اس عنوان سے مراد ”کوئی سہاں باندھنا۔ آنکھوں کی سامی کسی غیر حاضر چیز کی اوصاف بیان کر کے دل کی آنکھوں کی سامی پیش کرنا“ نکتہ۔ سوائی امور مہتمم بالشان قیامت حشر و نشر مناظر قدرت کی دیگر امور کی اگر تصویر کھینچی گئی ہے تو سہایت مختصر مگر اہم خد و خال اوس شے کی یا واقعہ کی سامی آجائی ہیں۔ ملاحظہ ہو: دوزخی کو پیپ پلائی جارہی ہے اور وہ اس کو نہیں بی سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے: یتجرعہ ولایکاد یسقیہ و یاتئہ الموت من کل مکان و ما ہویت (اور اوس کو وہ زبردستی چسکیان لی لیکر پٹی کا اور پھر بھی اوس کو گلی سے نہ اتار سکی گا اور موت اوس کو ہر جگہ سے آنی دکھائی دیکے اور پھر بھی نہ مریگا۔

یتجرع: کھونٹ کھونٹ کر کی مینا کبھی لذت کی لٹی بھی ہوتا ہے یہاں کلفت

دور کرنیکی لٹی ہی، و لایکاد بسیغہ (اس کیلٹی اس کا خوشگوار ہونا ناممکن ہوگا) ایک اور جگہ دوزخی کا حال ان لفظوں میں بیان ہوا ہے، لایموت فبہا ولا یحی (اوس) (دوزخ میں) نہ وہ جیتوں میں ہوگا نہ مردوں میں)۔

بیان قدرت: من ین ورت و دم لبنأ خالصاً سائماً للشارین (گوہر اور خون میں سو (ہم تم کو) خالص دودہ پلائی ہیں جس کو پینی والی آسانی سی غٹ غٹ پی جاتی ہیں) یہاں تفصیل مبداء کی ہی جہان سی دودہ نکلتا ہی، لفظ خالصاً کی قدرت کی تفصیل کردی۔

مناظر قدرت: کشتی کا دریا میں چلنا، بادلوں کا ہوا پر سوار آنا وغیرہ نہایت عجیب و غریب انداز سی بیان کیا گیا ہی، عربوں کیلٹی یہ مناظر تھی بھی عجیب و غریب اور مخاطبین اولین وہی ہیں۔ باد بان اور کشتی کا بھی ذکر ہی دیگر مرئیات کی جزئیات کی تصویر کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ بنی اسرائیل والی گاٹی کی تصویر ملاحظہ ہو: صفراء فاقع لونہا تسر الناظرین (وہ گاٹی ہو زرد اوس کا رنگ خوب گہرا ہو کہ دیکھنی والوں کو ہلی لگی) رنگ ایسی چیز ہی جو سب سی پھلی مرئی چیز کا نظر کی سامنی آتا ہی اور سب سی نمایاں رخ وہی ہی لفظ تسر الناظرین فی خوبصورتی کا انتہائی بلاغت کی ساتھ ذکر کیا۔ اچھا لگنا وغیرہ الفاظ سی ذکر نہیں کیا گیا بلکہ خوش کرنی ہی دیکھنی والوں کو۔

بعض بعض جگہ اثنائی بیان قصہ کی کسی جزئیہ کا ذکر ہی اور مصلحت سی ہی اس جزئیہ کی اہم خد و خال سامنی آجاتی ہیں اور اختصار بھی ہوتا ہی۔ ملاحظہ ہو: عزیز مصر کی بیوی نا حائز مراد حاصل کرنی کی لٹی حضرت یوسف کو کسی حصہ مکان میں لیجا کر دھوکہ سی تند کردیتی ہیں۔ ان کو معلوم ہوتا ہی تو نکانی کی کوشش کرتی ہیں ہر ایک کی کوشش ہی کہ دروازہ پر پہلی وہ پہنچی۔

واستيقا الباب: (اور دونو بھاگا بھاگ دروازہ پر پہنچی) یہاں چار امور ہیں۔ (۱) دروازہ (۲) حضرت یوسف کا دروازہ کی طرف بھاگنا اپنی خلاصی کی لٹی (۳) امرة العزیز کا پیچھی تعاقب کرنا (۴) ہر ایک کی اپنی ساتھی سی زاید تیز رفتاری، یہ سب باتیں اور دو لفظ۔

اسی کی آگے ہی: وقت قصبہ من دبر (اور بھاگتی کی پکڑنی میں) عورت  
 فی اس کا کرتا پیچھی سی بھاڑ دیا: ایک سوال ہوتا ہی کہ ایک فعل شنیع کی  
 لٹی جو تدابیر کی گئیں ان کی اس قدر تفصیل حالانکہ ایک دو جملہ سی زاید  
 نہیں ہی، اس کی وجہ یہ ہی کہ قصہ حضرت یوسف کی پاکدامنی کا ہی اور  
 اس کا بیان بغیر ان تفصیل کی ناممکن تھا۔ ایسی موقعہ پرفس پر قابو رکھنا اس  
 شخص کا کام ہی جو من عبادنا لہ مخاصمین (ہماری برگزیدہ بندوں میں سے تھی) کا  
 مصداق ہو۔

حضرت موسیٰ کو حضرت شعیب کی دونوں صاحبزادیوں میں سے ایک  
 صاحبزادی اپنی پندربزرگوار کی ارشاد کی تعمیل میں ملائی آئی ہی۔ ان کی آئی کی  
 کیفیت کی بیان میں ارشاد ہوتا ہی: فجاءتہ احداهما تمنی علی استحياء (ان میں  
 سے ایک اس کی پاس آئی شرم سے چلتی ہوئی)۔ صرف استحیاء فی آنکھوں کی  
 سامنی سہان باندہ دیا وہ مقدسہ کیسی چلتی ہوں گی

### کسی جماعت کی خصوصیات کا ذکر

ہومنین کی شب بیداری و تہجد گزاری کا ذکر ہی تجافی جنوہم  
 المضاجع (رات کو اون کی کروٹیں استروں سے الگ رہتی ہیں) یدعون وانہم خوفاً  
 وطمعاً (اپنی مالک کو ڈر کر اور امید رکھ کر پکارتی ہیں)۔  
 ایک اور جگہ تمام خصوصیات صحابہ کا ذکر ہی اشداء علی الکفار رحاء  
 بینہم (کفار پر سخت آپس میں مہربان)

واذا ریتہم تعجبک اجسامہم (اور جب تم ان کو دیکھتی ہو تم کو اون  
 کی ذیل ڈول بھلی معلوم ہوتی ہیں)۔  
 و ان یقولوا تسمع لقولہم (اور اون کی بات کان دہر کی سنتا ہی) انسانی فطرت  
 ہی کہ معزز آدمی کی ہر شخص بات کان دہر کی سنتا ہی۔  
 کانہم خشب مسندہ (گویا کہ وہ لکڑیاں ہیں جو ٹیکا لگا رکھی جائیں)  
 لکڑی بھی ٹیک لگائی لکڑی بزدلی کی انتہا ہی۔  
 بحسبون کل صیحة علیہم (جہان زور کی آواز ہوئی وہ سب جھوٹی ہیں کہ  
 للکاری گئی)۔

هم العدو: (بڑی دشمن وہ ہی لوگ ہیں۔)

فا حذرهم: (اون سی بچتی رہو۔)

قائلهم الله انی یوفکون: خدا کی مار اون پر، کہاں بھٹکی جارہی ہیں۔

حضرت عائشہ پر نہمت لگانا بھی منافقین کی خبت باطن کا کرشمہ تھا لیکن

بعض صادق مومن بھی اس بات میں ہمنوا ہو گئی۔ ارشاد ہوتا ہی: -

اذ تلقونه بالسنتکم و تقولون بافواہکم ما لیس لکم بہ علم و تحسبونه ہیناً

و هو عند اللہ عظیم: (تم لگی اپنی زبانوں سی اوسکی نقل در نقل کرتی اور اپنی منہ

سی ایسی بات بکتی جسکی تمکو مطلق خبر نہیں اور تم فی اس کو ہلکی

سی بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کی نزدیک بڑی سخت بات ہی۔

کہنا منہ سی ہوتا ہی تاکد دم کیلغی ایسا کیا گا۔ محاورہ ہی: تونی یہ بات

ربان سی نکالی کسی۔

حاملہ عورت کو دوران حمل اور وضع حمل کی وقت جو تکالیف ہوتی

ہیں سبکو معلوم ہی۔ ارشاد ہوتا ہی: حملتہ امہ کرهاً وضعته کرهاً: (مصیبت

جھیل کر اس کی ماں فی اس کو یدٹ میں رکھا اور مصیبت جھیل کر

اس کو جنا)۔

رات دن کا چکرکس اختصار سی بیان کیا ہی مگر ایک تصویر سی کھینچ

جانی ہی: یغشی اللیل النہار (اسی رات کو دن کا پردہ پوش بنایا)۔

یطلبہ حیثنا (رات دن کی پیچھی لگی ہوئی چلی آ رہی ہی)۔

پانی برسنی سی جو رونق و شادابی رونما ہوتی ہی دو لفظوں میں اسکا سماں

کھینچا گیا: فاذا انزلنا علیہا الماء اهتزت و ربّت (پھر جب اس پر پانی برساتی

ہیں تو وہ سبزہ سی لہلہائی اور اوبھر فی لگتی ہی)۔

کبھی ایک ایسی امر کی تصویر کھینچی جانی ہی جو حواس ظاہری سی

ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ یتیموں کی مال کھا جائیوالوں کی متعلق ارشاد

ہوتا ہی:

انما یا کلون فی بطونہم ناراً۔

کہیں کسی امر کو منع کرتی ہوئی اس کی وہ شکل پیش کردی جانی ہی جو

عموماً ہوا کرتی ہی اور اس سے منع کرنا مقصود ہوتا ہی۔ یتیموں کی مال کی سلسلہ میں ہی: ولا تاكلوها اسرافاً و بداراً ان يَكْبُرُوا (اور ان کی بڑی ہوئی کی اندیشہ سے اون کا مال و متاع جلدی جلدی کھا ہی نہ ڈالنا۔)

ان دونوں لفظوں اسرافاً و بداراً کی سبب کچھ بتلادیا جو عموماً ایسی مواقع پر ہوا کرتا ہی جہاں عیبت سے ممانعت کی گئی ہی کس قدر بلیغ الفاظ میں منع کیا گیا ہی اور طبعی نفرت دلائی گئی ہی ارشاد ہوتا ہوتا ہی:

ولا يفتي بعضكم بعضاً (اور کوئی تم میں سے دوسری کی غیبت نہ کری۔)  
 احب احداکم ان ياكل لحم اخيه ميتاً فكرهتموه (بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہی کہ وہ اپنی مردہ بھائی کا گوشت کھائی۔)

فطرۃ سلبہ کو مخاطب کیا گیا ہی: لحم اخ کھانا کس قدر قابل ہرٹ چیز ہی مزید برآں مردہ بھائی صاحب طراز فی اس آیت کی نحت میں ورق کی ورق لکھی ہیں اور مفید باتیں پیدا کی ہیں۔ اس سلسلہ میں تکبر کی مذمت ذیل کی الفاظ میں بھی قابل لحاظ ہی۔

انک لن تخرق الارض (و نہ زمین کو پھاڑ سکی گا اور نہ تن کر چلنی سے پھاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکی گا۔)

حضرت ذکریا علیہ السلام نہایت مسن ہو گئی ہیں اولاد کی امید میں مجیب الدعوات کو پکارتی ہیں: کہنا یہ ہی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں جو اس ایک کلمہ سے ادا کیا جاسکتا تھا: سخت۔ اس کی بجائی الیاط ذیل میں پکارتی ہیں: رب انی وهن العظم منی واشتعل الرأس شیباً۔ صاحب طراز فی بو یا دس صورتوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہی جن میں بعض بیان کیجاتی ہیں۔

وهنت عظام بدنئ ، انا وهنت عظام بدنئ ، انی وهنت العظام من بدنئ ، انی

وهنت العظام منی ، اشتعل الرأس شیباً (بڑھاپی کی سفیدی چمک اٹھی سر میں)۔

جنت کا تفصیلی ذکر تو بہت جگہ ہی مگر ایجاز کی ساتھ اس آیت میں

سب کچھ بیان کر دیا گیا ہی۔

وفیها ما تشته الافس و تلذ الاعین فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرۃ اعین:

(اور جس چیز کو اون کا جی چاہی اور جو ان کی نظر میں بھلی معلوم ہو

بہشت میں ان کی لٹی موجود ہوگی۔ اور کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ لوگوں کی نیک عملوں کی بدلی میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کی لٹی پر دم غیب میں موجود ہیں)۔

طوفان بوح اپنا کام کر چکا، ہی جن منکرین و معابدین کی تباہی مقصود تھی وہ تباہ ہو چکی، زمین پر سناٹا ہی، ہر طرف پانی ہی پانی ہی اب یہ عارضی حالت منظور نہیں، ارشاد ہوتا ہی: وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویسما اقلعی و عیس الماء و قسی الامر و استوت علی الجودی و قیل بعداً للقوم الظالمین (حکم دیا گیا ای زمین اپنا پانی جذب کر لی اور ای آسمان تھم جا اور پانی کا چڑھاؤ اتر گیا اور اقوام کا کام تمام کروا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر کھڑی ہو گئی اور چار دانگ عالم میں پکروا دیا گیا کہ ظالم (خدا کی ہاں سی) دھتکاری کٹی)۔  
 ہر ہر فقرہ اور فقرہ کا ہر ہر لفظ قابل غور ہی، اول کی دو جملوں کا توازن اسی طرح بعد والی دو کا توازن دیکھنی کی قابل ہی

قضاء امر کام ہو چکا یا کیا جا چکا کس قدر عمدہ اور ہر محل جملہ ہی استوب الخ میں صاحب قصہ اور ان کی ہمراہیوں کی نجات کا ذکر ہی اخیر فقرہ و قیل بعد غابت طوفان کی علاوہ کیلئے مرثیہ خوانی کر رہا ہی جس قدر افعال مذکور ہیں سب صبحہ مجہول کی شکل میں ہیں جن میں اشارہ ہی اس امر کی طرف کہ اس قدر بڑی بڑی کام صرف ایک ہی ذات سی ظہور پذیر ہو سکتی ہیں۔ اس آیت میں کس قدر نفوذ امر و قوت سلطان پر دلالت ہی

اس آیت کی ملاغت میں علماء ملاغت فی بیسوں صفحہ رنگی ہیں کسی کو مزید شوق ہو تو سکا کی کی مفتاح العلوم اور طراز کا مطالعہ کری اہل علم میں بھی نفوذ امر پر دلیل ہی ایک نکتہ یہ ہی کہ پانی زمین کی غذا ہی اسی لٹی ماءک کہا گیا نفوذ امر اور قوت سلطان مع حسن بیان مع الاشجاز کی لٹی دوسری آیت بھی ملاحظہ ہو:

فانما ہی زجرة واحدة، فاذا هم بالساهره (بس اس کی صرف اتنی سی حقیقت ہی کہ ایک ڈانٹ بتلائی اور سب کی سب میدان حشر میں آ موجود ہوئی)



## جنت کا بیان مع الایجاز

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرۃ اعین (تو کسیکو معلوم نہیں کہ اس کی لگی (آخرت میں) آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی کئی ہے)

لاطینی کی ایک مثال ہے کہ ہر غیر معلوم چیز اہم معلوم ہوتی ہے جو چیز کسی کی لٹی چھپا کر رکھی جاتی ہے کس قدر دل اس کو چاہتا ہے پھر من قرۃ اعین کا لفظ کوئی بات نہیں چھوڑتا۔ و فیہا تشته الانفس و لذللا اعین (اور اس میں وہ کچھ ہے جسکو نفوس چاہیں گی اور آنکھوں کو لذت دیگی انتہائی خوشی و عیش میں اسکی زوال کا ہونا تمام عیش کو مکدر کردیتا ہے دیا میں سب سے بڑا عیب زوال ہے متنی کہتا ہے اور خوب کہتا ہے:

اشد الغم عندی فی سرور تیقن عنہ صاحبہ انتقلا

(خوشی میں سب سے بڑا غم میری نزدیک خوشی والی کا یہ یقین ہے کہ یہ خوشی زائل ہوتی والی ہے)

لہذا ارشاد ہوتا ہے: واتم فیہا خالدون وعظ اس سے بڑھ کر کیا ممکن ہے۔ افرئیت ان متعنا ہم سنین ثم جاء ہم ما کا نوا یوعدون ما اغنی عنہم ما کا نوا تتمون۔ (نرا دیکھو تو سہی کہ اگر ہم چند برس ان کو (دیاوی) فائدہ اٹھائی (بھی) دین پھر جس (عذاب) کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ان کی روبرو آ موجود ہو تو وہ جو اونہوں فی (دیاوی) فائدی اٹھا لٹی اب (اس حالت میں) اون کی کاکام آسکتی ہیں۔) فقرہ ما اغنی عنہم کس قدر وعظ بلیغ ہے۔

حسرت: فتلک یدونہم خاویۃ بما ظلموا ان فی ذالک لایۃ لقوم یعلمون۔ (اب یہ اون کی گھر ہیں کہ اون کی نافرمانیوں کی وجہ سے بڑی بھائیں بھائیں کر رہی ہیں اس واقعہ میں اون لوگوں کیلئے جو جانتی اور سمجھتی ہیں بڑی عبرت ہے۔)

حسرت و نمتا: کافر کہیگا یا لینی کنت ترابا (ای کاش کہ میں مٹی ہوتا) عربی میں لفظ لیت اس آرزو کیلئے آتا ہے جو محال ہوتی ہے۔ یا لیت ایام الصباء راجعاً (کاش بچپن کی دن لوٹ آئیں) اس سے بڑھ کر

کا فر کی حسرت ذیل کی آیت میں :

باليٰتها كانت القافية (ای کاش مریس مری ہستی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا)  
ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہی گویا متکلم کی ذہن میں موت اس حسرت  
کی ساتھ جاگزیں ہی کہ کوئی اور تصور نہیں۔

«منحصر مرنی پہ ہو جسکی امید» نا امید اسکی دیکھا چاہی

قصہ کی معنی فیصلہ کردینی ختم کردینی کی ہیں۔ قصہ ہی پاک کر چکی ہوئی  
حضرت مریم بھی موت کی آرزو کرتی ہیں لیکن طرربیان سی معلوم ہوتا ہی کہ  
ان کو سوسائٹی میں اپنی حفاظت ناموس کی خاطر موت کی آرزو تھی اور وہ  
ابھی نہیں آتی۔ کا فر ہایت تمنا سی گذشتہ موت کو یاد کر رہا ہی

حضرت مریم کہتی ہیں : يا لتي مت قبل هذا او كنت نسيا منسيا (ای  
کاش کہ میں اس مصیبت سی پہل ہی مر چکی ہوتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔  
خدا کی ذات و صفات کی متعلق کہاں تک آیات نقل کی جائیں۔ سورتوں میں  
بکثرت یہ مضمون موجود ہی۔ سورہ رعد میں اللہ يعلم ما تحمل کل الشیء سی  
دور تک پڑھو یہاں صرف اية الكرسي نقل کیجانی ہی :

اللہ لا اله الا هو الحي القيوم۔

لفظ اللہ کو مقدم کیا اور یوں نہ کہدیا لا اله الا اللہ الحي القيوم تاکہ مخاطب خبر  
اور واقعہ کی طرف متوجہ ہو۔ فرمایا اس کی سوا کوئی معبود نہیں ہی۔ صفات  
میں سب سی اول حیات لفظ حی کی ذیل میں ذکر کی گئی جس میں سمیع  
بصیر، علیم و قدرت وغیرہ ہی آگئیں۔ لفظ حی صفت کا صیغہ ہی جو دوام پر  
دلالت کرتا ہی لیکن ایک چیز حی ہو معلوم نہیں کہ وہ دوسروں کو بھی حیات  
بخش ہی یا نہیں۔ فرمایا القيوم : یہ مبالغہ کا صیغہ ہی اس کی معنی دوسری  
چیزوں کو قائم رکھنی والا مدبر وغیرہ۔

امام راغب لکھتی ہیں القيوم۔ ای القائم الحافظ لکل شیء والمعطی له مابہ  
قوامہ و ذالک هو المعنی المذكور، فی قوله الذی اعطی کل شیء خلقه ثم ھدی۔

یعنی محافظ ہر شیء کا اور اس کو وہ چیز دینی والا جس پر اس شیء کا دار  
و مدار ہو۔ اور یہی بات اس دوسری آیت میں مذکور ہی کہ وہ ذات جس فی ہر

شی کو اس کی خلقت دی اور طریق معاش بتلائی  
 منتظم اور نگران کیلئے آرام بھی تو ضروری ہی فرمایا :  
 لا تاخذہ سنة ولا نوم (اونگہ اور نیند نہیں آتی) ترتیب کی باقاعدگی  
 بھی ملحوظ رہی لیکن اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہی زندہ سہی ہر وقت نگران سہی  
 مدبر سہی مگر مالک کوئی اور ہو ارشاد ہوا :

لہ ما فی السموات و الارض (جو آسمان اور زمین میں ہی سب اسی کا ہی)  
 جلال و کبریائی کی رہی سہی بات اس حملہ فی پوری کردی :

من الذی یشفع عندہ الا اذہ (کون ہی حق اس کی اذن بغیر اس کی  
 جناب میں (کسیکی) سفارش کری) باوجودیکہ آیت میں تمام صفات جبروت  
 کی بیان ہوئی ہیں ، لیکن الابدانہ بتلارہا ہی کہ اجازت سی سفارش کی جا  
 سکتی ہی بلا سفارش قبول ی فائدہ چیز ہی اس لئی ضرور سی بھی جانی  
 ہوگی لعل القیوم میں اشارہ علم کا ذکر آچکا۔

یعلم ما بین ایدہم و ما خلفہم (جو کچھ کہ لوگوں کو پیش آ رہا ہی  
 اور جو کچھ ان کی بعد (ہونیوالا) ہی (وہ) اس کو (سب) معلوم ہی) لیکن  
 اور ہستیان بھی علم سی متصف ہیں۔ لہذا سبب معلوم ہونی چاہئی۔ ارشاد ہوا :  
 ولا یحیطون بشئی من علمہ الا بما شاء۔ (اور لوگ اس کی معلومات میں سی  
 کسی چیز پر دسترس نہیں رکھتی مگر جتنی وہ چاہی)

پہلی جلوں میں گذر چکا کہ سب عالم اسی کا ہی مالکیت معلوم  
 ہو چکی جبروت و جلال و قوۃ سلطان کی کچھ مدارج غیر بیاب  
 شدہ رہ گئی ہیں۔ ارشاد ہوا :

وسع کر سہ السموات والارض (اس کی کرسی آسمان و زمین پر حاوی ہی)  
 پہلی گذر چکا کہ نند اور اونگہ نہیں آتی مگر شاید تھکن  
 لاحق ہونی ہو۔ ارشاد ہوا :

ولا یؤدہ حفظہا آخر میں و هو العلی العظیم (اور آسمان و زمین کی حفاظت  
 اس پر (مطلق) گراں نہیں اور وہ عالی شان اور عظمت والا ہی)  
 نتیجہ سمجھو دلیل سمجھو عام انداز قرآن کا ہی کہ اسماء حسنی

میں سی کسی صفت مناسب پر آبت ختم فرمائی ہی  
ذیل کی دو آیات جامعہ ایجاز کی مثال کافی ہیں جن میں تمام فرائض  
دینی و دنیوی و معاشیات بیان کردئی گئی۔

واعبدوا لله ولا تشركوا به شئيا وبالوالدين احسانا وبذی القربی والیتامی  
والمساکین والجارنی القربی والجار الجنب و صاحب بالجنب وابن السبیل و  
ما ملکت ایمانکم ان الله لا یحب من کان مختالا فخورا۔ (اور الله ہی کی عبادت  
کرو اور اس کی ساتھ کسی چیز کو شریک مت نہراؤ اور ماں باپ اور قرابت  
والوں کی یتیموں اور محتاجوں اور قرابت والی پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور  
پاس کی بیٹھنی والوں اور مسافروں اور جو (لوہڈی غلام) تمہاری قبضہ میں ہیں  
ان سب کی ساتھ سلوک کرنی رہو الله ان کو دوست نہیں رکھتا جو اترائیں  
اور نرائی مارتی پھریں۔)

ان امور میں سی کسی میں کوتاہی کرنا گویا فخر اور تکبر کی  
شان ہی انسان کی فطرت ہی کہ جس کسی سی اپنی کو مستغنی سمجھتا ہی اسکی  
ساتھ احسان کرنا گویا ضائع کرنی کی مراد سمجھتا ہی عبادت کی ساتھ  
ہی والدین کا ذکر کرنا ان کی ساتھ حسن سلوک کی اہمیت پر دال ہی ترتیب  
فرائض الفاظ کی بندش اصحاب ذوق خود ملاحظہ کر سکتی ہیں۔

دوسری آیت: فلذلك فادع واستقم كما امرت ولا تتبع اهوام و قل آمنت  
ابر الله وامرت لا عدل بینکم الله ربنا و ربکم لنا اعمالنا و لکم اعمالکم لا حجة  
بیننا و بینکم الله یجمع بیننا و الیہ المصیر۔ (تو اسی لئی (لوگوں کو) اسی (اصل دین)  
کی طرف بلائی رہو اور خود (بھی) جیسا تم سی فرما دیا گیا ہی (اسپر) قائم  
رہو اور ان کی خواہشوں پر نہ چلو (ان سی صاف) کہدو کہ کتاب (کی قسم میں)  
سی جو کچھ خدا فی اتارا ہی میرا تو سب پر امان ہی اور مجھکو (خدا کی  
ہاں سی) حکم ملا ہی کہ تمہاری درمیان (تمہاری اختلافات کا فیصلہ) انصاف کی  
ساتھ کرو۔ الله (تمہارا پروردگار ہی) ہمارا کیا ہمکو اور تمہارا کیا تم کو ہم میں  
تم میں کچھ جھگڑا نہیں الله ہی (قیامت کی دن) ہمکو اور تم کو ایک جگہ جمع  
کری گا اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹ جا نا ہی)

## الفاظ کی بندش و جملوں کا جوڑ۔

قرآن مجید میں جو لفظ جہان ہی گویا لکینہ ہی کہ اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔ جو لفظ مقدم ہوا چاہتی وہ مقدم ہی جو مؤخر ہوا چاہتی وہ مؤخر ہی۔ تقدیم و تاخیر کا ایک وسیع باب ہے

صاحب طرازی کئی ورق میں لکھا ہے قرآن مجید جا بجا جن و انس کو مخاطب کیا اکثر مقامات پر لفظ انس مقدم ہی بسبب شرف کی کہیں جن کو مقدم کیا گیا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں قہر و غلبہ یا تسلط و استیلاء کا مقام ہے مثلاً وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون۔ (کہ میں نے جن اور انس کو صرف اپنی عبادت ہی کی لٹی پیدا کیا ہے)

جب سے سرکشی کا زائد اندشہ ہی ممکن ہے کہ اپنی قوت پر گھمنند ہو چھوٹی سی سورت اذا جاء پر غور کرو۔ الفاظ کی شست کی خوبی درجہ اعلیٰ پر ہے۔ نصر اللہ (اللہ کی مدد) کا آنا کسقدر اعلیٰ خوش خبری ہی اور نیک فالی۔ ایک مستقل وجود تسلیم کر کی لفظ جاء (آیا) لا یا گیا یہ بھی کہ تمہاری مدد کی گئی وعدہ جسی دوسری جگہ لقد نصرکم اللہ وغیرہ اللہ کی مدد کی بیشمار نتائج ہیں مگر آنحضرت کی مشن کی مناسب فتح مکہ بڑی نعمت ہے لہذا اس کی متصل والفتح کہا گیا۔

و رأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا: فتح سے اسقدر متصل ہی جیسی فتح نصر اللہ سے فتح مکہ کی بعد سنہ ۹ میں تمام عرب کی وفود آئی اور اسلام میں داخل ہوئی نصر اللہ سے مناسب تسبیح و تقدس ہے۔

اور اسلام کی اشاعت و نشر کی مناسب استغفار ہی کہ فرائض نبوت پوری ہوئی اب خدا کو یاد کرو (حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ گویا خبر موت ہی تھی)

معوذتیں کو دیکھو دوسرے میں خدا کی حمایت اور پناہ چاہی گئی ہے تناسب و حسن تالیف نمایاں ہے رب الناس لوگوں کا آقا ممکن ہے بادشاہ نہ ہو۔ آ کی ہی ملک الناس ممکن ہے بادشاہ ہو خدا نہ ہو الہ الناس چونکہ شیطان کی وسوسے سے پناہ طلب کی ہے جو بڑا مظہر شر و فساد کا

ہی۔ اس لئی اس قدر صفات عظام ذکر کئی ہیں۔ ہر خلاف سورہ فلق کی وہاں جسمانی مصائب سے حمایت چاہی ہی۔

ربط آیات: اسی سلسلہ میں آیات کا ربط قابل لحاظ ہی۔ علمای معانی متفق اللفظ ہیں کہ بلا تناسب کی ایک بات کا دوسری پر عطف کرنا خارج از بلاغت ہی۔ قرآن مجید میں بعض آیات کا تعلق بعض سے بادی النظر میں ظاہر نہیں ہوتا۔ واقعات و حالات کی اقتضاء سے آیات کی نزول کا اقتضاء بھی یہی ہی۔ تاہم علماء فی عور و فکر کر کے ربط آیات کی مرحلی کو بھی صاف کر دیا ہی۔ بعض مقام میں اگرچہ آدمی ربط کی وجہ بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن ذوق اور وجدان سے کلام کو مربوط سمجھ لیتا ہی۔ ملاحظہ ہو:

افلا ينظرون الى الابل كيف خلقت والى السماء كيف رفعت والى الجبال كيف سببت والى الارض كيف سطحت۔ (تو کیا لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتی کہ کیسی (عجیب) پیدا کئی گئی ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا اونچا اُٹھا گیا ہی اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسی کھڑی کئی گئی ہیں اور زمین کی طرف کہ کیسی پچھائی گئی ہی) اسکا کی فی عرب کی تمدن و معاشرت کو لحاظ کرتی ہوئی ربط بیان کیا ہی۔ عربوں کی نظر آسمان کی طرف مینہ کی لئی ہوتی ہی اونٹ ان کی معاش کا ایک بہت بڑا رکن اہم ہی۔ پہاڑ اور زمین بھی آیات قدرت میں سے بڑی نشانیاں ہیں۔ امام رازی لکھتی ہیں کہ اس آیت میں وہ چیزیں جمع کی ہیں جن میں خوبصورتی اور نزاکت نہیں ہی۔ خوبصورت چیزوں کی دیکھنی سے تذکر اور عبرت اندوزی نہیں حاصل ہوتی لیکن ان کی خلقت میں انتہائی حکمت پائی جاتی ہی؛ نیز یہ کہ زمین عرب کی صحرا میں سفر کرتا ہوا تنہا آدمی جب اپنی داہنی دیکھیگا تو پہاڑ بائیں پہاڑ اوپر آسمان۔ ان اشیاء کا جمع ہونا نہایت پر لطف ہی جو وجدان سلیم اور ذوق سے محسوس ہو سکتا ہی۔ سورہ بقرہ میں ایک مقام پر جہاد کی متصل حج کا ذکر آیا ہی۔ علماء فی جہت جامعہ سفر نکالی ہی مہاشمی کی تفسیر اس موضوع پر اچھی کتاب ہی لیکن کہیں کہیں تکلف معلوم ہوتا ہی۔

ارسطوفی کتاب بلاغت میں لکھا ہے کہ ہر مضمون کی لئی اویسی کی مناسب طرز style ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی مسائل کا طرز علیحدہ ہے، قصہ کا جدا انداز و تخویف کا اس سی الگ۔ چنانچہ پورا علم فرائض (میراث کی مسائل) بتفصیل بیان کئی کئی۔ مگر شان ایجاز بھی خوب قائم رکھی کئی ہے۔ ایک نہائی رکوع و غط و نصیحت کا ہے باوجود ایجاز کی قانون بیان کرنی میں معمولی سی معمولی سمجھ کی پہوچ کی مطابق کلام کیا گیا ہے اور وہ شبہ جو کم فہم آدمی کو ہو اسکا ازالہ بھی کر دیا گیا چنانچہ جہاں محرمات بتلائی کئی ہیں

و رہائیکم اللاتی حجور کم من نسائکم اللاتی دخلتم بہن فان لم تکونوا دخلتم بہن فلاجناح علیکم۔ (اور جن بیویوں کی ساتھ تم صحبت داری کر چکی ہو ان کی گیلز لڑکیاں جو (عالباً) تمہاری گودوں میں پرورش پائیں (تم پر) حرام ہیں لیکن اگر ان بیویوں کی ساتھ تم فی صحبت داری نہ کی ہو تو (گیلز لڑکیوں کی ساتھ نکاح کر لینی سی) تم پر کچھ گناہ نہیں)

لفظ (فان لم تکونوا دخلتم بہن) کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن رحمة علی العباد اس عقدہ کو بھی کھول دیا۔

ایسی ہی وحلائل ابنائکم الذین من اصلا بکم (اور تمہاری بھوئیں یعنی تمہاری (اپنی) صلبی بیٹیوں کی بیویاں) بھی (تم پر حرام ہیں)۔

ایسی ہی حج میں جو شخص قربانی پر قدرت نہ رکھی اس کیلئے حکم ہے کہ تین روزی ایام حج میں رکھی اور سات بعد کو۔ یہ حکم بتلا کی ارشاد کیا گیا فلک عشرة کاملۃ (یہ پوری دس ہوئی)

بعض ملاحذہ کا اعتراض ہے سات اور تین دس تو ہوتی ہے ہیں اس فقرہ کی ضرورت ہے کیا تھی یہ فقرہ اعتراض کا باعث کیا معنی اور موجب فصاحت ہے اور زیادتی وضاحت کا باعث لفظ واؤ عربی میں جیسی اور کی معنی میں آتا ہے ویسی ہے یا کی معنی میں آتا ہے۔ جالس الحسن وابن سیرین (حسن یا ابن سیرین کی پاس انہا بیٹھا کرو۔)

نو کہیں حاجی یہ نہ سمجھ لے کہ سفر میں چونکہ شدائد زائد ہوتی ہیں

اس لٹی اگر وہاں روزہ رکھا جائی تو تین اور سات مکان پر ہوں گی اس کی تردید کردی گئی اور اس کی اہمیت جتلا دی گئی کہ دس میں ایک کم نہ ہو یعنی دس کی تعداد مقصود ہی۔

طرز آدا: بڑا طویل الذیل عنوان ہی ہم صرف یہاں چند آیات بطور نمونہ پیش کرتی ہیں اور اس میں اس دلچسپی کو ملحوظ رکھا ہی کہ وہ آیات نقل کی جائیں جن میں ظاہری طرز تکلم چھوڑ کر کوئی اور طرز اختیار کیا گیا ہو یا جس میں کوئی نکتہ ہو۔

کافر سود کو شیر مادر سمجھتی ہیں اور اس کو بیع کی طرح جائز۔ طاهر محل کا اقتضا تو یہ ہی کہ کہا جاتا (قالوا اما الربوا مثل البيع) معاملہ سود مثل معاملہ بیع کی ہی۔ ارشاد ہوا: اما البيع مثل الربوا (معاملہ بیع معاملہ سود کی طرح ہی)

اس کی خوبی وہ سمجھی گا جو اس جملہ کی جگہ کہ زید شیر کی طرح ہی نہ کہی کہ شیر زید کی طرح ہی، گویا زید بہادری میں شیر سی زائد شہرت رکھتا ہی

ایک اور مضمون ہی کہ اگر عورتیں کچھ مہر معاف کر دین تو وہ جائز ہی ارشاد ہوا فان طبن لکم عن شی منہ نفساً (اگر وہ خوشدلی سی کچھ معاف کر دیں، فکلو ہنیئاً مریاً (اس کو کھاؤ رچتا بچتا) یعنی بالکل رضا و خوشنودی سی معاف کرین تب جائز ہوگا۔

جنت کی لباس کا ذکر ہی۔ ارشاد ہوتا ہی: بطائنہا من استبرق (اسکی استر اطلس کی ہوں گی جسکا استر اطلس کا ہوگا اسکی ابرہ کا کیا کہنا۔ جنت کی وسعت کا ذکر ہی عرسہا السموات (اسکی چوڑائی آسمانوں کی وسعت جیسی ہی بیان یہ کرنا ہی کہ مطلقہ عورت کا نان نفقہ لڑکی کی باپ کی ذمہ ہی۔ ارشاد ہوا، وعلی المولود لہ رزقہن وکسوئہن بالمعروف (اور جس کا بچہ ہی (یعنی باپ) اس کی ذمہ دستور کی مطابق ماؤں کا کھانا کپڑا دینا ہی)

امام ابو حنیفہ فی اس سی استدلال کیا ہی کہ نسب کا اعتبار باپ سی ہی۔ حضرت یوسف کو امرءة العزیز نا جائز مطلوب کیلٹی پھسلانی ہی



ارشاد ہوتا ہے: وراودته اللی ہوفی بیتھا عن نفسہ (اور جس کی گھر میں یوسف رہتی تھی اسنی اپنا (نا جائز) مطلب نکالنا چاہا۔)  
راودت امراء العزیز نہیں کہا کہ شاہانِ شان نہیں کہ کسی پرائویٹ عورت کا نام لیا جائی۔

دوسری اس صورت سی ادا کرنی میں حضرت یوسف کی پاک دامنی کا بدرجہ اتم ثبوت ہے۔

طرزِ ادا کی سلسلہ میں ادب کی متعلق بھی کچھ لکھ دینا نامناسب نہ ہو گا۔ حضرت ابراہیم اپنی کافر باپ سی کس طرح یا ابت یا ابت کر کے خطاب کرتی ہیں۔ (دیکھو سورۃ مریم) ایک اور جگہ جناب موصوف کی دعا کی الفاظ منقول ہیں جہاں وہ خدا کی صفات بیان کر رہی ہیں الذی ہو یطعمنی و یسقین و اذا مرضت فهو یشفین (اور جو مجھ کو (کھانا) کھلاتا ہے اور جو (پانی) پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے) بیماری کو اپنی طرف منسوب کیا ہے یہ نہ کہا کہ بیمار کرتا ہے تو وہی شفا دیتا ہے۔

سورہ جن میں جنوں کی زبانی ارشاد ہوتا ہے: وانا لایدری اشر ارید بمن فی الارض اما اراد بہم ربہم رشدا (اور ہم نہیں جانتی کہ (اس انتظام سی) زمین کی رہنی والوں کو کچھ نقصان پہونچانا مقصود ہے یا ان کی پروردگار کا ارادہ ان کی حق میں بہتری کرنی کا ہے۔

ابحجاز و اطناب: ایک ہی مضمون کو کبھی اطناب کی ساتھ بیان ہوتا ہے حضرت موسیٰ کا قصہ سورہ طہ میں کس قدر مفصل ہے۔ خلاف اسکی والنازعات میں تمام اہم باتیں آگئیں اور صرف چند آیات میں: هل اتاک حدیث موسیٰ اذا داء ربہ بالواد المقدس طوی اذہب الی فرعون انه طفی فقل هل لک ان ترکک و اھدیک الی ربک فتخشى فارام الایۃ الکبریٰ فکذب و عسی ثم ادبر یسعی فحشر فنادی فقال انا ربکم الاعلیٰ فاخذہ اللہ نکال الاخرۃ والاولیٰ۔

لہجہ: صاحب طرازی لہجہ کی متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور آیات

نقل کی ہیں۔ لہجہ سی مراد یہ ہے کہ جہاں شفقت اور رحمت کا موقعہ ہے وہاں الفاظ فقری ضحائر وغیرہ سب اسی کی مناسب ہوں اور جہاں غصہ کا موقعہ ہے اس کی مناسبت کا احاطہ ہو۔ (شفقت شکایت کا رنگ لٹی ہوئی) عروۃ تبرک ایک بڑی آزمائش کا غروہ تھا۔ منافقین نے گھر بیٹھنے کی اجازت حاصل کر لی ہے بعض مخلص مسلمانوں نے بھی کمزوری دکھلائی ہے آیت نازل ہوئی ہے: عفا اللہ عنک لم ادب لہم (خدا تمہیں معاف کری تم نے انکو (گھر بیٹھی کی) اجازت کیوں دیدی) گفتگو میں پہلا فقرہ شفقت اور رحمت سی پر ہے دوسری فقری میں شکایت محبت آمیز طریق پر ہے اسی طرح سورۃ عبس و احزاب میں بھی غتاب آمیز لہجہ ہے

دوسری آیت ملاحظہ ہو جس میں اس خاک کی پتلی کو جو حشر کا اپنی قصور فہم کی سبب سی منکر ہوتا ہے خطاب عام ہے۔ اولم یرالاسان انا خلقنہ من طعۃ فاذا ہو خصیم میں و ضرب لنا مثلا و نسی خلقہ قال من یحیی العظام و ہی رحمہم (کا آدمی کو معاموم نہیں کہ ہم نے اسکو نطفہ سے پیدا کیا نا این ہمہ وہ (ہمارا) کھام کھلا (مقابل بن کر) لگا جھگڑی اور لگا ہماری سبب باتیں بنانی اور اپنی اصوات کو بھول گیا کہتا (کیا) ہے کون (اسی قدرت رکھتا) ہے کہ (آدمی کو) ہڈیاں گل (کر خاک ہو) گئی ہوں اور وہ ان کو جلا کھڑا کریں)۔ اسان کی فی حقیقت مبدہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور فرمایا اس فی حقیقت قطرہ سی ہم نے پیدا کیا جس کی قدرت سی وہ منکر ہے خصیم میں گویا کٹھنہ حجۃ اور بحث کرنی کا مفہوم ادا کیا گیا ہے جیسی بولتی ہیں کہ فلاں شخص منطق بگھارتا ہے یہاں لفظ عامی اور کافر طاعی جیسی الفاظ سی نہیں یاد کیا اس لئے کہ آیت کا لہجہ محض شکایت پر دلالت کرتا ہے

اسی طرز کی ایک اور آیت ہے: و نجعلون رزقکم انکم تکذون (اور تمہی اپنا راتب باندہ لیا ہے کہ (اسکو) جھٹلاتی ہے رھو کی) الرزق العطاء الجاری (بندھا راتب)۔ لفظ رزق قابل غور ہے

شدت عتاب: لقد جئتم شیا ادا تکاد السموات یتفطرن منه و تنشق الارض

و تخر الجبال هذا ان دعوا للرحمن ولدا. (تم ایسی بڑی سخت بات (اپنی طرف سے گھڑ کر) لائی جس سے (عجب نہیں) آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شوق ہو جائی اور پہاڑ ریزی ریزی ہو کر گر پڑیں کہ لوگوں نے (خدای) رحمن کی لٹی بیٹا قرار دیا۔

محض شفقت و رحمت کا لہجہ دیکھنا ہو تو والصحی اور الم شرح پڑھو مگر وہاں بھی نعمتیں گنوا کر ایک ایک اخلاقی حکم بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔ پھر وہ خطاب خاص ہی رحمۃ للعالمین کو۔ ذیل کی دو آیتیں قابل غور ہیں۔ فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولا تکفرون (اور تم ہماری یاد میں لگی رہو کہ ہماری بہاں بھی تمہارا ذکر ہوتا رہی) درال لفظ ذکر (یاد کرنا) پر غور تو کرو کون کس کو یاد کر رہا ہے پھر ضمیر واحد متکلم یعنی مجھے فرمایا۔ یہ نہیں فرمایا کہ میں۔ موقع رحمت اور شفقت کا ہے نہ کہ اظہار عظمت و جبروت و شوکت کا۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو: وادا سألك عبادی عی فانی قریب اجب دعوةالداع اذا دعان فليستجیوالی ولیومنوالی لعلهم یرشدون (جب میری بندی تمہی میری باری میں دریافت کریں تو ان کو سمجھا دو کہ میں ان کی پاس ہوں جب کبھی کوئی مجھ سے دعا کری تو میں دعا کریں والی کی دعا کو قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہی کہ میرا حکم (ہی) مانیں اور مجھے پر ایمان لائیں تاکہ وہ سیدھی راستی لگ جائیں۔

میری بندی کہا نہ کہ ہماری بندی کہ موقع شفقت کا ہے لفظ عبد (بندہ) خود رحمت و لطف کا مقتضی ہے پھر جبکہ کہا جائی میری بندی کس قدر تخصیص ہے میرا خادم، میرا آدمی، میرا مرید جس طرح تخصیص و شفقت پر دلالت کرتی ہیں اسی طرح عبادی بھی۔

”جب پوچھیں“ کسی خاص وقت کی تعیین نہیں۔ یہ نہیں فرما یا گیا جیسی دوسری مقامات پر ہی یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فیہ قل قتال فیہ کبیر۔ (تم سے ادب والی مہینوں کی نسبت یعنی ان میں لڑنے کی بابت دریافت کرتی ہیں تو سمجھا دو کہ ادب والی مہینوں میں لڑنا بڑا گناہ ہے)

یا جیسی یسئلونک عن الالهة قل ہی مواقیت للناس والحج (نسی چاند کی باری مین دریافت کرتی هین تو کہو چاند سی لوگوں کی (معاملات اور عبادات مثلاً) حج کی واقعات معلوم ہوتی هین) گویا بالکل تیاری ہی انتظار کی دیر ہی نہیں۔ یہ آیت بھی جب بارل ہوئی کہ لوگوں فی دریافت کیا تھا کہ ہمارا پروردگار دور ہی یا نزدیک جسی اوپر والی آیات۔ فرمایا (انی قریب) »ان« کی لفظ سی مضمون جملہ کی تاکید ہو جانی ہی اہل علم اس چھوٹی سی جملہ کی رور کو سمجھ سکتی هین۔

اجیب- ادا دعان تک وہی واحد متکلم کی صبر (مجہی) چلی جاتی ہی آگے ارشاد ہوتا ہی: فلیستجیلوالی (میری بھی تو مان لین) لفظ استجاة (ماننا، سننا، قبول کرنا) دعا کی قبول کرنی مین عموماً مستعمل ہوتا ہی۔ یہاں بندہ کلٹی مستعمل ہوا ہی، جسی کوئی مطلق العنان بادشاہ اپنی رعایا سی کہی کہ مین تو حاضر ہوں تمہاری درخواستوں کی قبول کرنی کلٹی لیکن تم بھی تو میری سنو۔ والدومنو فی اصل الاصول مقصود اعلیٰ کا ذکر ہی آگے تعلیم یرشدون (تا کہ وہ لوگ زستی لگجائن): لفظ رشد اس موقع پر تمام ان الفاظ سی رائد مناسب ہی جو اس کی ہم معنی یا قریب معنی رکھتی هین، مثلاً فلاح صلاح نجات وغیرہ لفظ رشد کی متعلق امام راعب کی تصریح سی معاون ہوتا ہی کہ دسا و آخرت دونوں کی صلاح و بہبودی کیلٹی یہ لفظ آتا ہی مضمون بہت طویل ہو چکا لیکن ایک مختصر سی بحث باقی رہ گئی جس کی بغیر ہماری خیال مین مضمون بالکل ناقص رہتا ہی، کہا جا سکتا ہی کہ شاعر ناظم و نائر کی کلام مین خوبیاں نکالی جا سکتی هین۔ تفوق کا یہ معیار ہوا چاہٹی کہ ایک مضمون اور معنی کی دو عبارتین نظم ہوں اور پھر تفوق حاصل ہو تب یہ بیشک مانا جا سکتا ہی کہ فلاں کلام دوسری ہم معنی کلام سی اس درجہ تک بڑھا ہوا ہی کہ گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہر چند تفحص اور استقراء کیا گیا لیکن اس قسم کا کلام بہت کم ملا ہی تاہم ذیل کی دلچسپ بیان سی بہت کچھ روشنی پڑی گی اس قسم کی مضمون کی مواد کی کم ملتی کی وجہ سب سی بڑی یہ ہی کہ جو مضامین قرآن مین

ہین ابر ڪوئی ناظم و نا تر طبع آزمائی نہیں کرتا بہر حال اس مختصر نمونہ سی اندازہ لگایا جا سکتا ہی

سمؤل ابن عادیا عرب کا مشہور جوانمرد اور شریف النفس شاعر فخر مین کہتا ہی (جس قصیدہ سی یہ شعر لیا گیا ہی وہ قصیدہ فخریہ شاعری ڪی ہزین نمونوں مین شمار کیا جاتا ہی)

و نکران شنا علی الناس قولہم ولا ینکرون القول حین نقر  
ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کی تردید کر سکتی ہین اور ہماری کہی کی وہ تردید نہیں کر سکتی

اس سی ملتی جلتی آیت ملاحظہ ہو : لا یسئل عما یفعل و ہم یسألون  
(اس کی ڪئی کی بار پرس ہوگی لیکن اس کی ڪئی کی بار پرس ہوگی)

سمؤل کا یہ فخر سرف یہاں تک محدود ہی کہ اسکی مات کی ڪرئی تردید نہیں کر سکتا اعمال و افعال کا ذکر نہیں ہی لیکن کہا جا سکتا ہی کہ سمؤل کی عرس ہی اسی قدر تھی

ذیل کی مضمون مین بالکل انک ہی چیز دو عنوانوں مین پیش کی گئی ہی مضمون ہی بذہا ہو جانا سیاہ بالوں مین سفیدی نمودار ہونا : حریری چھٹی صدی کا مشہور ادب (جسکی کتاب مقامات کو بعض بد مذاق مستشرقین یورپ ہی قرآن کی بعد دوسرا درجہ دیا ہی) اس مضمون کو ذیل کی الفاظ مین ادا کرتا ہی اقمربللہ الدجوجی (اس کی تاریکی والی رات چاندی والی ہو ڪئی ہی) لفظ دجوجی ہی فقریکی رونق کو مٹا دیا ورہ استعارہ برا نہ تھا اسی مضمون کو ایک شاعر ادا کرتا ہی لیل ایصیح بحابیہ بہار ہماری خیال مین حریری سی اس کا طرز ادا رائد دلکش اور سماں کھینچنی والا ہی قرآن مین ہی واشتعل الراس شیبا (سر بڑھایی سی بھڑک اٹھا) سیاہ سر جو کوئلہ کی برابر سیاہ تھا اب اس مین آگ کی طرح بڑھاپا بھڑک اٹھا۔ حریری کا جملہ نزول قرآن کی بعد کا ہی ایک اور دلچسپ ترین مقابلہ ملاحظہ ہو ضرب الامثال پھلیون کی متعلق یاد رکھنا چاہی کہ جب تک کوئی زبان زندہ رہتی ہی اس کی ضرب الامثال جوں کی توں

باقی رہی ہیں۔ گویا اس زبان کی بولنی والوں کی ادنیٰ تنقیدی مذاق  
نی اس کو بالکل بلاسقم تسلیم کر لیا ہی اب ذیل کی بیان کو دیکھو: عرب  
میں اس مضمون کی ادا کرنی کی ایک مثال ہی کہ قاتل کو قتل کر دینا  
آئندہ قتل کی واردات کو روک دینا ہی القتل افی للقتل (قتل واردات  
قتل کو زائد مٹا دینا ہے) اس کی مقابلہ میں ایک آیت ملاحظہ ہو۔

فی القصاص حیوة (قصاص) (کی قاعدی) میں زندگی ہی) عربوں کی ضرب المثل  
میں انط قتل دو دفعہ آپسی کلام، ہذا ہو گیا دوسری لفظ افی کی ای ایک  
۸۴ چھلہ محذوف ماننا پڑے گا من ترکہ یہی قتل کرنا قتل نہ کر بیکی نسبت  
جرم قتل کو زائد مٹا دینا ہے ہر خلاف اسکی آیت میں ایک ادنیٰ خوبی  
صفت مطابقت یعنی دو مخالف چیزوں کا ذکر زندگی اور قصاص کی علاوہ  
کس قدر لطیف و خوبی ہے کہ قصاص یہی قتل کر دینی میں زندگی ہی  
عربوں کی مثال میں یہ نقص ہی تھا کہ بدلہ میں قتل کرنا بہ نسبت ترک  
فعل کی اچھا ہی یا ظلماً قتل کرنا اس نقص کو لفظ قصاص نے اٹھادیا باقی  
حویبان محو و معافی سے تعلق رکھتی ہیں جنکا بیان خاص طبقہ کی علاوہ  
بانت تکدر ہوگا آیت میں لفظ قتل ہی سری سے ندارد ہی جو عرب کی  
ہاں دو جگہ آیا ہے تعداد میں بھی آیت کی حروف کم ہیں۔ ضرب المثل  
قرآن کی نزول سے پہلی کی ہے۔ لہذا ایک اور مقابلہ نقل کر کے مضمون  
کو ختم کرتی ہیں۔ قرآن مجید دورخ کی ذکر میں انہا ترمی بشر  
کا قصص کانہ جہالۃ صفر (اسکی مثل محل کی چنگاریاں برسی ہونگی گویا کہ  
وہ زرد اوشوں کی گلی ہیں)۔

ابوالعلاء معری پانچویں صدی کا مشہور ادیب مگر مذہب میں نہایت آزاد  
بلکہ دہربت تک پہنچا ہوا اس آیت کی معارضہ میں ذیل کا شعر نظم کرتا ہے۔

ہمراء ساطعت الذوائب فی الدجی ترمی بکل شرارة کطراف

آگ سرخ رنگ کی ہی اسکی مینڈھیاں تاریکی میں بلند و بالا ہیں  
ایسی چنگاریاں پھینکتی ہی جو مثل چڑی کی سرخ خیمہ کی ہیں۔

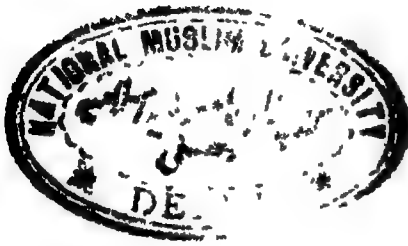
آیت کی متعلق امام رازی بحوالہ ابن عباس لکھتی ہیں کہ اس تشبیہ

میں عربوں کی معاشرت اور مذاق کا بہت لحاظ رکھا گیا ہی ان کی محل چھوٹی چھوٹی خیموں کی طرح ہوتی ہیں۔ امام رازی کہتی ہیں کہ ابوالملا فی یہ جدت طرازی کی کہ بجائی چھوٹی چھوٹی محل کی سرخ خیمہ کو مشہ بہ بنایا پھر امام موصوف فی تقریباً بارہ اعتراض اس تشبیہ پر کئی جن میں کی اہم نائین درج ذیل ہیں

- (۱) چنگاری کا رنگ زرد ہوتا ہی لہذا زرد اونٹ سی تشبیہ زائد مناسب ہی۔ (۲) اونٹ متحرک رہتی والی چیز ہی خیمہ ایسا نہیں
- (۳) چنگاریوں کا ایک دوسری کی بعد پیای آنا اسکی تشبیہ اونٹوں کی چھوٹی چھوٹی سی متحرک جماعت سی مناسب ہی (۴) عادہ محل خواہ کتنا ہی مختصر ہو خیمہ بڑا ہوتا ہی پھر جب کہ وہ تعداد میں اونٹوں کی گلوں کی طرح ہو خیمہ کی تشبیہ میں یہ بات حاصل نہیں (۵) قرآن کی تشبیہ میں جسامت کا بیان بھی آچکا اور تعداد کا بھی اور موقع کا اقضاء بھی یہی ہی معری کی ہاں صرف جسامت کا ذکر ہی یوں سمجھو کہ قرآن کی تشبیہ مفصل ہی جو زاید ببلغ ہی نہ سبب تشبیہ مجمل کی
- (۶) آیات سابقہ کو لحاظ کرنی ہوئی اس تشبیہ میں زاید مناسبت ہی پہلی گذر چکا ہی: اطلقوا الی ظل ذی ثلث شعب (یعنی دھوئین کی) سائبان کی طرف چلو جس کی تین حصی ہیں) ظل کی مناسب محل ہی ہی کہ خوب سایہ دار ہوتا ہی محل والی کی پاس اکثر اونٹ ہوتی ہیں لہذا قصر اور اونٹ کا ذکر نہایت مناسب ہی اطلقوا الی ظل والی آیت ایسی سمجھو جیسی ایک دوسری مقام پر ہی ذق انک انت العزیز الکریم (چکھہ ! تو تو معزز و گرامی قدر ہی)
- (۷) محل بہ نسبت خیمہ کی زاید ثقیل چیز ہی اسکا ہوا میں اڑنا بہ نسبت خیمہ کی اڑنی کی زاید دھشتناک ہی اگر کسی پر کرجائی تو خیمہ کی کئی کئی نسبت زاید باعث مصیبت ہوگا۔ (۸) شتر جب فی مہار ہو تو خدا کی پناہ پھر جبکہ ایسی اونٹوں کی بیشمار جماعتیں ہوں۔ مختصر یہ کہ ابوالملاء فی سونچ سونچ کر آگ کی جس قدر صفات ہو سکتی ہیں نہایت عجیب و غریب طرز

(۳۱)

سی بیان کین لیکن ابوالعلاء نے جس آگ کا ذکر کیا  
ہی وہ آتشبازی کی آگ ہو تو ہو لیکن قرآن میں  
جس آگ کا ذکر ہی وہ دوزخ کی آگ ہی





# حضرت اویس قرنیؓ

قبیلہ مرادسی تھی جو مذحج کی ایک شاخ ہی سلسلہ سبب یہ ہی اویس بن عامر بن جزء بن مالک بن عمرو بن سعد بن عسوان بن قرن بن زہام بن مراد۔

بیان کیا گیا ہے کہ عہد رسالت میں موجود تھی اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کی وجہ سے جو نابینا تھیں دربار نبوی میں حاضر نہ ہو سکی اسوجہ سے صحابیت کی رتبہ سے محروم رہی لیکن باتفاق صلحاء و صوفیہ کرام انکا درجہ زہد و تقویٰ کی لحاظ سے تابعین میں سب سے بڑھ کر ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ تابعین میں آٹھ اشخاص ہیں جن پر زہد منتهی ہو گیا۔ عامر بن عبدالمقیس، اویس قرنی، ہرم بن حبان، ربیع بن جشم، ابو مسلم خولانی، حسن بصری۔ امام مسروق رحمہم اللہ ۲

متعدد روایات مرفوعہ ہیں اس مصنف کی ہیں۔ اس سور ۳ کی لکھا ہے کہ جنگ صفین میں ایک شامی نے نکل کر پکارا کہ کیا تم (کوفہ والوں) میں اویس قرنی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اویس قرنی تابعین میں سب سے بہتر ہیں یہ کہکراہی کہوڑی کو مہمیز لگائی اور آ کر کوفیوں میں شامل ہو گیا۔

دوسری روایت سلام بن مسکین کی حوالہ سے اسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت میں سے میرا خلیل اویس قرنی ہے ۴

(۱) انکی حالات ابن سعد، حاتم ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابن کثیر، امام یاقعی اور امام ذہبی وغیرہ نے لکھی ہیں۔ ادھر فارسی اور اردو کی اولیا و اصفا و اخبار و انوار کی تذکروں میں بھی وہی باتیں کسی قدر تفصیل اور غیر معتبر اضافوں کی ساتھ درج کی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں نہ تو تعرض نہیں کیا اور صرف قصہ کی روایات کو لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں بہت سی دلچسپ قصے جو متاخرین نے لکھے ہیں نہیں آسکیں۔

(۲) لیکن یہ تو صرف سات ہوتے۔ غالباً انھوں نے امام ابن سیرین ہوں کی مگر ذہبی کی نزدیک اس روایت کا یہ سبق ہی باطل ہے (میزان الاعتدال)

(۳) طبقات جلد ۶ صفحہ ۱۱۲ (۴) اس کی ساتھ صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی یاد رہی "لو کنت متخذاً خلیلاً لاعتدلت ابانکر خلیلاً"

تیسری روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سی ہی کہ جب انہوں نے اویس سی فرمایا کہ ”میری لٹی مغفرت مانگو“ جواب دیا کہ ”میں کیسی آپ کی لٹی استغفار کروں، آپ تو صحابہ رسول میں سی ہیں۔“ حضرت عمر نے کہا کہ ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سی سنا ہی کہ تابعین میں سب سی بہتر ایک شخص ہی جسکا نام ہی اویس۔“

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء<sup>۱</sup> میں حضرت ابوہریرہ سی روایت کی ہی کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاس اصحاب خاص کی حلقہ میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ”کل تمہاری ساتھ ایک جنتی شخص نماز پڑھی گا۔“ مجھے امد ہوئی کہ شاید وہ میں ہوں۔ سویری مسجد میں گیا اور آن حضرت کی پیچھی نماز پڑھی جب سب لوگ چلی گئی تو ایک سیاہ چردہ مرد پیوند لگا ہوا تہ بند باندھی ہوئی آیا۔ آن حضرت سی مصافحہ کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ میری لٹی دعا فرمائی، سرور عالم نے اسکی لٹی شہادت کی دعا کی، اسکی جسم سی مشک اذہر کی مہک آرمی تھی، میں نے پوچھا کہ ”یہی وہ شخص ہی؟“ فرمایا کہ ”ہاں، یہ غلام ہی اور فلاں خاندان کی ملکیت میں ہی۔“ میں نے کہا ”آپ اسکو خرید کر آزاد فرما دیجیے۔“ جواب دیا کہ ”مجھے اس سی کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسکو جنت کی بادشاہوں میں سی بنایا ہی۔ ای ابوہریرہ! جنت میں ہی ملوک اور سادات<sup>۲</sup> ہیں اور یہ حبشی جنت کی انہیں ملوک اور سادات میں سی<sup>۳</sup> ہی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سی ان پاک نفس، مخفی فرمانبرداروں کو پسند کرتا ہی جنکی بال پریشان، چہری خاک آلودہ، اور شکم بجز کسب حلال کی بھوکی اور لاغر رہتی ہیں، امیروں کی یہاں جب وہ باریابی چاہتی ہیں تو نہیں ملتی، نازنینوں سی نکاح کا پیغام دیجی ہی تو قبول نہیں کیا جاتا، غائب رہتی ہیں تو تلاش نہیں کٹی جاتی، حاضر رہتی ہیں تو کوئی بات نہیں پوچھتا، نہ بیماری میں کوئی عیادت کو آتا ہی، نہ مرنے کی بعد ان کی جنازہ میں شرکت کرتا ہی۔“

لوگوں نے پوچھا کہ ”ایسا کوئی شخص ہم کو کیسی ملی؟“ فرمایا کہ ”ایسا

(۱) جراول قلمی صفحہ ۲۵۷ (۲) ملوکیت کا یہ درجہ ۱۱ (۳) حضرت فاطمہ اور ان کی دونو بیٹی روایات کی مطابق سادات جنت میں سی ہیں۔

شخص اویس قتی ہی، لوگ بولی کہ اویس قتی کون؟ کہا کہ ”وہ بھڑی بالوں والا“  
 سرمکین چشم ہی، راست قدم، برکشادہ، رنگ مائل سرخی، ٹھوڑی سینے سے لگی ہوئی،  
 نظر بیچی، دایاں ہاتھ بائیں پر رکھی ہوئی قرآن کی تلاوت کرتا ہی اور اپنی نفس پر  
 روتا ہی، دوسے تیسرا لباس نہیں، ایک کلیمی تہ بند، ایک کلیمی رداء، زمین میں گننام  
 ہی مکر آسمان میں مشہور، اگر وہ اللہ پر قسم دلائی تو اللہ اس کو ضرور پوری کردی۔  
 ہاں باد رکھو اس کی مونڈھی کی بیچی ایک چمکتی ہوئی سفیدی ہی، قیامت کی دن  
 جب نیک بندوں سے کہا جائیگا کہ جنت میں جاؤ، اویس کو حکم ہوگا: نہر  
 جاؤ اور سفارش کرو، اس کی شفاعت سے ربیعہ اور مضر جتنی لوگوں کو اللہ بخش  
 دی گا<sup>۱</sup>۔ ای عمر! ای علی! جب تم اس سے ملنا تو درخواست کرو کہ  
 تمہاری لٹی وہ مغفرت کی دعا کری“

یہ دوہوں حضرات اس کی بعد بیس سال تک اویس کی تلاش میں  
 رہی، یہاں تک کہ خلیفہ ثانی فی اپنی زندگی کی آخری سال میں حج کی  
 موقع پر خود ہی قبائل میں جا کر آوار لگائی کہ ”تم میں قبیلہ مراد کا اویس  
 نامی کوئی آدمی ہی؟“ بہ سن کر ایک بڑھا شیخ لمبی داڑھی والا اٹھا اور  
 کہا کہ ”ہم اویس کو تو نہیں جانتے البتہ میرا ایک بھتیجا اس نام کا ہی لیکن  
 وہ گننام اور بی مایہ ہی، یہ رتبہ نہیں رکھتا کہ امیر المؤمنین کی پاس اس  
 کا ذکر ہو۔ وہ ہماری اونٹ چرائی کو لی گیا ہی،“ حضرت عمر فی پوچھا ”کہاں  
 ملی گا؟“ بولا کہ ”میدان عرفات میں جہاں پیلو کا جنگل ہی،“ یہ سن کر  
 حضرت عمر اور علی دونوں اونٹ پر سوار ہوئی اور تیزی کی ساتھ وہاں پہنچی،  
 دیکھا کہ وہ شخص ایک درخت کی سایہ میں نماز پڑھ رہا ہی، اور اونٹ  
 ارد گرد چر رہی ہیں۔<sup>۲</sup>

ان لوگوں فی جانی ہی سلام کیا۔ اویس فی نماز کو ختم کیا اور جواب

۱ ربیعہ اور مضر دو نامی عدنان قبائل ہیں جنکی تعداد بڑی ہی اور جنکی شاخیں حجاز  
 سے نجد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فارسی تذکروں میں ہی کہ ربیعہ اور مضر کی پہڑوں کی روٹیں  
 برابر اس امت کی لشعاس کو مجتہدین کا ش بھی صحیح ہو کہ اس سے تقریباً ساری امت کی  
 خنثی ہو جائیگی اس لٹی کہ ان قبائل کی پاس کثرت سے بھڑیں تھیں۔

۲ تذکرۃ الاولیاء میں ہی اسکی اوٹوں کو فرشتہ چرا رہا ہی۔

دیا 'وعلیکم السلام' ان لوگوں نے پوچھا 'تم کون ہو؟' کہا 'اونٹوں کا چرواہا' اور انکی مالکوں کا نوکر بولی کہ 'ہم نام پوچھتی ہیں' کہا کہ 'عبداللہ' فرمایا کہ 'آسمان اور زمین کی کل چیزیں 'عبداللہ ہیں' ہمکو تمہارا وہ نام دکرار ہی جو تمہاری ماں نے رکھا' کہا کہ 'اس سے کیا مقصد ہی؟' فرمایا کہ 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اویس قرنی کی اوصاف بیان کئی تھی جن میں سے بھوری بال اور سرمگین آنکھیں تو ہم دیکھ رہے ہیں' اب تمہاری نائین موندھی کی بیچی کوئی چمکتی ہوئی سفیدی ہو تو ہمکو دکھلا دو' اگر ہوگی تو تم وہی شخص ہو' اویس نے موندھا کھول کر اٹھایا سفیدی نظر آئی 'ان دوہوں حضرات نے لپک کر اسکو چوم لیا اور کہا کہ 'یشک تم ہی اویس قرنی ہو' ہماری لٹی مغفرت مانگو' اللہ تمہاری مغفرت کریگا۔

اویس نے کہا کہ 'میں استغفار میں کسی کو مخصوص نہیں کرتا یہ اپنی کو نہ اولاد آدم میں سے کسی اور کو بلکہ جمیع مؤمنین و مؤمنات و مسلمین و مسلمات کی لٹی خواہ بر میں ہوں یا بحر میں مغفرت طلب کرتا ہوں۔ پھر کہا 'اللہ تعالیٰ نے میرا حال تو آپ دوہوں حضرات پر ظاہر کر دیا' اب آپ اپنی بھی تعریف فرمائی' حضرت علی نے کہا کہ 'یہ امیر المؤمنین عمر ہیں اور میں علی بن ابی طالب' یہ منکر اویس سرو قد کھڑی ہو گئی اور سلام کیا اور کہا کہ 'ای امیر المؤمنین' اللہ تعالیٰ آپ کو اس امت کی طرف سے اور ای علی! آپ کو اپنی ذات کی طرف سے جزاء خیر عطا کریں' حضرت عمر نے فرمایا کہ 'تم اسی جگہ رہو' میں مکہ میں جاتا ہوں اور تمہاری خرچ کیلئے کچھ عطیہ اور پہننے کیلئے کپڑا لاتا ہوں۔ دیکھو! اسی جگہ ملنا' اویس نے جواب دیا کہ 'میں ملنے کا وعدہ نہیں کرتا' اور آج کی بعد پھر آپ کی اور میری ملاقات بھی نہ ہوگی مجھے عطیہ کی کیا ضرورت ہے اور میں کپڑی لی بکر کیا کروں گا میری جسم پر گلیمی تھ بند اور گلیمی ردا ہے' میری

---

۱ مسلم اور اسد الغابہ میں تصریح ہے کہ یہ برص کا داغ باقی رہ گیا تھا لیکن اردو تذکرہ میں اسکی برخلاف یہ تصریح ہے کہ یہ برص کا داغ نہیں تھا۔

پاؤں میں نسمہ دار جوتیاں پہنے، اور چرائی کی مزدوری میں چار درہم بھی ملتی ہیں، یہ کافی ہیں۔ ای امیرالمومنین! میری اور نیز آپ کی آگے ایسی پر خطر گھاٹی ہے جسکو وہی بار کرسکتا ہے جو لاغر میان، سبک بار، اور چست کام ہو، اسلئے بوجہ ہلکا رکھئے۔ اللہ آپ پر رحم کری۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ بات سنی تو اپنا درہ زمین پر مارا، اور چلا کر روئی کہہ کاش عمر کی ماں عمر کو نہ جنتی، کاش وہ بانیجہ ہوئی، اور — — — اسکی بعد اویسؓ نے کہا کہ »امیرالمومنین آپ روانہ ہوں تو میں اسطرف جاؤں« حضرت عمرؓ مکہ کی سمت پلئے، اویسؓ اونٹوں کو ہانکتے ہوئے ان کی مالکوں کی پاس لپکتے، چرواہی سے معافی چاہی، اور عبادت میں مصروف ہوگئے۔ ابن سعدؓ نے اسیر بن جابر کا یہ بیان لکھا ہے کہ کوفہ میں ایک محدث کی پسر ہم حدیث سننے کیلئے جمع ہوتے تھے، جب فراغت ہو جاتی تو سب لوگ چلے جاتے، صرف چند آدمی رہ جاتے تھے، جن میں ایک شخص تھا جو ایسی باتیں کرتا تھا کہ دوسروں کی منہ سے میں نے نہیں سنی۔ میری دل میں اس کی محبت پیدا ہوگئی۔ ایک بار کئی روز تک میں نے اس کو حلقہ میں نہ دیکھا، اپنی ساتھیوں سے پوچھا کہ »فلاں شخص اس اس صفت کا جو ہماری جماعت میں شریک تھا وہ کہاں ہے؟« ایک نے کہا کہ »میں جانتا ہوں، اس کا نام اویس ہے۔« میں نے کہا کہ »تم اسکی منزل سے بھی واقف ہو؟« کہا »ہاں۔« میں اسکی ساتھ گیا، حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ اندر سے نکلی میں نے کہا کہ »برادر آپ کیوں نہیں حلقہ میں آئی؟« بولی کہ »میری پاس کبڑی نہیں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کی ساتھی انپر آوازہ کرتی اور ان کا مذاق اڑاتی تھی۔ میں نے ان کو اپنی چادر دی اور کہا اسکو پہن لو جواب دیا کہ »میری ساتھی جب اسکو میری بدن پر دیکھیں گی تو ہنسی اڑائیں گی اور ستائیں گی۔« میں نے اصرار کر کے وہ چادر ان کو دیدی، جب وہ نکلی تو انکی رفیق ہنسی اور کہا کہ »آج یہ چادر تم سے کہاں سے اڑائی ہے؟« انھوں نے آکر اسکو اتار دیا اور کہا کہ »تم نے دیکھا نہ لیا۔« میں نے جا کر ان لوگوں کو سختی کی ساتھ ڈانٹا اور کہا

کہ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ انسان کبھی برہنہ رہتا ہی کبھی کبھری پہنتا ہی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی درمیان میں کوفہ سی ایک وفد حضرت عمر ؓ کی خدمت میں گیا جس میں ایک شخص ان لوگوں میں سے بھی شامل تھا جو اویس سے نمسخر کرتے تھے حضرت عمرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی قرن کا باشندہ ہے؟“ وہ شخص جا کر سامنے کھڑا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک شخص تمہاری پاس یمن سے آئی گا، وہاں اسکی ماں کی سوا اور کوئی اسکا نہ ہوگا اس کا نام ہی ”اویس“۔ اسکی بدن میں سفید داغ تھے۔ اللہ سے اسنی دعا کی کہ ان کو دور کر دیں چنانچہ وہ جاتی رہی، صرف ایک درہم کی برابر داغ باقی رہ گیا ہی سو تم میں سے جو کوئی اس سے ملی اپنی مغفرت کی دعا کرائی۔“

حضرت عمرؓ نے کہا کہ ”جب وہ شخص آیا میں نے اس سے پوچھا کہ ”کہان گھر ہے؟“ بولا ”یمن“، پوچھا ”نام کیا ہے؟“ کہا ”اویس“، دریافت کیا کہ ”وطن میں کسکو چھوڑا؟“ جواب دیا ”صرف اپنی ماں کو“، پوچھا کہ ”کیا تمہاری جسم میں سفید داغ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا سے دور کر دیا؟“ بولا کہ ”ہاں“، میں نے کہا کہ ”میری لٹی مغفرت کی دعا کرو“ اسی پہلی کہا کہ ”مجھے جیسا شخص آپ جیسی بزرگ اور امیر المومنین کیلئے مغفرت کا طالب ہو؟“ پھر میری لٹی مغفرت کی دعا کی۔ میں نے کہا کہ ”تم میری بھائی ہو، میرا ساتھ نہ چھوڑنا لیکن وہ غائب ہو گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہاری ساتھ کوفہ میں ہے۔“ یہ سنکر وہ شخص جو اویس کی ہنسی اڑاتا تھا امیر المومنین سے کہنے لگا کہ ”ہم میں تو ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔“ انہوں نے فرمایا ”ضرور ہے“ اسنی جواب دیا کہ ”ہاں ایک آدمی اس نام کا ہے، لیکن اس سے ہم مذاق کرتے رہتے ہیں۔“ امیر المومنین نے فرمایا کہ ”اس سے ملنا“ مگر مجھے امید نہیں کہ تم اس کو پاؤ گی۔“

جب وہ شخص کوفہ میں واپس آیا اپنی گھر میں جاتی سے پہلی اویس کی پاس حاضر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ”یہ تو تمہارا دستور نہ تھا“ بولا کہ ”میں

فی امیر المؤمنین سی تمھاری نسبت ایسی ایسی باتیں سنیں اب تم میری لٹی مغفرت کی دعا کرو۔“ اویس فی کہا کہ ”بشرطیکہ تم میری ساتھ مسخر چھوڑ دو اور جو کچھ حضرت عمر سی سنکر آئی ہو اسکا کسی سی تذکرہ نہ کرو۔“ پھر اسکی واسطی استغفار کیا۔

اسیر بن جابر کہتی ہیں کہ اسکی بعد کوفہ مین شہرت ہو گئی۔ مین انکی پاس گیا اور کہا کہ ”یہ کیسی عجیب و غریب باتیں تمھاری نسبت مشہور ہو رہی ہیں؟“ بولی کہ ”میری طرف سی تو کوئی بات پھیلائی نہیں گئی ہی ہر شخص کو اسکی عمل کا بدلہ ملیگا۔“ پھر وہ غائب ہو گئی۔ دوسری سال اشرف کوفہ مین سی ایک شخص حج کی موقعہ پر حضرت عمر سی ملا۔ انھوں فی اس سی اویس کی بابت پوچھا۔ کہا کہ ”مین فی انکو اس حال مین چھوڑا تھا کہ انکی پاس کچھ نہ تھا اور وہ بالکل بی مایہ تھی۔“ حضرت عمر فی وہی باتیں جو اس سی پہلی لکھی گئی ہیں بیان فرمائیں اور اس شخص کو ترغیب دلائی کہ ان سی مغفرت کی دعا کرائی۔ جب وہ واپس آیا تو اویس سی مغفرت کی دعا کا طالب ہوا۔ انھوں فی کہا کہ ”تم ایک متبرک سفر سی واپس آئی ہو، حق تمھارا ہی کہ دعا کرو۔“ پھر اس سی پوچھا کہ ”کیا تم عمر سی ملی تھی؟“ اسی کہا ”ہاں“ اس پر حضرت عمر کی لٹی بھی مغفرت کی دعا کی اور اسکی واسطی بھی لوگوں مین اسکا چرچا ہونی لگا، اسوجہ سی وہ کوفہ سی چلی گئی۔

ایک بار قبیلہ مراد کا ایک شخص انکی پاس آیا۔ پوچھا کہ ”اویس کیا حال ہی؟“ بولی کہ ”اس شخص کا کیا حال پوچھتی ہو کہ جو صبح ہوتی ہی تو شام کی امید نہیں رکھتا اور شام ہوتی ہی تو صبح کی۔ موت کی یاد مومن کی دل مین کوئی خوشی نہیں چھوڑتی اور حقوق اللہ کی معرفت سی کوئی درہم و دینار اسکی پاس نہیں رہتا اور اسکی احکام پر قائم رہنی سی کوئی دوست بھی باقی نہیں رہ جاتا“ کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سی لوگ ہمکو اپنا دشمن سمجھتی لگتی ہیں اور نافرمان بندی انکی مدد پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اسی کی بدولت بڑی بڑی تہمتیں انھوں فی مجھہ

پر لکائین لیکن پھر بھی میں امر الہی کی بجا آوری سی باز رہی والا آدمی نہیں ہوں۔

ابن زید کہتی ہیں کہ اویس کی عبادت بھی غیر معمولی تھی۔ کبھی کہتی کہ یہ سجدہ کی رات ہی اور تمام شب سجدہ گزار دیتی اور کبھی کہتی رکوع کی رات ہی اور تمام رات رکوع میں رہتی۔ ہر شام کو جو کچھ کھانا یا کپڑا انکی گھر میں بچتا صدقہ کر دیتی پھر کہتی کہ ای اللہ اگر کوئی بھوکا مری یا تنگ رہی مجھے پر اسکا مواخذہ نہیں۔

مغیرہ کہتی ہیں کہ اویس قرنی اپنی کپڑوں کو خیرات کر دیا کرتی تھی یہاں تک کہ اپنی حجرہ میں برہنہ بیٹھی رہتی تھی اور کوئی کپڑا انکی پاس نہیں بچتا تھا جس کو پہنکر جمعہ شریک ہو سکیں۔

حلیۃ الاولیاء میں یہ مرفوع روایت بھی درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی فرمایا کہ ”میری امت میں ایسی لوگ ہیں جو عریانی کی وجہ سے مسجد میں نہیں آسکتی بوجہ اسکی کہ وہ فقرا کی سوال پر اپنی کپڑی بخش دیتی ہیں ان میں سے اویس قرنی اور فرات بن حباب ہیں۔

ہرم بن حبان بیان کرتی ہیں کہ ”جب میں کوفہ میں پہونچا تو میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اویس سے ملوں۔ تلاش کرتی ہوئی فرات کی کناری گیا۔ دیکھا کہ اپنی کپڑی دھو رہی ہیں میں نے علامات سے پہچان لیا۔ چہرہ گندم گون، گھنی داڑھی، رعب دار صورت، سلام کیا اور ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے مصافحہ سے انکار کیا۔ مجھے انکا حال زار دیکھ کر رونا آ گیا۔ پوچھا کہ ”ای اویس تمہارا کیا حال ہے؟“ کہا کہ ”ای ہرم تمکو میرا نام کس نے بتایا؟“ میں نے کہا ”اللہ نے۔ اور آپنی مجھے کیسی پہچان لیا، کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی شناسائی نہ تھی“ بولی کہ ”میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا اور میری جان تمہاری جان سے ہمکلام ہوئی جسم کی طرح روح میں بھی جان ہے اور مومنین روح الہی کی وسیلہ سے باہم آشنائی رکھتی ہیں گو انکی درمیان بعد مکان اور دوری منزل حائل ہو۔“



پھر مین فی کہا کہ »نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرو، تاکہ مین اسکو یاد رکھوں۔« فرمایا کہ »مجھے دیدار نصیب نہیں ہوا، ہاں ان لوگوں سی ملا جو آپکی صحبت میں بیٹھی تھی اور انکی توسط سی وہ حدیثیں بھی سنیں جو تم لوگ سنتی ہو۔ لیکن مین محدث نہیں اور نہ قاضی مفتی بننا چاہتا۔ مجھے میری نفس کا شغل ہی بہت ہی۔«

مین فی کہا »تو پھر کتاب اللہ کی کوئی آیت ہی سنائی اور کچھ وصیت فرمائی۔« انھوں فی میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرات کی کناری چلی اور کہا کہ »میری رب کا قول ہی اور اسی کا قول حق ہی۔ میری رب کی حدیث ہی اور اسی کی حدیث سچی ہی۔ میری رب کا کلام ہی اور اسی کا کلام بہتر ہی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ان یوم الفصل میقاتہم اجمعین۔« یہ پڑھ کر اس طرح روئی کہ مجھکو کان ہوا کہ انکو غشی آگئی، پھر انھوں فی اسکی آگئی کی آیت پڑھی اور میری طرف دیکھا اور کہا کہ »ای ہرم! تیرا باپ مر گیا اور تو بھی عنقریب مرے گا، پھر جنت مین جائیگا یا دوزخ مین۔ آدم بھی مر گئی، حوا بھی مر گئیں۔ ابراہیم خلد الرحمن ہو، موسیٰ بھی، اور محمد بھی سب پر اللہ کی سلامتی ہو۔ ابونکر خلیفۃ المسلمین بھی مر گئی اور میری بھائی میری دوست اور یار حضرت عمر بھی۔ ہائی عمر! ہائی عمر! ہائی عمر!«

ہرم کہتی ہین کہ یہ حضرت عمر کی خلافت کا آخری زمانہ تھا۔ مین فی کہا کہ »وہ تو نہیں مری ہین بلکہ زندہ ہین۔« کہا کہ »نہیں مر گئی۔ اللہ فی انکی موت کی خبر مجھکو دیدی۔« پھر انھوں فی دعا کی، اسکی بعد فرمائی لگی »ای ہرم! مین تمکو کتاب اللہ کی وصیت کرتا ہوں اور موت کو یاد دلانا ہوں۔ اسی کبھی نہ بھولنا۔ جب واپس جانا تو اپنی قوم کو بھی سکھانا اور اپنی جان پر زحمت اٹھائی مین دریغ نہ کرنا۔ جماعت کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ دین ہاتھ سی جاتا رہیگا« اور تمھیں خبر بھی نہ ہوگی، اور جب تم مروگی تو قیامت کی دن دوزخ مین جانا ہوگا۔ پھر منہ اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ »ای اللہ! اسکا خیال یہ ہی کہ یہ میری ساتھ خالص تیری لٹی محبت رکھتا ہی اور اسی وجہ سی ملنی آیا ہی اسکو جنت مین داخل کرنا کہ وہاں

بھی میری زیارت کو آئی۔ اسکو تھوڑی دنیا پر رضامند رکھنا اور عافیت دینا اور نعمتوں کا شکر گزار بنانا۔ اے ہرم اللہ حافظ۔ آج کی بعد پورمیں تم کو نہ دیکھوں کہ تم میری جستجو میں ہو نہ میری بابت کسی سی سوال کرنا۔ میں تمکو یاد رکھوں گا اور انشاء اللہ تمہاری حق میں دعا کرتا رہوں گا۔ یہ کھکر وہ میرا ساتھ چھوڑ کر ایک طرف نکل گئی۔ اسوقت سی پھر نہ میں فی ان کو دیکھا نہ ان کی خبر سی۔<sup>۱</sup>

حافظ ابو نعیم عبد اللہ بن سلمہ کی روایت لکھتی ہیں کہ حضرت عمر کی عہد میں ہم آذربائیجان کی جنگ میں گئی تھی، اویس بھی ساتھ تھے۔ واپسی میں بیمار ہوئی ہم فی انکو سواری پر اٹھا لیا۔ آخر وہ گذر گئی۔ جہاں ان کی نعش اتاری وہاں دیکھا کہ ایک قبر کھدی ہوئی سی اور پانی اور حنوط موجود سی۔ بہلا کر نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔ جب آ کی بڑھی تو خیال کیا کہ ان کی قبر پر کوئی نشان بنا دین، پلک کر آئی تو نہ وہاں قبر تھی نہ اسکا کوئی اثر<sup>۲</sup>۔ اسی کی مدد وہ ایک دوسری روایت لکھتی ہیں کہ اویس جنگ سفین میں موجود تھی۔

امام ذہبی بھی فضیل بن عیاض سی نقل کرتی ہیں کہ حضرت عمر فی جب کہ وہ مقام منا میں منبر پر تھے اہل بمن کو پکارا۔ وہ لوگ جا کر سامنی کھڑی ہوئی۔ پوچھا کہ «کیا تم میں کوئی شخص اویس نامی سی؟» ایک فی جواب دیا کہ «ایک دیوانہ شخص اس نام کا سی حو صحرا اور بیابان میں پڑا پھرتا سی۔ کہا کہ «میں اسی کو پوچھتا ہوں» جب تم واپس جانا تو اسکو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور میری طرف سی سلام پہونچا دینا۔» جب ان لوگوں فی جا کر اویس کو سلام پہنچایا تو انھوں فی کہا کہ «امیر المومنین فی میری تشہیر کردی» اسکی بعد غائب ہو گئی۔ حضرت علی کی عہد میں

۱ حلیۃ الاولیاء جلد اول قلمی صفحہ ۲۶۰

۲ میزان الاعتدال میں امام ذہبی فی بھی ایک روایت لکھی سی کہ اویس سی غزوۃ آذربائیجان میں انتقال فرمایا اور ان کی ہمراہی ان کی قبر کھودنی کی لٹی ٹوٹی بڑنی تھی۔ اس بیان سی یہ معلوم ہوتا سی کہ مسلمانوں فی قبر کھودی تھی نہ کہ جنوں یا فرشتوں فی۔

ظاہر ہوئی اور جنگ صفین میں ان کی ساتھ شرکت کی اور اسی میں شہید ہوئی۔ دیکھا گیا تو جسم پر چالیس سی زیادہ زخم تھے۔<sup>۱</sup>

ابن سعد فی طبقات میں لکھا ہے کہ اویس ثقہ ہیں گو ان سی کوئی حدیث مروی نہیں، لیکن امام بخاری فی اپنی تاریخ میں اویس کو باصطلاح محدثین "فی اسنادہ نظر" کہہ کر مجروح کیا ہے۔ اس پر امام ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتی ہیں کہ اویس فی تو کوئی روایت ہی نہیں کی ہے جو انکی ثقہ یا غیر ثقہ ہونی کی بحث اٹھائی جائی، اگر امام بخاری فی ان کو صغفاء میں بہ لکھا ہوتا تو میں قطعاً ان کا ذکر ہی نہ کرتا کیونکہ وہ اولیاء صادقین سی ہیں۔<sup>۲</sup>

مگر حقیقت یہ ہے کہ بخاری جیسی عظیم الشان امام کی نسبت بہ خیال کرنا کہ بلا روایت کی وہ اویس کو معرض جرح و تعدیل میں لائی ہیں بدگمانی ہے۔ یقیناً ان کی مرویات ان کو پہنچتی ہونگی خود حافظ ابوسعیم فی حلیۃ الاولیاء میں اویس کی روایت سی ایک حدیث نقل کی ہے۔

بعض لوگ ابراہیم بن ادم کی طرح اویس کی وجود کی بھی منکر ہیں، کیونکہ ان کی قوم مراد سی جب اویس کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں فی اپنی قبیلہ میں کسی ایسی شخص کی وجود سی انکار کیا۔ امام ابواسحاق اور عمرو بن مرة سی بھی جب دریافت کیا گیا تو انھوں فی کہا کہ ہم اویس کو نہیں جانتی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی انکی وجود کی منکر تھی اور فرمانی تھی کہ ایسا کوئی شخص نہیں گذرا ہے

امام ذہبی لکھتی ہیں کہ اویس کی اس قدر شہرت ہے کہ ان کی وجود میں شک کی گنجائش نہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ علم عدم علم پر مرجح ہے ممکن ہے کہ ان منکرین کو ان کی بابت علم نہ پہنچا ہو۔

۱ صحاح کرام میں سی حضرت عتار بن یاسر حکمی نسبت بی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشہ گوئی "قتلہ الفتنۃ الباقیہ" حدیث میں وارد ہے۔ حاکم صفیہ میں حضرت علی کی ساتھ تھی۔ اب بروایت زید بن علی اس حدیث سی ثابت ہوا کہ تابعین کی محتاج اور ولی کامل حضرت اویس بھی شریک تھی۔ جنکی وجہ سی بعض حق پسند شامی کوفون میں آکر شامل ہو گئی تھی۔

۲ میزان الاعتدال میں انھیں لوگوں کا تذکرہ ہے جنہر کسی نہ کسی حیثیت سی جرح وارد ہوئی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر روایات جو اویس کی متعلق مذکور ہوئیں  
 بوجہ ضعف یا مجہولیت رواۃ کی غیر موثق ہیں، اور درایتاً مجہولیت اور اختلاق  
 کی آثار ان پر اس قدر ہویدا ہیں کہ کسی برہان یا حجت کی حاجت نہیں۔  
 صرف اسیر بن جابر والی روایت اصولاً قوی ہے، کیونکہ تین طرق سے صحیح مسلم  
 میں مروی ہے، لیکن ائمہ حدیث میں اسکا نام ہی محل بحث ہے کہ  
 اسیر ہی یا یسیر اور ابن جابر ہی یا ابن عمرو، پھر امام ابن حزم فی تصریح کی  
 کہ وہ قوی راوی نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں امام مالک کا انکار کچھ معنی  
 رکھتا ہے، خاصکر اسوقت جبکہ خود اویس کی قوم بھی انکاری ہے۔  
 صوفیوں میں انک فرقہ اویسیہ تھا جو حضرت اویس کی طرح نبوت کی  
 بلا واسطہ فیض حاصل کرنی کا مدعی تھا۔ اکثر اس میں صاحب حال ہوتی تھی  
 جو وجد میں رقص کرتی تھی، مگر تھوڑی ہی مدت میں یہ طائفہ ختم ہو گیا  
 اور آ کی یہ بڑھا۔

## ◀ لاهور کی ملاقاتیں ▶

میری استاد مسو لوئی مسیون پروفیسر کالج دی فرانس فی "لاهور کی ملاقاتیں" کی عنوان سی شہزادہ دارا شکوہ اور بابا لعل داس کبیر پنٹھی کی دلچسپ مکالمہ شائع کئی ہیں۔ داراشکوہ کو صوفیوں اور سنیا سیوں سی ملنی کا بہت شوق تھا۔ سنہ ۱۶۵۳ ع میں جب لاهور گیا تو بابا جی سی ملنی گیا اور اپنی چند شکوک رفع کرنی کی درخواست کی، چنانچہ ان مکالموں کا بیشتر حصہ انہیں ما بعد الطبعی مسائل اور مذہبی شکوک کی بیان پر مشتمل ہی۔ باتیں ہندوستانی زبان میں ہوئیں، بعد میں اسکی منشی چندر بھان پشالوی فی انہیں قلمبند کر کی فارسی ترجمہ کیا۔

دارا شکوہ کی شخصیت اسلامی ہند کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہی۔ وہ اور اسکا بھائی "برادر نا مہریان" اورنگ زیب ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کی دو مخصوص رجحانوں کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آتی ہی انکی "قومی" زندگی دو مختلف رجحانوں میں بٹ گئی۔ ایک کا منشاء، کیا بلحاظ انکی عقائد و معاشرت اور کیا بلحاظ ان کی فن و ادب کی انہیں ان کی اصلیت یعنی ٹھیک ہندیت کی طرف مائل کرتا تھا، اور دوسری کی غرض یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں بیگانوں کی طرح رہیں اور مذہبی اصطلاحوں کی آڑ میں اپنی قومی وجود سی چشم پوشی کرنی رہیں۔ سب سی پہلی صوفیائی کرام فی ہندوستان کی مسلمانوں کی زندگی کی مخصوص حالات کو محسوس کیا اور اپنی روادارانہ رویہ سی ان کی رجعت پسندانہ کمزیر کی روک تھام کرنی رہی۔ ساتھ ساتھ ہندو شائستگی و تہذیب سی خوشہ چینی میں بھی انہوں فی کوئی تامل نہیں کیا۔ اکبر اور اس کی مشیروں فی اس رجحان کی ہمدردانہ سرکاری پشت و پناہی کی اور اسی

ایک مستقل تحریک بنا دیا۔ داراشکوہ اسلامی ہند کی اس تحریک کا آخری نمائندہ ہی۔ اسکی اور اورنگ زیب کی تخت نشینی کی بعد مذہب اور سیاست دونوں ہی رجعت پسندانہ رویہ اختیار کیا اور اس کی بعد سلطنت مغلیہ کی زوال اور اجنبی حکومت کی قیام فی مسلمانوں کی قومی زندگی کا توازن رہا سہا جو کچھ تھا وہ بھی نگاڑ دیا۔

بابا لعل داس کی شخصیت بھی دلچسپی سی خالی نہیں۔ یہ کبیر پنتھی ہیں، اور دارا شکوہ کی طرح یہ بھی ایک مخصوص تحریک کی حامی ہیں۔ کبیر داس ویشنوی اصلاح کی تحریک کا حامی دار تھا۔ اس تحریک کی بنیادیں بھگتی کی فلسفہ پر قائم ہیں لیکن جیسا کہ خود کبیر داس کی کلام سی ظاہر ہی ان کی خیالات بڑی حد تک اسلامی اصول کی رہین منت ہیں۔ غرض کہ اس مکالمہ کی دونوں شخصیتیں ایک خاص اہمیت اور دلچسپی رکھتی ہیں۔

یوسف۔

یہ متن بڑی حد تک نسخہ الف (نادرالذکات) اسکفورڈ بوڈلین ۱۲۴۱، تقسم اوسکی فارسی، فولیو ۱۵۳ ب، ۱۴۵ الف) پر مبنی ہی، دوسری نسخی جنسی مقابلہ کر کی بعض جگہ اضافہ کیا گیا ہی یہ ہیں: ب (انتخاب، لندن برنس میوزیم ۱۸۴۰۴-۱۸۴۸-۲۴۸-۲۵۹) اور د (برلن ۱۰۸۱-۱۰۸۲ اسپرنگر ۱۶۵۹-۱۶۷۰-۱۷۶ ب-۱۸۳ الف)۔

لکھنؤ کی ایک نسخہ مین اور نسخوں سی اتنی عبارت آخر مین اور زیادہ ہی: 'بسملہ' سوالات دارا شکوہ شاہزادہ جواب گوسائین بابا لال ساکن کیتل معراں رائی چندر بہان برہمن منشی شاہزادہ، سہ سہ روز دو مجلس شدہ و سابق رائی جادو داس در بیان خاص نوشتہ بودند درینولا بعد فتح قندھار باز اتفاق افتاد۔'

لوئی میسون

گوشه<sup>۱</sup> بابا لعل و شاهزاده والا کهر دارا شکوه در دارالسلطنت لاهور مجلس شده بود جواب سوال نوشته شد<sup>۲</sup>

جواب سوال دارا شکوه هر که بخواند حقایق دنیا معلوم گردد با فقیر صاحب حال در بیان تحقیق بعضی مطالب حقیقت آیندی؟

(۱) سوال عزیز آنکه در ناد و بید چگونه فرق توان کرد؟

جواب کامل آنکه چنانچه پادشاه و حکم پادشاه بمعنی ناد و حکم بمعنی بیداست.

(۲) سوال عزیز آنکه در ماهتاب روشنی چیست و سیاهی کیست و سفیدی [از] ۳ چه باشد؟

جواب کامل آنکه ماهتاب بکلی در ذات خود شعاعی ندارد يك چیز معض صاف است که شعاع آفتاب درو می تابد و سفیدی عکس دریاست و سیاهی عکس زمین است.

(۳) باز عزیز می گوید که اگر عکس باشد چرا در آفتاب نمی نماید؟ باز کامل می فرماید که آفتاب مجموعه مثل آتش است و ماهتاب مجموعه آب عکس در آب می پذیرد نه در آتش.

(۴) سوال عزیز آنکه هرگاه بنده بندگی بکند قبول و ناقبول چه طور دانسته شود؟

جواب کامل آنکه که اگر ریاضت کنند مر خود مغرور شود و بگوید که ریاضت من خوب نشده است باید دانست که چیزی کرده باشد و شخصی که ریاضت کند و بر خود اعتبار گیرد و غرور کند و بگوید که من ریاضت خوب کرده ام باید دانست که کرده او در پیش است<sup>۴</sup> بر منظور قبول نیفتاده.

(۱) نسخه (الف) مین «گوشت» می. کوسائین یا گوشه گیر.

(۲) نسخه (د) مین به عبارت اور زیاده می، «آرا اهل فراست چندر بهان برهن از زبان هندوی بلسان فارسی نمود»

(۳) نسخه (ب)

(۴) نسخه (ب) مین «اوست» می.

(۵) سوال عزیز آنکه فقیر را با قید از چه رهگذر توان گفت؟  
جواب کامل آنکه وجود از خوردن و نوشیدن و دیدن و شنیدن و خواب کردن عادت دارد در قید اوست، هر که پائی بند این قسم چیزها شود و محتاج اینها نباشد و بی اینها بفرغ بگذراند بی قید است.

(۶) سوال عزیز که مت پرستی در عالم هند چیست و فرموده کیست؟  
جواب کامل که این معنی را برائی استحکام دل مقرر کرده اند، شخصی که از معنی خبردار باشد در صورت از این معنی معذور است که هرگاه که از باطن آگاه نیست در صورت وابسته صورت است. چنانچه دختران با کنخدا بصورت [لعبت]<sup>۱</sup> بازی دارند بعد از آن که کنخدا شدند همان کار نمی کنند، این کار قسم بت پرستی است تا آنکه از باطن آگاه نیست در صورت هرگاه که از باطن آگاهی یافت از صورت خواهد شتافت.

(۷) سوال عزیز آنکه طریقه اهل عالم از خوردن و نوشیدن و دیدن و شنیدن و خواب کردن و جمیع اعضا بکار بردن قوائی عنصر یافتن است صافی نهادن نیز اگرچه موافق این جماعه هستند اما کم و زیاده بکار می برند. پس فرق در طریقه عالم و صافی نهادن چه فرق توان گفت؟

جواب کامل آنکه کار با دل است صافی نهادن نگهبانی دل دارند و عالم از دست بریاد داده است چنانچه طفل و جوان در خوردن و نوشیدن و دیدن و شنیدن و خواب کردن برابر اند اما طفل را اگر زن بیگانه در بغل گیرد عیبی نیست جوان بیگانه اگر نگاه کند صد عیب دامنگیر او می شود. همچنان صافی نهادن مانند طفلان می گذرانند و عالم در طریقه عالمان است.

(۸) سوال عزیز آنکه که بعضی می گویند پیر من خس است اعتقاد من بس است.

جواب کامل که این حرف (نقیصه<sup>۲</sup> تماق دارد)<sup>۳</sup> عالم غلط فهمیده است

(۱) نسخه (ب) مین لفظ « لعبت » موحود نہیں.

(۲) مسبو هوار کی رائی می که یہ لفظ « قصه » می،

(۳) نسخه (ب) مین موجود هیست.



هرگاه پیر خسی خواهد بود مرید بمراد از کجا خواهد رسید؛ چنانچه عورت با مرد صحبت خواهد داشت اطفال هم خواهد رسانید و اگر با خواجه سرائی و ار قسم دیگر الفت داشته باشد محروم است؛ «او خویشان کم است کرا رهبری کند.» (۹) سوال عزیز که مرید [تا] <sup>۱</sup> در خدمت پیری بهره مند است و طبع

در خلاف می ورزد بعد از آن که خدمت پیری رسد فائق گردد؛ از چه رهگذر؟ جواب کامل که چنانچه عورت نآید خدا از هیچ یکی شرم نه دارد بی محابا جانب هر کس نگاه می کند. هنگامی که کد خدا شده و صحبت مرد یافت برقع شرم برو غالب آمد و سرنگون شد.

(۱۰) سوال عزیز که مرشد باستصواب <sup>۲</sup> مرید خود می کند به نسبت مریدی همه مریدان خود را برابری داند؛ بعضی از آن بسخن مرشد کامل به نشاء معرفت الهی رسیده بهره ور می شوند؛ بعضی محروم و مرشد کامل را بهیچ دوی در میان نیست مریدان همه برابرند. چون فرق در افتاد؟

جواب کامل آنکه مریدی که باعتقاد باطن خدمت پیر می کند و شد یعنی سخن مرشد را از خلوص اعتماد و راستی بر لوح دل نقش کرده مطابق امر بجا می آرد؛ باندک زمانی کشتی مقصود او بساحل مراد می رسد. آیات:

راستی آور که شوی رستگار راستی از تو ظفر ار کرد گار  
از کجافتی کم و کاستی از همه غم رستی اگر راستی  
و آنکه بر سخن مرشد قایم و ثابت می باشد و مائل خواهشهایی نفس  
بوالفضل شده بخواهشهایی می پردازد؛ محروم می نماید. <sup>۳</sup>  
مصرعه:

«در پیام راست بآید گر بود مشیر کج.»

دوهره <sup>۱</sup>

جنکی اتر با سنا بهجن دهری به دهیان تن کون گویند نامی انت هوت هی هان <sup>۴</sup>

- ۱ سجع (ب) مین می.
  - ۲ سجع (ب) اور (د) مین لفظ «با ستر صائی» می.
  - ۳ سجع (ب) مین «می ماند» می.
  - ۴ سجع (ب) مین به دوهره موجود بهوت سجع (ی) مین یون می.
- جهکی اتر یا سنا تاهی دهری دهیان تهکو گویند نامیت اتر هوت هی هان

مثل دیگر آنکه «دو کج ریسپان نمی بافتد» هرگاه اهل باف دو کج را پیش آهنگری برد، باندک ضرب نیکو راست می کند. «همان دستور ریسپان می بافتد» همان قسم مرید و مرشد است، اگر مرید خود را بمرشدی سپارد کجی یعنی گمراهی بضرب سخت دور نموده. بمراد می رساند، رباعی:

تا نیست نگردي ره هستت نه دهند    این مرتبه در همت پستت ندهند  
چون شمع کداختن اگر تن ندهی    سر رشته روشنی بدستت ندهند  
(۱۱) سوال عزیز آنکه در خالق و خالق چه فرق توان کرد، نیز از شخصی پرسیده بودم او در جواب اظهار ساخته که چنانچه درخت است و تخم درخت. اما همچنان است یا چه طور؟

جواب کامل که خالق مانند دریا و خلق کوزه آب، اگرچه در و آب یکدست در آبدان تفاوت کمال دارد. همچنان خالق خلق است و خلق خلق.  
(۱۲) سوال عزیز آنکه پیم آنها جیو آنها چگونه باشد و باز پیم آنها چگونه شود؟ جواب کامل آنکه چنانچه از آب شراب شده و هرگاه در زمین ریزد و آلایش (و) مسی و جنب را بر زمین می گذارد و آب خالص در زیر زمین رود باز آب است، همون قسم آدم که جیو آنها باشد، هرگاه آلایش مسی حواس همه وجود گذارد بحق<sup>۲</sup> پیبودد.

(۱۳) سوال عزیز که در آنها و پیم آنها چه تفاوت باشد؟

جواب کامل آنکه هیچ تفاوت نیست.

سوال عزیز که [اگر تفاوت نیست<sup>۳</sup>] پس در صورت [ثواب و<sup>۴</sup>] عذاب چون در آید؟

جواب کامل که تاثیر قلب است چنانچه کنگ و آب کنگ.

۱۵ باز عزیز می گوید که درین چه تفاوت توان کرد؟

کامل می گوید تفاوت بسیار است و از حد بی شمار چرا که آب کنگ

(۱) نسخه (ب) مین موجودنپین.

(۲) نسخه (ب) مین «بهرماتان» می.

(۳) نسخه (س) مین می.

(۴) نسخه (س) مین می.

اگر در کوزه در آید و بلك قطره شراب در وقت حکم شراب دارد و اگر در کنگ صد هزار کوزه شراب افتد همه کنگ است درین صورت پر آتما خلص است و مخلص آتما در تقید وجود هرگاه وجود گذارد پر آتما می شود و تا در وجود است آتماست.

(۱۶) سوال عزیز آتما که جوکیش را عبارت از فقیر کامل است کجا توان دانست؟

جواب کامل آنکه در جائیکه آغاز نشاء خواب و بیداری نداند چگونه که<sup>۱</sup> تمام عالم را خواب می گیرد اما از هنگام آغاز آن واقف است که در چه وقت گرفته و قتیکه این حالت روئی دهد و بداند سده توان دانست.  
(۱۷) سوال عزیز آنکه تریا [اوشها]<sup>۲</sup> که [عبارت از]<sup>۳</sup> لاهوت است در کدام جا ظهور دارد؟

جواب کامل سر جادر سده اول مهابور که بعد از کسب کمال مرتبه کشف معنوی دست داده باشد، دوم در طفل، سوم در شراب خور غلطان.  
(۱۸) باز عزیز می گوید که در سده اطهر من الشمس است اما در طفل و شراب خور چگونه اعتماد توان کرد؟

باز کامل می فرماید که<sup>۴</sup> تریا در اصل ارحود گذشتن است و این بهر سه کس می باشد غایب در سده مهابور که حسین سده که بیپوش است در همه جا ظهور دارد و کار می کند و هیچ جائی نیست و در طفل و مخمور برائی، ممل و لعل<sup>۵</sup> دارد و الا خواهشها در و پوشیده اند بعد از خیار یری اید جو کیش همیشه در خمار می ماند اما شب برهم از هر سه واقع است غایب از مهابور که تاثیر می کرد از آنها هم اثر کند اما ندانست قدرت ندارد.

(۱۹) سوال عزیز آنکه در کتب هندوی خبر می دهند که هر کس در

(۱) نسخه (الف) مین «که در» می.

(۲) نسخه (ب) مین می.

(۳) نسخه (ب) مین می.

(۴) نسخه (الف) مین «که در» می.

(۵) نسخه (ب) مین «تیل» می، اور نسخه (د) مین «تیل بمل» می.

کاشی ریخت می کند بیشک مکت می یابد ازین معنی تعجب می آید که احوال زاهد و معصیت کنندۀ مساوی باشد؟

جواب کامل آنکه در اصل کثیف وجود را قرار داده اند هر که در وجود میرد بیشک مکت می یابد.

(۲۰) باز عزیز می گوید که در وجود تمام عالم می میرد پس همه را مکت می شود.

جواب کامل که غیر از مهابور که در وجود هیچ کس نمی میرد و در خواهشها می میرند خواهش از وجود علاحد است خواهش بخواش می رساند از مکت محروم می ماند.

(۲۱) سوال عزیز آنکه در کتب هندوی آگاه نموده اند که اوتار برائی رفع فسادان و قطع ظالمان و محافظت صافی نهادان و استحکام حق پرستی می شود، خصوصاً درست جگ تمام صواب بود و در تریا جگ سه حصه صواب و یک حصه عذاب و در دواپر جگ قرار بالمناصفه و در کاجک یک حصه صواب و سه حصه عذاب. در آخر دواپر جگ که اوتار سری کشن صد واقع شده محقق<sup>۱</sup> برائی منافع آدمیان و عالمیان و رافع ظالمان و نگاه بانی صافی نهادان وارد گشته و صافی نهادان که سابق بر عالم بودند آنها را همراه برده و طریق عالم براسق نمانده چنان خیال بر چه توان کرد؟ جواب کامل که اوتار محض برائی این می شود که طریقه جگ گذشته ازو منسوخ سازد و آینده دور حال را استحکام دهد محافظت صافی نهادان در صورتی بود که همراه بودند طریقه عالم که مرتبه چهارم آخریست موافق همان برین نشود.

(۲۲) سوال عزیز آنکه صافی نهادان در مقام کجا می نمایند و در عالم کجا؟

جواب کامل آنکه صافی نهادان در مقام جبروت که بسکھویت است استقامت

(۱) مسبو هوار کی رائی می «محقق» کی بجائی «معنی» زیرا که موزون می.

می‌ورزند عالم در [ناسوت که]<sup>۱</sup> بی‌هوش است از بیداری و خواب محروم است و از جبروت هم محروم پس شخصی که به بیداری هوشیار است در خواب همان روبکار و آنکه در بیداری غفلت و زند در خواب همان دیدار.

(۲۳) باز عزیز می‌گوید هرگاه عالم در بیهوشی رفته یعنی در خواب و خراب که بعد از بیداری یقین می‌شود چه توان دانست؟

جواب کامل که در خواب جمال و جلال که سائنک و راجس و تامس باشد جائی دارند؛ پس هرچه که راجس و تامس ظهور می‌ابجامد باطل است و آنچه که سائنک می‌پذیرد در بیداری ظاهر.

(۲۴) سوال عزیز آنکه جوگیش را از ممر خواش تبدیل مکان که در معنی اوتار باشد دست می‌دهد. جوگی کمال والی سلطنت عظیم می‌شود؛ چون در جائیکه ریاضت جوگیست اصلا دشت در میان نیست و بعد از آن که در صورت سلاطین می‌شود تدبیر او بندوبست کردن و کشتن در میان می‌آید هرگاه که در آنوقت راه این معنی نبود الحال باین همه از کجا بهم رسند؟

و جواب کامل آنکه فی‌الواقع چنان است اما قیاسی باید کرد و حشمت جنگ و جدل و بیداد برابر جوگی هیچکس ندارد که در معنی روز و شب ما خواش حس روز آورد و هر روز جنگ تازه در میان است در همین آشنائی خواش بیائی دنیای می‌رساند در امور انصاف در هر جا که کذب و دروغ است نا شایسته خواش می‌باید دشمن قوی خود دانسته تدبیر می‌کند.

(۲۵) سوال عزیز آنکه چون ظاهر می‌سازد که در راج جوگ می‌شود چگونه اعتبار توان کرد که راج خالی از مشغله آرایش ترتیب نیست؟

جواب کامل آنکه در راج جوگ بواقعی می‌شود ازین سبب که هرگاه که میل صحبت اهل دنیا باشد چرا که خالص از دنیا جوگ است و قید دین دنیاست پس قیاس باید کرد که ساعتی و لمحه که خواش صحبت اهل الله باشد دنیا را در آن وقت دخل نمی‌شود همه قدر جوگ است.

(۲۶) سوال عزیز آنکه چون ظاهر می‌سازد که اکثر فقیر را خواش

در خاطر است مردم برائی افزونی عزت خود لباس درویشان می آموزد آخر حقیقت اینها ظاهری می شود ازین معنی خاطر نهایت مکدر می گردد ملک می خواهد که احتراز دارد؟

جواب کامل آنکه این راه را هرگز بند نخواهند کرد که اهل الله از همین گذر وارد می شود چنانچه اگر کسی سنگ را از همین ملاحظه جمع می کرده باشد سنگ پارس بدست می افتد و نیز از درویش که از لباسی به مجلس در می آید ایشان صواب عظیم است که هرگاه از آن برآمده مقام خود فرو می رسد مردم خدمت پرستش او بسیاری کنند صواب پیشتر است روزی چند مکرر هم سوال کرد بر جواب حاضر بود از آنجا که گفتار به کردار تعلق دارد بعد از استفسار این مقدمات کامل خاموش ماند. عزیز از پی سوال تنازگی در آمد درس صورت سخن کرد که اگر گفتار را در هر سوال و جواب فی البدیه گفته شود تا کجا شود که در جمع کتب مذکور در میان است دست آخر همان و اکثر در یاش دست غایب تا لذتی هم می رسد ساعتی بر او توقف باید داشت که دل در میان است دست آسودگی گیرد و مزه<sup>۱</sup> برائی خود بهم می رسد و مطالب درآید فائز بهره مند شود. (۲۷) سوال عزیز آنکه طاهرا در کتب را مائین مذکور است هنگامی که سری رام چند لنگ را فتح نمود لشکر سیار از هر طرف به قتل رسید که [از صفا]<sup>۲</sup> بعد از آن که فراغ آن با آب حیات کردید از طفیل آن لشکر رام چند تمام برخاست و زنده شده و لشکر راون که بفنا رفته بود برخاست چه توان گفت والا تاثیر آب حیات است بر هر مرده رسد زنده شود دویم سری رام چند را بیکانگی و بیکانگی با هیچ کس نبود زنده شدن يك طرف و مردن طرف دیگر چه معنی دارد؟

جواب کامل آنکه از آنجا که هنگامه راون شد و لشکر راون روز و شب خیال رام چند داشتند پس فائده آن است به تصور خالص صافی نهادن

(۱) نسخه (د) میث «مزه» کی بجائی لفظ «مسرت» استعمال کیا گیا می.

(۲) نسخه (ب) مین موجود نہیں.

آدم زاد که مکت یابد باز بقید قالب در نمی دهند چرا که در جنگ بکار آمده بودند ازین جهت که خیال رام چند در دل داشتند لشکر را ون مکت یافتند بقید قالب نیامدند.

(۲۸) سوال عزیز آنکه هرگاه راون سینا را بخانه برد ازو چوں محروم ماند؟

جواب کامل آنکه در اصل سینا دهرم بود با دیو سبت نداشت.  
(۲۹) نار عزیز می گوید دیو هر صورتی که خواهد می کند چرا صورت رام چند نکرد؟

جواب کامل که سینا با صورت رام چند الفت داشت ازو عذاب نمی شد هرگاه بصورت اصلی خود در می آید که صورت رام چند می شناخت خاصیت رام چند درو اثر کرد.

(۳۰) سوال عزیز آنکه هرگاه راون سینا را غنا به برده یقین که سینا ازو دهشت سیار خورده باشد چرا راون را از آتش دهرم خود نسوخت.  
جواب کامل آنکه سینا در اصل [صورت دهرم]<sup>۱</sup> است [سقی بودند]<sup>۲</sup> و سانک بود هر چند غصه را طلب می کرد پیش او حاضر نمی شد.

(۳۱) سوال عزیز در کتب هندوی مذکور است که در جگ-ترناده هزار سال عمر آدم بود راجه جستره که نه هزار سال عمر خود را بسر برد باعث آن چه باشد و سری رام که یازده هزار سال عمر خود بکار برده چه موجب شد سینا که یک هزار سال بن باس کرد و اردا ون ناوچه نست بود مگر سری رام چند این قدر قدرت و قوت نداشت که آن را تواند نگاه داشت؟

جواب کامل که راجه جستره را از سبب کشتن سرو نند دعا سراب بود ازین سبب یک هزار سال از عمر خود کمین شده و سری رام چند که یک هزار سال عمر زیاده کسری معتاد جگ-ترنیا بکار برد آن همه عمر پند را

۱ نسخه (د) موت موجود می.

۲ نسخه (ب) مین یون می.

برام چند رسیده بود و در عمر پدرسینا الفت [تلفظ]<sup>۱</sup> داشت برائی همین  
نوماس داده مقدمه [ده سر]<sup>۲</sup> در میان آورده.

(۳۲) سوال عزیز آنکه در مذهب هندوان رسمی است که در برج<sup>۳</sup>  
صورت خاص سری صو و گویان می نمایند ظهور این معنی مناسب هست یا نه؟  
جواب کامل راست کردن آن باهل دنیا مناسب ندارد و چرا که در  
آن صورت خاص اگر نگاه باشد بکار رود در صواب او عذاب می شود  
نفل آوردن آن مردم فقراً که خواهش را در وجود خود سوخته اند و ار  
هیچ وجه دل ایشان حرکت ندارد اگر نکند گنجایش دارد.

(۳۳) سوال عزیز آنکه حال برهم چگونه از همه وجه دل ایشان  
توان گفت<sup>۴</sup>

جواب کامل که ازین معنی در همه جایست معلوم بست که از آنجا که  
می آید آگاه نیست که در کجا استقامت می ورزد صورت ندارد رنگ ندارد  
همه رنگ است چنانچه مثل مهابور که بطفل می دهانند.

(۳۴) سوال عزیز آنکه هرگاه آفرینش از یک قدرت است پس  
استهاور و جنکم تفریق چرا افتاد که آن را استهاور و جنکم بریدوش و هوشیار  
واقع است بعضی بیخودی ازان بالاتر اوتار و برهمن و بشن و مهیش زیاده  
از آن پس درین صورت در آفرینش چون فرق افتاد<sup>۵</sup>

جواب کامل چون استهاور از زمین پیدا می شود و نخم آن زمین است و جنکم  
نخم آب است و آب بر زمین غالب آید اربین معنی جنکم را راستهاور  
زور می پندارد<sup>۶</sup>

(۳۵) باز عزیز می گوید که جنکم هم آدم و هم حیوانات پس آدم بر  
حیوانات چون غالب است<sup>۷</sup>

باز کامل می فرماید که آدم از عالم<sup>۸</sup> عین است و حیوانات از عالم جدید

(۱) نسخه (ب) میث می.

(۲) نسخه (ب) میث «ده سر» کی بجائی «راون» می.

(۳) نسخه (د) مین «متهرا جیولا» می.

(۴) نسخه (ب) مین «علم» می.



که عبارت از بیهوشی است، آدم در جماعت یکدیگر مقابل می باشد، ازین ممر بیهوشی است و حیوانات پیش و پس او از مقابل خلق شده هوش پیوست و این از مقابل پس و پیش بیهوشی گشت که مره باشد ازین جهت آدم بر حیوانات غالب است و استهوار از نغم زمین که جنبش ندارد قایم شده و جنگم چون از آب است و آب همیشه جنبش دارد در گردش است و باز آدم محتاج دیوتها است و آنها از ماد است باز سده غالب آمد سده اونکار روپ<sup>۱</sup> است.

(۳۶) سوال عزیز آنکه فقیر را کله چه باید کرد؟ درین صورت کامل جواب ندارد، بار عزیز در خواست جواب نمود: همین خاموشی. سوال یعنی طالب حرم از حالت نگاه بود گفت که ایشان جواب دادند که پرسید چه گفت؟ خاموشی. (۳۷) سوال عزیز آنکه در توحید و حالت چه فرق است.

جواب کامل آنکه خاموشی را راز حق توحید است و آغاز سخن حال ه طاق گفتاری ماید.

(۳۸) سوال عزیز آنکه دهیان چیست و سهاد چه شد؟ جواب کامل که دهیان گرفتن و سهاد گذاشتن از چه رهگذر که دل مانند آهو صحراست هنگامی که در دامی آید بستان بسیار می کند بعد از قید که از حبس مست می گردد گوشت صحرا تیرا گذاشته ناتوان می شود باز هوشناک از دانه و کاه<sup>۲</sup> چراه گاه گرفته آسوده می کند و از جنگل آسوده تر می شود هوشناک از دانه و کاه خبر د ارد و ریسمن در می گذارد [مراغب عقل را]<sup>۳</sup> نمی گذارد همان قسم دل در گرفتن بیتاب بعد ازین که شتاب می آید در حکم حاضر است پس گرفتن دهیان و گذاشتن سهاد است.

(۳۹) سوال عزیز آنکه بعضی جا اظهار می نماید که در وصال ذات می شود آن وصال چگونه اعتبار توان کرد که ذات میگردد؟

جواب کامل آنکه آهن را در آتش تاب می کنند و قتیکه رنگ آتش گرفت کار آتش می کند.

(۱) نسخه (الف) میت «نکاروپ» می.

(۲) نسخه (د) میت می.

(۳) نسخه (د) میت «و این عقب او» می.

(۴۰) سوال عزیز آنکه دامن عبارت از خیرات باشد، گفته اند که نائده خیرات بهر کس می رسد بعد از آن که شخصی در حین حیات خود خیرات می کند از پائی بند هرگز دارا در قلوب دیگر داخل شود و بعضی چیزها فقیر بآدم تعلق دارد باو چه طور می رسد؟

جواب کامل که در اصل اوقات آدم در سه کون ارادت می کند و اگر آنرا ساتک کرده بساتکی و بر اجس کرده بر اجسی و اگر تامس کرده است تامسی پس در حیوانات ساتک و راجس و تامس چگونه بند است ساتک چیرست که فی سعی بازو و فی محنت و فی گردش باو می رسد و راجس چیرست چنانچه آدم را برائی حیوان نگاه می دارد و تامس چیزست که کوتک رده می خورد.

(۴۱) سوال عزیز آنکه مقرر است که مسلمان را بعد از فوت دفن می کنند و هندو را می سوزند، درویشی که در برقه هندوست هرگاه او فوت می شود آنرا چه می کنند؟

جواب کامل آنکه در اول دفن کردن و سوختن موجود تعلق دارد و درویش از آن متعلق نیست بلکه از وجود خود گذشته در محرنشاء معرفت الهی باشد از هستی در گذشت در نیستی پیوست سربلند گشت آنرا مادیت چنانچه مار پوست خود گنجه را گذاشته در سوراخ در می آید آنرا به پوست تعلق نمی ماند هرچه داند بکند.

(۴۲) سوال عزیز آنکه شخصی می گفت که کم آزار مائی گفتم معنی کم آزار چه باشد گفت اندک آزار گفتم آزار داده باز آزار است چگونه دالسته شود؟

جواب کامل آنکه هر که بر خود بزرگ و زورمند باشد دست آزار برو نمی رسد و آنکه همقران برابر است بشدت او را برش می آید اما شخصی که از خود کم باشد آنرا آزار نباید داد کم آزاری همین است.

(۴۳) سوال عزیز آنکه فعل مختار معبود حقیقی است و نیز مذکور که فعل مختار همان<sup>۱</sup> کامیاب است چه طور اعتبار توان کرد؟

جواب کامل آنکه فعل مختار خدائی عز وجل سلطانه است و موجودات بپر

(۴۴) باز عزیز می گوید که هر دو وجه چه طور یقین شود؟

کامل می فرماید و قتیکه اطفال در رحم مادر بود در آنجا فعل مختار در و پروردگار بود که به جمع وادی در امان داشته پرورش می کرد و در آن هنگام کسی دیگر بود چون اطفال بعرضه ظهور آید نصف فعل مختار همان شد که از راه عنایت و بنده نواری قوت او در پستان مادرش پیدا کرد و نصف همه اطفال چگونه که هرگاه طفل گریه کرد مادرش مطلع شد شیر داد چنانکه کلاں شد و بخواهشهایی نفس الفت گرفت و بر نیک و بد اشتغال و زید در این معنی خود فعل مختار است چرا که الله تعالی از سک و بد منزله است چنانچه معصوم از خواهشهایی معذور است محرم خانه مستورات در آید پستان مادر و غیر آن می مکد احدی بد نمی برد و به الفت شیر می دهد هرگاه جوان شد راه نمی یابد تا که بهوش بود و خواهشهایی نمود نمی از پرداخت آن خدائی تعالی مختار بود چون بهوش آمد خود در نیک و بد اختیار دارد.

(۴۵) الف: سوال عزیز آنکه در کتب فارسی مذکور است که

باز هیچ جنم نیست.

جواب کامل آنکه بر آن مکان کتب چنین مذکور کرده اند فی الواقع آنها را هیچ نست چرا که ایشان از آن سبب که باز در قد تعین آید آنرا برید فارغ شدند پس ایشان را هیچ جنم نیست<sup>۲</sup>.

(۴۵) ب: مذکور است که باز جنم که عبارت از تناسخ باشد در کتب

(۱) سب نسحوں میت «مومن» می.

(۲) سبحه (الف) من اس حکه شهزاده دارا شکوه اور بابا لعل داس کی ان

ملاقاتوں کی ختم ہو نیکی تاریخ پر حسب ذیل نوٹ می.

«جواب و سوال شاهزاده والا کهر محمد دارا شکوه بابا لعل داس تمام شد بروز جمع

یازدهم شهر رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۸ هجری تحریر یافت بخط مومن چند املاء»

هندوی گفته اند باعتبار فارسی باطل است.

جواب کامل آنکه مصنفان کتب فارسی اکثر صاحب کمال بوده اند و هر که صاحب کمال است دل خود را از آلودگی نفس پاک داشته پیش از مرگ خود را فانی ساخته برائی او جنم باعتبار هر دو نداشت يك حال دارد که باز قید وجود نه پذیرد که اهل هند آنرا مکت نامند باین مرتبه که دست دهد قبول بود برائی استحکام اساس نیکو کاریست چنانچه انبار گندم که اگر از آن قدری در زمین ریزد باز روید و اگر اندک در آتش مریان کرده بکارید رویدن آن ممکن نیست.

(۴۶) باز عزیز گوید که در تناسخ جامعه اصلی معتبر نیست از آدم حیوان و از حیوان آدم باشد و از گندم جو بر نمی آید.

جواب کامل آنکه شخصی که صحبت اهل الله بشوق دریافت کند و حقیقت حق در یابد و از برائی هستی بکتم عدم شتابد باز در حلقه آدم وجود یافته کامیاب صافی نهادن می گردد که لیاقت دریافت حقیقت حق در وجود انسان است نه در حیوان، شخصی که از آلودگی نفس و خواهش حواس خسته می میرد در تناسخ تبدیل لباس می کند در جمیع کائنات مساوی است چنانچه گندم هم تبدیل می شود که هنگام تخم ریزی گندم می کارند و در وقت در و جو به دروید تا او مباح دانه گندم گرم پیدا شود.

(۴۷) سوال عزیز آنکه در کتب فارسی مذکور است وقتی که حق سبحانه تعالی بقدرت کامله خویش آفرینش پیدا کرد وجود آدم از اربع عناصر که خاک و باد و آب و آتش باشد فراهم آورده و در کتب هندی مذکور است که وجود آدم از پنج چیز آراسته شده پنجم چه طور دانسته شود؟

جواب کامل آنکه الحق آدم از پنج چیز آراسته شد اول از پریت یعنی از خلاصه خاک که آنرا شامه گویند که بعدد او بوئی نیک و بد زمین دریافت شده دوم آب که زبان مخصوص است و آنرا ذائقه گویند

که از تاثیر آب همیشه سیراب می باشد و از اندر آن در نمی گذرد  
 آتش که باشد چشم است آنرا با صره خوانند که این همه روشنی  
 دارد و جمیع صورت می بندد چهارم باد باشد که وجود است که آنرا لاسه  
 گویند از رسیدن وجود گرم بر او معائنه دارد پنجم اکاس که عبارت  
 از گوش باشد و آن را سامعه گویند یعنی قوت شنوائی بطرف جمع نیک و  
 بد هادی است طریق سبحانه و تعالی همین گوش است اگر گوش نباشد  
 آدم بصفات پاک بهره بیاید پنج خاصیت علحدّه علحدّه همین است.

(۴۸) سوال عزیز آنکه بعضی در خدمت فقرا حاضر و غیر  
 حاضر می گویند، بیان این چیست؟

جواب کامل آنکه هر که در ظاهر است و دل خود مشغول  
 حظوظ نفسانی دارد او غیر حاضر است و اگر از صورت دور است او  
 باطن خود از دهیان و سخنان مرشد کامل هشیار دارد و حویائی  
 مرضیات الهی است غیر حاضر حاضر است:

گر در غمی، نامی پیش می، و در پیش می می در غمی  
 چنانچه مرغ آتش خوار که بر زمین مباد و چون دل خود را  
 مهتاب سپرده آتش مخورد هر چند از ماه دور است اما از سردی ماهتاب  
 که در دل او حا دارد نمی سوزد و رغن هر چند در هوا نزدیک  
 بآفتاب میرسد لیکن چون خلاصه او مایل به لاشه مردار است گرمی  
 آفتاب باو نمی رسد همین طور حاضر و غیر حاضر است.

(۴۹) سوال عزیز الله تعالی سر است و ذره از انوار الهی که بعینه وجود  
 آمده در باز پرس محاسبه اعمال نیک و بد گرفتار شد، موجب چه بود؟

جواب کامل آنکه پادشاه بالوازم سلطنت بر مسند کامرانی می نشیند بر عالم  
 و عالمیان حکم او جبری است امدی را قدرت نیست که از حکم جهان مطاع او  
 انحراف نماید و اگر همان پادشاه در شب تاریک تنها بر آید عس شهر که نشاند

است بدزدی میگیرد و اگر بگوید که من پادشاه ام اصلاً نمی شنود و نمی گذارد بلکه تنبیه میکند، همین قسم ایزدی همتا پاک و منزله است بخواش خود در قید وجود آمده عاجز و گرفتار است باوجود این تمید به شبید یعنی سخن مرشد کامل خود را بشناسد که من جزوی از آن کل ام و مایل خواهشهایی نشود و بار پرس نیست محض پاک است و الا از صحبت وجود مابین همه خواری به سیاسی<sup>۱</sup> دیگر گرفتار خواهد شد.<sup>۲</sup>

(۵۰) سوال عزیز آنکه از ورد کلمه شریف آدم در بهشت داخل میشود؟ جواب کامل آنکه فی الواقع ورد کلمه معظم همه قسم است اما شخصی که میانه او قلب نباشد چنانچه نقره پاک را طرف نگاه میدارد و قلب را می اندارد، سکه بر هر دو واقعه است.

(۵۱) سوال عزیز آنکه در وجود چند نظر است؟

جواب آنکه سه نظر، یکی جرم نظر که آنرا در هندوی جرم دشت می گویند دوم نظر عالم که آنرا در هندوی آتم دشت می نامند و جرم نظر آنست که مثل آدم و غیره در حصور خود بنظر آید نظر عالم آنرا می گویند که آنچه تماشا و کیفیت مالک و شهرها هر چه بخواند در یکجا نشسته به بیند و ارواح نظر آنست که دل و جان وجود خود را نشناسد.

(۵۲) سوال عزیز آنکه که در وجود دل کجا می ماند؟

جواب کامل که در سه جا، عرض کرد که آن سه جا کدام است؟ فرمود یکی نظرگاه بیداری که آنرا در هندوی جا گرت می گویند و دوم خواب دیدن که آنرا در هندوی سپین گویند سوم آرام خواب که آنرا در هندوی سکھوپت می گویند نظرگاه بیداریست و سپین دیدن و خواب آرام آنرا می گویند که هیچ چیز در خواب نه بند به آرام خواب نماید در وجود این سه جا دل مقام دارد.

(۱) اس لفظ کی صحیح هون مین شه می.

(۲) نسخه (د) یهین ختم هو جاتا می.

(۵۳) سوال عزیز آنکه معنی دل چیست؟

فرمودند که معنی دل من و شما گفتن یعنی دوئی ازدو ست چرا که دل ارواح را بهر جانب ما مادر و پدر و برادر و عورت و فرزند و غیره می کشد و الفت می گیرد باید دانست که این الفت دوئی از دل است.

(۵۴) سوال عزیز آنکه صورت دل چیست که در نظر نمی آید؟

فرمودند که صورت دل مانند باد است.

(۵۵) عرض کرد که دانسته چه طور شود؟

فرمودند چنانچه درختان را باد بینج بر می کند و صورت آن در نظر نمی آید آن چنان دل حواس خمسہ را برهم می سارد و در وجود است بنظر نمی آید باید دانست که صورت دل مانند باد است.

(۵۶) سوال عزیز آنکه دل چه می کند؟

فرمودند که دل دلالتی ارواح میکند.

(۵۷) عرض کرد که از چه باید دانست؟

فرمودند که از دوکان حواس خمسہ که آنرا در هندوی اندر بان مگویند، لدات دیاوی گرفته به ارواح مبرساند و به گناهان آن لدت ارواح گرفتاری شود چنانچه که دل سودائی به خریدار از دوکان میدهند کمی و اضافه به خریدار و فروشنده رسد، خود دلالتی گرفته علحدہ میشود، این طور دلالتی میکند و در این است.

(۵۸) سوال کرد خیال دل از چیست؟

فرمودند چنانچه آهنگر آتش را از ما میان میدهد و آتش روشن میشود، وقتی که آهنگر میان میگذارد آتش می میرد، مراد دل آتش است و دل نیز زنده است از آن بداند که خیال دل از دم است.

(۵۹) سوال کرد خیال دم از چیست؟

فرمودند که خیال دم از دل است.

(۶۰) عرض کرد دانسته چه طور شود؟

فرمودند که خود نگاه داشته در خواب رفت چنانچه شخصی آمده

آن چیزها را برداشته مرد و در آن وقت دم حاضر بود دم را خبر نشد. دل در وقت خواب خیال می کرد و بس، نابد دانست که خیال دم از دل است گویا که دم بغیر از دل مرده است.

(۶۱) سوال کرد که خواب کرا میگویند که آن را در هندوی نند

می گویند؟  
فرمودند که خواب آن را می گویند که ماطلب حرص دیا در خواب رود، سهان حرص بر خیزد با ماء و می می میرد، باز بیدار می شود چنانچه گفته اند محبت از دل فقراً نمیرد هرگز، چو میرد مبتلا میرد چو خرد مبتلا خرد

(۶۲) سوال نمود که فقراً کرا میگویند؟  
فرمودند که حرص دیا وا گذاشته فارغ از ما و توشه در خواب رود و هیچ چیز دساوی در خواب نه بیند و شاید خواب فقرا را در هندوی جوك نند میگویند که او را ار آ مدورفت دسا فارغ میشود مو کش است.

(۶۳) سوال کرد که بیداری آن تمام حیوانات و نباتات و حمادات و غیرها را چهار وقت میگذرد، آن بیداری چیست؟  
فرمودند که آن را گردش فلك میگویند که سر آن شهاب یعنی اوتر و پائی آن جنوب یعنی دکهن و چشم آن آفتاب و ماهتاب است و استخوان او کوه و سنگ و پوست زمین و بوض های او دریاها خون او آب دریا و چاه و آنچه درخت از خس و خاشاک از تن مانند است همه موی برتن اوست و گوش آن آسمان.

(۶۴) عرض کرد که گوش دواند آسمان یکی؟  
فرمودند هر دو گوش يك سخن میشوند بر چهار وقت آدم و غیرها را در بیداری آن گردش فلك میگذارد وقتی که او در خواب خواهد آمد قیامت برپا خواهد شد که نام آن را در هندوی بمراث یورکه می خوانند

(۶۵-۶۶) سوال کرد و قتیکه آدم وجود می گذارد آن وقت بیدار است



در آن وقت بی خبری نمی شود، عرض کرد که در آن وقت بیداری در نظر نمی آید،  
فرمودند که اگر در آن وقت بی خبری باشد دست و پا تزدند خوا  
با آرام نماید در آن وقت گذاشتن وجود آرام نیست بلکه در تمام وجو  
آزار است چنانچه کوتوال دزد را گرفته بحضور صاحب صوبه می برد و دز  
می داند که مرا بدار خواهند کشید یا سزائی دیگر خواهند داد از س  
آن دل بطرف مردم خانه و مادر و پدر و فرزند و غیرها نمی آید و فک  
جان خود می افتد نظر و دل او بجناب کوتوال و صوبه است که در  
باب ما چه خواهد شد از آن طرف خبردار است و ازین سو بی خبر از  
آن باید دانست که در آن وقت بیداریست که آن را خواب بیداری میگویند  
(۶۷) باز سوال کرد که در واصل فرق چه می ماند؟

فرمودند که در واصل هر چه وجود فرق می ماند.

(۶۸) عرض کرد داسته چه طور شود؟

فرمودند جائی که واصل است آنجا دل واصل می شود، تن در آنجائی  
رسد، بنا برین وجود آنجا فرق است که در وجود واصل و نا واصل فرق است.

(۶۹) عرض کرد که چگونه فرق است؟

فرمودند که وجود واصل مانند آئینه است.

(۷۰) عرض کرد که از يك جانب روشن و يك جانب ناپیدا؟

فرمودند که از جانی که روشن است دل او بجانب خداست و از جانب ناپیدا  
تن او در این جا گویا که بطرف دنیا پشت داده، وجود نا واصل مثل هندوی  
است از هر دو جانب سیاه، بنا بر آنکه واصل سراسر روشن است نه از دین خبر  
دارد نه از دنیا، در میان [Redacted] لوئی مسیون

نوٹ - [مترجم] عبارت مین اکثر جگہ بن کہین معلوم

هوئی نقل مین غلطی هوئی می مد

۴ (ب) مین آخر

اواسکوه

نسخہ (الف) ایکدم می اس طرح ختم ہو جاتا ہ

میں اتنا اور زیادہ می

ختم شد انتخاب جواب و سوال بابا لعل داس و بادشاہ

شمس العلماء

# مولوی محمد حسین آزاد

از سیر المصنفین جلد دوم (غیر مطبوعہ)<sup>۱</sup>

پیدائش اور ابتدائی تعلیم:

آزاد کی صحیح تاریخ ولادت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اس امر سے کہ وفات کی وقت ان کی عمر ستر سال کی تھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقیناً سنہ ۱۸۳۲ عیسوی یا ۱۸۳۳ مین بہ مقام دہلی پیدا ہوئی، جو ان کا آبائی وطن ہے۔ آپ کی والد مولوی محمد باقر تھی جو شیخ محمد ابراہیم ذوق کی دلی دوست تھی اور ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کی موجد<sup>۲</sup> کہلائی۔ حضرت آزاد فی استاد ذوق کی سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نکات عروض و فن سخن انہیں کی فیض سے حاصل کی۔

دہلی کالج کا داخلہ:

بعد ازاں دہلی کالج میں داخل ہو گئی اور آپ اس کالج کی مشہور ترین طلباء میں سے شمار کی جاتی ہیں۔ آپ فی علوم مروجہ میں اسی درسگاہ سے اچھی استعداد حاصل کی تھی۔

---

(۱) یہ حالات «ادیب» الہ آباد سنہ ۱۹۱۰ع اور «خزانۂ جاوید» مؤلفہ

لالہ سری رام می ماخوذ ہیں، تنہا۔

(۲) بعض لوگ ڈاکٹر اسپرنگر کو اردو اخبار نویسی کا موجد قرار دیتی ہیں، تنہا۔

مشاعروں کی شرکت :

آپ کو اپنی استاد کی بدولت اکثر نامی گرامی اشخاص سی ملنے جلنے کا موقع ملا، اور معرکوں کی مشاعروں میں شرکت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ان کو کمال حاصل ہوا وہ حضرت ذوق کی فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔ آزاد جو کچھ اپنی استاد سی سنتی تھی یا ان کی صحبت میں دوسری بزرگوں کی زبان فیض ترجمان سی ادا ہوتا تھا اپنی حافظہ میں محفوظ رکھتی جاتی تھی۔ جب غدر کی ہنگامہ کا خاتمہ ہوا اور آزاد کو اطمینان نصیب ہوا تو لاہور میں بیٹھ کر بفرغت تمام اگلی پچھلی باتوں کو از سر نو یاد کیا اور ان صحبتوں کو صفحہ قرطاس پر دوہرایا۔ کچھ اپنی بیٹی تھی، کچھ جگہ بیٹی، غرض وہ کہانی سنائی کہ جسکو سنکر ہر کہ و مہ اسکا والدہ و شیفتہ ہو گیا اور دوسو برس سی لیکر اس وقت تک شعرا کی جتنی محفلیں قائم ہوئی تھیں اور یہ فلک تفرقہ پرداز ان کو درہم و برہم کرتا رہا تھا، سب کا نقشہ اس خوبی سی کھینچ کر دکھلا دیا کہ وہ تمام بزرگ چلتی پھرتی تصویروں کی طرح نظر آتی لگی۔ اس مرقع کا نام آب حیات ہی جسی نہ صرف اگلی جلسوں کو تازہ کردیا اور ان ہی ہوئی صورتوں میں جان ڈال دی بلکہ مصنف کا نام بھی زندہ جاوید بنادیا اور زمانہ فی ان بزرگوں کی طفیل میں آزاد کو بھی خلعت بقائی دوام عنایت فرمایا۔

کلام ذوق کی ترتیب :

آپ فی حضرت ذوق کی وفات کی بعد بڑی سرگرمی اور تندرستی سی ان کی کلام کی ترتیب کا اہم کام شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ عیسوی فی کئی سال کی علی الاتصال محنتوں اور مشقتوں پر پانی پھیر دیا اور وہ تمام مجموعہ دہلی کی تباہی کی ساتھ ساتھ برباد و تاراج ہو گیا اور حضرت خاقانی ہند کی صلیٰ فرزند کی ساتھ روحانی اخلاف بھی واصل رحمت الہی ہوئی۔ چونکہ آزاد کی تصانیف

مین سی ڪوئی مجموعہ نظم ۱۲۶۴ هجری سی بیشتر کا دستیاب  
ہین ہوتا اور جو چند غزلین کلام آزاد مین طبع ہوئی ہین وہ غدر کی  
بہت بعد کی کھاٹی ہین۔ اغلب یہ ہی ڪہ وہ اپنا پرانا ذاتی سرمایہ  
بھی غدر کی نذر ڪرینٹھی۔

حکیم آغا جان عیش سی استفادہ :

حضرت آزاد فی استاد ذوق کی وفات کی بعد حکیم آغا جان عیش  
سی بھی جو دربار شاہی مین بزمۃ اطبا منسلک تھی استفادہ کیا۔  
اگرچہ حکیم صاحب ذوق کی ہم پلہ نہ تھی تاہم وہ بھی صاحب کمال  
تھی۔ ایک ہی طرح مین، ایک قافیہ پر دونوں صاحبان فی فکر سخن کی  
ہی اور حق یہ ہی ڪہ اپنی اپنی موقع پر دونوں شعر بہت اچھی ہین۔  
مشاعرہ مین عیش فی پہلی اپنی غزل پڑھی تو ذوق ہم قافیہ شعر کی  
پڑھی مین متزدد ہوئی لیکن آزاد کی والد ماجد فی باصرار کہا ڪہ  
ضرور پڑھی تاکہ معلوم ہو ڪہ استاد اس مصمون کو اس طرح باندھی ہین۔  
چنانچہ عیش کہتی ہین :

ای شمع، صبح ہوئی ہی، روتی ہی کس لٹی  
تھوڑی سی رہ گئی ہی اسی بھی گذاردی  
اور ذوق فرماتی ہین :

ای شمع عمر تیری طبعی ہی ایک رات  
ہنس کر گزار یا اسی رو کر گزار دی

آزاد وطن مالوف کو خیر باد کہتی ہین :

جب ہنگامہ غدر مین آزاد کی والد بزرگوار فی شہادت کا درجہ پایا تو  
آخر سال ۱۸۵۷ عیسوی مین آزاد اپنی عیال و اقربا کی ہمراہ اسی شہ  
کی طرف کام زن ہوئی جو محمد شاہ رنگیل کی بعد سی دہلی ڪے  
بجائی اہل کال کا ملجاؤ ماوا تھا اور مرجع خلائق تھا، لیکن یہاں ایک سا

قبل ہی سی خاک اڑ رہی تھی اور وہ خاندان جو اہل کمال کو اپنی سائہ عاطفت میں جگہ دیتا تھا زمانہ کی دست برد سی خود بھی محفوظ نہ رہا تھا اور جہاں عیش و نشاط کی محفلین گرم تھیں اب وہاں ہوکا عالم تھا۔ یعنی لکھنؤ اب وہ لکھنؤ نہ تھا جب میر تقی میر اور مرزا رفیع السودا اور سید انشاء اللہ خان جیسی صاحب علم و فن وہاں پہنچی تھی۔ اس وقت وہ خود اپنی حال پر نوحہ خوانی کر رہا تھا۔ بیچاری آزاد کی غم بہن کون درد شریک ہوتا۔ پس حضرت آزاد چندی وہاں کی مشاہیر ملتی جلتی رہی اور کچھ عرصہ تک اطراف و جواب میں سفر کرتی پھر بعد ایک مدت ۱۸۶۴ عیسوی میں تقدیر راہ پر آئی اور آزاد لاہور پہنچی۔ یہاں آکر آپ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئی۔

لاہور کا قیام اور سکونت :

آپ کی بابرکت زندگی کا بڑا حصہ لاہور ہی میں گزرا ہی۔ انجمن پنجاب کی جلسوں کا بانی اگر آپ کو کہا جائی تو بیجا نہیں۔ انہیں کی کوششوں سی حکام بالا کی عموماً اور افسران تعلیم کی خصوصاً زبان اردو کی نشو و نما اور ترقی کی طرف خاص توجہ مبذول ہوئی۔ یہ بھی آپ ہی کی کوشش کا یادگار نتیجہ تھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی قدم میمنت لزوم سی انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنیاد پڑی۔ حضرت آزاد کچھ عرصہ تک اسسٹنٹ سگریٹری رہی اور یونیورسٹی کالج کی صیفہ علوم مشرقی میں بعدہ پروفیسری مدتوں کام کیا۔ اسی اثناء میں تعلیمی کاموں کی علاوہ ملک کی خدمات بھی وقتاً فوقتاً کمال لیاقت کی ساتھ انجام دیتی رہی۔ سنہ ۱۸۶۵ عیسوی میں بکار سرکار کلکتہ کا سفر کیا بعد ازاں پنڈت من پھول کی ہمراہ کابل و بخارا گئی۔ ۱۸۸۳ عیسوی میں دوبارہ ایران گئی۔ آزاد کو خدمات ماضیہ کی صلہ میں گورنمنٹ سی ۷۵ روپیہ ماہوار پینشن ملتی تھی، لیکن حضرت موصوف فی اپنی تصانیف اور کفایت شعاری سی خاصا سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہی کہ آزاد کو

پنشن ان کی خدمات ملازمت کی وجہ سے ملی گورنمنٹ کی اپنی سرکاری کاموں کا کوئی صلہ نہیں دیا۔

آزاد کس طرح چھوٹی تنخواہ سے بڑی درجہ پر پہنچی ہیں :

جب آزاد وارد پنجاب ہوئی تو اول اول مولوی رجب علی صاحب کی پاس جگرائواں مین مقیم رہی، پھر مولوی صاحب کی ذریعہ سے پنڈت من پھول صاحب میر منشی لفٹنٹ گورنر صاحب کی پاس آئی اور میر منشی صاحب کی سفارش سے لاہور مین آئی۔ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کی دفتر مین ۱۵ روپی مہوار کی ملازم ہوئی، ادنیٰ عہدہ کی وجہ سے اوپر ایسا موقع نہ ملتا تھا کہ اپنی لیاقت و استعداد کو اعلیٰ افسروں پر ظاہر کریں، اس کی علاوہ میجر فلر صاحب ڈائریکٹر اگرچہ عربی، فارسی کا مذاق رکھتی تھی، عام دوست تھی مگر اجنبی کیلئے ان کا طاہری رعب و داب ان تک پہنچی مین سد راہ تھا، اتفاق سے اسی زمانہ مین رائی بہادر ماسٹر پیاری لال صاحب

(۱) ماسٹر پیاری لال آشوب ۱۸۳۸ ع مین بمقام دہلی پیدا ہوئی جو تین سو برس سے ان کی بزرگوں کا مسکن رہا ہے۔ ان کا نسلی سلسلہ شہنشاہ اکبر کی مشہور وزیر راجہ نوڈر مل تک پہنچتا ہے۔ آپ پرانی دہلی کالج کی تمام درجہ طے کر کے ۱۸۵۷ ع مین تکمیل عام کر لے آکر کالج مین داخل ہوئی اور وہاں کی سند حاصل کرنی کے بعد ۱۸۵۸ ع مین بریلی جا کر سرکاری ملازمت اختیار کی، مگر ایک سال کے بعد پنجاب چلی آئی۔ تھوڑی عرصہ تک کوڑگاوان اور دہلی مین ہیڈ ماسٹر رہی۔ ۱۸۶۴ ع مین دہلی سے تبدیل ہو کر لاہور پہنچی اور وہاں کیوریٹر کی نازک عہدہ کی اہم فرائض کو پندرہ سولہ برس تک نہایت ہوشیاری اور دیانت سے انجام دیا۔ ۱۸۸۴ ع مین انسپیکٹر مدارس ہو گئی اور ۱۸۹۵ ع تک اس عہدہ پر فائز رہی۔ قیام لاہور کی زمانہ مین کئی برس تک سرکاری اخبار کی اڈیٹر رہی۔ میجر فلر صاحب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم ان سے بہت خوش تھے۔ ان کی پاس کلکتہ یونیورسٹی سے سوال آیا کرتی تھی اور وہ ان کی جواب مین اکثر رائی بہادر سے مشورہ لیا کرتی تھی ایک مرتبہ

کسی سرکاری کمیٹی میں شریک ہونی کی غرض سے لاہور تشریف لائی۔ چونکہ فلر صاحب ماسٹر صاحب سے از حد مانوس تھی، اس موقع پر حضرت آزاد فی ماسٹر صاحب سے کہا کہ تمکو میجر صاحب سے ملا دیتی۔ ماسٹر صاحب نے ان سے وعدہ کر لیا اور موقع کی منتظر رہی۔ کمیٹی سے فارغ ہو کر میجر صاحب سے ملاقات ہوئی تو صاحب نے ایک تحریر ماسٹر صاحب کو دکھلائی، اس میں صاحب بہادر نے لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا۔ ماسٹر

کلکتہ یونیورسٹی سے یہ سوال آیا کہ مسجع اور مقفی عبارت میں کیا فرق ہے مع مثال بیان کرو۔ حسب معمول یہ سوال بھی رائی صاحب کی پاس بھیجا۔ رائی صاحب نے بجنسہ مرزا غالب کی پاس بھیج دیا، جن کی خدمت میں رائی صاحب کو نیاز حاصل تھا اور مرزا صاحب ان پر بہت مہربانی فرماتی تھی۔ انھوں نے اس کا جواب مع امثال نظم میں لکھ کر دیا جس کا اخیر شعر یہ تھا:

تحریر ہی یہ غالب یزدان پرست کی

تاریخ اس کی آج نوین ہی اگست کی

سنا ہی پروفیسر آزاد اور مولانا حالی کو بیچرل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت میں ہوا اور آپ ہی سے اس کی متعلق معلومات حاصل کیں، لیکن ہماری نزدیک جو کچھ شوق ہوا کرنل ہالرائڈ ہی کی تحریک اور امداد سے ہوا، اب جو چاہی اپنا نام کر لی۔

آپ نے 'رسوم هند' کی پہلی تین باب، 'قصص هند' حصہ اول و سوم، اردو کی تیسری کتاب لکھی اور ترجمہ تاریخ انگلستان کلاں کیا، نیز رسالہ 'اثالیق پنجاب' کی مضامین لکھی، ترجمہ دربار قیصری ۱۸۷۷ع مؤلفہ مسٹر ویلر شستہ و با محاورہ بلکہ برجستہ و دل آویز کیا اور اس کی صلہ میں آپ کو ایک تحفہ اور ایک جلد 'مطالو مذہب' مرحمت ہوئی۔ ۱۸۹۲ع میں آپ کو رائی بہادری کا خطاب ملا اور ۱۸۹۵ع میں ۳۶ سال کی ملازمت کی بعد پینشن لی۔ آپ ایک علم دوست آدمی تھی، عرصہ ہوا کہ انتقال ہو چکا ہے مگر افسوس ہے کہ صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں ہوئی: تنہا۔

صاحب فی دیکھ کر اعتراض کیا کہ یہ لفظ مذکر بولا جاتا ہی، صاحب فی جواب مین کہا کہ مولوی کریم الدین صاحب سررشتہ دار کو یہ تحریر دکھائی ہی اور وہ اس عبارت کی صحت کی ذمہ دار ہین۔ مولوی صاحب بلائی گئی۔ میجر صاحب فی ماسٹر صاحب کا اعتراض بیان کیا، مولوی صاحب فی جواب مین سند چاہی، ماسٹر صاحب فی حضرت آزاد کی لٹی یہ موقع مناسب خیال کر کے میجر صاحب سی کہا آپ کی دفتر مین ایک شخص محمد حسین آزاد دہلی سے رہتی والی ہین، انہیں مثال کی ہزاروں شعر یاد ہین۔ یہ سنتی ہی آزاد صاحب طلب کئی کئی اور فلر صاحب ہادر فی ان سی دریافت کیا کہ لفظ ایجاد مؤث ہی یا مذکر۔ آزاد فی جواب مین عرض کیا کہ مذکر۔ صاحب فی سند مانگی۔ انہوں فی ہر جستہ سودا کا یہ شعر پڑہ دیا :

ہائی کس بھڑوی کا یہ ایجاد ہی نسخی مین معجون در انباد ہی  
اس وقت سی فلر صاحب کی خدمت مین حضرت آزاد کی رسائی ہو گئی  
اور کچھ ترقی بھی ہوئی۔ اس کی بعد کرنل ہالرائڈ صاحب فی ان کی قدر دانی فرما کر ۷۵ روپیہ تنخواہ کردی اور ان کو سب اڈینز مقرر کردیا۔ جس اخبار کی یہ سب اڈینز ہوئی، اس کی اڈینز رائی ہادر ماسٹر پیاری لال صاحب آشوب تھی، اخبار کا نام »اتالیق پنجاب« تھا۔ یہ اخبار سرکاری تھا، سالانہ قیمت دیگر اخبارات سی نسبتاً کم تھی۔ کچھ تو اسوجہ سی کہ یہ اخبار سرکاری تھا اور کچھ اس سبب سی کہ اڈینز و سب اڈینز دونوں قابل اور لایق تھی یہاں تک مقبول خاص و عام ہوا کہ اپنی معصرا اخباریں سی کوئی سبقت لیکیا۔

»اتالیق پنجاب« کی جگہ »پنجاب میگزین« کا اجراء :

»اتالیق پنجاب« کی مضامین کی خوبی، عبارت کی برجستگی اور خوش اسلوبی فی اس کو ہر دل عزیز بنادیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ہندوستانی اخبارین فی گورنمنٹ سی درخواست کی کہ گورنمنٹ کارعایا کی مقابلہ مین

(۱) اس شعر سی لفظ ایجاد کا مذکر ہونا ثابت نہوت ہوتا کیونکہ »کا« کی جگہ »کی« بھی پڑھا جا سکتا ہی۔ آجکل ایجاد کو زیادہ مؤث ہی لکھتی اور بولتی ہین، تنہا۔



اخبار شائع کرنا در پردہ ملکی لوگوں کو نقصان پہنچانا ہی۔ گورنمنٹ فی یہ مقبول عذر تسلیم کر کے اخبار مذکور کی جگہ ایک رسالہ 'پنجاب میگزین' کی نام سی جاری کر دیا۔ حضرت آزاد کی بعد جب وہ پروفیسر ہو گئی تو خواجہ حالی فی بھی کچھ دنوں 'اتالیق پنجاب' کی سب ادبیری کا کام انجام دیا تھا۔ در اصل یہ سب ادبیر نہ تھے بلکہ یہ دونوں صاحب ان مضامین کی جو انگریزی سی ترجمہ کئی جاتی تھی، زبان کی اصلاح و درستی پر مامور تھے۔  
شکل و صورت اور شمائل :

آزاد قدرت کی ظاہری محاسن میں بڑی حصہ دار نہ تھے۔ میانہ بلکہ چھوٹا قد، گندمی رنگ، چہرہ بری بدن کی آدمی تھی۔ مزاج کی طرح وضع اور لباس میں بھی سادگی تھی، اکثر چفہ پہنتی اور ہندوستانی فیشن کا عمامہ باندھا کرتی تھی۔ چہری سی ذکاوت و فطانت ٹپکتی تھی۔ بشرہ سی کشادہ پیشانی، ہنس مکھ، نکتہ رس اور ہمدرد و رحمدل معلوم ہوتی تھی۔ تالف قلوب کا یہ عالم تھا، زبان میں یہ جادو اور خیالات میں یہ اثر تھا کہ جو شخص ایک گھنٹہ بھی آپ کی صحبت میں بیٹھ گیا آپ کا کلمہ پڑھنی لگا۔ بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا پھول جھڑتی تھی آج کل کی اسکول اور کالجوں، شاگرد اور استادوں میں عقیدت اور یگانگت کا وہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا جو پہلی شاگرد اور استاد میں ہوتا تھا، مگر صدہا نوجوان جن کو گورنمنٹ کالج لاہور میں مولانا آزاد کی سامنی زانوئی ادب نہ کرنی کی خوش نصیبی میسر آئی، ان کو اسی نظر سی دیکھتی تھی جس نظر سی کہ فتنہ مرزا غالب کو، شیفتہ مومن خان کو دیکھتی تھی۔ ان کی شفقت بزرگانہ بہان تک تھی کہ اکثر شاگردوں کو فارغ التحصیل ہونی کی بعد حصول معیشت میں انہوں فی بڑی امداد دی۔

علمی استعداد:

مولانا آزاد فارسی کی عالم متبحر اور عربی کی اچھی عالم تھی اور تمام علوم پر عبور رکھتی تھی جو ان زبانوں میں متضمن ہیں۔ ہاشا اور

ہندی کی دیکھت اور خوبییوں سے پوری آگاہ اور انگریزی عالم ادب کی  
 سرصیات سے واقف تھی، اگرچہ انگریزی نہیں جانتی تھی: صرف و محو،  
 روض اور صنائع و بدایع میں بد طولی رکھتی تھی، فارسی ایسی سلبس  
 پر مبنی محاورہ بڑی تھی اور لب و لہجہ ایسا تھا کہ ان میں اور اہل ایران  
 میں تمیز کرنا غیر ممکن تھا

اردو کی ترقی میں آزاد کا حصہ :

اردو پر آزاد کی احسانات عظم ہیں۔ نہ صرف یہ کہ تمام صوبہ پنجاب میں  
 خاص اردو کی واقفیت کی لٹی انکا ممنون ہی بلکہ پنجاب کو اردو  
 سکھائی کی لٹی جو تصنیفات و تالیفات انہوں نے کی، اسوقت اردو زبان  
 کو انکی اشد ضرورت تھی۔ پرانی سلسلی میں اردو کی پہلی دوسری اور  
 تیسری کتابیں، اردو کا قاعدہ، قصص ہند کا دوسرا حصہ، جامع القواعد  
 اور نئی سلسلی کی بھی کئی پرانی کتابیں مولانا آزاد ہی کی تصنیف سے ہیں۔  
 فارسی میں بھی انہوں نے کئی مقتدر کتابیں لکھیں اور انہوں نے ہندو  
 زندہ فارسی سکھائی۔ ایران کی روزمرہ کی تعلیم دی۔ جو کچھ انہوں نے لکھا،  
 جو محاورہ اور روزمرہ انہوں نے ہم کو سکھائی وہ قدما کی تصانیف کی  
 مطالعہ کی بعد ان کی مروجہ زبان کی ذاتی تحقیق و تلاش کا نتیجہ تھا۔  
 ایران اور تاتار وغیرہ ممالک میں جہاں فارسی بولی جاتی ہے ان کی  
 سیاحت موجودہ زبان کی تحصیل میں بہت معاون ہوئی۔

محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر :

دوسری مرتبہ مولانا آزاد جب ایران کی سفر سے واپس آئے تو  
 ایک پشتارہ نوٹوں، مسودوں، یادداشت اور تحقیقات کا اپنی ساتھ لائے۔  
 تقریباً سنہ ۱۸۸۷ عیسوی میں وہ کتب خانہ آزاد کی عبارت تعمیر  
 کرا رہی تھی ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرط اشتیاق سے اس میں چند الہاریوں  
 کی ترتیب اور خانہ پری میں مصروف تھی۔ اتفاق سے محاورہ کی صحت

استعمال کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمائی لگی کہ ایک غیر زبان جکی معاوری کو صحیح اور ناموقعہ استعمال کرنا بہت مشکل ہی اور یہ دلچسپ روایت بیان کی کہ ایک دن مین ایران کی ایک صاحب خانہ کا مہمان تھا، کھانا پک رہا تھا، ماں دس بارہ برس کی لڑکی کو چولہی کی پاس چھوڑ کر آپ اندر کی دالان مین کوئی کام کرنی لگی اور لڑکی سی کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھی تا کہ کھانا جوش کھا کر ابل نہ پڑی۔ رفتہ رفتہ آج تنز ہوتی گئی۔ اب مین فی سوچا کہ چاول ابل کر باہر نکل پڑینگے دیکھوں تو اس کفبت کو نہ لڑکی کن الفاظ مین طاہر کرتی ہی۔ اور فرمایا کہ مین اپنی فارسی کی لغات اور زبان دانی کی دفترن کو اپنی دھن مین دوہراتا تھا اور اس خالی کیفیت کی مختلف اطہار گھڑتا تھا کہ شاید یہ کہنگی، یہ کہنگی، کہ وہ وقت آپہنچا اور میری تمام خیالی دفتر خالی پلاؤ ثابت ہوئی۔ جوں ہی دیگچی مین چاول جوش کھانی سی اسکا ڈھکنا ایک طرف سی ایک آدہ ایچ اوپر کو اٹھا کہ لڑکی چنخی: «اماں! اماں! دیگچہ سر کردہ۔» یہ لفظ کو یا مبری کانوں مین الہامی کلمہ کی طرح پڑی اور مری آنکھین کھل گئیں۔ جس شخص کو زماندانی سی بہاں تک مذاق ہو، جو شخص اتنا کتہ رس اور صاحب تلاش ہو، جسنی عمر زمانوں کی تحقیق مین اسدرجہ کاوش اور کوشش کی ہو وہ خود اپنی زبان مین کیا کچھ نہ کر دکھاتا اور حق الامر یہ ہی کہ اردو مین آزاد فی وہ کچھ کر دکھایا جسکی ان جیسی شخص سی توقع کی جاسکتی تھی

قدیم شاعری کی کساد نزاری:

جب آزاد لاہور پہنچی مین، اسوقت بازار علم مین دہلی اور اکھنڈ کی نکسالی شاعری کی کساد بازاری ہو چکی تھی اور چونکہ کسب معاش علوم مغربی کی تحصیل پر موقوف تھا اسلئے قدیم شاعری کی بے قدری ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ آزاد لکھتی مین:

«اس سی بڑھکر یہ ہی کہ بعض طبائع شعر سی متنفر پائی جاتی مین

اور دلیل اس کی یہ پیش کرتی ہیں کہ اس سی کچھ حاصل نہیں۔

نیچرل شاعری:

ان حالات سی متاثر ہو کر اور دیگر زمانوں سی اپنی زبان کی شاعری کا موازنہ کر کی آزاد کی جدت طبیعت نی اردو مین ایک نئی طرر یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ پہلی خود کئی نظمیں لکھیں، کئی حکمانہ مضامین اس ایجاد کی حمایت مین لکھی اور پھر ایک مشاعرہ قائم کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اپنی کتاب 'مجموعہ نظم حالی' کی دیباچی کی شروع مین اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتی ہیں:

”سنہ ۱۸۷۴ع مین جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سی متعلق اور لاہور مین مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرل ہال رائڈ ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم پنجاب کی ٹائڈ سی انجمن پنجاب نی ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہی مین ایک نار انجمن کی مکان مین منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروہست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو کئی ہی اسکو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائی۔“

اس مشاعرہ مین مطالب نجوہز کئی جانی تھی اور دیگر محفل مشاعرہ کی طرح کوئی مصرعہ طرح نہیں دیا جاتا تھا۔ بیسات، حب وطن، تعصب و انصاف پر مولانا حالی کی بینظر نظمیں موجود ہیں۔ وہ اس نادگار مشاعرہ کی یادگار ہیں، بہر حال اس نئی شاعری کی لئی مولانا آزادنی ملک کو پہلی ہی سی تیار کر رکھا تھا، انجمن کی اکثر جلسوں مین وہ اردو ادب اور نظم کی شقوں پر مبصرانہ اور نقادانہ لکچر دیا کرتی تھی، انجمن کی ایک جلسہ مین جو ماہ اگست ۱۸۶۷ع مین منعقد ہوا تھا، اپنی ایک بسیط مضمون 'نظم اور کلام موزون کی باب مین خیالات' پڑھا، اس مین سی چند سطور پیش کش ناظرین ہیں:

”شاعر اگر چاہی تو امورات عادیہ کو بھی بالکل سا کر دکھائی،“

بیچر کو ~~کو~~ درختان ہیا در گل کو رواں کردی، ماضی کو حال، حال کو استقبال کردی، دور کو نزدیک کردی، زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیری کو اجالا کردی . . . . . روشن دلان اہل درد کی نزدیک طلوع و غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ و بہار قدرت الہی کی شگفتہ کرتا ہی اور تیرہ دلان بیخبر کی نزدیک کار گاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہی کہ دن رات چکر مین چلا جاتا ہی . . . . اس سی تڑہ کریہ ہی کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتی ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہی . . . . . اسی طرح شاعروں کی بد زبانی و بد خیالی سی شعر ہی نہمت کفر سی بدنام مہین ہوسکتا، درحقیقت ایسی کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہئی، کیونکہ شعر سی وہ مراد ہی جو جوش و خروش خیالات سنجیدہ سی پیدا ہوا ہی اور اسی قوت قدسیہ الہی سی ایک سلسلہ خاص ہو، خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتی جاتی ہیں، مرتبہ شاعری کو پہنچتی جاتی ہیں . . . . . ابتداء مین شعر گوئی حکماء اور علمائی متحرکی کمالات مین شمار ہوتی تھی اور ان تصانیف مین اور حال کی تصانیف مین فرق ہی زمین و آسمان کا ہی،

مئی ۱۸۷۴ع مین آپ بی اس طرز جدید کی مشاعری کا پہلا جلسہ منعقد کیا اور اپنی افتتاحی تقریر مین ایک پر مغز اور ادیبانہ تقریر کی اس مین اردو شاعری کی متعلق نہایت عمدہ خیالات ظاہر فرمائی. امید ہی کہ ذیل کی اقتباس سی موجودہ اور آئندہ اردو نظم کی حالت کا صحیح اندازہ ہو جائیگا: بیشک مبالغہ کا زور، تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان مین لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہی. لیکن نمک اتنا ہی چاہئی کہ جتنا نمک، نہ کہ تمام کھانا نمک . . . . . مہین چاہئی کہ اپنی ضرورت بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کی اختصار فارسی سی لین، سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سی سیکھین، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں، کیونکہ ابد رنگ زمانہ کا کچھ اور ہی، ذرا آنکھیں کھولینگی تو دیکھیں گی کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہی جس

میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کی گلدستی، ہار، طری ہاتھوں  
میں لٹی حاضر ہیں، اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی  
ہی لیکن اب وہ بھی منتظر ہی کہ کوئی صاحبِ مہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ  
کر آگے بڑھائی،

آگے چل کر اسی مضمون میں فرمائی ہیں:  
»ای میری اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا  
زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و ضائع کی سامان تمہاری بزرگ  
اس قدر دی گئی ہیں کہ تمہاری زبان کسی سی کم نہیں، کمی فقط اتنی ہی  
کہ وہ چند ہی موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئی ہے۔ وہ کیا،  
مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف، مہمت سی حسرت و  
ارمان، اس سی زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، ہار، خزاں، فلک کی  
شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوں  
ہیں۔ بعض دفعہ ایسی دور کی استعاروں میں ادا ہوتی ہیں کہ  
عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسی خد بندی اور نازک خیالی کہتی ہیں،  
اور فخر کی موجھوں پر تاؤ دیتی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں  
سی ذرا نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتی، یعنی اگر کوئی واقعی  
سرگزشت یا علمی مطالب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس  
کی بیان میں مد مزہ ہو جاتی ہیں۔

»ای میری اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آسوں بھائی ہیں، جب  
مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہی والا بھی  
کوئی نہ رہیگا۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ بہ سبب بیکدردی کی اور کہی  
والی پیدا نہ ہونگی، کئی پرانی مورتیں باقی ہیں، وہ چراغِ سحری ہیں۔  
انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سی بالکل محروم ہو جائیگی، اور اردو  
میں نظم کا چراغ کل ہو جائیگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب قدیم طرز کا بھی کوئی بالکل کہی  
والا نظر نہیں آتا، وہ پرانی مورتیں جنکی نسبت آزادی چراغِ سحری کہا ہے

مدت ہوئی کہ خاک کی ٹھیروں کی ٹلی چھپ گئیں اور ان کی ہڈیاں بھی زیر زمین گل کر مٹی ہو گئیں۔ آجکل جو لوگ بیچرل شاعری میں کام زن ہیں وہ آزاد اور حالی کی طفیل میں کچھ کہہ لیتی ہیں ورنہ درحقیقت نظم اردو کا چراغ گل ہو گیا، اب نثر کا دور دورہ ہی:

”زمانہ ما تو بسازد تو بازمانہ بساز“

کھنی کی لٹی ڈاکٹر اقبال جو اب سر اقبال ہو گئی ہیں اپنی بلند خیالات کی لحاظ سے ضرور اعلیٰ درجہ پر ہیں لیکن ان کی یہاں صحت و سقم الفاظ کا خیال کم ہی، جسکی وجہ سے وہ بلحاظ فن اس درجہ پر نہیں پہنچی جس پر شاعر مسلم الثبوت استاد ہو جاتا ہی۔ ہاں، اس سلسلہ میں سند اکبر حسین صاحب (سابق جج) الہ آبادی فی اپنا نیا رنگ نکالا اور وہ اس درجہ مقبول ہوا کہ اکبر ملک سخن کی بادشاہ تسلیم کئی گئی اور ہر شخص ان کی اشعار ٹری ذوق و شوق سے سنتا ہی اور ان سے لطف اٹھاتا ہی۔ لیکن اب وہ بھی نہ رہی۔

تصنیفات و تالیفات:

آزاد کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں:

”آب حیات“، ”نیرنگ خیال“ (دو حصہ)، ”سخندان فارس“، ”نگارستان فارس“، ”دربار اکبری“، ”جانورستان“، ”مجموعہ نظم اردو“، ”قصص ہند“ کا دوسرا حصہ، ابتدائی درسی کتب اردو، ”نصیحت کا کرن پھول“، ”قند پارسی“، فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب، ”جامع القواعد فارسی“، ”قواعد اردو“، ”دیوان ذوق“، ان کی علاوہ اور بہت سی نظمیں اور مضامین، جنوں کی زمانہ کی سپاک و نہاک مزید برآں۔

آزاد کی تصنیفات پر ایک عام رائی:

آزاد کی ہر کتاب میں ایک خاص وصف ہی اور وہ یہ کہ تلاش اور جستجو کا مادہ ان کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہی۔ جو کتاب لکھی ہی نہایت سلیقہ

کی ساتھ اور اپنی تلاش اور جستجو کی داد دی ہے۔ زبان جو اختیار کی ہے اس کا ذکر ہے کیا ہے، جو شیرینی اور گہلاوت ان کی زبان میں ہے، جس قدر اس کی تعریف کی جائے وہ کم ہے، تشبیہات و استعارات بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان کو اس قرینہ سے سجایا ہے کہ یہ اختیار زبان سے سبحان اللہ اور واہ واہ کی نعرے نکل جاتی ہیں۔ ان کی نظمیں بھی بجائی خود اچھی ہیں لیکن دراصل وہ اقلیم سخن کی بجائی اقلیم نثر کی بادشاہ ہیں۔ اور جو طرز خاص ان کا ہے وہ کسی دوسری مصنف کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص ان کی تقلید میں دوچار صفحہ لکھدی، لیکن کتاب لکھدینا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ قدرت نے ان کی انداز تحریر میں وہ دلکشی پیدا کی ہے کہ دوسری مصنف کو مشکل سے نصیب ہوگی۔ البتہ ان کا قلم جنبہ داری ضرور لے ہوتا ہے۔ وہ ہندو مسلمانوں کی معاملات میں بی تعصب سہی اور اکثر صاحب قلم اہل ہندو اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کی معاملہ میں ضرور انہوں نے لکھنؤ کی بعض با کمال اصحاب کو اپنی کتاب "آب حیات" میں نظر انداز کر دیا ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنی ایک مضمون "اردو لٹریچر" میں اس کی سخت شکایت کی ہے اور ایک حد تک صحیح ہے، اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ جن بزرگوں کا ذکر "آب حیات" میں کیا گیا ہے ان کی پہلو بہ پہلو وہ اصحاب جنکو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بمشکل بیٹھ سکتے تھے البتہ اسی "آب حیات" میں آزاد نے اپنی استاد ذوق کو بیحد آسمان پر چڑھایا ہے اور جا و بیجا ان کی مداح سرائی کی ہے، حالانکہ آج زمانہ فی الواقع کرات کر دیا ہے کہ وہ ہرگز اس تعریف کی قابل نہ تھے جس کی دوچار اپر کی گئی ہے۔ الحاصل آزاد فن تنقید سے دراصل نا آشنا نہ تھے لیکن اپنی محسن استاد کی تعریف میں رطب اللسان ہوا ہے وہ جو ہر شرافت جانتی تھی اور یہ نہ سمجھتی تھی کہ اپنی ممدوح کو فرشتہ بنادینا آسان ضرور ہے لیکن وہ جو ہر شریف سے معری ہوا جاتا ہے اور اس کی تمام محامد اس کو انسانیت سے خارج کٹی دیتی ہیں۔



آزاد کو اگر ہم کسی انگریزی مصنف سے تشبیہ دین تو کبھی سکتی ہیں کہ وہ اپنی وقت کی لارڈ میکالی تھی۔ اور اگر اردو زبان کے فیاضی پر خیال کریں تو ہم ملاحظہ فرمادیں کہ ان کے تصنیفات فی اردو کی خالی خزانے کو مالا مال کر دیا اور جب تک یہ زبان اور اس کی بولنے والی قائم رہینگی "آب حیات"، "دربار اکبری"، "پیرنگ۔ خیال"، "زندہ رہینگی اور اپنی دلفریبیوں سے سب کو اپنا کر ویدہ کرتی رہینگی۔ چونکہ اردو زبان جلد جلد ترقی کی مدارج طے کر رہی ہے اس لیے بعض الفاظ جو آزاد کے یہاں پائی جاتی ہیں اب وہ متروک ہو گئی ہیں لیکن اس سے ان کی انشا پردازی کمال پر کوئی حرف نہیں آتا آزاد کی شہرت ان کی علمی کارناموں کی وجہ سے ہوئی۔

آزاد حقیقتاً آزاد تھے۔ نہ کسی ایسوسی ایشن کی ممبر تھی، نہ وہ کسی کانفرنس میں شریک ہوئی اور نہ وہ کسی ملی و ملکی تحریک کی بانی ہوئی۔ ان کو شروع سے اپنی زبان کی تحفظ کا خیال تھا، اسی کو دلچسپ اور ہر دلچیز بنانی میں انھوں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی، پس ان کے شہرت کا آفتاب بھی سوشل یا پولیٹیکل پارٹ کی افق سے نمودار نہیں ہوا، بلکہ ان کی کلام کی مقبولیت محض اپنی اصلی معیار اور جوہر ذاتی کی وجہ سے ہوئی، ورنہ وہ نہ کسی دربار کی مدح خواں تھی نہ کسی مدون جماعت کی آرگن۔ قلم انکی چوب تھا اور کاغذ ان کا تقارہ، اور انھیں سے ان کی شہرت کا آوازہ ساری ہندوستان میں گونج اٹھا۔

شمس العلماء کا خطاب :

مولانا آزاد کو گورنمنٹ فی شمس العلماء کا خطاب ۱۸۸۷ ع کے جوبیل پر دیا تھا۔

آزاد کی بعض کتابوں پر رائے :

"پیرنگ۔ خیال" کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے، رنگین بیانی

ک دلفریب مرقع ہی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک پختہ کار دستور العمل  
ی، پند و نصائح کا ایک دفتر ہی۔ استعاری اور تمثیل میں وہ وہ مطلب کی  
تین تا کئی ہیں کہ پڑھنی والا شستہ خیالات سی مالا مال ہو جاتا ہی اس  
کتاب فی اردو نثر کی نئی طرز قائم کی اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں  
کہ اس کتاب میں زیادہ تر انگریزی روش کا پرتو ہی جس میں مضمون  
بویسی کی جدید طرز کا چر بہ اتارا ہی۔

»آب حیات« طرز بیان، سلاست زبان، شستگی الفاظ، رجستگی، بساختگی،  
اور روشن خیالی کا اعلیٰ نمونہ ہی۔ یہ تذکرہ تمام تذکروں سی ہر مارج فائق و  
ممتاز ہی اسلکی کہ حق المقدور محققانہ طریقہ سی ہر ایک شاعر کا حال  
قلمبند کیا ہی۔ آزادی سبب ہی سید ہی، صاف اور سادی بیان میں جابجا  
رنگی طبع کی ایسی جد ولین کھینچی ہیں کہ واہ واہ! بعض اوقات وہ سید ہی  
بات کو پیچدار الفاظ میں بیان کر جاتی ہیں مگر کیا مقدور کہ پڑھنی والی کو  
مطلب سمجھی میں ذرا بھی دقت یا رکاوٹ ہو۔ حضرت آزادی اردو نثر کی  
باغ میں نئی گل بوٹی لگائی، نئی کیاریاں اور نئی روشیں نکالیں اور اس کی  
بوسیدہ جسم میں نئی روح پھونکی۔ ایجاد اور نو آئینی اسی کھتی ہیں کہ  
انہدام کی ساتھ تعمیر بھی ہو، سادگی کی ساتھ رنگ آمیزی بھی ہو، پرانی ملبہ  
میں ایک اینٹ بھی کام کی ہوئی تو اٹھائی اور نئی چوٹی سی نئی عمارت میں  
چن دی، ماضی کی عزت، حال پر شفقت، مستقبل کی فکر، یہ طرز عمل اس  
مصلح کا رہا ہی اور حق یہ ہی کہ اردو ادب میں یہ اختراع و اصلاح کر کی  
مولانا آزادی زبان داناں ملک کی لقی ایک شاہ راہ بنادی ہی خواہ کوئی  
اس پر چلی یا نہ چلی۔

آزادی فی »آب حیات« لکھکر، اچائی قدامت کیا ہی۔ اردو نثر کو  
نظم کا ہمپایہ بنادیا ہی، اور اردو زبان کو تاریخی حیثیت بخشی ہی۔ پہلی  
شعراء یا نثاروں کی کلام پر تعریفیں یا تعریفیں ہوتی تھیں۔ آزادی کی قدر  
تنقید سی بھی کام لیا ہی، لیکن جو تنقید کا حق تھا اسی وہ ادا نہیں  
کر سکی۔ یا تو ان بزرگوں عزت دل پر اس قدر احاطہ کئی ہوئی

تھی (جن کا حال انھوں فی ہواۃ قلم کیا ہی) کہ کھل کر ان پر حرف کریں  
 سکریا ان کی بس میں نہ تھا، بازمانہ ان کڑوی مگر سچی باتوں کی گھونٹ  
 اپنی خلق سے اتاری کی لٹی آمادہ نہ تھا اور اس لٹی انھوں فی استعارات  
 و تشبیہات کی قند ملا کر ان کو لوگوں کی کلی سے اتارا۔

اسی / "آب حیات" کی ابتدائی صفحات "تاریخ زبان اردو" کی لٹی وقف  
 کئی کئی مین۔ اور حق یہ ہی کہ خوب داد تحقیق دی ہی۔ آجکل  
 بعض لوگوں کی رائی میں کتاب کا سب سے ناقص حصہ بھی ہی۔ جس  
 کی وجہ یہ ہی کہ آزاد فی ولی کو اردو نظم کا آدم مانا ہی اور ادھر نثر  
 میں میر فضل کی کتاب "دہ مجلس" کو اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب  
 کہا ہی جو ۱۱۴۵ ہجری کی تصنیف ہی، حالانکہ اب جدید دلدادگان  
 تحقیق و تدقیق فی اس امر کا سراغ لگا لیا ہی کہ سلطان قلی قطب شاہ  
 ولی سے بہت پہلی اپنا دیوان مرتب کر چکا تھا اور نثر میں شیخ عین الدین  
 "کنج العلم" اپنی اردو رسالی آٹھویں صدی ہجری میں تصنیف کر چکی  
 تھی۔ "آب حیات" سے پیشتر، اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اردو شعراء  
 کی دس بیس تذکری ضرور لکھی گئی۔ کوئی تذکرہ قطب شاہ کی  
 شاعری کا معترف نظر نہیں آتا اور جو تذکرہ نویس بھی اردو شاعری کو  
 شروع کرتا ہی وہ ولی سے ہی اسکی ابتدا کرتا ہی اور شالی ہند میں واقعہ بھی  
 بھی ہی کہ ابتدا سے ولی ہی کی کلام کو مقبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ ان حالات  
 کی ہونی ہوئی اگر آزاد فی ولی کو اردو نظم کا آدم مانا تو کیا برا کیا؟ کیا  
 ان کو چاہی تھا کہ وہ برسوں دکن کی خاک چھاتی؟ اگر وہ ایسا کرتی تو بھی  
 گوہر مقصود شاید ہی ان کی ہاتھ آتا جو اب حسن اتفاق سے دلدادگان تحقیق  
 کی ہاتھ آ گیا ہی، جس کی بنا پر انھوں فی آزاد کو سرتاسر غلط کہنا شروع  
 کر دیا ہی۔ ہم تو باوجود ان کی اس تحقیق کی اب بھی حضرت آزاد کو  
 حق بجانب سمجھتی ہیں کہ انھوں فی ولی کو اردو شاعری کا آدم مانا  
 ہی۔ فرا شاہ کی کلام کو ولی کی بالمقابل رکھ کر دیکھتی کہ کس کلام  
 کو اردو کا کلام کہا جائی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ فرمائی ہیں :

رکھه ايک هي هر ايک هي کدھن لاکھه جن هي  
 لکھه جوت هي هر نهار ولي نیک رتن هي  
 پيا باج پيال پيا جائی نا پيا باج يک نکل جيا جائی نا  
 ولي کا ارشاد هي :

خوبی اعجاز حسن يار اگر افشا کروں  
 ني تکلف صفحه کاغذ يد ينيضا کروں

اگر کچھ نہ کچھ کہنا هي تمغائی اردو شاعری هي تو کہینگی کہ  
 سلطان محمد قلی قطب شاہ سی بہت پیشتر امیر خسرو اردو کی شاعر ہوئی ہین  
 اور انکی کتاب 'خالق باری' جو ہر وقت تصنیف ابک ضخیم کتاب تھی کیوں  
 نہ نظم کی پہلی کتاب مانی جائی، جس کی مقبول و مشہور ہویکی یہ ادبی  
 دلیل هي کہ ايسوین صدی عیسوی کی آخر تک مکتبوں میں مبتدی طلباء کو  
 پڑھائی جانی تھی؟ حقیقت یہ هي کہ اعتراض کرنا بہت آسان کام هي لیکن تمام  
 باتوں پر نظر ڈالکر صحیح رائی قائم کرنا دوسری شی هي۔ آزادی فارسی زبان  
 کی تحقیق میں ایک عمر صرف کی تھی اور اردو زبان کی متعلق بھی کاملین فن  
 کی صحبت اٹھائی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ کسی زبان کی ابتدا میں کیا حالت  
 ہونی هي، اور رفتہ رفتہ قالب بدلتی بدلتی کس وقت اس قابل ہونی هي کہ اسی  
 زبان کھا جائی۔ اگر معترضین کی نظر کسی کی ارتقائی حالت پر پڑی ہوئی  
 تو وہ ہرگز یہ رکک الزام آزاد پر نہ لگائی کہ اہوں نی چوئکہ ولی کی  
 بجائی قطب شاہ سی اردو شاعری کا دور قائم نہیں کیا اور اردو نثر میں  
 شیخ عین الدین گنج العلم کی رسالوں کو اردو نثر کی پہلی کتابین نہیں  
 قرار دیا لہذا تصنیف 'آب حیات' پایہ اعتبار سی گری ہوئی هي اور وہ  
 تحقیق و تدقیق سی کام نہیں لیتی۔ ذرا معترضین آزاد کی تاریخ وفات اگلی  
 صفحوں پر ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ مولانا حالی جو ان کی  
 ہم عصر تھی اور جو ہم لوگوں سی زیادہ بہتر جانتی تھی وہ آزاد کی  
 نسبت کیا رائی رکھتی ہین۔ اور یہ بھی ظاہر هي کہ مولانا حالی

حقیقت نگار تھی۔ اگر فی الواقع ان کی بہ رائی نہ ہوتی تو وہ ہر گز آزاد کو اپنی اشعار میں محقق نہ فرماتی۔

بعض صاحبان اردو شعراء کی حالات میں حوالہ اور ماخذ چاہتی ہیں کہ آزاد فی یہ باتیں کس سی سنیں یا کن کتابوں سی اخذ کیں۔ میری نزدیک یہ سراسر غلط ہی کہ دو صدی کی بعد جن نزرگون کی سوانح لکھی جائیں، ان کی حالات کا حرف حرف تاریخ کی طرح حوالہ جات سی مستند کرایا جائی ورنہ عدم حوالہ جات کی صورت میں ان واقعات سی انکار کیا جائی۔ اول تو شاعروں کا تذکرہ کوئی تاریخ نہیں ہوتا جس کی صحت و عدم صحت سی کسی قسم کا اثر مرتب ہو۔ دوسری آزادی اپنی کتاب اس وقت لکھی تھی جب کہ ماخذوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ آجکل لازمی ہو گیا۔ پس جسوقت تک کوئی واقعہ غلط نہ ثابت ہو جائی، اسوقت تک ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہی کہ ہم کسی امر کی خواہ مخواہ تکذیب کریں اور ایک واقعہ غلط ہونی پر تمام کتاب کو لغو قرار دیں۔ بلکہ میں تو نہ عرض کروں گا کہ شاعروں کی حالات جس دلچسپی کی ساتھ وہ بیان کئی کئی ہیں اسی دلچسپی سی تنقید کی ساتھ پڑھی جائیں تو بہتر ہی، کہ اس سی لطف دو بالا ہوتا ہی اور ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اگرچہ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ جو واقعات ہمیں پڑھی ہیں وہ دراصل وقوع میں نہیں آئی، علاوہ ازیں آزاد کی نسبت میرا یہ خیال ہی کہ انہوں فی شاعروں کی تمام حالات یا حضرت ذوق اور ان استادوں سی سنی تھی جن سی ان کو دوچار ہونیکا موقع ملا یا انہوں فی مختلف تذکروں سی جمع کئی ہیں۔ وہ ایسی آدمی نہیں معلوم ہوتی کہ خواہ مخواہ انہوں فی حالات کو دلچسپ بتانی کیلئے واقعات تراشی ہوں۔ یہ ممکن ہی کہ جو کچھ انہوں فی سنا ہو اس کا اکثر حصہ کچھ رد و بدل ہو کر ان تک پہنچا ہو۔ بہر حال ہم تو »آب حیات« کو ہر لحاظ سی ایک لاجواب کتاب سمجھتی ہیں، موجودہ دور کی مصنفین جب اس سی بہتر کتاب لکھینگی تو ہم ان کی تحقیق کو مان لینگی اب تک تو باوجود دو تین تذکرۃ الشعراء لکھی جانی کی »آب حیات« اپنی آپ نظیر ہی۔

» دربار اکبری « بھی اپنی عبارت کی رنگینی کی اعتبار سے آزاد کی بہترین تصنیفات میں سے ہے۔ اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظر ثانی کی مدد نہ چھپوا سکی کیونکہ عرصہ سے وہ پیرانہ سالی اور بعض امراض میں مبتلا تھی، اور ان کی دماغ کی حالت خراب ہو گئی تھی، تاہم کتاب کی دلاویز ہونی میں کوئی شک نہیں۔ » دربار اکبری « کی عبارت دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو ضرور لارڈ میکالی کی تاریخ نویسی یاد آجائی گی۔ جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سے پیدا ہوتا ہے، بعینہ آزاد کی تحریر اردو میں دل پر وہی اثر کرتی ہے۔ اور جس طرح لارڈ میکالی کی تاریخ انگلستان ناقابل اعتناء ہے، بعینہ یہی حال ایک حد تک » دربار اکبری « کا ہے، کیونکہ آزاد نے اپنی آراء اور جذبات کو ہر جگہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ امر فن تاریخ نویسی کی بالکل خلاف ہے، اگرچہ اکثر مورخ اسی دام میں پھنس جاتی ہیں۔

تعلی و خود بینی :

آزاد طبع حضرت آزاد کی مزاج میں کچھ تعلی و خود بینی کا مادہ بھی موجود تھا، اسوجہ سے اکثر اپنی معاصرین سے علمی نوک جھوک اور مخالفت رہا کرتی تھی۔ پروفیسر آزاد کا خاندانی مذہب امامیہ تھا مگر بعض بعض باتوں میں اپنی ذاتی رائے خاندانی مذہب سے الگ رکھتی تھی۔

جنون کی آثار پیدا ہونا :

جناب آزاد کی صحت عرصہ سے فرسودہ ہو گئی تھی، اپنی صاحبزادی کی انتقال کا صدمہ، جس کو انھوں نے ایسی اعلیٰ تعلیم دی تھی کہ وہ ان کی تصانیف کی نظر ثانی کیا کرتی تھی، ان کی دل پر ایسا ہوا کہ اس حادثہ جانکاہ کی بعد پھر ان کی طبیعت کبھی بحال نہ ہوئی، اسپر ایران کی دوسری سفر کی تکالیف اور زیادہ ہوئیں۔ ان سب واقعات نے دماغی مصروفیت کی انتہائی کثرت کی ساتھ ملکر ان کی دماغی تر و تازگی کو خشک اور

پریشان کر دیا اور اگست ۱۸۸۷ء سے جنون کی آواز پیدا ہو گئی۔ وقتہ رفتہ  
 بہ مرض پختہ ہو گیا اور آخر دم تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

### الہیات کا شغل:

عالم جنون میں ان کا شغل الہیات تھا، اسی کا ذکر اذکار اہل  
 سکی زبان پر رہتا تھا۔ انہیں ایام میں ایک مرتبہ آپ رائی بہادر  
 ماسٹر پیاری لال سے ملنی آئی۔ دو تین گھنٹی کی قریب ملاقات رہی،  
 لیکن بار بار یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلتی تھی:

» رائی صاحب! آپ اس شعر کو پڑھا کیجی، اسکی معنی آپ  
 جو چاہیں سمجھ لیں:

پردہ در کعبہ سے اٹھا دینا ہی آسان

پر پردہ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا

### حالت جنون کی تحریر:

حضرت ممدوح فی اپنی ذاتی تالیفات و تصنیفات کی علاوہ اپنی استاد ذوق  
 کا حق شاگردی بھی کما ینبغی ادا فرمایا ہی یعنی استاد ذوق کا ایک دیوان خاص  
 اپنی اہتمام سے مرتب کیا ہی جس میں ان کی سوانح عمری اور اوائل عمر سے  
 بالترتیب کلام جمع کر کے دکھایا ہی کہ فلاں غزل، فلاں قطعہ، فلاں محل اور موقع  
 پر کہا تھا۔ یہ دیوان چھپ گیا ہی۔ بعض لوگوں کا اسکو نسبت خیال ہی کہ  
 آپنی اس میں جا بجا تصرف کیا ہی بہر حال مجموعی حیثیت سے یہ امتیاز  
 ضرور ہی کہ سابقہ مرتب دیوان سے اس کا کلام زیادہ صحیح ہی۔ »دیوان  
 ذوق« چھپنی کی بعد جب ایک کاہی ان کی سامنی رکھی گئی اور خانہ لکھنی  
 کی درخواست کی گئی، کئی دن تک انکار کرتی رہی، ایک دن خود ہی  
 ہوات قلم لیکر ایک صفحہ لکھ دیا، جو »دیوان ذوق« کی خانہ پر درج ہی۔  
 اس میں اور حالت صحت کی تحریر میں کچھ فرق نہیں۔ البتہ اس میں بھی  
 تصوف اور الہیات کی بو آتی ہی۔ بقول مؤلف »خانہ جلوس« اس بگڑی ہوئی

حالت میں بھی جب کبھی قلم دوات کی نصیب کھل جاتی تو عجیب عجیب گل افشائیاں کرتی کہ اب کوئی ذی ہوش بھی ایسی گلکاریاں نہیں دکھا سکتا۔ ان کی حال پر خود آزاد ہی کی شعر کا مضمون صادق آتا ہی:

اگر میں ہوش میں ہوتا تو پھر کیا جانی کیا ہوتا

فروغ دیدہ عالم میں یہ مد ہوشیاب میری

یہ قابل زیارت پروفیسر لاہور موجی دروازہ میں رہتی تھی۔ اگرچہ دماغی عارضہ کی سبب ان کا عدم وجود برابر تھا، تاہم علم دوست طبیعتوں اور نگاہوں کیلئے ان کا شربت دیدار مسرت افزا تھا اور یہ شعر ان کی حسب حال تھا:

تیری دانائی کی قائل تھی سب افلاطون منس  
شاعری فی کردیا ای داغ سودائی نبھی

آخر اس حالت میں خودی میں بمر ستر سال ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ع مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ ہجری کو حضرت آزاد اس قید ہستی سے آزاد ہو گئی اور لاہور میں دفن ہوئی۔ مولانا حالی فی جو تاریخ وفات لکھی تھی اس کی اشعار یہاں درج کئی جانی ہیں۔

سہ

آزاد وہ دریائی سخن کا در یکتا  
جس کی سخن آرائی پہ اجاع تھا سب کا  
ہر لفظ کو مائینگی فصاحت کا نمونہ  
جو اس کی قلم سی دم تحریر ہی ٹپکا  
ملکوت میں پھر مدتوں تحقیق کی خاطر  
چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا  
دیکھا نہ سنا۔ ایسا کہین اہل قلم میں  
تصنیف کا، تدوین کا تحقیق کا لپکا

صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں  
ہمت تھی بلا کی توارادہ تھا غضب کا



فرض اپنا ادا کر کی کئی سالہ سی مشتاق  
 بیٹھا تھا کہ آئی کہیں پیغام طلب کا  
 آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا  
 آہنچا نصیبوں سی بلاوا اسی رب کا  
 تاریخ وفات اوس کی جو پوچھی کوئی حالی  
 کھدو کہ 'ہوا خاتمہ' اردو کی ادب کا  
 (اس کی بعد اصل کتاب میں پروفیسر آزاد کی کتابوں سی چند اقتباسات  
 درج کئی کئی ہیں جو بوجہ طوالت نظر انداز کئی جاتی ہیں . تنہا)

(۱) اس تاریخ میں سنہ ۱۳۲۷ ہجری نکلتا ہی، حالانکہ آزاد کی وفات  
 سنہ ۱۳۲۸ ہجری میں واقع ہوئی ہی لیکن سنہ ۱۳۲۸ ہجری میں  
 صرف نو دن زیادہ ہوتی تھی لہذا اس قسم کی تاریخ جائز ہی، تنہا

# عربی رسم الخط

(مقتبس از دائرۃ المعارف اسلام)

عربی رسم الخط اگرچہ باعتبار زمانہ بہت زیادہ قدیم نہیں لیکن جغرافی اعتبار سے یہی ایک رسم الخط ہی جسے رومی رسم الخط کی بعد سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ حدود چین سے لیکر شمالی افریقہ کی مغربی سواحل اور قسطنطنیہ سے لیکر جزائر ملائیا تک تمام زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ یوں بھی دنیا کی ہر حصہ میں اس کی جانی والی موجود ہیں اور اسکا تھوڑا بہت استعمال ہر جگہ ہوتا ہے۔

گذشتہ صدی تک برابر یہ خیال چلا آتا تھا کہ عربی رسم الخط کی ابتدا خط کوفی سے ہوئی، قدیم عربی دستاویزین، قرآنی آیات، سکی اور سنگی کتب سب اسی خط میں ملتی ہیں، لیکن پچھلی صدی میں جب سے متعدد پاپیرس (Papyrus) دستیاب ہوئی ہیں یہ خیال باطل ہو گیا ہے۔ اس سے بھی تعجب خیز امر یہ ہے کہ ابتدا میں عربی رسم الخط کی جو صورت تھی وہ خط نسخ سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ خط کوفی سے مشابہ صرف دو کتب ملتی ہیں، ایک زبید کا کتبہ (۵۱۲ ع) جو عربی، سریانی اور یونانی تین زبانوں میں ہے اور دوسرا حرانی کتبہ ۲ جس کا زمانہ ۵۶۸ ع ہے اور جو یونانی اور عربی دو زبانوں میں ہے۔

یہ کتبیں بابلانی خود ان کتبات سے مشابہ ہیں جو جزیرہ نمائی کنعان میں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان دونوں خطوں کی درمیان جو مشابہت پائی جاتی ہے اس سے علما قدرتا اس نتیجہ پر پہنچی کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسری سے ماخوذ ہوگا۔ کنعانی کتبوں کی زبان ببطی (آرامی کی)

- (۱) بین کا قدیم شہر۔
- (۲) حران، "الجزیرہ" کا مشہور شہر حونسطوری علم و حکمت کا مرکز رہا ہے۔

ایک شاخ) ہے۔ لیکن اس رسم الخط کا زمانہ ان ببطی کتبوں سے متاخر ہے جو دمشق سے لیکر مدینہ تک ہر جگہ ملتی ہیں اور جنکی قدامت ولادت مسیح (علیہ السلام) تک پہنچتی ہے۔<sup>۲</sup> بایں ہمہ ان کتبوں کی قدم اور متروک خط میں بھی عربی رسم الخط کی اکثر اجزاء موجود ہیں

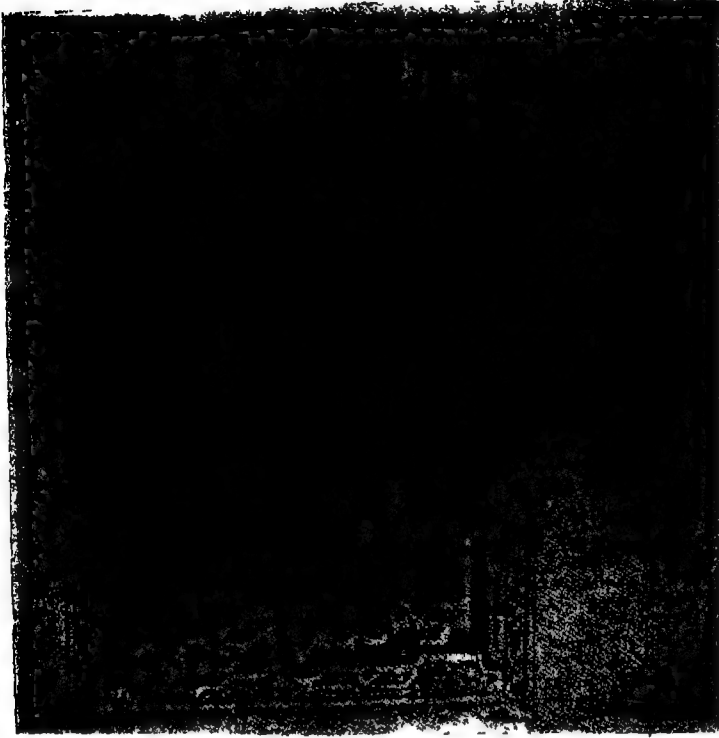


دمشق کا ایک قرآن، ۲۶۰-۲۵۶ء ہجری

لسانی اور تاریخی اعتبار سے کتبات کچھ بہت زیادہ اہم ہیں ان میں اس ببطی خط کی نقل کی گئی ہے جسے ۴ دوسری صدی کی آخر اور تیسری صدی کی آغاز میں ببطی دارالسلطنت نے<sup>۲</sup> میں رواج تھا۔ آخری سے آخری کنعانی کتبات کا زمانہ ۲۳۰-۲۱۰ ع ہے اور قدیم سے قدیم عربی کتبوں کی ابتدا ۵۶۸-۵۱۲ ع سے ہوتی ہے۔<sup>۳</sup> سارہ کا عربی کتبہ<sup>۳</sup> جس کا زمانہ ۳۲۸ ع ہے ببطی خط میں لکھا گیا ہے، لیکن اس میں بھی ایک

- (۱) ببطی تقریباً ۴۰۰ ق م سے ۱۰۶ ع تک شامی حجاز<sup>۲</sup> میں حاکم رہی
- (۲) بطرا (Petra) جس کا دوسرا نام الرقیم ہے شامی حجاز میں واقع ہے۔
- (۳) امراء القیس بن عمرو کی قبر کا کتبہ جس کی الفاظ یہ ہیں: "عربوں کا بادشاہ جس نے تاج پہنا اسد اور طی پر حکومت کی۔"

جدید رسم الخط کی آغاز کی علامتیں موجود ہیں، مثلاً حروف کا ملانا،  
 کی صورت اور حرف سامک کی عدم موجودگی۔



قرآن مجید مرصع کوفی خط میں تحریر ابو بکر غزنوی ۵۶۶ ہجری

لہذا خیال یہ ہے کہ نبطی رسم الخط کی چونہ ہی پانچویں صدی عیسوی  
 میں عربی رسم الخط کی صورت اختیار کر لی ہوگی، لیکن اس مسئلہ کی حل  
 کی لٹی کہ آیا یہ تغیر بطرا میں رونما ہوا یا بوخیز غسانی ریاست میں  
 جو بطرا کی نواح میں قائم ہوئی ہمیں مزید تحقیقات کا انتظار کرنا  
 چاہی۔ اعداد کی اعتبار سے عربی رسم الخط کی موجودہ ترتیب قدیم ترتیب  
 سے بالکل مختلف ہے، نبطی حروف تہجی میں ت = ۷۰۰ سب سے آخری  
 حرف ہے۔ اسی اعتبار سے عربی رسم الخط میں حروف ث = ۵۰۰، خ = ۶۰۰

(۱) اب تک نبطی حرف، مفصل بحث کی لٹی ملاحظہ ہو جبریل رائیل ایشیائک سوسائٹی۔

ذ=۷۰۰، ض=۸۰۰، ط=۹۰۰ اور غ=۱۰۰۰ کا اضافہ ہوا۔ یہ  
حروف بطلی خط میں موجود نہیں۔

عربی حروف تہجی کی موجودہ ترتیب غالباً اس خیال پر مبنی ہے کہ یکساں  
حروف کو ایک ساتھ لکھ لیا جائی، لیکن اس اصول پر بھی پوری طور پر



قرآن مجید مرصع کوفی خط میں۔ تحریر ابو بکر غزنوی ۵۶۰ ہجری

عمل نہیں ہوا، موجودہ ترتیب میں حرف ی کو ب ت ث کی ساتھ نہیں بلکہ سب  
سی آخر میں لکھا جاتا ہے، شاید اس لٹی کہ آخر میں اسکی شکل بالکل بدل دی

کئی ہی (ی)۔ قدیم خط میں ف اور ق کی آخری حمی باہم مشابہ نہیں تھی  
 دانیہمہ ان دونوں کو ساتھ ساتھ لکھا گیا۔

غالباً حروف نہجی کی موجودہ ترتیب اسلام سے قبل مکمل ہو چکی  
 تھی۔ یہ امر یاد رکھنی کی قابل ہے کہ مغربی (افریقی) خط حسکا آغاز  
 دوسری صدی ہجری میں ہوا باعتبار ترتیب ابک حد تک ببطی خط کا  
 باندھ ہی۔ ہر کیف عربی رسم الخط کی ابتدا نظراً ما ریاست غسان جہان  
 کھن سی بھی ہوئی رفتہ رفتہ اس کا حلقہ اثر وسیع ہوا شروع ہوا۔  
 اس کا اصلی سبب عرب کی وہ تجارتی سرگرمیاں ہیں جنکا سلسلہ جنوب  
 سے لیکر شمال تک پھیلا ہوا تھا، جس طرح چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا  
 میں اس کا رواج شام میں ہوا تھیک اسی زمانی میں اس کا اثر جنوب  
 میں بھی پہنچا۔ ایک سو برس کی بعد اسلام کا ظہور ہوا اور مشرق و مغرب  
 میں ہر جگہ اس کا دور دورہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زمانہ میں مکہ میں صرف  
 ستر آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کی علاوہ کچھ عورتیں بھی تھیں۔  
 غالباً یہ روایت صحیح نہیں اس لیے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتابوں  
 میں ۵۰ سے لیکر ۱۰۰ آدمی کام کرتے تھے، علاوہ ازیں مصریوں کی طرح اہل مکہ  
 بھی کتابت کی شوق میں ہر طرح کا سامان ترقیم استعمال کرتے تھے اور مکہ ایسی  
 تجارتی شہر میں یہ امر کچھ بھی تعجب خیز نہیں۔ کان غالب یہ ہے کہ اس وقت  
 بہت کا فی لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اندرین حالات عربوں کا یہ خیال  
 ہے کہ اس کی بعد عراق زبیرین کی لخمی ریاست حیرہ میں لکھنی پڑھنی کا  
 رواج ہوا غلط معلوم ہوتا ہے۔ وید ہاؤزن کا خیال ہے کہ یہاں لکھنی پڑھنی  
 کی ابتدا عیسائیوں کی بدولت ہوئی۔ ہر کیف یہ امر یقینی ہے کہ طرفہ کی زمانہ  
 میں (چھٹی صدی عیسوی کا آخری نصف) یہاں عربی رسم الخط کا رواج  
 ہو چکا تھا۔

اسلام کی بدولت فن کتابت کو از سر نو تحریک ہوئی۔ ۶۲۲ء میں بھی

قرآنی عبارات قلمبند ہو چکی تھیں اور پھر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی زمانی میں جب قرآن کا ایک نسخہ سرکاری طور پر معین کر دیا گیا تو لکھنا پڑھنا عام ہو گیا۔

عربی رسم الخط کی قدیم ترین نمونی جنکا تعلق اسلامی عہد سی ہی یہ ہیں

(۱) متعدد سکی جنکا زمانہ ۶۴۱ ع. ہی۔

(۲) بعض کتب: قبة الصخرہ (قدس) کا کتبہ (۹۲-۲۹۱ ع) ۷۲ ہجری

خليفة عبد الملك کی تین سنگھائی میل جنپر کوئی تاریخ نہیں دی گئی۔ قصر خرائی کا کتبہ (۱۱-۷۱۰ ع) ۹۲ ہجری۔ مناسب معلوم

ہوتا ہی کہ یہاں دوسری صدی ہجری کی کتبات کا تذکرہ بھی کر دیا جائی: (۱) کتبہ قصر الاخون (تدمر کی شمال مشرق میں)

۱۱۰ ہجری اور (۲) کتبہ قصر الحائر (تدمر کی جنوب مغرب میں)

جنہیں خلفہ ہشام فی طار کرانا تھا؛ (۳) کتبہ مصر بالائی؛ (۴)

کتبہ معسکر جراس؛ (۵) کتبہ مسجد عسقلان؛ (۶) کتبہ حوض رملہ؛

(۷) عہد ہارون رشد کا اشنی کتبہ جو سرحد کی پتھر پر کندہ تھا

اور اس وقت راقم الحروف ا کی پاس موجود ہی؛ (۸) مقابر مسطاط

کی لمص کتب

(۳) متعدد دستاویزیں جو پپیرس (Papyrus) پر لکھی گئی ہیں اور

جنکا زائد حصہ ساتویں صدی کی آخری زمانی سی تعلق رکھتا ہی۔

عربی رسم الخط فی جو سادہ صورت اختیار کی اس میں اکثر حروف

بالکل یکساں تھی۔ لہذا سریانی طرز تحریر کی تتبع میں ان میں سی بعض

پرنقطی لگادئی گئی۔ ان کا آغاز غالباً طہور اسلام سی پہل ہی ہو چکا تھا،

البتہ سب سی آخر میں جس حرف پرنقطی لگائی گئی (دوسری صدی ہجری)

وہ ة ہی۔ ایسی ہی ف اور ق کی صورت میں بھی کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

ابتدا میں و کو ب اور ق کو ف لکھا جاتا تھا، چنانچہ مغرب میں

اب بھی ان حروف کی پرانی شکل قائم ہی۔

(۱) B. Moritz جنہوں نی اس مضمون کو لکھا ہی:

اعراب کی ابتدا بھی زمانہ قدیم ہی میں سریانی کی تقلید میں ہوئی۔ شروع شروع میں ان علامات کی لٹی بھی نقطی استعمال کٹی جاتی تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ ان میں اور حروف کی اصلی نقطوں میں تمیز ہوسکی ان کی لٹی سیاہی کی بجائی سرخ یا نیلا یا کوئی اور رنگ استعمال کیا جاتا تھا، البتہ بعض دستاویزوں میں نقطوں کی بجائی دائری استعمال ہوتی ہیں، یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری میں اعراب فی موجودہ صورت اختیار کیے۔ عربوں کا بیان ہے کہ انکا وجود مشہور بحوی خلیل (۷۸۶ = ۸۷۰ م) تھا۔ ظاہر ہے کہ اعراب کی موجودہ صورت جیسا کہ ضمه (پیش = جزم) سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے حروف علت سے مستخرج ہے۔

ہمزہ اور تشدید کی ایجاد بھی خلیل کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی ابتدا کا زمانہ متعین نہیں پھر بھی یقین ہے کہ انکا آغاز فتحہ، کسرہ اور ضمه سے مؤخر ہے۔ فتحہ و کسرہ کی طرح ہمزہ کی صورت میں بھی کافی تغیر و تبدل ہوتا رہا۔ قرآن مجید کی قدیم ترین نسخوں میں اس کی لٹی دو سرخ نقطی استعمال ہوئی ہیں۔ آ کی چل کر دو نقطوں کی بجائی الف یا ی کی سچی نیلی رنگ میں ایک نقطہ یا ایک دائرہ بنادیا جاتا تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں قدیم سامانِ ترقیم کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زمانی میں تمام تحریریں چوڑی پر لکھی جاتی تھیں۔ اکثر اس چوڑی کو سرخ رنگ لیا جاتا تھا۔

(۲) عصب یعنی کھجور کی چھال۔

(۳) غلم، اونٹ کی ہڈی۔ بالعموم پسلیوں اور کاندھوں کی چوڑی ہڈیاں

استعمال کی جاتی تھیں

(۴) خذف یا شقف (ٹھیکری) مختصر تحریریں انہیں پر لکھی جاتی تھیں۔ یونانی قبطی دور اور زمانہ قدیم میں یہ چیز عام طور



پر لکھنی کی لٹی استعمال ہوتی تھی۔  
(۵) لخاف یعنی چینی سفید پتھر غالباً یہ چوٹی کی پتھر کی چھوٹی چھوٹی  
ٹکڑی ہوتی ہونگی۔ افسوس سی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک انکا کوئی نمونہ  
دستیاب نہیں ہوا۔

(۶) غالباً لکڑی کی تختیاں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ کتبخانہ خدیوہ  
میں ایک لوح موجود ہے جسکی ایکطرف سورة الفجر مرقوم ہے۔  
(۷) رقعه (یا جلد یا فلجان) (Parchment)۔ یہ چیز نہایت گراں تھی۔  
(۸) قرطاس، یا قرطاس مصری (Papyrus)۔ زمانہ قدم ہے سی مصر اس  
سکی ساخت کی لٹی مشہور ہے۔ جب تک کاغذ کا رواج نہیں ہوا اسی کا  
استعمال ہوتا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں کاغذ کا رواج ہوا  
عربی رسم الخط کی ابتدا کسوتکر ہوئی اس کی متعلق عربی روایات  
سی کچھ مدد بہین ملتی۔ بلاذری کا خیال ہے کہ اس کا آغاز رباست لخم  
میں ہوا۔ ابن خلدون اور ابن خلکان نے بھی یہ کہہ کر کہ عربی خط  
حیرہ و انبار سی آبا بلاذری کی ٹائید کی ہے۔ البتہ صاحب الفہرست<sup>۱</sup> فی  
ہشام الکلبی (م۔ ۲۰۴) کی سند پر یہ روایت نقل کی ہے کہ سب سی پہل  
جن لوگوں نے عربی خط تحریر کیا وہ ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون،  
صفص اور قرسات تھے۔ یہ مدین کی پادشاہ تھی جو وہاں کی مشہور زلزلہ کی  
نذر ہو گئی<sup>۲</sup>۔ اس روایت سی پتہ چلتا ہے کہ عربی خط دراصل نبطی  
خط سی ماخوذ ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہیں اسکی ابتدا  
ہوئی ابو (ابن) ندیم ابن ابی سعد نے انک اور روایت میں ان پادشاہوں کی نام  
زیادہ صحیح شکل میں یوں بیان کئی ہیں:

ابجاد، ہاوز، حاط، کلمان، صاع نص، قرست

(۱) ابن الندیم  
(۲) ظاہر ہے کہ ان پادشاہوں کی نام فرضی ہیں۔ مدین شمالی حجاز میں ساہل  
بحر پر آباد ہے۔

اگر ان میں سے الف کو حذف کر دیا جائی تو باقی ماندہ حروف سے اصلی خط کی ترتیب ظاہر ہو جائیگی سو انہی میں سے ایک متروکہ بڑی حرف سامک کی بجائی میں اور میں کی بجائی میں کا اضافہ ہوا۔ اسلام کی پہلی ۵ صدیوں کی علوم و فنون کی ترقی کی ساتھ رسم الخط کو بھی غیر معمولی فروغ ہوا، لیکن شروع شروع میں تمام تر توجہ اسکی جمالی پہلو پر رہی۔ صاحب الفہرست فی ان میں سے بہت سی خطوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن چونکہ موجودہ زمانہ میں ان کا کوئی مستند نمونہ باقی نہیں رہا ہے لہذا یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے ہر خط کی صورت کیا تھی۔ امتداد زمانہ کی ساتھ میں بھی بہت سی خط ناپید ہو گئی۔

عباسیوں کی عہد کی بڑی بڑی خوشنویسوں میں علی بن عبدالرحمان (م ۲۱۹ ہجری) کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔ علی الرحمانی ایک قسم کی آرائشی خط، خط ریحانی کا موجد ہے۔ ابن مقلا (۳۲۸-۲۷۲) اور اس کا بھائی ابو عبد اللہ الحسن (۳۲۸-۲۶۸) بھی مشہور خوشنویس ہیں، لیکن انہوں نے فن کتابت میں جو کمال پیدا کیا، اس کی متعلقہ ہیں کوئی عام نہیں۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ کا درباری خوشنویس یاقوت المستعصمی اس زمانہ کا نہایت مشہور کاتب تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی ہاتھ کی لکھی ہوئی قرآن مجید کی دو نسخہ اب تک موجود ہیں۔ یاقوت بجائی خود ایک جداگانہ طرز تحریر، خط یاقوتی، کا بھی موجد تھا۔ بغداد کی بعد اسلامی علم و حکمت کا دوسرا مرکز قاہرہ تھا، جسی فاطمیوں کی زمانہ میں غیر معمولی فروغ ہوا۔ فاطمیوں کی بعد ایوبی مور ایوبیوں کی بعد مالیک مصر کی حاکم ہوئی۔ فاطمیوں کی عہد میں خط نسخ کو غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ایوبیوں کی زمانہ میں جیسا کہ سلطان صلاح الدین کی سنگی کتبوں کی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، اس نے ایک خاص مگر متناسب صورت اختیار کی: ہم اس خط کو خط ایوبی کہہ سکتے ہیں۔ خط نسخ نے انتہائی خوبصورتی مالیک کی عہد میں حاصل کی۔ مملوک پادشاہوں نے کاتبوں اور خوشنویسوں پر عباسی شہنشاہوں

سی کچھ کم توجہ نہیں کی۔ قلعہ شندی فی اپنی کتاب کی دوسری تہی میں اس عہد کی مختلف خطوط پر تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ اس زمانی کی سنگی کتبوں سے بھی ایک نہایت درجہ خوبصورت اور متناسب طرز تحریر کا پتہ چلتا ہے۔ مہالیک کی زوال کی بعد عثمانی ترک اسلامی تہذیب کی رہی سہی یادگاروں کی مالک ہوئی۔ انہوں نے بھی فن خوشنویسی کو بہت کافی ترقی دی کہا جاتا ہے کہ ایک زمانی میں دولت عثمانیہ میں تیس قسم کی خطوط رائج تھی۔ حمد اللہ (م ۹۳۶ھ = ۱۵۳۰ع) اور حافظ عثمان (م ۱۱۱۰ھ = ۱۶۹۸ع) مشہور ترکی خوشنویس ہیں۔

اوپر سان ہوچکا ہے کہ عربی رسم الخط کی قدیم ترین نمونہ چھٹی صدی مسیحی کی دو کتب ہیں۔ انکا طرز تحریر خط کوفی سے مشابہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس زمانی میں صرف اسی ایک خط کا وجود تھا یا اس زمانی اس مدور خط کا رواج تھا جس نے بعد میں خط نسخ کی صورت اختیار کی۔ اب تک ہم کو جو بات وثوق سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں دو قسم کی خط موجود تھی ایک نوکدار اور دوسرا مدور اور اس اختلاف کی وجہ غالباً سائنات کا باہمی فرق تھا۔

دوسری صدی ہجری میں ان دونوں خطوں میں سے ایک نے زیادہ نوکدار صورت اختیار کی۔ زمانہ قدیم ہی سے مؤخر الذکر کا نام خط کوفی چلا آیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خط کوفہ کی بنا سے ایک صدی پیشتر عراق میں موجود تھا، لیکن سب سے پہلی اسی کوفہ ہی کی بدولت جو بغداد سے قبل اسلامی تہذیب کا مرکز تھا، شہرت ہوئی۔ یہیں یہ خط سرکاری تحریروں میں استعمال کیا گیا اور پھر بعد کی زمانہ عروج میں دنیای اسلام کی ہر حصی میں اس کا رواج ہو گیا۔ غالباً خط کوفی کی اصطلاح کی ابتدا بھی بغداد میں ہوئی، اس کا سب سے قدیم تذکرہ میں الفہرست میں ملتا ہے، جسکی مصنفہ فی تین اور خطوں یعنی خط مکی، خط مدنی اور خط ہسری کا بھی تذکرہ

کیا ہی۔ عجیب بات ہی کہ مصر اور کوفہ میں تو باوجود معمولی مسافت کی دو جگہ گانہ خطوں کا رواج ہو اور شام جو پون صدی تک سلطنت اسلامی کا مرکز رہا اور مصر کی طرف جہاں کتابت کا ہمیشہ رواج رہا کوئی خط منسوب نہ ہو۔

تقریباً پانچ صدیوں تک قرآن مجید کی نسخی صرف خط کوفی میں لکھی جاتی تھی لیکن امتداد زمانہ کیساتھ اسکا رواج کم ہوتا گیا۔ عام خط و کتابت کی لئی اس زمانہ میں ہی بالعموم مدور خط کو استعمال کرتی تھی اس لئی کہ خط کوفی میں کچھ لکھنا تکلف سی خالی نہ تھا۔ خط کوفی فی تین طرز اختیار کئی:

(۱) قدیم، سادہ کوفی طرز جس کا رواج تیسری صدی ہجری تک رہا۔ اس میں بعض حروف کی بالائی حصوں کو موڑ دیا گیا ہی۔ اس سی پتہ چلتا ہی کہ اس رسم الخط کو آرائشی صورت دینی کا آغاز ہو چکا تھا (۲) کوفی خط کا وہ دور جس میں حروف کی تزئین و آرائش کی خیال سی ان میں نقش و نگار کی صورت دی گئی تھی۔ فاطمونی کی عہد میں اس طرز کو بی حد فروغ ہوا۔

(۳) پانچویں اور چھٹی صدی میں عراق اور شام کی کوفی خط میں حروف کو نہایت خوبصورتی سی ایک دوسری میں الجھادبا گیا ہی، لیکن بالآخر جیسا کہ عیسائیوں کی آخری سکوں کی دیکھنی سی معلوم ہوتا ہی اس خط فی نہایت قبیح صورت اختیار کر لی۔

اس غیر طبعی اور تکلیف دہ خط، یعنی خط کوفی کی خلاف چھٹی صدی ہجری میں ایک رد عمل شروع ہوا یہ سوال کہ آیا اسکی ابتدا ایران کی اس سنی تحریک سی ہوئی جو پانچویں صدی ہجری میں فاطمہ مصر کی خلاف پیدا ہوئی یا اسکا رواج مغرب سی مشرق میں پھیلا ابھی تک زیر بحث ہی۔ بہر کیف یہ امر یقینی ہی کہ مدور خط کا سب سے پہلا نمونہ علی بن یوسف ابن تاشقین (۵۲۷-۵۰۰) سلطان مراہطین کی سکوں سی ملتا ہی۔ دولت موحدین کی ابتدا (۵۲۴) کی

ساتھ اسکی رواج میں اور بھی اضافہ ہوا۔ موجودین کی سبب ہی سکی اسی خط میں ملتی ہیں۔ کوفی خط کا آخری کتبہ جو مصر میں ملا می ۵۵۵ ہجری (۱۲۳۰ ع) کا می، لیکن مدور خط کا رواج اس سے ایک صدی پیشتر المستنصر<sup>۱</sup> (۴۸۷-۴۷۶ = ۱۰۹۴-۱۰۳۶) کی زمانی سی ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ اسکا رواج شام میں پھیل گیا۔ خط نسخ کا پہلا صحیح نمونہ افضل والی دمشق (۵۹۲ = ۱۱۹۶) کی ایک درہم سے ملتا می۔ ۶۲۲ ہجری (۱۲۲۵) کی بعد خط نسخ کا رواج سلاجقہ روم میں ہوا، چنانچہ ساتویں صدی ہجری کی بعد ایشیائی کوچک کی تمام کتب اسی خط میں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں خط کوفی کا بھی کوئی نمونہ ملتا می لیکن محض آرائش کی لئی۔

البتہ الجزیرہ کی مشرقی حص اور ایران میں خط کوفی کا رواج دیر تک قائم رہا۔ دولت عباسیہ کی آخری یادگاروں اور ایران کی تمام عمارات میں اگرچہ ہلاکو اور ہلاکو کی بعد تیمور کی ہاتھوں ایران کی تمام اسلامی یادگاریں برباد ہو گئیں، تاہم ۶۲۰ (۱۲۲۳) تک اسی خط کا استعمال ہوتا رہا۔

جن جن ممالک پر عربوں کا قبضہ ہوتا گیا ان میں تھوڑی بہت ترمیم کی ساتھ عربی رسم الخط کا رواج پھیل گیا۔ اس اعتبار سے مغربی رسم الخط سب سے قدیم می۔ روایات سے پتہ چلتا می کہ سب سے پہلی اس خط کا آغاز قیروان میں ہوا، جو ۵۰ ہجری (۶۷۰) میں آباد ہوا اور مغرب میں اسلام کا سب سے پہلا سیاسی مرکز می، اور پھر ایک صدی بعد جامع قیروان کی بنا کی ساتھ مسلمانوں کا علمی مرکز بن گیا۔ دوسری صدی ہجری کی آخر میں جب دولت اعلیہ<sup>۲</sup> کی ساتھ مصر ہمیشہ کی لئی مغرب سے علیحدہ ہو گیا تو قیروان کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ قیروان دولت اعلیہ کا مرکز تھا۔ یہیں اس نئی خط (خط قیروان) کی

(۱) ابونعمان المستنصر بالله، آنھوان فاطمی خلیفہ۔

(۲) ۱۵۰-۲۹۹ ہجری۔



NABATAEA		
1-3. Century.		
PETRA, SINAI, YEMEN		
Α	666611	
Β	33311111	-
Γ	1122552	2
Δ	77777	7
Ε	ππββδδδδ	δ
Ζ	9992	9
Θ	1	1
Η	ηηηηηη	η
Θ	666666	6
Ι	4	4
Κ	3	3
Λ	55, 11	11
Μ	00000000	0
Ν	11111111	11
Ξ	2	2
Ο	4444444	4
Π	3333	3
Ρ	5555	5
Σ	7777777	7
Τ	8888888	8
Υ	9999999	9
Φ	1111111	11
Χ	2222222	22
Ψ	3333333	33
Ω	4444444	44
Α	5555555	55
Β	6666666	66
Γ	7777777	77
Δ	8888888	88
Ε	9999999	99
Ζ	1111111	11
Θ	2222222	22
Η	3333333	33
Θ	4444444	44
Ι	5555555	55
Κ	6666666	66
Λ	7777777	77
Μ	8888888	88
Ν	9999999	99
Ξ	1111111	11
Ο	2222222	22
Π	3333333	33
Ρ	4444444	44
Σ	5555555	55
Τ	6666666	66
Υ	7777777	77
Φ	8888888	88
Χ	9999999	99
Ψ	1111111	11
Ω	2222222	22

یا پڑی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ خط مغربی اور خط مشرقی میں اسب  
ی نمایان فرقہ اور ق کی تحریر کا ہے۔ حروف کی ترتیب میں  
ہی مغربی خط قدیم پہلی خط اور جدید عربی خط کی بین بین ہے۔ مثلاً:  
ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز ط ط ک ل م ن ص ض ع غ ف ق س ش و ی لا  
مانہمہ خط مغربی خط کوفی ہی سی ماخوذ ہے۔

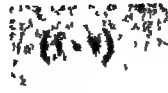
زوال قبروان کی بعد جب اندلس اسلامی علم و حکمت کا مرکز  
نہا تو ایک نئی خط (خط اندلسی یا خط قرطبی) کی ابتدا ہوئی۔  
ابن خلدون فی اپنی مشہور "مقدمہ تاریخ" میں لکھا ہے کہ جب شہابی  
افریقہ میں خط قبروان (یا خط مہدہ<sup>۱</sup>) کا رواج باقی نہ رہا تو  
افریقہ میں ہر جگہ خط اندلسی پھیل گیا اور زوال<sup>۲</sup> موحدین تک  
اسی کا دور دورہ رہا۔ بنی مرین<sup>۳</sup> کی عہد میں ایک تیسری خط (خط فاسی)  
کی بنا پڑی۔ ابن خلدون کا خیال ہے کہ فاس (فیس، دارالحکومت  
مراکش) کا رسم الخط نہایت بدلتا تھا، لیکن اسکی یہ رائی مبالغہ سی خالی نہیں۔  
ساتویں ہجری کی بعد وسطی افریقہ میں بہت سی اسلامی ریاستیں  
قائم ہوئیں۔ ان سب کا مرکز نمبکنو تھا، جو ۵۵۹۰ (۱۲۱۳) میں  
آباد ہوا اور اپنی مشہور مدرسے کی بدولت افریقہ کا چوتھا علمی مرکز  
قرار پایا۔ نمبکنو کی شان و شوکت دسویں صدی ہجری تک قائم  
رہی۔ یہیں افریقہ کا چوتھا رسم الخط (خط سودانی) وجود میں آیا۔  
موجودہ زمانہ میں مغرب میں چار خط رائج ہیں:

(۱) خط تونسوی جو سوائی ف اور ق کی طرز تحریر کی خط  
مشرقی سی مشابہ ہے۔

(۲) خط الجزائر: یہ خط زیادہ تر نو کدار ہے اور اس کا پڑھنا بھی  
کسی قدر دقت طلب ہے۔

(۱) مہدیہ کی بنا ۳۰۴ ہجری میں عبداللہ مہدی بال دولت فاطمیہ نے رکھی جب  
تک مصر فتح نہیں ہوا مہدیہ فاطمیوں کا پایۂ تع رہا۔  
(۲) دوسری بربر سلطنت جو مراطین کی جد افرتہ اور اندلس کی حاکم رہی۔  
(۳) مراکش کا مشہور خاندان جسنی موحدین کی مدد ایسی حکومت کی بنا ڈالی۔





(۳) خط لسانی زیادہ تر مدور ہی۔

(۴) خط سودانی: یہ خط کسی قدر موٹا اور بھدا ہی۔ خط سودانی اشاعت اسلام کیوجہ سے بحر اطلانتک کی سواحل تک جہاں لاگوس اسلام کا ایک نیا مرکز بن گیا ہی، پھیلا ہوا ہی۔

ہم اوپر لکھ آئی ہیں کہ ساتویں صدی ہجری عربی رسم الخط کا عہد انقلاب ہی۔ اسی زمانہ میں خط کوفی کا خاتمہ ہوا اور خط نسخ اپنی انتہائی نشوونما کو پہنچا۔ معلوم ہوتا ہی کہ خط تعلیق کو بھی اسی زمانی میں ترقی ہوئی، اگرچہ اسکی ابتدا بہت پہلی ہوگئی ہوگی۔

خط تعلیق یقیناً پہلوی اثر سے ظہور میں آیا۔ اسپہبدان طبرستان اور وہان کی عربی عمال کی قدیم سکی بھی جن کا زمانہ ۷۵۷ء (۷۵۷) ہی اسی خط میں ملتی ہیں۔ اس کی دو صدی بعد الفہرست کا مصنف پہلوی خط کی متعلق لکھتا ہی کہ اس میں گوشت کو بسر لکھتی ہیں، لیکن گوشت پڑھتی ہیں، اسبطرح روئی کو لہما یا لحم لکھتی ہیں اور پڑھتی نان ہیں اس سے پتہ چلتا ہی کہ اس زمانی میں بھی علما پہلوی رسم الخط سے واقف تھے اسکا مزید ثبوت مشہور بویہی سلطان عضدالدولہ کی کتبہ اصطخر (۳۴۴ = ۵۶ - ۹۵۵) سے بھی ملتا ہی؛ جس میں بیان کیا گیا ہی کہ جب سلطان فی اصطخر کی آثار کو ملاحظہ کیا تو دو آدمی اسی پہلوی کتبہ ترجمہ سنائی جاتی تھے۔ صاحب الفہرست فی یہ بھی لکھا ہی کہ ایراف رسم الخط ایک خاص قسم کی خط سے ماخوذ ہی جو قرآن مجید کی نسخوں کو لپی استعمال ہوتا تھا اور قیراموز کہلاتا تھا۔ لیکن افسوس ہی کہ ہم یہ جانہ ہیں کہ قیراموز کی کیا معنی ہیں اور نہ ہمیں اس رسم الخط کا کوئی نمونہ ملا ہی۔ قدیم ترین ایرانی تحریر جسی مارکولیتھ فی جرنل آف رائل ایشیانا سوسائٹی میں شایع کیا تھا (۱۹۰۲) ۴۰۱ ہجری (۱۰۱۰ - ۱۱) کی ایا تجارتی دستاویز ہی جس میں خط نستعلیق کی جھلک صاف نمایاں ہی۔

(۱) طبرستان (نواح بحرہ کیسین) کی مجوسی حاکم جو عربوں کی ماتحت تہ اسپہد ماسانی حکومت میں ایک فوجی عہدہ تھا۔

ساتویں صدی ہجری میں سب سے پہلی دواہن اشعار اور بعد میں  
 ہر قسم کی علمی اور مذہبی کتابیں خط تعلیق میں شائع ہونا شروع  
 ہوئیں اور ایرانیوں کی ذوق جمال کی بدولت اسی غیر معمولی ترقی ہوئی۔  
 لیکن افسوس ہے کہ اس قدیم عہد کی تحریریں اس قدر شاذ ہیں  
 کہ ہم اس عہد کی ایرانی خوش نویسی کی متعلق کوئی رائی قائم نہیں کر سکتے۔  
 بائیسہمے اس زمانہ کا سب سے مشہور ایرانی خوش نویس نجم الدین  
 ابوبکر محمد راوندی تھا جو چھٹی صدی ہجری کی آخری نصف میں کاشان  
 کی قریب راوند میں پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص سترہ  
 قسم کی خط لکھ سکتا تھا

غالباً اسی عہد کی آخری ایام میں خط نستعلیق (نسخ و تعلیق) کا  
 ظہور ہوا۔ خط نستعلیق اور خط تعلیق میں کوئی خاص فرق نہیں  
 سوائے اس کی کہ علمائی فرنگ ابتدائی نستعلیق کو تعلیق کہتے ہیں۔  
 البتہ ایرانیوں کی نزدیک تعلیق وہ خط ہے جو توقیع (تحریر فرامین) کی لپی  
 استعمال ہوتا تھا۔ اسی طرح سے قدیم نستعلیق کی ایک قسم کو جسکا استعمال  
 عام تحریروں میں ہوتا تھا یہ لوگ تحریری کہتے ہیں۔ خط نستعلیق کی  
 ایک دوسری قسم جو عام تحریروں کیلئے استعمال ہوتی ہے خط شکستہ ہے۔  
 چونکہ اس خط کا پڑھنا نہایت دشوار ہے اس لپی کو کوشش ہو رہی ہے  
 کہ عام تحریروں کو بھی اس طرح لکھا جائے کہ انہیں ہر شخص  
 آسانی سے پڑھ سکے۔

ایران سے عربی خط ایشیا کی مشرقی اور جنوبی مشرقی حصص میں  
 پھیل گیا، جہاں علما کی خیال میں اسلام کا مستقبل نہایت شاندار رہیگا۔  
 اہل چین کو ابتدا میں اسلام کا علم تھا۔ یہاں اس سے بحث نہیں  
 کہ وہاں اسلام دوسری صدی ہجری میں پھیلایا چوتھی صدی ہجری  
 کی وسط میں۔ کینٹن کی پرانی مسجد کا کتبہ جسکا زمانہ ۷۵۱ ہجری  
 (۱۳۵۰ء) ہے کوئی بہت زیادہ صاف نہیں علاوہ ازیں چینی مسلمانوں کو  
 تحریری دستاویزوں کا بھی پتہ کچھ نہیں چلتا۔ چینی مسلمانوں نے باوجود کثرت

تعداد کی اپنی ملت کی مذہبی زندگی کی لٹی کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن حال میں اس قسم کی کوششوں کی ابتدا بھی ہو چکی ہے لیکن کتابت و طباعت کی لٹی وہ جن طریقوں سے کام لی رہی ہیں نہایت قدیم اور قریباً سودہ ہیں مسلمانان ہندوستان ایرانی رسم الخط (نستعلیق) کا تتبع کرتے ہیں۔

مجمع الجزائر ملایا میں سب سے پہلی ایرانیوں اور پھر عربوں کی بدولت اسلام کو فروغ ہوا۔ ابن بطوطہ کی زمانی میں (۱۲۵۰) جاوا، سماٹرا کی شامی عربوں کی زیر حکومت تھا۔ اس سے ایک سو سال بعد جنوبی عربوں نے جاوا میں متعدد ریاستیں قائم کیں۔ جزائر ملایا میں عربی تحریر کی قدیم دستاویزیں مفقود ہیں، لیکن موجودہ رسم الخط کی دیکھنی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایرانی کی بجائے جنوبی عربی رسم الخط سے ماخوذ ہے۔ مشرقی افریقہ میں بھی جنوبی عربوں کی بدولت اسلام پھیلا، لیکن ازمۃ متوسطہ میں انہیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی البتہ نویں صدی ہجری کی آخر میں عربوں کا ایک دوسرا حملہ شروع ہوا اور پھر تیرھویں صدی میں نیگرو قبائل کی اتحاد کی وجہ سے مشرقی افریقہ کی تمام بڑی بڑی حصوں میں اسلام پھیل گیا۔ عربی رسم الخط یوگاندا اور کانگو میں پہنچ چکا تھا کہ دول یورپ کی مداخلت شروع ہوئی، اور اسکی ترقی رک گئی یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم جنوبی عربی رسم الخط (جس میں بہت کم حروف ملائی جاتی ہیں اور جو قدیم ترین سامی رسم الخط سے؛ تو فلسطینی اثر سے ۱۰۰۰ ق، م کی بعد یا جنوبی الجزیرہ کی بدولت اس سے قبل ظہور میں آیا) کب ناپید ہوا۔ غالباً جنوبی عربی تہذیب کی خاتمہ کی بعد اسکا رواج بھی قائم نہ رہا، لیکن باوجود عدم استعمال کی اس کی جانتی والی ضرورت موجود تھی، اسی لٹی ابن خلکان وغیرہ کے یہ بیانات کہ ظہور اسلام کی زمانہ میں یمن میں کوئی شخص لکھنا پڑھا نہیں جانتا تھا بالکل غلط ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام کی اشاعت کی ساتھ جنوب میں بھی عربی رسم الخط جاری ہو گیا۔

قدیم زمانی میں جنوبی عرب سب سے پہلی تجارتی اور پھر سیلابی تجارتی

پر جنوبی تمام میں آباد ہوئی۔ الملاکی قریب سبائی کتبہ دستیاب ہوئی  
ن اور ممکن ہی کہ ارض مدین، فلسطین کی جنوبی حدود اور دریائی  
ان کی مشرق میں مزید کتبہ دستیاب ہوں۔

ان یادگاروں کی علاوہ شمالی عرب میں بھی مختلف زمانوں کی جنوبی  
نی کتبہ ملی ہیں جن میں سے سب سے زیادہ قدیم لحيانی کتبہ  
انکا اکتشاف زیادہ تر الملاکی ضلع میں ہوا ہے۔ یہ کتبہ قدیم  
ی اور سبائی طرز تحریر کی درمیانی کڑی ہیں۔

لحيانی کتبوں کی بعد ان کتبوں کا زمانہ آتا ہے جنکو ابتدائی عربی یا ثمودی  
کتبات کہا گیا ہے۔ یہ کتبہ سب سے پہلی العلی اور پھر شمال میں دستیاب  
ہی۔ ان میں سے کچھ مدین اور کچھ تبوك کی شمال مغرب میں بھی ملی ہیں۔  
جنوبی عربی خط کا آخری نمونہ ان کتبات سے ملتا ہے جو دمشق سے جنوب  
شرق میں ۱۰۰ میل کی فاصلہ پر صفا کی آتش فشانی علاقہ میں ملی ہیں۔ غالباً  
کا زمانہ پہلی صدی عیسوی سے دوسری صدی عیسوی تک ہے۔ یہ کہنا مشکل  
ہ کہ اس طرز تحریر کا خاتمہ کب ہوا، بھر کیف یہ امر نہایت ہی اہم ہے کہ  
۳۲۰ ع کا کتبہ نیارہ، خط صفائی کی بجائے نبطی حروف میں لکھا گیا ہے۔

جنوبی عربی قبائل کی ہجرت کی بدولت جنوبی عربی خط حبش  
میں پہنچا اور سب سے پہلی اس کا رواج اسکسوم میں ہوا، جو اسوقت  
حبش کا دارالسلطنت تھا۔ تھوڑی ہی دنوں میں یہاں عربی اور افریقی  
قبائل کی اختلاط سے اتھوپی اقوام کا ظہور ہوا، جنکی زبان سامی کی ایک  
شاخ تھی۔ لیکن عیسائیت کی فروغ کی بعد یہاں بہت جلد یونانی اثر کی  
بدولت ایک انقلاب پیدا ہوا، نہ صرف حروف کی شکل تبدیل ہوگئی  
بلکہ تحریر کی ابتدا بھی دائیں کی بجائے بائیں طرف سے ہونی لگی۔  
نویں اور دسویں صدی عیسوی کی دوران میں اس اتھوپی زبان کا  
خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ موجودہ حبشی زبان نے لی۔ موجودہ حبشی  
رسم الخط کی سب سے آخری شاخ ہے۔ تین ہزار برس کی بعد اسکی حروف  
آج بھی ایک دوسری سے جدا رکھی جاتی ہیں۔

## غزل

جانشین میر و غالب حضرت ثاقب، لکھنوی، مدظلہ العالی

—o—o—o—

جھکایا سامنی آہوں کی سر ہر شمع محفل فی  
زمانی بھر مین سناٹا سا پیدا ہو کر دیا دل فی  
نظر روئی حقیقت پر نہ ڈالی پھر کبھی دل فی  
عجب جلوہ دکھایا دھڑکی اس نقش باطل فی  
مرا دل ہی فقط نقش تصور کا نہیں مجھ  
تری تصویر کھینچی آسمان پر ماہ کا قمر فی  
وہی دل قیس کا جس مین نہ ایک دنیا سہانی تھی  
اسی ساغر کو اکدن بھر دیا لیل کی محفل فی  
جہان کی مریبوالوں سی مرا ماتم ہوا پہلی  
کسی مقتول کو دیکھا نہ تھا آنکھوں سی قاتل فی  
یہ مرگ ناگہانی جو منجھی آئی عجب ہی تھی  
زمانی صکو رلایا عمر لا حاصل کی حاصل فی  
نہا دیتی تھی باہم راستی حسن محبت کی  
بغیر آنکھوں کی پہچانا تو بھی منزل کو منزل فی

کبھی اڑھا کبھی بیٹھا امید و یاس کی ہاتھوں  
بڑی مشکل سی نام عشق کو اونچا کا دل فی

ہن اس ایذا رسائی پر بھی ممنون عنایت ہوں  
نباہا ساتھ برسوں قید زندان میں سلاسل فی

منسی جو درد سی واقف نہ تھی لیکن یہ رویا کی  
ہم ایسوں سی بہت ہمدردیاں کین شمع محفل فی

بہت خوش ہوں کہ انتک سجدہ گاہ اہل الفت ہی  
وہ موقع جس جگہ میری قدم چومی تھی منزل فی

وفا کی جنس بقی ہی جہاں کی ہاتھ پھیلی ہین  
وہی تقسیم ہوتا ہی جو چھوڑا تھا میری دل فی

خدا ہی ہی جو پہنچوں کعبۂ مقصود تک ناقد  
قیامت کنی برابر پاؤں پھیلائی ہین منزل فی

## پتھر

غلام احمد، ایک کھاتا پیتا، نوجوان آدمی، اپنی کمرہ میں پلنگ پر لیٹا چھت کی طرف نکلنے لگا تو دیکھ رہا تھا، اور سوچ میں پڑا تھا، 'میں ہمیشہ پلنگ پر لیٹا کسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں'، اوسنی اپنی آپ سی کہا، 'اور کبھی کچھ نہیں کرتا۔ لیکن میں کروں کیا؟ مجھے ایک نیا مکان تلاش کرنا ہی، یہ تو سچ ہی، لیکن نیا مکان آخر کوئی کہاں ڈھونڈھتا پھرے؟ اور اگر مجھے مکان میں سب سے ذلیل کمرہ نہ ملا ہوتا،' اوسنی بھلا کر کہا، جب ایک گاڑی پاس سے گذری اور منوں گرد و غبار اوس کی کمری میں جھونک گئی، 'تو شاید مجھے یہ تکلیف نہ اٹھانی ہوتی۔' اوس کی دماغ میں یہ خیال اوسوقت نہ آیا کہ کمرہ اور کسی کام کی لٹی موزوں نہیں تھا۔ اوسکا دروازہ سڑک پر کھلتا تھا، اس لٹی وہ اوس کی بیوی کی لٹی مناسب نہیں تھا، اور وہ اتنا بڑا تھا کہ اوسنی باورچی خانہ بنانا یا نوکروں کو دیدینا بھی ناممکن تھا، دوپہر کا وقت تھا، گرمی بہت شدت کی تھی اور دم گھٹ رہا تھا، اس لٹی غلام احمد اپنی غصہ کو نہ روک سکا۔ وہ اوس گرمی پر خفا ہو گیا جو اسی لٹی لٹی بھی پسینہ سے بھگو رہی تھی، چھت پر، کہ وہ کافی سفید نہیں تھی، ان کتابوں پر جو ایک کونے میں پڑی تھیں اور جن پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ وہ کوڑھے کرکٹ کا ٹھہر معلوم ہو رہی تھیں، اور جب اوسنی نوکر کا خیال کیا جو اتنا سست تھا کہ اسی سال میں ایک مرتبہ بھی نہیں صاف کرتا تھا، اور اپنی بیوی کا جو کمرہ میں کسی قسم کا انتظام نہیں کر سکتی تھی اور جس کی کپڑوں سے پستیاں کی بہت تیز بدبو آتی تھی، تو اوسکا غصہ سے بدن کا پتھر لگا اور وہ چلا آیا۔

یا خدا! کونسی اور بھنی ہوئی کھجور اور بھی بیوی رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔

وہ پلنگ پر اوجھ کر بیٹھ گیا، اس امید میں کہ شاید بیٹھنی سی کچھ آرام ملی۔ کچھ دیر تک وہ زمین کی طرف گھورتا رہا اور اوسکی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہی۔ پھر اوس فی آنکھ اٹھائی، اس طرح سی کہ گویا کوئی اوسی مجبور کر رہا ہی، اور اوسنی وہ کتابیں دیکھیں جن پر مٹی برسوں سی جمی ہوئی تھی، وہ میز جس پر اوسنی بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور جس پر اب پرانی اخبار، کتابوں کی پھٹی ورق، خالی دوات، بی تب کی قلم رکھی تھی، اور پھر اپنی پلنگ اور اپنی اوپر نظر ڈالی۔ ہر چیز پر مٹی جمی ہوئی تھی، اور ہر چیز معلوم ہوتا تھا صرف اوسی غصہ دلائی کی لٹی کمرہ میں آگئی ہی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئی، اور اسنی عاجز آ کر پھر اپنی آپ سی پوچھا: ”یہ سب چیزیں آخر کیوں مری سامنی آ کر کھڑی ہوگئی ہیں اور مجھی غصہ دلا رہی ہیں؟ میں فی آخر کیا جرم کیا ہی؟“ اور اسی فکر میں اس کا سر جھک گیا۔ ”شاید اس کی وجہ یہ ہی“ اوسی ایکبارگی خیال آیا، ”کہ میں بالکل کچھ نہیں کرتا ہوں۔ چار پانچ دن سی میں پلنگ پر پڑا ہوں، میری پسینہ نکلتا رہتا ہی، اور میں اپنی نکمی پن پر غور کرتا رہتا ہوں۔۔۔۔۔ اگر میں کسی کام میں مشغول ہوتا، تو مجھی اپنی کمرہ اور مکان کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ میں خاموش اور متین اور خوش مزاج ہوتا، مگر سچ تو یہ ہی کہ میں ایک بیگمنا، کاکھل، فالائق، بزدل، بیوقوف آدمی ہوں“ اگر میں اپنی نوکر پر سختی کرتا تو اوس کی کیا مجال تھی کہ کوئی چیز صاف ستھری نہ ہوتی، اگر میں ٹھیک وقت پر اوسی ہر کام کیلئی حکم دیتا۔۔۔۔۔ لیکن کبھی شرماتا جاتا ہوں، کبھی کاکھلی سوار ہوتی ہی، ہر کام کو نالتا رہتا ہوں، اگر میں اپنی بیوی سی کہتا کہ صاف ستھری رہی تو وہ ضرور میرا کہتا کہ ”مگر میں اوس سی کہتا ہی نہیں۔ ہمیشہ انتظار میں



رہتا ہوں، سمجھتا ہوں کہ سب کچھ آپ ہی کہہ رہے ہیں اور پھر  
خفا بھی ہوتا ہوں۔۔۔۔۔ میں بھی کیسا احمق ہوں! اور اوس  
اپنا سر تکیہ پر دی مارا۔

کچھ دیر تک وہ پلنگ پر ویسی ہی پڑا رہا، لیکن اوس سوچ میں  
مبتلا ہونیکا اچھا موقع ملا تھا۔ اوس آ نکھین بند کرلین اور اپنی  
نکمی پن پر غور کرنی لگا۔ شادی کی بعد جو دو سال گزری تھی  
جنہیں اوس فی پوری طرح سی ضایع کیا تھا، اوس سب سی پہلی  
یاد آئی۔ ان دو سالوں میں وہ اپنی بیوی سی بالکل تنگ آ گیا تھا،  
اگرچہ پہلی وہ اوس بہت پسند تھی؛ اوس فی دنیا سی قطع تعلق کرلیا تھا،  
اور دنیا فی اوس سی؛ اور زندگی میں اوس کی لٹی کوئی دلچسپی  
باقی نہیں رہی تھی۔ پھر اوس وہ دن یاد آئی جب اوس میں جوانی کا  
جوش باقی تھا، اور زندگی اوس کی لٹی بی معنی اور بی لطف دنوں اور  
راتوں کا ایک سلسلہ نہیں بن گئی تھی۔ اوس زمانی میں وہ کھیل کود  
میں شربک ہوا کرتا تھا اور اپنی کالج کی طرف سی کئی مرتبہ ہاکی  
کی ٹورنمنٹ میں بھی کھیلا تھا۔ اوس زمانہ میں وہ عاشق بھی ہو گیا تھا۔  
لڑکی خوبصورت اور سلیقہ کی تھی، اور اوس غلام احمد سی امیدیں  
بھی بہت تھیں۔ لیکن وہ ایکبارگی اوس چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا، اور صرف  
تھوڑی سی جائداد کی لالچ اور اپنی باپ کی لڑ سی اپنی موجودہ بیوی  
سی شادی کرنی پر راضی ہو گیا۔ مگر وہ اس سی نہ انکار کر سکتا تھا اور  
نہ اسی بھول سکتا تھا کہ اوس عشق کی حوصلوں کو طبیعت کی کمزوری  
کی وجہ سی چھوڑا تھا، اور اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنی آزادی  
اور اصل خوشی لڑ کر حاصل کری۔ اپنی واسطی جو زندگی اوس فی  
پسند کی تھی وہ صرف ایک چھوٹی، کمینی طبیعت کو جاسکتی تھی  
”ہاں میں کمزور ہوں، بزدلا ہوں، ورنہ اب تک ضرور کچھ کر دکھاتا  
میری بیوی سمجھدار، صاف ستھری ہوتی۔ بجائے اس کھیل چھانچ کر  
عورت کی جو جانوروں کی طرح جدھر ہانکن گئی اودھر چلتی ہی

خود بیوقوف ہی ایسی فوسری ہو سکتی ہے بیوقوف بنادیتی ہی۔ ہائی میں کیا نہیں کر سکتا تھا؟

ایک دل آویز خواب کی مانند اوس کی سامنی ایک محل کی تصویر کھنچ گئی۔ چاروں طرف شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، لیکن محل کی دو دیوار سی ایک ایسی گہری سچی مسرت کی کریں نکل رہیں تھیں کہ اوسی مایوسی کی ہوا تک نہیں لگ سکتی تھی۔۔۔۔۔ اور اوس محل میں ایک میاں بیوی رہتی تھی جن کی عمر دوسروں کی خدمت میں گذر رہی تھی اور جو اپنی بھلائی دوسروں کی خوشی میں پاتی تھی۔ اوس مکان کی روح روان، اوسی یقین تھا، وہی لڑکی ہی جس سی اوسی محبت تھی اور جس کی ساتھ اوس فی بیوفائی کی۔ وہ مجھے ہر طرح سی آدمی بنا دیتی، میری طبیعت کو مضبوط کر دیتی۔ لیکن مجھے میں اتنی صلاحیت بھی ہے؟ مجھے جیسی نزدلی کو بھلا سکوئی بہادر بنا سکتا ہے؟۔۔۔۔۔ مگر اوس زندگی کی تصویر فی جو اوس کی لٹی ممکن تھی اوس کی موجودہ حالت کو اور ناقابل برداشت کر دیا۔ یہ احساس کہ وہ اب ایک بالکل بیفائدہ، بیمغی، بی لطف زندگی سر کر رہا ہے اوس کی دل میں کانٹ کی طرح چبھتی لگا۔

اوسنی اپنی آپ کو بہت یقین دلائی کی کوشش کی کہ اب اوس کی لٹی کوئی امید باقی نہیں، مگر اوسکی ابتدائی جوانی اور عشق کی یادگاروں فی، باوجود اوس مایوسی کی جو وہ اپنی ساتھ لائیں، اوسکی تصور میں حوصلہ پیدا کر دیا۔ ان یادگاروں میں لپٹا ہوا ایک اور واقعہ اوسی یاد آجاتا تھا، جب اوس لڑکی فی جس سی اوسی محبت ہو گئی تھی اوس کی حکمت عملی اور ہمت کی داد دی تھی، اور اوس وقت اوسکا چہرہ خلوص اور دلی خوشی سی روشن تھا۔ کالج کی سٹاف اور طالب علموں میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا، غلام احمد کی کوششوں سی معاملہ صاف ہو گیا غلام احمد کو اپنی حرکت پر ہمیشہ تعجب ہوتا رہا، اور یہ اوسکی سمجھہ میں کبھی نہ آیا کہ اوسی ایسی معاملہ میں دخل دینی کی جرأت کیسی ہوئی

لیکن اوس پوری طرح می کامیابی ہوئی تھی اور وہ اصل اس تعریف کا مستحق تھا۔ غالباً وہ دوسری واقعات کی علامت اسی بھی بھول جاتا، لیکن لڑکی تعریف کرنی وقت مسکرائی تھی، اور یہ مسکراہٹ اوس کی دل پر ایک نقش بن گئی تھی جو اوس کی مٹائی نہ مٹ سکا۔ اگر وہ اپنی اوپر لعنت ملامت کرتا ہوتا، تو اوس مسکراہٹ کی یادگار اوس کی طبیعت نہ کردیتی؛ رنج اور مایوسی کی دہن وہ ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن کر اوسی نرونازہ کردیتی۔

کبھی کبھی، جیسی اسوقت، وہ امید کا پیغام لاتی تھی۔ غلام احمد کا پسینہ سوکھنی لگا، اعضا حرکت پر رضامند ہوگئی، رگوں میں خون دوڑنی لگا، اور اوس یقین سا ہوئی لگا کہ وہ اتنا کمزور اور نزدلا نہیں جتنا کہ وہ سمجھتا ہی، اور ابھی اوس کی سدھرنی کی امید ہی اوس فی دنیا میں بہت کچھ کھویا تھا، لیکن اسکی وجہ سی سب کچھ کھو بٹھنا لازم نہیں ہوگیا تھا۔ وہ اوسی گھر میں اور اوتھیں لوگوں میں پھر زندہ ہوسکتا تھا، یہ بھی نا ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی ساتھ دوسروں میں بھی روح پھونک دی۔۔۔۔۔ اوسکا دل نئی جوش سی دھڑکنی لگا، ہاتھ پاؤں کاپنی لگی، جب اوسنی یہ عہد کیا کہ اب ہمیشہ سختی سی اپنی ارادہ پر قائم رہی گا، اپنی نوکر کو نکال دی گا اگر اوسنی پھر کبھی کسی قسم کی فی تمیزی یا کاهلی کی، اپنی بیوی کو مجبور کری گا کہ گھر کا انتظام ٹھیک طرح سی کری، اور کپڑی صاف رکھی، وہ خود محنت مشقت کری گا، اور دوسروں کی لٹی نمونہ بنی گا۔۔۔۔۔ یہ عہد کر کی اوسنی ایک ٹھنڈی سانس بھری، آنکھیں مل کر ادھر ادھر اس اطمینان اور خوشی سی دیکھنی لگا کہ گویا اوسکا کمرہ صاف ہی، اوس کی بیوی شائستہ، وہ خود محنت، چست اور دوسروں کا رہنما اور خادم۔ اور وہ پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔ دل آرزو کی موجودگی سی پھٹا جاتا تھا، اور وہ اس انتظار میں بیتاب تھا کہ اپنی ارادہ کا امتحان لی، دوسروں کو اپنی عمل کی ذریعہ سی ایک بہتر زندگی کا پیام دی، اور جلد سی جلد اس انقلاب کی خبر دنیا تک پہنچائی۔

اسی نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہی لیکن نہ وہ بغیر آنکھ ہولی بنا سکتا تھا کہ شام ہو گئی ہی۔ ہوا نرم تھی اور کسی قدر ہی، زمین اب آسمان سے ترحم کی درخواست نہیں کر رہی تھی، بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اطمینان سے سنہ کر بجھی ہوئی دل سے و فکر کر رہی ہی اور اپنی بچوں سے بھی یہی چاہتی ہی۔ علاوہ اس کی اوسنی بچوں کو اپنی دروازی کی قرب کھلتی اور ہنستی سنا۔ بھی شام ہونی کی دلیل تھی

جب وہ رفتہ رفتہ پوری طرح سدار ہو گیا تو اسی اپنا ارادہ ناد لیکن اوسی اس سے تسکین یا تازگی نہیں حاصل ہوئی۔ وہ اب اوسکی برائے بھاری بوجھ کی طرح دھرا ہوا تھا اور اس سے بجات ملی کی ف سے بالکل مایوسی تھی۔ وہ نہ محسوس کر رہا تھا کہ اس ارادی پورا کرنا اس پر فرض ہی لیکن اوسی یقین ہو گیا کہ وہ اسانہیں کرنی پائی گا۔ "میں فی کیوں بیٹھی شہائی یہ ارادہ کر لیا؟ کیوں اپنی سر یہ نئی مصیبت لی لی؟ کنا میرا ضمیر مجھے بھلی ہی کافی ملامت نہیں کر رہا ہی؟ اب مجھے ہر لحظہ یہ خیال رہی گا کہ میں فی ایک بات کا ارادہ کر لیا ہی اور اس پر قائم رہنا ضروری ہی، ہمیشہ ہر جگہ میں یہی سوچا کروں گا اور دل ہی دل میں شرمنا کروں گا۔ جو تھوڑا بہت اطمینان قلب مجھے حاصل تھا وہ بھی اب گنا۔ ب جب کبھی مجھے یںند کی خواہش ہوگی تو میں محسوس کروں گا کہ مجھے جاگتی رہنا چاہی، جاگتا رہوں گا تو یہ خیال ہوگا کہ کچھ کروں، کچھ کروں گا تو یہ فکر ہوگی کہ ناکافی ہی۔۔۔ اور آخر میں کروں تو کیا کروں؟ اگر میں اپنی بیوی سے کہوں کہ صاف رہا کرو تو وہ مسکرا دی گی اور کہیگی "اب میں ایسی میلی بھی نہیں ہوں۔" یا وہ بی نہائی دھوئی کبڑی بدل لیگی اور مجھے اسی پر قانع ہونا پڑی گا۔ لیکن میں نوکر کو کیا کروں؟ اگر اسی نکان دوں تو کوئی دوسرا آٹکا جو اتنا ہی کاہل ہوگا بلکہ مسکن ہی کہ اور اوپر سے چور ہی ہو۔ اور یہ کبخت

اتنا زبان دراز ہی کہ میں اسکی کاهلی یا کوئی قصور ثابت ہی نہیں کر سکتا ۔ ۔ ۔ پھر یہ کہ میں اپنی لٹی کام کونسا نکالوں؟ یونیورسٹی میں دوبارہ داخل ہونا تو فضول ہی، کیونکہ میری عمر بہت ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ تو کبھی بھی نہیں مل سکتی کیونکہ میری پاس کوئی ڈگری نہیں۔ صرف ایک صورت ہی، کہ سیاسی کام شروع کر دوں۔ لیکن نہ میری پاس رویہ ہی، نہ اتنا اثر ہی، تقریر بھی نہیں کر سکتا۔ پھر وہاں کیا بنا لوں گا۔ لوگ نہ سمجھیں گی کہ میں رویہ گمانا یا سطحی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ارادہ کرنی کو تو کر لیا، لیکن کوئی کام بھی ہو؟

وہ کبھی فلسفوں کی انداز سی اپنی حالت اور اپنی ارادی پر مسکرایا اور اس سی اسی ایک گونہ اطمینان ہوا گو وہ اپنی دل میں سمجھتا تھا کہ ان دلیلونسی اسی اپنی ارادی سی ہمیشہ کی لٹی چھٹکارا نہیں ملا ہی اور اسکا ضمیر اسی یہ ارادہ یاد دلا کر شرمندہ کیا کری گا۔ لیکن یہ وقت اوسی دور معلوم ہوتا تھا۔ اس فی لمبی سانس لی اور ایک کروٹ ہو کر لیٹ گیا کہ پھر اونکھ جائی۔

نیند کا انتظار کرتی ہوئی وہ بچوں کا اودھم، ہنسی اور گالی گلوچ سنی لگا۔ اوسی معلوم ہو گیا کہ وہ کونسی کھیل کھیل رہی تھی، کیا کیا غلطیاں کر رہی تھی، اور اوس فی کوشش کی کہ کھیل کی رفتار پر غور کرتا رہی۔ لیکن دفعہ سارا اودھم موقوف ہو گیا، اور ایسا معلوم ہوا کہ سب بچی کونکی ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ اسنی اپنی بو کر کی ہاری موئی آواز سنی جو بچوں کو گالی دی رہا تھا اور نکال رہا تھا۔ پھر اسنی ایک بچی کی روئی کی آواز سنی اور اپنی نو کر کو گلا پہاڑ کر چلائی ہوئی، جس سی وہ آواز دب گئی۔

غلام احمد کو بہت غصہ آیا۔ اوسی یوں بھی پسند نہ تھا کہ اوسکا نوکر بچوں پر خواہ مخواہ سختی کری۔ اور یہ تو وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ان میں سی کسی کو مار بیٹھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کینخت کو جب موقع ملتا ہی تو، سختی اور ظلم سی نہیں چوکتا، اور اوسی اس کی ان حرکتوں سی نفرت تھی۔ اس لٹی اسنی قصد کیا کہ

تھا کہ اسی خوب ڈالنی کا اور لعنت ملاحت کی ایسی بوچھاڑ کری گا کہ  
فرت و حقارت کا سارا بخار جو اس کی دل میں تھا نکل جائی۔ اوسی  
اپنی دل میں کہا: ”اسکی یہ حرکت پہلی بار نہیں ہی بلکہ ہمیشہ یہی  
کرتا ہی۔“ اسی یکایک یہ خیال آیا کہ نہ کبھی خود اس سی  
اور اسکی بیوی سی بھی بد تمیزی سی پیش آتا ہی اور کبھی سدھی منہ  
دات نہیں کرتا۔ غلام احمد فی بلند آواز سی کہا ”کبھی نہ کبھی تو اس سی  
سمجھنا ہی۔ آج ہی کیوں نہ فیصلہ ہو جائی۔“ وہ بستر پر اٹھ کر سٹھہ گیا، اور  
اپی نوکر کی آنیکا انتظار کرنی لگا۔

لیکن نوکر نہیں آیا۔ وہ اپی مرضی سی کہیں اور چلا گیا۔ غلام احمد اس  
پر برس پڑنی کو آمادہ بیٹھا تھا کہ اسی اپنی ارادی کا خیال آیا۔ تقدیر فی اسی یہ  
موقع دیا تھا۔ ”بہی اسی پورا کورنیکا وقت ہی، نوکر سی بسم اللہ کرون پھر  
اپنی بیوی کی خبر لون، پھر اپنی، پھر ساری دنیا کی۔ بس یہی وقت ہی۔“ اس  
فی اپی دات اور مٹھیان بھینچ لین اور اورو پر بل ڈال لیا۔ لیکن اس سی  
وہ کبھراٹ دور نہ ہوسکی جو اس پر غالب آری تھی اور جس فی اسی شک اور  
پس و پیش میں ڈال دیا تھا۔ وہ ڈانٹنی ڈپٹی کو تیار بٹھا تھا اور دل کڑا کر کی  
ایسا کر بھی گذرتا۔ لیکن اصولا یہ کرنا، اسی ایک مستقل دستور العمل، ہمیشہ  
کی لقی بنانا۔۔۔۔۔ اسی فی اسکی ہمت پست کردی۔ اور وہ پھر شک  
اور مایوسی کا شکار ہو کر بستر پر گر پڑا۔

عین اسی وقت، گویا واقعات فی غلام احمد کو بیس ڈالنی کی سازش کر لی تھی،  
یہ سنائی دیا کہ اسکا نوکر کھٹ پھٹ کرتا لمبی نی تلی قدم رکھتا چلا آ رہا ہی۔ اور  
ذرا دیر کی بعد وہ اس کی سامنی کھڑا تھا۔۔۔ ایک لمبا بھاری بھرکم آدمی  
جس کی چہری سی بد تمیزی ٹپکتی تھی اور جس کی لبوں پر طنز آمیز مسکراٹ  
تھی جسو وہ کبھی دبائی یا چھپائی کی کوشش نہیں کرتا تھا

غلام احمد فی انتہائی کوشش سی کہ اس کی آواز سی اعصابی کمزوری نہ ظاہر  
ہو کہ ”نہ کہانت ہی؟“

اس کی نوکر فی سوال کو دھرایا ”میں کہاں تھا؟“ اور غلام احمد کو یہ

مجسوس ہوا کہ اسکی ہوٹوں پر معمولاً جو مسکراہٹ رہتی تھی وہ پھیل کر  
زہر خند بن گئی۔

”ہاں! ہاں! تم یہیں تھی۔ میں سن رہا تھا کہ تم فی ایک بچی  
کو مارا۔ بتاؤ تمہی اسی کیوں مارا؟“

”کیوں مارا؟ مارتا نہیں تو کرتا کیا؟ اگر ان لونڈوں کو نہ ماروں  
تو کل کو گھر میں گھر کر کھیلنے کی اور مجھے ان کی چیخ دھاڑ اچھی  
نہیں لگتی۔۔۔۔۔“ نوکر جواب دی رہا اور آخر میں اوس کی  
آوازی ملاحت کا لہجہ اختیار کیا۔

غلام احمد فی کمزور آواز میں کہا: ”بھلا اتنی سی بات پر کوئی بچی  
کو مارتا ہی؟“ اوسی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پلنگ ٹوٹ جائیگا اور وہ  
بیچی کر پڑیگا۔

”ماروب نہیں تو کام کیسی چلی۔ گالی سی تو مانتی نہیں۔  
سنی سنتی عادت ہو گئی ہی۔ ہر کوئی اونہیں گالیاں دیتا ہی۔ مجھے مارا ہی  
پڑتا ہی۔ کم سی کم ایک لونڈا۔۔۔“

غلام احمد فی سنا تھا کہ وہ لڑکا دوسروں کی بھاگ جانی کی بعد دیر تک  
روتا رہا۔ غالباً وہ سب سی چھوٹا تھا، اسی لٹی اسی سزا ملی۔ بہر حال اسی یقین  
تھا کہ صرف ڈانٹنی سی لڑکی بھاگ جانی اور نوکر کا اس لڑکی کو مارنا محض  
ظلم تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس کبخت کو دلیل سی قائل نہیں کر سکتا اور  
اس کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ پس اس فی اس ذکر کو چھوڑ دیا جس سی  
اس کی نوکر فی نتیجہ نکالا کہ وہ ہار مان گیا۔

غلام احمد فی حتی الامکان رعب سی کہا: ”اب تم کہاں جا رہی ہو۔“  
”بیوی مجھے شہر بھیج رہی ہیں۔“

”اچھا جاؤ۔“ غلام احمد فی کروٹ لیلی تا کہ نوکر اسکا چہرہ نہ دیکھے  
سبکی اور احتیاط کی غرض سی اسی اپنی بازو سی چھپا لیا۔ نوکر  
حقارت سی مسکرا کر چل دیا۔

غلام احمد فی نوکر کی جانی کی آواز سنی تو اسی کیستقدہ اطمینان ہوا۔ اپنی

اکامیابی ہی اسی قدر سی ہوئی کیونکہ اسی خود اسکی پیشین گوئی کی تھی۔  
 مکن اس کی اسطیلا کی حالت باقی رہی اور اس کی ساتھ کھری اندورنی فی چینی۔  
 اس کی دل سی ایک بوجھ ہٹ گیا (نوکر سی گفتگو کرنی کی بعد اسکا ارادہ کافور  
 ہو گیا تھا) لیکن اسکی سیرت پر ایسا دھبہ لگا تھا جسکا مٹنا ناممکن تھا۔ اسی  
 ایک دھندلا سا احساس تھا کہ کی موجودہ نا کامیابی کی نتائج کھری اور دیر پا  
 ہوئی اور اگر آ کی چل کر اس فی اور اس کی امیدوں فی سرائی یا تو اس  
 کوشش کی یاد اسی مغلوب کردیگی اور پچھاڑ دیگی۔ گویا اس فی خود داری  
 اور رفاہ عام کی سیرھی پر چڑھنی کی کوشش کی لیکن کرپڑا اور اسکی ٹانگ  
 نوٹ کئی۔ اب پھر ایسی کوشش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن خدا جانی  
 کیا بات تھی کہ غلام احمد کو اس خیال سی ایک طرح کا اطمینان تھا۔ اب  
 آ کی چل کر نہ کوئی امید ہوگی نہ کوشش نہ نا کامیابی کی ذلت۔ اگرچہ وہ  
 اپنی بزدلی کو قابل حقارت سمجھتا تھا تا ہم اسکی خیال سی اوسی ایک قسم کی  
 خوشی ہوتی تھی۔ یرانی افیونی کی طرح وہ جان بوجھ کر نشی کی گھونٹ چڑھا تا تھا۔  
 وہ جانتا تھا کہ اسکا کیا نتیجہ ہوگا، اسی اعتراف تھا کہ اس سی بہتر زندگی  
 ممکن ہی لیکن پھر ایک چسکی لیلیتا، تا کہ اپنی آپ کو یقین دلا دی کہ بہتر  
 زندگی اس کی قسمت مین نہ تھی۔

پس وہ فی حس و حرکت پلنگ پر پڑا تھا۔ نیند اب کافور ہو چکی تھی  
 اور اطمینان قلب بھی۔ کچھ دیر تک اوس کی خیالات اور تصورات اور جذبات  
 فی رولہ ٹوک امنڈنی رہی اور وہ فی پروائی سی ان کی حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا۔  
 وہ جانتا تھا کہ اگر مین چپ چاپ رہوں تو یہ طوفان خود بہ خود بیٹھے جائی گا؛  
 اور ایسا ہی ہوا۔ جب کچھ دیر کی بعد اس کی بیوی فی دروازہ کھولا تو اسکا  
 اطمینان قلب لوٹ آیا تھا، اسکا اضطراب جاتا رہا تھا اور اسکی وہی حالت تھی  
 جو ہمیشہ رہتی تھی۔

اسکی بیوی فی چپکی سی کہا "مین نوکر سی میوہ منگانا بھول گئی ذرا چل  
 جانی اور لی آئی۔" اسی کچھ جواب نہیں دیا۔ اسی اپنی بیوی کی بات سنی لیکن وہ  
 اسیر غور کر رہا تھا کہ اسکا دل اسوقت ایک تاریک خالی فضا کی طرح تھا جس مین



پیا ساقیا آر چام شرابی ، که یکجا بینم مه و آفتابی  
 ویا باز کن نرگس نیم خوانی ، بینداز در ملک جان انقلابی  
 که تا هست کردم ؛ بگبرم ربانی ، سرایم چو مرغی برقصم چو آبی

چه خوش روزگاری بود با نکاری

لب جویباری بزیر چناری

بنخواهم بخوبیاں کشمیر رقصم ، به سبزه و گل بایم و زیر رقصم  
 لب آب جو یا بزنجیر رقصم ، ملغزم ، یفتم ، چو نخچیر ، رقصم  
 ماتش عذاراب به شمشیر رقصم ، بیاد زمان جها نکیر رقصم

چه خوش روزگاری بود با نکاری

لب جویباری بزیر چناری

خوشا آن زمانی ، خوشا روزگاری ، که بد مردم هند را شهر یاری  
 خوشا شهر یاری خوشا غمگساری ، که در دور او ملک شد لاله زاری  
 همی خورد مردم می پر شراری ، همی خواند با گلرخاں چون هزاری

چه خوش روزگاری بود با نکاری

لب جویباری بزیر چناری

سلامی بخوام مآں روزگاران ، سلامی فرستم مآں شهر یاران  
 خدایا ز گلزار مآشد بهاراب ! ، زایم کرم مآز بفرست بهاراب  
 برویاں بهار از بر کوهساران ، که رقصم و خوانیم در جویباران

چه خوش روزگاری بود با نکاری

لب جویباری بزیر چناری

## پیام اتحاد

اجمن اقوام کی " بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی " کی ایک کمیٹی اس عرصہ سے مقرر کی گئی ہے کہ جتنی بین الاقوامی ادارہ دنیا میں ہیں ان کی اتحاد عمل کی ممکن صورتوں پر غور کر کے ایک رپورٹ پیش کریں اس رپورٹ کا خلاصہ ہماری پاس مع مندرجہ ذیل خط کی بغرض اشاعت بھیجا گیا ہے۔

### بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی

رو دو موبائسی نمبر ۲ ( پیل روناں )

پرس۔

جناب اڈیٹر صاحب

اس خط کی ساتھ چند اوراق ملفوف ہیں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کمیٹی اتحاد ادارات بین الاقوامی کیا چیز ہے اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی لٹی کیا کیا کوششیں کر رہی ہے، مجھے امید ہے کہ یہ اوراق آپ کی پاس حفاظت سے پہنچ جائیں گی اور آپ انہیں قابل توجہ سمجھیں گی۔

میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ اپنی رسائی کی پڑھنی والوں کو اس تحریک سے آگاہ ان اوراق کی مضمون سے واقف کر دیں گی۔  
براہ مہربانی میری خلوص کی جذبات کو قبول کیجئے۔

(منجانب فائز گھنیر)

خلاصہ رپورٹ کمیٹی اتحاد ادارات بین الاقوامی

میں خاص خاص بین الاقوامی اجمنون میں جنہیں نوجوانوں کی تربیت اور قیام

امن سی دلچسپی ہی باہمی تعلقات قائم رکھنے کی لٹی ایک ذریعہ کمیٹی اتحاد کی صورت میں پیدا کیا ہی۔ یہ کمیٹی بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی کی ماتحت کام کرتی ہی اور اس کا وجود بھی ادارہ مذکور اور انجمن اقوام کی طرح تاریخی ضروریات پر مبنی ہی۔

حقیقت میں یہ اس تنظیمی تحریک کا نتیجہ ہی جو اب سی تیس چالیس سال پہلے تمام ملکوں میں اور تمام طبقوں میں شروع ہوئی تھی اور جسکا شمار موجودہ زمانی کی خصوصیات میں ہی۔

بین الاقوامی انجمنین جن میں سی متعدد کی اراکین کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہی صرف اپنی اراکین کی کثرت کی لحاظ سی اہم نہیں، بلکہ ان کا طرہ امتیاز یہ ہی کہ تمام بین الاقوامی افکار و خیالات کی تنظیم ایک خاص طرز پر ایک معین جدو جہد کی لٹی کرتی ہیں۔

اس لٹی یہ ضروری بات تھی کہ یہ انجمنین، خصوصاً وہ جو نوجوانوں کی جسمانی اور ذہنی تربیت سی دلچسپی رکھتی ہیں باہمی تعلق اور تبادلہ خیالات کی ذرائع تلاش کریں۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کی لٹی بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی وجود میں آیا، جس کا ایک شعبہ یہ کمیٹی ہی۔ یہ کمیٹی کوئی انتظامی کمیٹی نہیں ہی، لیکن اس کی مقاصد میں یہ بھی داخل ہی کہ وہ تبادلہ خیالات میں آسانی پیدا کریں، مشترکہ مطالعہ کی ذرائع تلاش کریں، اور ان ذرائع کو اختیار کریں۔

یہ واقعہ ہی کہ ادارات بین الاقوامی مختلف قسم کی ہیں، وہ طرح طرح کی انسانی خیالات کی ناپائیدگی کرتی ہیں۔ بعض خالص علمی، اور بعض کا دائرہ عمل بہت وسیع ہی، لیکن یہ ہیکھا گناسی کہ باوجود خیالات اور طرز عمل کی گہری اختلافات کی ایک مشترک نقطہ ہی جس پر یہ سب ملتی ہیں، اسلٹی ان میں ذہنی اور عملی اتحاد ممکن ثابت ہوا۔ بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی فی الحقیقت اس تجربہ کا موقعہ دیا اور یہ کہا جاسکتا ہی کہ اب تک یہ تجربہ

حاصا کامیاب ثابت ہوا ہے۔ کمیٹی اتحاد جس کا پہلا اجلاس ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ کو ہوا اپنا کام باقاعدہ کرتی رہتی ہے۔ اس کی پانچ عام جلسی ہو چکی ہیں، اور اس فی کام کی تقسیم متعدد مستقل سب کمیٹیوں میں کردی ہے اس فی اپنی دستور العمل میں ایک عارضی دفعہ رکھی ہے جس میں بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی کی ساتھ مل کر کام کرنی پر زور دیا گیا ہے۔ بعض بین الاقوامی انجمنوں فی جو افتتاح کی وقت شریک نہ تھیں اس کی بعد ممبری کی درخواست کی، ان میں سی وہ جماعتیں جو بوجوانوں کی ترست میں مشغول ہیں قدرتی طور پر بہت خلوص کی ساتھ بین الاقوامی اتحاد کی اصول کی حامی ہیں، اور انہیں خاص طور پر اشتراک عمل کی خواہش ہے۔ ان کی سبب سی کمیٹی ایک عالمگیر جماعت بن گئی ہے۔ یہ کمیٹی ملحقہ انجمنوں کی منظوری کی شرط پر حسب ذیل اعلان کرنا چاہتی ہے۔

## اعلان

”ہر صحیح نظام تعلیمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر بچی کو اس کی فطرتی ماحول یعنی اوس کی خاندان اور اوسکی بنی نوع سے وابستہ کریں۔“ اسکی ضرورت ہمیشہ سی ہے، لیکن اوس شدید زلزلہ کی بعد جس فی انسانی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا، ہی پرانی رشتوں کو توڑ دیا ہی اور انسانوں کی دلوں میں اور کائنات کی نظام میں انتشار پیدا کر دیا ہی یہ ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔

ایسی وقت میں بچی کی ذہن میں توازن قائم رکھنے کی لٹی اور اوسکی عام بھبودی کی لٹی یہ ناگزیر ہے کہ اوس کی دل میں احساس فرض پیدا کیا جائی اور اسی یہ سمجھایا جائی کہ اسی مردانہ وار اپنی خاندان، اپنی رفقہ، اپنی گاؤں یا شہر اور اپنی قوم کی حقوق ادا کرنا چاہتی لیکن اوسی یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ تعلیمی اور وابستگی ایک ملک کی حدود کی پابند نہیں ہوسکتی اور نہیں ہونا چاہتی کیونکہ نوع انسانی

امن سی دلچسپی ہی باہمی تعلقات قائم رکھنے کی لٹی ایک ذریعہ کمیٹی اتحاد کی صورت میں پیدا کیا ہی۔ یہ کمیٹی بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی کی ماتحت کام کرتی ہی اور اس کا وجود بھی ادارہ مذکور اور انجمن اقوام کی طرح تاریخی ضروریات پر مبنی ہی۔

حقیقت میں یہ اس تنظیمی تحریک کا نتیجہ ہی جو اب سی تیس چالیس سال پہلے تمام ملکوں میں اور تمام طبقوں میں شروع ہوئی تھی اور جسکا شمار موجودہ زمانی کی خصوصیات میں ہی۔

بین الاقوامی انجمنین جن میں سی متعدد کی اراکین کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہی صرف اپنی اراکین کی کثرت کی لحاظ سی اہم نہیں بلکہ ان کا طرہ امتیاز یہ ہی کہ تمام بین الاقوامی افکار و خیالات کی تنظیم ایک خاص طرز پر ایک معین جدوجہد کی لٹی کرتی ہیں۔

اس لٹی بہ ضروری بات تھی کہ یہ انجمنین، خصوصاً وہ جو نوجوانوں کی جسمانی اور ذہنی تربیت سی دلچسپی رکھتی ہیں باہمی تعلق اور تبادلہ خیالات کی ذرائع تلاش کریں۔ اسی ضرورت کو پورا کرتی لٹی بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی وجود میں آیا، جس کا ایک شعبہ یہ کمیٹی ہی۔ یہ کمیٹی کوئی انتظامی کمیٹی نہیں ہی، لیکن اس کی مقاصد میں یہ بھی داخل ہی کہ وہ تبادلہ خیالات میں آسانی پیدا کریں، مشترکہ مطالعہ کی ذرائع تلاش کریں، اور ان ذرائع کو اختیار کریں۔

یہ واقعہ ہی کہ ادارات بین الاقوامی مختلف قسم کی ہیں، وہ طرح طرح کی انسانی خیالات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بعض خالص علمی، اور بعض کا دائرہ عمل بہت وسیع ہی، لیکن یہ ہیکہا گناسی کہ باوجود خیالات اور طرز عمل کی گہری اختلافات کی ایک مشترک نقطہ ہی جس پر یہ سب ملتی ہیں، اسلٹی ان میں ذہنی اور عملی اتحاد ممکن ثابت ہوا۔ بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی فی الحقیقت اس تجربہ کا موقعہ دیا اور یہ کہا جاسکتا ہی کہ اب تک یہ تجربہ

اصاً کامیاب ثابت ہوا ہے۔ کمیٹی اتحاد جس کا پہلا اجلاس ۱۰ دسمبر ۱۹۲۵ کو ہوا اپنا کام باقاعدہ کرنی رہتی ہے۔ اس کی پانچ عام جلسی و چکی ہیں، اور اس فی کام کی تقسیم متعدد مستقل سب کمیٹیوں میں کردی ہے۔ اس فی اپنی دستور العمل میں ایک عارضی دفعہ رکھی ہے جس میں بین الاقوامی ادارہ اتحاد ذہنی کی ساتھ مل کر کام کرنی پر زور دیا گیا ہے۔ بعض بین الاقوامی اجتماعوں فی جو افتتاح کی وقت شریک بہ تہین سے کی بعد ممبری کی درخواست کی، ان میں سے وہ جماعتیں جو جوانوں کی تربیت میں مشغول ہیں قدرتی طور پر بہت خلوص کی ساتھ بین الاقوامی اتحاد کی اصول کی حامی ہیں، اور انہیں خاص طور پر اشتراک عمل کی خواہش ہے۔ ان کی سب سے کمیٹی ایک عالمگیر جماعت بن گئی ہے۔ یہ کمیٹی ملحقہ اجتماعوں کی منظوری کی شرط پر حسب ذیل اعلان کرنا چاہتی ہے۔

## اعلان

”ہر صحیح نظام تعلیمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر بچی کو اس کی فطرتی ماحول یعنی اوس کی خاندان اور اوسکی ہی نوع سے وابستہ کریں۔“ اسکی ضرورت ہمیشہ سے ہے، لیکن اوس شدید زلزلہ کی بعد جس فی انسانی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا، ہی پرانی رشتوں کو توڑ دیا ہے اور انسانوں کی دلوں میں اور کائنات کی نظام میں انتشار پیدا کر دیا ہے یہ ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔

ایسی وقت میں بچی کی ذہن میں توازن قائم رکھنے کی لٹی اور اوسکی عام بہبودی کی لٹی یہ ناگزیر ہے کہ اوس کی دل میں احساس فرض پیدا کیا جائی اور اسی یہ سمجھایا جائی کہ اسی مردانہ وار اپنی خاندان، اپنی رفا، اپنی گاؤں یا شہر اور اپنی قوم کی حقوق ادا کرنا چاہی۔ لیکن اوسی یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ تعلیق اور وابستگی ایک ملک کی حدود کی پابند نہیں ہو سکتی اور نہیں ہونا چاہی کیونکہ نوع انسانی

کی مختلف جماعتوں میں حقوق و فرائض مشترک ہیں بلکہ ان کی باہمی تعلقات اس سی سی بھی زیادہ مستحکم بنادوں پر قائم ہیں۔

علاوہ اسکے گھر میں، مدرسے میں اور ان اداروں میں جو مدرسہ کی تعلیم کی تکمیل کرتی ہیں بچی پر اس بات کی تاکید ہونا چاہئی کہ وہ غیر ملک کی لوگوں کی ساتھ اخلاق سی پیش آئی اور اوسکو شوق دلانا چاہئی کہ اون کی رسم و رواج سی واقفیت حاصل کری، ان کی زبان سیکھی اور اون کی خیالات سمجھی۔

معلموں کو چاہئی کہ وہ تصویروں، فلموں اور جادو کی لالین کی ذریعہ، تاریخ، جغرافیہ، تاریخ ادب، عام ادب اور سائنس وغیرہ کی تعلیم اسی اصول پر دیا کریں۔ ان تعلیمی طریقوں کو بی حد موثر بنانی کی تدابیر دریافت کرنا چاہئی اور انہیں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی ضروریات کی مطابق بنانا چاہئی۔

یہ بھی مناسب ہی کہ جہاں تک ممکن ہو مختلف ملکوں کی بچوں اور بوجوانوں کو سیر و سفر، حلقہ ہائی مطالعہ، خط و کتابت وغیرہ کی ذریعہ براہ راست تعلقات پیدا کرنی کا موقعہ دیا جائی۔

یہ بین الاقوامی 'تبادلہ' اگر تمام تعلیمی مدارج میں اس طرح کیا جاسکی کہ اسکول اور کالج کی لڑکوں اور پروفیسروں کو باہمی تعلقات پیدا کرنی کا موقعہ ملی تو یہ بچوں کو بین الاقوامی اتحاد کا طریقہ سکھائی اور انجمن اقوام کی کام کو فروغ دینی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔ تعلیم خواہ وہ خاندان میں ہو یا مدرسے میں یا کسی دوسری جگہ، اور تربیت خواہ وہ ادبی ہو یا صنعتی، لوگوں میں باہمی واقفیت اور ذہنی مفاہمت پیدا کرکی قیام امن کی کام میں بڑی مدد دی سکتی ہی۔

[اس کی بعد مختلف ممالک کی فہرست ہی جو مندرجہ بالا اعلان کی پسندیدگی کا اظہار کر چکی ہیں۔]

# غزل

از مصور فطرت حضرت صفی صاحب، لکهنوی

شیشوں کی طرح ٹوٹی، توبہ سر می خانہ  
ساقی! پھر اسی کن سی، اک لغزش مستانہ  
یہ دل شکفی کب تک، ای جلوۂ جانانہ  
سجدی کو تڑپتا ہی، کعبہ ہو کہ ستخانہ  
کیا رند بلاکش کا سرمایۂ میخانہ  
درکا ہوا اک شیشہ، رستا ہوا پیمانہ  
یہ سوختہ سامانی، ہی رونق کاشانہ  
اک شمع کی چند آنسو، مشت پر پروانہ  
ایک اک سی اولجھتا، ہی اپنا ہو کہ بیگانہ  
بوجھو نہ روش دل کی، دیوانہ تو دیوانہ  
ہمت کا زبانوں پر، ہی آج تک افسانہ  
کیا کام کیا تو نی، ای تیشۂ مردانہ  
ای برق نظر دشمن، ای جلوۂ جانانہ  
اک مرتبہ دھرا دی پھر طور کا افسانہ  
اسباب تفسیر سی آرائش ہستی ہی  
کچھ دن کہین آبادی، کچھ دن کہین ویرانہ  
کیا سر ہی سر واعظ، کیا دل ہی دل زاہد  
ادراک سی مستثنیٰ، احساس سی بیگانہ



روزی هی جو قسمت کی، کم، بیش، وه پهونچیکی  
 دانه نه سهی خرمن، خرمن نه سهی دانه  
 پاسی ڪو پلڪ جاتی، کچهه دیر نهین لکئی  
 افسون کری دولت، افسانه هی افسانه  
 جب قید تعین سی، ای دل هی بری ڪوئی  
 سنگ ره مقصد هی، ڪعبه هو، که بهخ به  
 صحرای محبت مین تیغین بهی اگر برسین  
 پیچهی به قدم سرکی، ای همت مردانه  
 هر رور نئی نقشی، بنی هین، نگزنی هین  
 اب رسم محبت هی، بازیچه طفلانه  
 دور معی عشرت سی ڪیا کام صفی همڪو  
 جب عمر هی کا ایی لریز هی پیماره

# رباعی

ار جناب نصیرالدین حسین صاحب نصیر، عظیم آبادی، برسر

و جان منی و جان جاسا هستی ، فریاد زبان بی زبان هستی  
بر حیطة عقل من نه گنجید و صفت ، برتر ز حال مدح خوانان هستی

دیگر

دل را به فراق سار جانی خستم ، نقشی بخیال دوست شها ستم  
تا آنکه ز درد دل اثر پیدا شد ، ناگاه ز در رسید جانان رستم

دیگر

سروى نه بمثل خویش دندم بچمن ، بگر بخت خراں چو من رسدم بچمن  
هر گل که مرا بدید مستت گر دید ، تا توئی کسی دهم دمدم بچمن

دیگر

تیرت چو بمن رسید دل فوز آمد ، صد درد رسد و عشق پر سور آمد  
چون پاك بسوخت نجان و تن را یکسر ، دل مطلع نور عالم اوور آمد

دیگر

از روز ازل تراست دلبر بودن ، در قسمت ما سپند و مضطر بودن  
سرخداری حسن بر تو شد ختم ولی ، در ملک حنون تراست افسر بودن

## تنقید و تبصرہ

مثنوی شیریں و خسرو :

سلسلہ 'کلمات خسروی' کی اشاعت میں مسلم یونیورسٹی پریس علیگندہ ی امسال امیر خسرو دہلوی کی 'شیریں و خسرو' شائع کی ہے۔ اصل مثنوی ۲۸۵ صفحات میں ہے اور اسکی تنقید ۱۱۸ صفحات میں۔ طبعات، کثافت اور کاغذ وغیرہ کی احاطہ سے یہ بھی ویسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہے جیسی وہ سابقہ مثنویاں جو اس سلسلہ میں پیشتر شائع ہو چکی ہیں اسکی تنقید و تصحیح مولوی حاجی علی احمد خان صاحب اسیر مرحوم دہلیونی سابق پروفیسر فارسی سنٹ جاس کالج آگرہ فی کی ہے۔

تصحیح پر جہاں تک ہم فی سرسری نگاہ ڈالی خاصی محنت کی گئی ہے حاشیہ میں کہیں کہیں مشکل الفاظ کی معانی کی بھی تشریح ملتی ہے تنقید میں بھی مطالب مثنوی اور اسکی اشخاص کی متعلق نقادانی جو کچھ لکھا ہے بہت کاوش اور کوشش سے لکھا ہے، اور وہ بہت کچھ قدر کی قابل ہے، لیکن جہاں خسرو اور نظامی کا مقابلہ کیا ہے وہاں وہی سنت قدم پیش نظر رکھی ہے کہ خسرو کو فضیلت دی جائے۔ ہم فی شروع ہی میں اس خیال سے روکا تھا، اور اسوقت جو مثنویاں اس سلسلہ میں شائع کی گئی تھیں اسکی تنقیدوں میں علی الاعلان اس غلطی کا اظہار کر دیا تھا اور صاف صاف لکھ دیا تھا کہ مثنوی گوئی میں خسرو کو نظامی پر فوقیت نہیں ہے۔ لیکن نواب اسحاق خان مرحوم چونکہ امیر خسرو کی شیدائی خاص تھی اور انکو شاعری کا سب سے بڑا ہیرو بنانا چاہتی تھی اس لئے جن لوگوں سے انھوں فی مثنویات خسرو کی تنقیدیں لکھائیں انھوں فی ان کی اس خواہش

کا خاص خیال رکھا۔ اور زیادہ تر یہی کوشش کی کہ نظامی اور خسرو کے اشعار کا مقابلہ کر کے جس طرح ہوسکی خسرو کو ترجیح دے۔ چنانچہ سلسلہ وار اب تک غلط روی چلی جاتی ہے حالانکہ خود خسرو اپنی آپ کو نظامی کا شاگرد اور پرستار مانتے ہیں انکا زیادہ سی زیادہ دعوی صرف یہ ہے کہ نظامی کی چربہ کشی مجھ سے دور کوئی نہیں کر سکتا، چنانچہ کہتی ہیں:

زاسکے کہ مرد پرہیز داشت ، بہ زس نتوان نمونہ برداشت  
اہل فن کی نزدیک سلسلہ کلیات خسروی کی نقادوں کا بہ حرم کی  
طرح قابل معافی نہیں، کاش اب بھی اس سے باز آئیں، اور اپنی ناواقفیت  
یا ملکی عصبیت سے فن کی چہرہ کو داعدار نہ بنائیں  
اس مثنوی کی نقاد صاحب کو غالباً اردو لکھنے کی کم عادت تھی، یہی  
وجہ ہے کہ عبارت میں تکلف ہے اور کہیں کہیں حملی اور فقری غلط  
ہو گئی ہیں۔ کاش چھاپی سے پہلی اصلاح کر لی جاتی  
اسکی قیمت کہیں درج نہ ہو۔  
نظام گزٹ۔

چار مینار حیدرآباد دکن بہ گزٹ ہفتہ وار سند وفاء احمد صاحب ایم ای  
اور محمد حبیب اللہ صاحب رشدی، ایم ای کی ادارت میں شائع ہوا شروع ہوا ہے۔  
۱۸ جمادی الاول سنہ ۱۳۶۶ھ میں اس کا پہلا نمبر نکلا جو رومو کی لٹی موصول  
ہوا ہے شکل و صورت میں یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی احیاء الہلال کی  
مشابہ ہے۔ حجم ۶۱ صفحہ ہے۔ قیمت سالانہ چھ روپہ۔ تصویر بن بھی کہی  
کبھی شائع کرنے کا وعدہ ہے۔

نمبر زیر تنقید میں اعلیٰ حضرت نظام کی ایک غرک بقیہ، اور مہاراجہ  
کشن پرشاد کا ایک مضمون 'پیام اتحاد' مندرج ہے۔ بظاہر اس اخبار کا مقصد  
تعلیمی، اصلاحی اور معاشرتی معلوم ہوتا ہے، اور یہ اقوام ہند میں مصالح کا  
خواہاں ہے۔ قابل مدیرین اور لہجہ کی متانت اور مقاصد کی خوبی کی لحاظ سے  
ہمکو امید ہے کہ یہ اخبار ترقی کریگا۔

## القریش

یہ مہوار رسالہ امرتسر سی محمد علی صاحب رزوق کی اذیزی میں شائع ہوتا ہے  
چھپائی، لکھائی، اور کاغذ اوسط درجہ کا، قیمت سالانہ تین روپیہ، مقصد  
قریش برادری کی اصلاح و ترقی ہے۔ مصامین نظم و نثر معمولی ہیں، اور غیر قریش  
مسلمانوں کی لٹی دلچسپی کا سامان اس میں زیادہ نہیں ہے۔

اسلامی برادری اور اخوت کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس لٹی ہم اس قسم کی  
جماعتی اخبارات یا رسائل کو اسوقت مفید نہیں سمجھتی۔ ہم کو یقین ہے  
کہ رفتہ رفتہ زمانہ کا تلاطم ان نامہنی تفرقوں کو خود ہی مٹا دے گا، اور ساری  
مسلمان بھائی ایک سطح پر آجائیں گی اور منفقہ مقاصد کی لٹی مل سکے۔ کوشش  
کرا سکتی ہے۔

## الایمان:

حاجی مولوی محمد مقتدی خان صاحب شروانی منبجر مسلم یونیورسٹی  
پریس علیگڑھ فی اس نام سی۔ دو رسالوں کا مجموعہ حروف شتاس مسلمان بچوں کی  
تعلیم کی لٹی شائع کیا ہے۔ پہلی رسالہ میں ایمان کی مجمل کیفیت بیان  
کی ہے۔ دوسری میں مصل، جس میں ان تمام رسولوں کی حالات  
مختصراً دئی ہیں جس کا ذکر کلام مجید میں ہے۔ نیز آسمانی کتابوں کا  
بھی بیان ہے۔ قرآن کی نصحت و حکمت کی آیتیں چن کر جمع کر دی ہیں،  
اور پیغمبر آخر الزمان یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالات کی قدر  
تعیل کی ساتھ بیان کئی ہیں، اور احادیث سی جوامع الکلم اور دعائیں  
وغیرہ درج کی ہیں۔ غرض یہ کتاب مسلمان بچوں کی لٹی ہر طرح  
پڑ فائدہ مند ہے۔ چھپائی، لکھائی اچھی، حجم تقریباً پونی دوسو صفحہ  
قیمت ۱۲ آنہ۔ مصنف موصوف کی پتہ سی مل سکتی ہے۔

## مطلع انوار:

- سلسلہ خسرو کی یہ مثنوی نہ تنقید و تصحیح و تحشیہ مولوی مقتدی خان  
صاحب موصوف مسلم یونیورسٹی پریس میں چھاپ کر شائع کی گئی ہے۔ مولوی

صاحب موصوف فی دیگر تنقید نگاران خسروی کی طرح اس کا مقابلہ نظامی کی ساتھ  
ہیں کیا ہے، بلکہ اس سے احتراز فرمایا ہے۔ صرف کلام خسروی کی خوبیاں  
اور ان کی اس مثنوی میں جو تعلیقات ہیں ان کو واضح کرنی کی کوشش فرمائی ہے۔  
تصحیح و تحشیہ بھی محنت سے کیا ہے۔

چھپائی حسب معمول اعلیٰ درجہ کی ہے قیمت بہ تفاوت کاغذ حسب ذیل  
ہے: قسم اول آٹھ روپیہ، قسم دوم چھ روپیہ، قسم سوم غیر مجلد تین روپیہ۔  
بھی قیمت ان تمام مثنویوں کی ہے جو اس سلسلہ میں شائع کی گئی ہیں۔  
مسلم یونیورسٹی لک ڈپو یا مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑہ سے مل سکتی ہے۔

ج-۱

تائیس :

[ اناطول فرانس کا مشہور ناول مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب فی ای مجلد  
حجم ۴۸۰ صفحہ، شائع کردہ "دارالاشاعت پنجاب" لاہور۔ قیمت درج نہیں ]  
اناطول فرانس پچھلی پچاس برس سے فرانسیسی انشاپردازوں میں  
سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تصانیف میں مغربی تمدن کی  
اوس دور کی جھلک نظر آتی ہے جب ساری زندگی پر ثبوتیت کا رنگ۔  
غالب تھا۔ تمدنی شعبوں میں سب سے اہم علم سمجھا جاتا تھا اور علم  
بھی سائنس کا علم۔ مذہبی عقیدہ کی کمزوری سے زندگی کا کوئی مرکز  
باقی نہیں رہا تھا۔ بظاہر ہر پہلو سے ترقی ہو رہی تھی، لیکن انسان  
کی مجموعی شخصیت جو صرف مذہب سے تسکین پاسکتی ہے سکون  
و اطمینان کی لٹی تڑپ رہی تھی۔ اناطول فرانس رومان رولان کی خلاف اپنی  
عہد کا مصلح نہیں بلکہ مصور ہے۔ وہ اپنی همصوروں کی سرگشتگی دکھاتا  
ہے، رہنمائی نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ راہ بہ خود اوسی معلوم ہے اور نہ  
اوسکی خیال میں دوسروں کو۔

"تائیس" میں اس نے موجودہ زمانی کی تصویر بہن دکھائی ہے بلکہ  
اوس زمانی کی مصر کا مرقع جب عسائیت کا آغاز تھا اور یونانی - رومی

تمدن کا جامعہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ عہد غالباً اسی لٹی منتخب کیا گیا ہے کہ موجودہ عہد سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں اسکندریہ مغرب اور مشرق ادنیٰ کی ساری تمدنوں کا محل اجتماع ہے۔ وہاں نوفلاطونی بھی ہیں، یہودی بھی اور عیسائی بھی؛ سب کی سب علم کی شے میں سرشار ہیں، اور عقیدے اور عمل میں ڈانوان ڈول۔ وہ جانتے بہت ہیں، مانتے کم ہیں، اور کرنی کچھ نہیں۔ دوسری طرف عیسائی راہب ہیں جو علم و عقل سے بیزار ہیں، اور عقیدہ و عمل کی عاشق۔ انکا عقیدہ صغف الاعتقادی ہے اور انکا عمل ترک دینا اور نفی زندگی دیدار فرقی ادنیٰ جذبات کی غلام ہیں اور راہب ادنیٰ اور اعلیٰ کل جذبات کی دشمن۔ اس حالت میں ایک راہب پینوتوس انک دسادار عورت یعنی رقاصہ تائیس پر عاشق ہوتا ہے، اوسے نفسانی پسے سے روحانی بلندی پر پہنچانا چاہتا ہے۔ راہب کی دل پر عمروں چھایا ہوا ہے اور توازن معدوم ہے، رقاصہ باوجود اپنی بدکاری کی عجز و ساز کی جذبات رکھتی ہے اور فنون لطیفہ سے حسن و تناسب سیکھ چکی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رقاصہ کی دل میں انسانوں کا درد ہے اور راہب اس سے محروم ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رقاصہ راہب کی بدولت توبہ کی دروازی سے روحانی مسرت کی نارگاہ میں پہنچ جاتی ہے اور راہب اپنی خواہشات ہسانی کی ہاتھوں قعر مذلت میں گر جاتا ہے۔

مولوی عنایت اللہ صاحب کا ترجمہ اگرچہ انگریزی سے کیا گیا ہے لیکن اسقدر مکمل ہے کہ غالباً اصل فرانسسی سے بھی اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کی ادنیٰ ذوق فی الفاظ کا پردہ اٹھا کر شاہد معی کو بی نقاب دیکھا ہے، اس لٹی اصل اور ترجمے کا فرق ان کی لٹی باقی نہیں رہا۔ اس ترجمے سے شائد لسانیات کی ماهر کو کوئی شکایت ہو لیکن ادب کو کوئی شکایت نہیں ہو سکتی وہی زور، وہی متانت، اور وہی گہری ظرافت کی جھلک حوا انا طول فرانس کی طرز ادا کی خصوصیت ہے ترجمے میں یہ موجود ہے۔ کتاب کی شروع میں محمد سعید صاحب کا ایک مقدمہ ہے اور آخر میں مترجم فی تلمیحات کو سمجھانی کی لٹی مفصل نوٹ دی ہیں

ان دونوں چیزوں نے کتاب کو علمی حیثیت سے مدد بنا دیا ہے۔ کتاب  
کی لکھائی خاصی ہے کاغذ اور چھپائی قابل اطمینان ہے۔

۔ پر گل :

[جلیل احمد قدوائی صاحب بی۔ ای (علیک) کی مختصر افسانوں کا  
مجموعہ، حجم ۲۰۵ صفحہ، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ مصنف سی، مسلم  
یونیورسٹی علیگندہ، یا 'کاشانہ' اناؤ کی پتہ سے مل سکتا ہے۔]  
جدید طرز کی افسانہ نگاری کی ابھی اردو میں ابتدا ہے، لیکن اس  
صنف میں اس تھوڑی عرصے میں جتنی کامیابی مختصر افسانوں کو ہوئی  
ہے ناول یا ڈراما کو نہیں ہوئی۔ ملک کی متعدد ادب اچھی مختصر افسانے  
لکھ رہے ہیں جن میں پریم چند صاحب، محمد مجیب صاحب اور پنجاب  
کی بعض اہل قلم کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری  
ادبی نشو و نما کی پہلی منزل مختصر افسانہ ہے جب اچھی مختصر افسانے ہماری  
زبان میں ہر دلعزیز ہو جائیں گی اس کی بعد اچھی ناول اور ڈراما کی پڑھنی  
کی طرف لوگوں کو رغبت ہوگی۔

ان ادیبوں کی صف میں اب جلیل قدوائی صاحب بھی شامل ہوئی ہیں۔ آپ کی  
کتاب 'سیرگل' ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سی ۷ چبخوف کی  
افسانوں سے ترجمہ کئی کئی ہیں، اور چھ خود جلیل صاحب کی تصنیف ہیں۔  
چبخوف کی مختصر افسانے مغرب کی دنیا کی ادب میں جواہر کی قیمت رکھتی  
ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ انہیں مشرق میں بھی یہی حیثیت حاصل نہ ہو  
جلیل صاحب نے ان افسانوں کا ترجمہ روسی میں نہیں بلکہ انگریزی سے کیا ہے  
پھر بھی ان میں بہت سی ادبی خوبیاں جو روسی جانتی والی چبخوف کی کلام  
میں بتاتی ہیں موجود ہیں خصوصاً گفتگو کی روانی اور فی تکلفی کا ترجمہ  
میں قائم رکھنا قابل داد ہے۔

خود جلیل صاحب کی افسانوں سے ادب کا سچا شوق اور جذبات قلب  
خصوصاً غم و الم کی جذبات کا صحیح مطالعہ ظاہر ہوتا ہے۔ 'زوال حسن'



اور " دو آنسو " خاص طور پر تعریف کی مستحق ہیں ۔

افساہوں کی زبان میں دلاویری اور بدرت ہی لیکن یہ بدرت کہیں کہیں غیر مانوس اور دھندلی لفظوں اور ترکیبوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہی ہماری بوجوان ادیب کی احساسات (خدا کرے مطبع والی اسی احساسات نہ گردین) کی گہرائی قوت اظہار کی قابو میں نہیں آتی ۔

کتاب کی شروع میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا مقدمہ ہے جو ادبی نقطہ نظر سے مقدمی کا سچا حق ادا کرتا ہے ۔ خواجہ صاحب نے ان چند صفحات میں افسانہ نگاری کی اخلاقی قدر اور چینیخوف کی ادبی خصوصیات بہت خوبی سے بیان کی ہیں اور جلیل قدوائی صاحب کی افساہوں پر بھی مصرعہ اور منصفانہ انداز سے تنقید کی ہے ۔ ایک نئی بات کتاب میں یہ ہے کہ ہر افسانہ کسی دوست یا عزیز کی نام پر معنون کیا گیا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مصنف کو منظور کچھ اور ہے اور " سر گل " محض " شوخی بہانی " کی ۔

کتاب کی لکھائی معمولی ہے ، چھپائی اوزکاعد عمدہ ہے ، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب شائقین ادب کیلئے ایک ایسا تحفہ ہے جسے شکر ٹی اور حسرت کو ساتھ قبول کرنا چاہئے ۔

نکشی :

[ سلسلہ دارالمصنفین کی اٹھاسویں کتاب مولفہ ایم ۔ ای مکی ، مترجم پروفیسر سید مظفر الدین ندوی ایم ۔ ای ، حجم ۶۰۶ صفحہ ، قیمت درج نہیں ۔ ہر تصنیف میں مصنف کی ذات کی تھوڑی بہت جھلک نظر آتی ہے لیکن نکشی ان لوگوں میں ہے جن کی کتابیں بالکل ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہیں نکشی کی سیرت متضاد عناصر سے مرکب تھی اس لئے اس کی تصانیف میں بہت متناقض خیالات پائی جاتی ہیں ۔ اس تضاد میں سے اصلی شخصیت ڈھونڈنا نکالنا اور اس تناقض میں سے اصلی خیالات کا تلاش کرنا اسقدر دشوار ہے کہ سو انی جرمنی کی جید فلسفی ریل (Riel) کو کسی کو اس میں کامیابی نہی

ہوئی۔ یہ چھوٹا سا رسالہ جس کا ترجمہ دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوا ہے  
 نثر کی سہرت لکھنے اور اس کی خیالات پر تنقید کرنی کی ایک ناکام کوشش ہے۔  
 نثر کی زندگی کی حالات صحیح ہیں اور اس کی کتابوں کا خلاصہ بھی قابل  
 اعتراض نہیں، لیکن یہ تو ان حالات سے آنکھوں کو اس کی شخصیت کا کوئی  
 مکمل نقشہ نظر آتا ہے اور یہ اس خلاصہ سے ذہن میں اس کی فلسفہ کا کوئی  
 صحیح تصور بندھتا ہے۔

نثر کی زندگی اور اس کی افکار کی اصل کنجی دو ذہنی عناصر کی  
 کشمکش ہے۔ ایک طرف تو اس پر اپنی رہائی کی اڑ سی علم و عقل جمالیات و  
 تخیل کا رعب سٹھا ہوا ہے اور دوسری طرف اپنی طبیعت کی تقاضی سے قوت اور  
 ارادی کا تسلط ہے۔ ان عناصر کو خود اسی اپالو کا رنگ اور ڈایونسیس کا رنگ  
 کھکھر سمجھانا چاہا ہے، اسکی ساری زندگی اور اسکا سارا فلسفہ ان دو رجحانات  
 کا جولا بگڑا رہا ہے جن میں امتزاج پیدا کرنا اسی آخر تک نصیب نہ ہوا۔  
 وہ کتاب جو زیر تنقید ہے اس کشمکش کی دکھائی سی قاصر ہے۔  
 جو کچھ کہا گیا ہے اصل کتاب کی متعلق تھا۔ سد مظفر الدین صاحب  
 کا ترجمہ ہر لحاظ سے نہایت قابل تعریف ہے۔ علمی اصطلاحات کی  
 لفظی عام طور پر بالکل مناسب الفاظ استعمال کئی کئی ہیں اور عبارت  
 میں اسقدر سلاست، روانی اور وضاحت ہے کہ شاید اصل کتاب میں  
 بھی نہیں۔ اگر ہماری زبان میں مستند علمی کتابوں کی بھی ایسی ترجمی  
 شائع ہوتی لگتی تو اسکا علمی معیار بہت بلند ہو جاتی۔

کتاب میں بعض اغلاط بھی ہیں جنہیں دوسری اندیشہ میں دور گردینا  
 چاہیے اشخاص کی نام کو اردو کی قالب میں ڈھالنے میں یہ انگریزی تلفظ کی  
 مطابقت کی گئی ہے نہ جرمن کی تلفظ کی۔ ہماری زبان میں غالباً وہ سب اصوات  
 موجود ہیں جو مختلف مغربی زبانوں میں ہیں، اس لفظی مناسب ہے کہ ہم  
 اسہائی معرفہ کی معاملی میں یہ اصول اختیار کریں کہ جس زبان کا نام ہے  
 اس کی تلفظ کا پورا تتبع کیا جائی۔ ذیل میں ہم ان اغلاط کی نسبت  
 دیتی ہیں جن کا صحیح کرنا بہت ضروری ہے۔

ص (۳) شوین ہار کی جگہ شوین ہاؤا پر ہونا چاہتی ۔  
 " فاسفہ عزم کی جگہ فلسفہ ارادہ ہونا چاہتی کیونکہ جرمن لفظ  
 Wille سی مراد ارادہ ہی جو علاوہ نفس اسانی کی قوت کی ایک مافوق الطبعی  
 وجود کی حیثیت بھی رکھتا ہی ۔ اسکی لئی عزم کا لفظ کسی طرح مناسب نہیں  
 ص (۱۳) وکنی کی جگہ فشنی ہونا چاہتی ( دائی مجہول سی )  
 ص (۱۴) شیلر کی جگہ شلر ہونا چاہتی ۔  
 ص (۱۷) کائنجن کی جگہ گوئنگن ہونا چاہتی ۔  
 ص (۱۹) بیل کی جگہ جرمن قاعدی سی دارل یا فراسیسی قاعدی سی  
 نال ہونا چاہتی ۔

ص (۲۱) لاپرواہی کی جگہ بی پروائی ہونا چاہتی  
 ص (۲۱) حادثہ کا آغاز کی جگہ المہ کا آغاز ہونا چاہتی ۔  
 ص (۲۲) گرہولڈ کی جگہ کرائف والد ہوا چاہتی ۔ ڈور پاٹ خدا جانی  
 کس نام کی خرابی ہی ۔  
 ص (۲۳) انک ہی نام انک جگہ اسٹراس دوسری جگہ اسٹرار ہی ۔ صحیح  
 اسٹراؤس ہی ۔

ص (۳۰) کنی کی جگہ گوئی ہونا چاہتی مصنف بی امپڈوکنیس اور  
 ہراکلیٹس کی ساتھ خدا جانی کوں گوئی کا نام بھی ان لوگوں میں لکھدیا  
 ہی جن کی ذہن میں "اشیائی عالم کی اغراض و مقاصد کا خیال تک نہیں  
 آتا تھا ۔" یہ صریحی غلطی ہی

ص (۴۱) ہین کی جگہ ہائی ہونا چاہتی  
 ص (۶۶) کنٹ کی جگہ کانٹ ہونا چاہتی ۔  
 کتاب کی لکھائی چھپائی بہت عمدہ ہی اور کاغذ بھی بہت نفیس  
 لکایا گیا ہی ۔

۔ ہم سید مظفرالدین صاحب کو اون کی ترجی پر مبارکباد دیتی ہیں  
 نکالنا شہرہ دہی ہیں کہ فلسفہ کی مستند کتابوں کا ترجمہ کریں ۔

# شذرات

میری دیرنہ کرم فرما اور جامعہ صکی قدیم ناصح مشفق موای عبدالمحمد صاحب دریادادی فی اخبار "سج" نمبر ۴۳ مین جو ۲ و مرسنہ ۱۹۲۷ ع او شائع مواہی ملوکیت اور جمہوریت کی بحث کا سلسلہ جو انہوں فی مری "النظر" والی مضمون پر شروع کیا تھا، مری درخواست پر حمہ لردنا لیکن اس نمبر میں جو طویل مقالہ انہوں فی لکھہ ڈالا ہی اسمہ اپنی اخبار کی ناظرین نو معالطہ دکر میری طرف می بدگاموں میں مبتلا کرنی کی کوشش کی ہی اس وجہ سی ضرورت ہوئی کہ میں ان نو رفع کردوں۔

خانمہ کی ساتھ میں فی جو خط آنکو لکھا تھا، اور جو ہم و دسی ادات کام کا ہوگا، اس کو اگر درج کردیتی تو بہ ضرورت ناقد بہ دھی، لیکن والا اس کی درج کئی ہوئی اپنی اخبار میں پوری چھہ کالموں میں اسکا جواب لکھہ ڈالا، جسکی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہی کہ انہوں فی دیکھہ لیا کہ اسکو درج کی کی بعد جواب کی کوئی صورت رہ نہ جائی گی۔ اس لئی قصداً اسکی چھاپی سی گرہر کیا اور بلا اندراج اصل تحریر اسکی تردید کر ڈالی اس میں بھی حالہا حسمد میری فقری نقل کئی ناجائز قطع و برد سی ان کی مفہوم کو مسخ کر ڈالا

صحابہ کرام کی شان میں انہوں فی خود "کوئہ اندیشی" کا لفظ استعمال لیا ہی اور اسکو باریک قوسی خطوط میں لکھکر ناظرین کو اس و ہم میں ڈالی کی کوشش کی ہی کہ یہ منقول ہی، حالانکہ میری تحریر اس لفظ سی بالکل پاک اور مبرا ہی، اور اس قسم کی گستاخانہ لفظ کو سب صحابہ میں داخل سمجھتا ہوں پھر اسی میں وہ میری نسبت لکھتی ہیں کہ میں فی "تاریخ الامت" میں حضرت عثمان کی اخلاق کو "نا پسندیدہ" اور حضرت علی کی نسبت "فوق پسندی" "ارادہ کی کمزوری" "بی صبری" کی الفاظ لکھی

آج "تاریخ الامت" ملک کی طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا الفاظ میں سے ایک لفظ بھی اس میں نہیں ہے۔ یہ مولوی صاحب موصوف نے خود اپنی فہم سے تراش کر میری سر تھوپی ہیں۔ اس فہم کا نمونہ یہی دیکھنے کی قابل ہے "تاریخ الامت" میں یہی عبارت ہے: "حضرت عثمان اکثر امور میں چشم پوشی اور نرمی سے کام لیتی تھی، مگر یہ خلق کسی حکیم یا عالم میں ہو تو بہت قابل تعریف ہے لیکن فرمانروا اور خایفہ کی لٹی پسندیدہ نہیں۔" مولوی صاحب نے اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے حضرت عثمان کی اخلاق کو "پسندیدہ" لکھ دیا۔ اسکا فیصلہ میں ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ فن مناظرہ میں علماء نے یہ اصول طے کر دیا ہے کہ ایک فرقہ دوسری کی عبارت سے جو التزامی مفہوم نکالی وہ خود اسی کا قول قرار دیا جائے گا اور فرق مخالف پر حجت ہوگا کاش مدرس "سچ" اپنا اخبار نکالی سے پہلی سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا سکھے لیتی۔

جواب کا سب سے زیادہ مضحک حصہ وہ ہے جہاں خود مجھکو میری تحریر پر سمجھی کا الزام دیا ہے۔ اس پر مجھکو دو شعر یاد آ گئے جو امام خلیل بن احمد عروسی اپنی ایک ملامت گر کو مخاطب کر کے کہتی ہیں:

لو کنت نعلم ما اقول عذرتی ، او کنت اجہل ما تقول عذلتکا  
لکن جہلت مقالتي فعذلتی ، وعلمت انک جاہل فعذرتکا

ا- ح

ۛ

ہم کو بہت افسوس ہے کہ ہم حسب وعدہ تاسیس نمبر شائع نہیں کر سکی بلکہ اکتوبر کی معمولی نمبر کی اشاعت میں بھی اتنی دیر ہوئی کہ نومبر کا نمبر اس کی ساتھ شامل کرنا پڑا۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ رسالی کو نائب میں چھپوانے کا تجربہ کیا گیا، لیکن بد قسمتی سے ہماری مطبع کو اردو نائب کی کمپوز کرنے والی بہت کم ملی، اس لٹی مجبوراً کام بہت سست رفتار سے کیا گیا۔ ہم قارئین کرام سے معافی کی التجا کرتے

ہیں ، اب انشاء اللہ دسمبر کا نمبر لیتھو مین مقررہ وقت پر نکلی گا . نائب کی چھپائی کا تجربہ ہم اس وقت تک نہ کریں گی جب تک ہماری مطبع مین بڑی مشین نہ آجائی اور کمپوز کرنی والی کافی تعداد مین نہ ہوں . پھر بھی قارئین کرام سے توقع ہے کہ وہ اصل سوال کی متعلق اپنی رائی کا اظہار فرمائیں گی کہ اس نائب کی چھپائی انہیں پسند ہے یا نہیں ، اور اگر ساری دقتیں رفع ہو جائیں تو وہ جامعہ کو نائب مین چھاپی کا مشورہ دیتی ہیں یا نہیں .



ہمیں ” بین الاقوامی ادارۃ اتحاد ذہنی “ کی طرف سے ایک خط اور ایک رپورٹ ابتدائی اکتوبر مین موصول ہوئی تھی . ہم دونوں چیزوں کو اس ممبر مین شائع کرتی ہیں . یہ ادارہ جس کی طرف سے یہ خط ہے انجمن اقوام کی ماتحت پیرس مین قائم ہوا ہے . اسکا مقصد یہ ہے کہ تمام ملکوں اور قوموں کی درمیان ذہنی تعلقات قائم کئی جائیں ، تاکہ باہمی مفائرت اور مخالفت کم ہو اور یکجہتی اور اتحاد پیدا ہو . اسی کی ماتحت ایک کمیٹی اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ دنیا مین اور جتنی انجمنیں بین الاقوامی تعلقات قائم کرنی کی کوشش کر رہی ہیں سب کو ایک مرکز پر جمع کر کے اون مین اتحاد عمل پیدا کریں . یہ رپورٹ جو شائع ہو رہی ہے اسی کمیٹی کی طرف سے ہے ، اور اس کمیٹی کی مقاصد سے کوئی سمجھدار آدمی اختلاف نہیں کر سکتا قوموں کی باہمی مخالفت اور عداوت کی سبب سے جو عذاب دیا پر نازل ہو رہا ہے اس کا ایک منظر ہم جنگ عظیم کی صورت مین دیکھ چکے ہیں . ایسی حالت مین ظاہر ہے کہ دنیا کی سب سے اہم ضرورت اتفاق و اتحاد ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اتفاق و اتحاد گہرا اور دیر پا تب ہو سکتا ہے جب اس کی بنا ذہنی اور عام تمدنی مفاہمت پر ہو . پس اگر کوئی جماعت یہ مبارک مقصد لی کر اٹھتی ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں مین ذہنی اتحاد عمل کی کوشش کری تو اصولاً ہر شخص کو اسکی تعریف اور اسکی مدد کرنا چاہی .

لیکن ہر بات میں اہولی پہلو کی علاوہ ایک عملی پہلو بھی ہوتا ہے۔ دیا  
میں اچھی اصواوں کی پردی میں بڑی بڑی برائیاں کی جا چکی ہیں، اس لٹی احتیاط  
کا تقاضا یہ ہے کہ ہر معاملی کو، خواہ وہ اصولاً کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، عملی  
پہلو سے بھی جانچ لیا جائی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس معاملی کی صورت کیا ہے

☆

ادارہ اتحاد ذہنی انجمن اقوام کا ایک شعبہ ہے۔ انجمن اقوام کی  
متعلق خود یورپ میں عام خیال یہ ہے کہ یہ مغربی یورپ کی سلطنتوں،  
خصوصاً برطانیہ عظمیٰ کی سیاسی مقاصد کی حاصل کرنی کا ایک آلہ ہے  
اس لٹی اس ادارہ اتحاد ذہنی پر بھی کسی کو اعتبار نہیں ہے اور جب  
تک یہ ادارہ انجمن اقوام سے الگ نہ ہو جائی یا خود انجمن اقوام  
آزادی اور احلاس کا ثبوت نہ دی اسوقت تک سوائی چند سادہ دلوں کی  
کوئی اسکی طرف توجہ نہیں کریگا۔

☆

جب یورپ میں اس ادارے اور اس کی سرپرست انجمن اقوام کی طرف سے  
لوگوں کا یہ رویہ ہے تو ظاہر ہے کہ ایشیا، خصوصاً ہندوستان والی، اس پر اعتماد  
کرنی یا اسکی ساتھ اتحاد عمل کرنی سے بالکل معذور ہیں، کیونکہ وہ جانتی  
ہیں کہ بہ فرض محال اگر یورپ والوں میں یکانکت اور اتفاق ہو بھی جائی  
تو انکا رویہ ہماری ساتھ بدستور حاکمانہ، جارحانہ، اور تاجرانہ رہیگا اور ان  
میں اور ہم میں اتحاد ذہنی کی صرف یہ صورت ہوگی کہ ہم ان کی خیالات  
کی پرستش کریں اور وہ ہماری معتقدات اور مسلمات کو ذلیل سمجھیں۔ ایک  
زمانہ تھا کہ ہم اس پر قناعت کرتی تھی، مگر وہ گیا اور اب انشاء اللہ کبھی نہ آئیگا۔

☆

خصوصاً ہندوستان کی لٹی جہاں مختلف فرقی اور مختلف جماعتیں  
ابھی آپس ہی میں اتحاد ذہنی قائم کرنی سے بہت دور ہیں ایسی ادارات  
سے تعلق پیدا کرنی کا کوئی موقعہ نہیں۔

☆

ہم ادارہ اتحاد ذہنی کی ڈائرکٹرز سے افسوس کی ساتھ کہتی ہیں کہ ہم انکی ادارہ

ہندوستان میں ہر طغریز بنانی میں کوئی مدد نہیں دیسکتی اور نہیں دینا چاہتی۔

پروفیسر زادہا کرشن فی جو فاضلانہ خطبہ صدارت اندھرا یونیورسٹی کی جلسہ تقسیم اسناد میں پڑھا تھا وہ تمام اہل علم اور اہل تعلیم کی لٹی قابل غور ہی۔ پروفیسر صاحب کی اس قول سی ہر سمجھدار آدمی اتفاق کریگا کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد وسعت خیال اور آزادی نظر پیدا کرنا ہی اور اسکی لٹی ضروری ہی کہ وہ لوگوں کو اپنی تنقید آپ کرنی کی تعلیم دی۔

☆

یہ بھی پروفیسر صاحب فی بالکل بجا فرمایا کہ کسی قوم کی صحیح تعلیم کی بنا اسکی قدیم تمدن کی مطالعی پر ہونا چاہتی، اس غرض سی نہیں کہ کل روایات کو آنکھ بند کرکی قبول کرلیا جائی بلکہ اس لٹی کہ ناقدانہ نظر سی اصل اور فرع، جوہر اور عرض میں فرق کیا جائی۔

☆

مگر پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوستان کی علمی زبان انگریزی ہی رہنا چاہتی، کیونکہ اسی فی ملک میں قومیت کی جذبات کو ابھارا ہی، عجب طرح کا استدلال ہی۔ اس منطق کی مطابق یہ بھی کہا جا سکتا ہی کہ ہندوستان میں ہمیشہ انگریزوں کی حکومت رہنا چاہتی کیونکہ اسی حکومت فی ہندوستانیوں میں آزادی کی خواہش پیدا کی ہی۔

☆

اسمیں شک نہیں کہ قومی زبان کا مسئلہ بہت مشکل ہی اور آسانی اسی میں نظر آتی ہی کہ انگریزی زبان اختیار کرلی جائی۔ لیکن آسان طریقی اکثر بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ پروفیسر صاحب اس سی انکار نہیں کرسکتی کہ انگریزی کا ملک کی آبادی کی ہر طبقی میں پھیلنا ناممکن ہی۔ زیادہ سی زیادہ یہ "اویچی" طبقوں کی "علمی" زبان ہوسکتی ہی۔ مگر "اویچی" اور "بیچی" طبقوں کی فرق کو پڑھا فی سی قوموں کی زندگی میں ایسا انتشار پیدا ہوجاتا ہی جو انہیں برباد کٹی بغیر نہیں رہتا۔ اسی طرح "علمی" اغراض کی لٹی اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر کوئی دوسری زبان اختیار کونی سی خود علم ایک بیجان چیز بن جاتا ہی۔



اگر ہم اب تک اس پر متفق نہیں ہو سکی ہیں کہ دیسی زبانوں میں سی کون سی 'قومی زبان' بنائی جائی تو اس کی یہ معنی نہیں کہ ہم ذہنی کاہلی سے مجبور ہو کر اس مسئلہ پر غور ہی کرنا چھوڑ دیں اور انگریزی محض اسلئے اختیار کر لیں کہ اسمیں 'آسانی' ہی۔

✱

پروفیسر صاحب فی یونیورسٹیوں کا جو تعلق تحریک آزادی سے ہیں اس کا ہی وہ بھی بالکل یکطرفہ اور ناقص ہے۔ فرماتی ہیں کہ ہم آزادی کی طاہری علامات پر حد سے زیادہ زور دیتی ہیں اور اس کی باطنی عناصر کی طرف سے غافل ہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم پہلی اتحاد اور تنظیم، اجتماعی زندگی اور یکجہتی، تعلم اور اصداط پیدا کریں، اس کی بعد آزادی کا نام لیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ یہ چیزیں صحیح آزادی کی لٹی یا گزیر ہیں لیکن ہم پروفیسر صاحب کو اس طرف توجہ دلانا چاہتی ہیں کہ آزادی کی طاہری علامات ہی اس واقعی دنیا میں اتنی حقیر نہیں جتنی ان کی فلسفی کی خیالی دنیا میں ہوں گی۔ ان طاہری علامات کی اصل قوت ہی جس سے ہماری مراد کوئی نفسیاتی اصطلاح نہیں بلکہ وہ واقعی اور محسوس سداسی قوت جو اگر ہماری ہاتھ میں ہو تو اتحاد و تنظیم وغیرہ پیدا کرنے میں مدد دی سکتی ہے اور اگر ہماری مخالفوں کی ہاتھ میں ہو تو اسمیں رکاوٹیں ڈال سکتی ہے۔

✱

اس حد تک ہم بھی پروفیسر صاحب کی ہم زبان ہیں کہ یونیورسٹیوں کو ایسی توجہ کا مرکز 'باطنی آزادی' کو بنانا چاہیے، لیکن ہماری خیال میں دل و دماغ کی آزادی اسوقت تک ہرگز مکمل نہیں ہو سکتی جب تک دست و بازو بھی آزاد نہ ہوں، پروفیسر صاحب کو خدا جانی کہاں سے یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں 'ظاہری' آزادی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ہماری علم میں تو یونیورسٹیاں اور ان کی اساتذہ اس معاملہ میں ہماری پروفیسر صاحب سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیتی ہیں۔

# مجلہ رسالہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراچوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد ۹	باب ۱۰ ماہ رجب ۱۳۴۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء	نمبر ۶
-------	--	--------

فہرست مضامین

۱۔	وائے برون	ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی پی۔ ایچ۔ ڈی، کیرج، ہری پور، کشمیر
۲۔	مقدمہ سر	محمد مجیب صاحب بی۔ اے (اکسن)
۳۔	روحانی کلام اور روحانی عمل	عبد القادر صاحب بی۔ اے (جاسی)
۴۔	ایمان و ایمانی ادبیات میں	یوسف حسین خان صاحب بی۔ اے (جاسی) مقیم ہری پور
۵۔	پیش کیا تعلیمی اوج	ملک محمد اسلم خان بی۔ اے (کیرج) سابق مشعل
۶۔	اسکھانے کے حقیقی خطوط	
۷۔	غزلیات	جناب صفی ذاقب و قاری
۸۔	تشیعات	
۹۔	تاریخ اسلام کا ایک حق	اسلم جیراچوری
۱۰۔	شذرات	

# ولے برون!

(۲)

جامعہ کے جون نمبر میں پروفیسر برون مرحوم کے تعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مرحوم کی زندگی، علمی خدمات، اور ذاتی خصوصیات پر جی الامکان پوری طرح روشنی ڈالی جائیگی لیکن وقت کی ٹکلی کتابوں کی عدم موجودگی اور معلومات کی کمی کی وجہ سے، مرحوم کی زندگی کا خاکہ تک مکمل نہیں ہو سکا اور اس کا ایک حصہ تو ایسا دھندلا پر گیا کہ اس میں چند نقطوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جتنا اس نمبر میں کوشش کی جاتی ہے کہ اسی نقطہ سے دوبارہ مصاف اور نمایاں خطوط کیسے چھانے سے پہلے حصہ میں دھندلا پن شروع ہوا تھا۔

مصلیٰ میں جب برون، پیروک کالج کے فیلو منتخب کئے جانے کے بعد فارسی سیکھے اور وہاں کے مختلف شہروں کی سیاحت، مختلف طبقے، مذاق، اور مذہب کے لوگوں سے ملنے جلنے، ان کے حالات زندگی، خیالات، تہذیب، اور ذہنیت کے غار مطالعہ میں مشغول تھے تو کیا ایک اقیام کرمان کے زمانہ میں، "ابو نیور" ایک نامور اور کیریج پوجیو سنی میں فانی کے کچھ از قریب کے باہمی ملاقات دی گئی تھی۔ اگست میں خیابان پلاز میں انکو ملکر دیا گیا تھا کہ ابتدا میں کیریج پہنچ جائیں۔ اس واقعہ نے اگر ایک طرف انکی مانند زندگی کی نوعیت کی تھیں کہ وہ دوسری طرف موجودہ سفر کے آئندہ حصے کے تعلق ان کے خیالات کی جزیرہ کا ذخیرہ، ان کا خیال تھا کہ بزرگ عباس علی خان فارسی، بغداد اور دیگر شام کا ایک شہر پر حال قابل فرقہ کے شخص مرزا علی حسین بہادر موسوی تھے۔ سے ہوتے ہوئے انکے تعلق واپس آئے لیکن اس واقعہ کے بعد ان کے ایک موقع پر انکی زندگی پر ایک اور نمبر نے اپنے خیالات بدل دیئے اور ان کے ایک اور نمبر پر انکی

اس واقعہ کے بعد انکی زندگی پر ایک اور نمبر نے اپنے خیالات بدل دیئے اور ان کے ایک اور نمبر پر انکی

سرزمین عاریں کو شیر باد کہا۔

اس سفر نے برون کے خیالات میں زبردست تغیر پیدا کیا۔ ایرانیوں کے اخلاق و انداز نے برون کے دل سے ترکوں کی محبت بحال کی تھی اور خود اس پر ایسا شکم قبضہ ہوا کہ وہ مرتے دم تک اس کے دلدادہ رہے اس سفر میں انکو بیچیں تکلیفیں ہوئیں لیکن علم کا شوق دیکھو تو اپنے سفر فراموش کئے ہیں کہ جو نواز حاصل ہونے ان کے مقابل میں اس سے بہت زیادہ تکلیفیں ہی قابل خیال نہیں۔

اکثر برجستہ علم میں برون کی عمر بڑھ گئی، اس وقت کی کسی بزرگ کے کہنے سننے سے کیمریج کے لئے اب یہ کیمریج یونیورسٹی اور پیروک کالج کے اندر گریجویٹ نہ تھے، اپنے ذاتی رہان کے خلاف صرف حکم حکم کے سبب اسے کسی شعبے میں انکو اپنے عزیز وقت کا کثیر حصہ صرف کرنا کی ضرورت نہ تھی، اپنے پیچھے مضامین عربی و فارسی کی تحصیل کے لئے پبلک فوٹو گریوٹوں کی کثرت نے اور تاروں کی تن تنہا سنی کی حاجت نہ تھی، اب یہ کیمریج یونیورسٹی کے پچھواں پیروک کالج کے مینلو تھے، اپنے وقت کے خود مختار ملک تھو اپنے انعطاف و اعمال میں باطل آزاد تھے، فارسی عربی ترکی زبانوں کے ماہر تھے، اور اہل فاکس کے متعلق ایک مستند فاضل کی حیثیت رکھتے تھے۔

کیمریج کے علمی فضا میں برون کی سابق زندگی، اس کے علوم شرقیہ کے ذوق و شوق، اور آخری طور اسیدا ماؤنٹینس نے انکی ابتدائی دلچسپی اور مایوس کن ناکامیوں کا مہلب دیو مقید و پابہر تہذیب کے ہاتھ پیریش کیا تھا، وہ قدر کا حامل ناکام پیشوا تھا، اور علوم شرقیہ کی دیوی اپنے ساتھ لایا تھا اس لئے آگے بڑھ کر برون سے کہا، برون اتیری محبت و وفایت، استقلال و پامردی انت و فداکاری نے فتح پائی تھی، ناکامیوں اور محرومیوں کے جیسے ایکست کا کو تہذیب ہے، میری دلی تجویز علوم شرقیہ کی دیوی سے تیرے ساتھ ہے تو سچے غرض میں ہے اس دلکش خار و عورت، ہوش و حواس کے طربا چہرے سے چل واپس آ کر ایک پردہ کشا اپنی جلدی و دنیاوی سے کام لے اور حقیقہ تہذیب کے سر میں دیووں سے اپنے اندر کھینچ کر کسی غافل و غافل کی کہ نہیں من و مومن اور دعا و دعا ہے کچھ وقت جہنم میں رہنا دیا، اسے جہنم لباس پہناتے، اس کے لئے بڑی قربانیاں ہیں لیکن جب ان لوگوں کی بد حاصلیوں، بد سگالیوں،

فرقہ بندی، فادر جگیوں اور خون خرابوں نے مجھے حد پہنچایا تو میں نے اپنی سب سے پیاری شے بھٹک دی وہی ان سے پسینہ لی، اوکھہ دونوں تک اسے ایسا چھپا لکھا کہ دنیا اسے گویا بھول گئی، یورپ والوں کے ذہن میں اس کے کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے تھے انہیں نقش و نگار کے مطابق ان لوگوں نے میری ہیمنہ مدہ سے ایک نئی صورت بنا ڈالی۔

دنیا آج اس پر فریفتہ ہو رہی ہے، اس کی جدت طرازی حشوہ و کرشمہ سازی، اور دلکشی پر مشرق و مغرب چین و دل سے قربان ہو رہے ہیں، اس نئی دیوی کو بھی تو نے اپنی طرح دکھا ہے ایک مدت تک اس کی پوجا کی ہے لیکن تجھے اس کی صورت نیچائی، کیونکہ میں انسانیت کے منہ کی ایک بہت سی جو تودیم دیوی کا دلدادہ رہا اب وہ تیرے قبضہ میں ہے۔ اس نعمت غیر مترقبہ کی قدر کر، اس کی خدمت میں اپنی پوری زندگی صرف کر۔

نوجوان برون نے حامل تضاد قدر کا فران گوش دل سے سنا اس کے سامنے تسلیم نہ کیا اس کی دھوت کو لیک لکھا، اپنی آئندہ زندگی اسی دیوی کی خدمت کے لئے وقف کر دی، اپنی دولت اپنا آرام و آسائش، اپنا وقت بکرا اپنی زندگی تک اس پر نثار کر دی۔

تعمیل فرماں کے خیال سے برون ۱۸۷۰ء فروری ۱۸ء کو رائل ایسٹیا ہنگ سوسائٹی کے ممبر ہو گئے۔ اراپل کو انہوں نے سوسائٹی کے جلسہ میں فرقہ بابیہ کی تائید پر ایک مضمون پڑھا۔ اسی مضمون کا وہ مباحثہ انہوں نے ۱۸ جون کے جلسہ میں پڑھا۔ اگرچہ یہ برون کا پہلا علمی کارنامہ تھا لیکن اس کی اہم گیری، جدت، چھانداز، تنقیدی اور پچھلے طرز اوائے متشرقین کی دنیا میں برون کی قابلیت کا لوہا منواؤ۔ اس زمانے سے ۱۸۷۰ء تک علمی میل و ملت علوم شرقیہ اور خفاصہ علوم فارسیہ کی خدمت میں مشغول رہے دنیا میں زبردست تغیرات ہوئے۔ مانگیر جگ بھولی بڑی بڑی سلطنتوں کے تخت الٹ گئے اس عدم آباد، سچے نانے کئی کر دیں ہیں، خود برون کی زندگی میں، ہم تغیرات ہوئے خود شادی کی (انکی بیوی اسی کیرولین بیگرن مشہور مورخہ آئندہ اے۔ بیگرن کی صاحبزادی تھیں۔ برون نے ۱۸۷۱ء میں ان کی شادی کی، باپ کا انتقال ہوا (۱۸۷۱ء) مختلف قسم کا لالچی ذات پڑا، لیکن علمی خدمت کے صلے میں

عزم و استقامت میں ذرا الغرض تک نہ ہوتی، ہاں فارس کی سیاسی حالت کے تغیرات کے ساتھ ساتھ ان کے  
 علمی و ادبی کاموں کا موضوع بھی بدلتا رہا۔ لیکن جود فارس کو دیکھتے تھے وہ اسی کے قبضہ میں رہا۔ ۱۲۵۰ء کے  
 وسط میں بھی جب یہ مرض الموت میں مبتلا بترک پر پڑے ہوئے تھے تو انہوں نے شہنوی جلیل الدین بھی  
 کی ایک حکایت پر فاضلانہ مضمون لکھا، جو اسلامیات میں شائع ہو گیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے برون کا یہ  
 آخری مضمون تھا۔

۱۲۵۰ء سے ۱۲۵۱ء تک گذشتہ اوّل و آخر مضامین کے درمیان برون نے تصنیفات،  
 تالیفات، متن کتب فارسیہ، مضامین وغیرہ کے دریا بہا دئے ان میں سے اہم تصنیفات کی معمولی فہرست پندرہ  
 بانگر نے در اسلام آئیں مرزا محمد قزوینی نے، ایران شہزادیں اور مشرطاجہ تجارت میں برون کی زندگی پر  
 معمولی تبصرہ کرتے ہوئے شائع کر دی ہے لیکن ان سبوں میں ایک بھی مکمل نہیں، ان سب سے زیادہ  
 مکمل تو وہ فہرست ہے جو مرحوم نے خود شائع کی تھی، پروفیسر گلن جو برون کی غیر شائع شدہ فہرست  
 کتب ذاتی، کے تصحیح و ترتیب میں مشغول ہیں اس کے تہید و تبصرہ میں مرحوم کی تصانیف کی فہرست  
 بھی شائع کی ہو جائے گی۔ لیکن یہ مکمل ہو سکتا ہے لیکن متفرق مضامین کے لئے تو رسائل کی جلدوں ہی کی  
 ورق گردانی پڑے گی۔ مرحوم کے مضامین اگر کل نہیں تو تقریباً کل رسائل ایشیاٹک سوسائٹی کے  
 رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ میں نے انکی تصنیف کی ہے، اور لکھتوں میں جہاں تک دوسرے یورپائی  
 رسائل تک پہنچے ہیں انکی ورق گردانی میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن یہی نہیں بلکہ یہ بات یقینی ہے کہ اس  
 تصنیف و تحسیس کے باوجود بہتر سے مضامین نظر نہ پڑی ہو۔ بہر حال اس تبصرہ کو مکمل بنانے کی پوری کوشش  
 کی گئی ہے۔

(۱) جلد ۲، نمبر ۱

(۲) مئی ۱۲۵۱ء

(۳) اپریل ۱۲۵۱ء

(۴) مئی ۱۲۵۱ء

برون کی تصانیف و مضامین جہان تک میری نظر سے گزری ہیں، انہیں حسب ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

(۱) تصانیف و مضامین متعلق فرق اسلامیہ۔

(۲) عقیدت و توحید کا کتب قدیمہ۔

(۳) رسائل سیاسیہ۔

(۴) تاریخی ادبیات و مضامین متعلقہ۔

(۵) فہرست کتب۔

(۶) شفرقات۔

(۱)

جہان تک مجھ کو علم ہے، برون نے فرق اسلامیہ میں سے صرف دو فرقوں کے متعلق قلم اٹھایا ہے (الف) فرقہ بابیہ (ب) فرقہ عروقیہ۔ فرقہ سامعیلیہ کے خیالات، تو تاریخ سے بھی انکو ابتداء ہی سے کوئی تھی، لیکن اس فرقہ کے متعلق انہوں نے نہ کوئی کتاب لکھی نہ کوئی مضمون شائع کیا، یاں اس فرقہ کے ایک اہم داعی، حکیم ناصر خسرو کے متعلق انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اور اس کی متعدد کتابیں اسے ذاتی غرض سے شائع کرائی ہیں۔ ان کے متعلق آئندہ تبصرہ کیا جائیگا۔ اس نمبر میں صرف فرقہ بابیہ کے عقائد و تاریخ مختصراً بیان کئے جائیں گے اور ان کے متعلق برون کی تصنیفات پر بحث کی جائیگی۔

(الف)

## فرقہ بابیہ

گرم بابی فرقہ اور اس کے عقائد کے متعلق اردو زبان میں ابھی خاصہ ذخیرہ موجود ہے، لیکن ایک قواعد عام طور پر لوگ اس سے ناواقف ہیں، وہ صرف یہ سارا ذخیرہ، آثار و خیالی و حقیقی کی دولت و غنای

(۱) فہرست اب غلامی کی اردو دیکھو: (A Persian Anthology)

لیکن جب میری نظر سے نہیں گزری۔

کے سلسلہ میں جمع ہو گیا ہے، یا اُس کے مخالفین کے قوتِ تردید اور زورِ تحریر کا نتیجہ ہے۔ اس فرقہ کے متعلق کوئی غیر جانبدار یا منصفانہ تحریر میرے علم میں، اردو زبان میں موجود نہیں لہذا میں پہلے اس فرقہ کی تاریخ علی سبیلِ اختصار بیان کرتا ہوں۔

مگر یہ بانی فرقہ کے الدین راہنما رضا علی محمد باب تھے لیکن اگر ان سے کچھ قبل زمانہ کے یورپ اور ایرانی علماء کے خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کے جراثیم ایران کی فضا میں پہلے ہی موجود تھے۔ باب نے اپنے آخری دعوے حدیث، نبوت وغیرہ سے ان مردہ جراثیم میں روحِ پیوند دی، اور باب اور اُن کے متبعین کی علماء و مجتہدین نے جو زبردست مخالفت کی اور حکومت نے اس پر جو ظلم انتہا کو پہنچا دی تو اس فرقہ کے صبر علی الظلم فکر علی الجبر، حق پرستی، ایثار نفسی اور جہاد فی سبیل اللہ کی شہرت تقریباً تمام عالم میں پھیل گئی لیکن یہ ابتدائی جراثیم کیا تھے، اور کہاں تھے؟

اٹھارہویں صدی کے آخر میں شیخ احمد احسنؒ، ایک آزاد خیال ایرانی فاضل طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے بہتر سے قدیم تسکین، اور ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ صدی کے آزاد خیالوں کی طرح عقل و نقل مذہب و فلسفہ، احکام اسلامی اور اقتصادِ عقلی میں تطبیق کی کوشش کی، ان کا خیال تھا کہ کل علوم و فنون قرآن مجید میں موجود ہیں اور اس کے اصلی باطنی مفہوم کے سمجھنے کے لئے کل علوم کا مانتا ضروری ہے۔ ساتھِ علیم اسلام کے متعلق ان کو حد سے زیادہ غلو تھا۔ ان کو منظرِ اشد اس کے صفات میں شریک اور خالق سمجھتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ ایک نبید وایاک متعین پڑتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق کا تصور کر لیا جاتا ہے۔ اس خلوک کے ساتھ ساتھ ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ امام فاضل علیہ السلام کے

(۱) یہ کل معلومات زیادہ تر خود بردن کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں، بعض امور کے متعلق خود بایوں کے تصانیف

سبھی مدولی گئی ہے۔

(۲) فتح احمدی کے حالات زندگی، ان کے خیالات اور تصانیف کے متعلق لے ال ام کو اس نے بہترینوں کا ایک کتاب

میں بیان کیا ہے۔ یہ کتابیں سے مطالعہ میں شایع ہوا ہے۔ ایک میری نظر سے نہیں گزری



ساتھ کو ایک خاص تعلق ہے انہیں یہ اکثر خواب میں دیکھتے ہیں، اور اسی حالت میں ان کے پاس ظلم  
 احکام و ہدایات آیا کرتے ہیں ظاہری جسم انسانی کو کافی، اور ناقابلِ پرواز و سحر و جادو سمجھتے تھے۔  
 معراج کے تعلق بھی ایسا خیال تھا کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم ظاہری کو اس سے کچھ تعلق  
 تھا لیکن ایک غیر فانی جسم کے قابل تھے، جسے جسم ہو کہینہ کہا کرتے تھے، اسی کو قابلِ پرواز و سحر و جادو  
 سمجھتے تھے۔

ان خیالات کی وجہ سے شیخ احمد احسنی پر عام راسخ الاعتقاد علماء نے کفر و الحاد کا فتویٰ دیا، اور ایک  
 حد تک انکی مخالفت کی لیکن علم و فضل کی وجہ سے انکی وقعت کی جاتی تھی، چنانچہ محمد شاہ قاجار، خود اہم  
 قدر دان تھا۔ ان کے متبعین کی تعداد بھی گروہ بہت بڑی تھی لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی۔ یہ لوگ مشین  
 کہلاتے تھے۔

جب شیخ احمد احسنی کا انتقال ہو گیا تو ان کے شاگرد حاجی سید کاظم ان کے جانشین، اور فرقہ بندی  
 کے مقتدا مقرر ہوئے۔ یہ بھی کربلا میں درس دیا کرتے تھے اور اپنے استاد کے خیالات کی  
 تلقین کیا کرتے تھے۔ ائمہ کے متعلق بھی اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے اور ان میں خاص طور پر امام غائب کے ائمہ کا  
 اکثر خبر دیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں شیراز کے ایک معمولی تاجر سید محمد مرزا کا انتقال ہو گیا یہ تاجر کوئی تھا، یہ مرزا اصل  
 کے جو کچھ نول کے بعد باب کے لقب سے مشہور ہوئے اور بانی فرقہ کے بانی ہوئے، والدہ ماجدہ  
 تھے مرزا علی محمد اس زمانہ میں کسن تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ابائی پیشہ کے متعلق پھرتے  
 کر رہے تھے۔ یہاں حاجی سید کاظم کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے، بلعینت پیدا انشی اور فطری علم  
 پر گمان و وہ بیان اور مذہبی تخیل کی طرف مائل تھی۔ سوئیچ کار ان کے خمیر میں داخل تھا۔ ان کے طریقے  
 انداز اسی وقت سے دنیا سے نرالے تھے۔ حاجی سید کاظم کے بچروں نے ان کے خیالات میں یکساں  
 پیدا کر دیا، انہوں نے اپنے قوت تخیل سے اور بھی زیادہ کام دیا اپنے خیالات میں غلطی و جادو  
 بیعت ائمہ کے جتنے پے گئے، حاکمین آئے تو بھی اسی اور شریعت میں تھے، غلطیوں میں غلطیوں نے ان کا

خیالات کا مطالعہ کیا۔ اس ناپی چلی کتاب زیارت نامہ شائع کی۔ اس سے ان کے ابتدائی خیالات کا بڑی حد تک پتہ چلتا ہے۔

”زیارت نامہ عربی زبان میں ہو۔ اس کی عربی نہایت معمولی ہے بلکہ اس میں نحوی صرنی غلطیاں تک پائی جاتی ہیں۔ مگر ترجمہ عربی کچھ اچھا نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے صرف شیخ احمد حسنی کا غلو فی الائمہ ان کی اس کتاب میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے، ائمہ کو شیخ نہیں، اور خدا کا اوتار مانا ہے۔ امام ماب کی مانند خاص تعلقات کا اظہار کیا ہے اور ان سے احکام و ہدایات پانگی جبر دی ہے۔ باب کے خاص خیالات دعوے ہدایت وغیرہ کا اس میں کوئی اثر نہیں پایا جاتا ہے۔

باب کے ذاتی خیالات ان کی مابعد کی کتابوں تفسیر سورہ یوسف، ایتقان، بیان (فارسی) اور بیان عربی (پارسی) ملتے ہیں۔ ان کتابوں میں انہوں نے پہلے تو ہدایت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد نبوت اختیار کی، دیگر بنیاد کے ایسی خبر دی، انبار کو وجود ادبی حقیقی کا منظرہ قرار دیا، بابی مذہبی سلطنت کا تقریباً مکمل قانون شائع کیا۔ کل علوم و فنون کی ترقی ضروری ظاہر کی، فضول اور بیکار علوم کے جس میں نقد مذہب مردہ زبانیں داخل ہیں، چڑھنے پڑھانے کی مانع کی، عورتوں کی آزادی کی مسہ فدا ری کی جس میں اسناد پروردہ بھی داخل ہے، قری ہینوں کی جگہ شمسینی داخل کے، نارجماعت بالکل موقوف کر دی صرف جنازہ کی جماعت کے ساتھ ضروری قرار دی۔ مگر سیوں کا استعمال فرش سے بہتر قرار دیا۔

باب کے قتل کے بعد مرزا علی صبح ازل ماننے بائین منتخب کئے گئے کچھ دنوں تک تو یہ لوگ باہر میں مجبور رہے، پھر تھانہ میں مجبور کئے گئے، وہاں سے ایڈریا نول بھیجے گئے۔ ایڈریا نول میں مرزا یحییٰ کے سوتیلے بھائی مرزا حسین علی بہار اللہ نے جو صبح ازل کے زمانہ خلافت میں بابی تحریک کے متعلق مل کام کیا کرتے تھے، یہ دعویٰ کیا کہ جس شخصیت کے آئینگی شہر باب نے دی تھی وہ یہ خود ہیں اور بہار اللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس دعوے کا نتیجہ ہوا کہ بابیوں میں زبردست اختلافات ہو گئے۔ ان میں دو فرقہ چلی اور تھانہ میں ہو گئے اور ان کے آپس میں سرپٹول ہو گئی۔ اس کے بعد بہار اللہ ایڈریا نول میں

(۱) بابیوں کی اکثریت تھانہ میں تھی، اہل امام نکولاس نے تھانہ میں پیرس سے شائع کیا ہے۔

شہام چھپنے گئے۔ وہیں حالت قید میں انکا انتقال ہو گیا۔ انکے بعد انکے بیٹے عبداللہ نے کتبائیں مرقومہ ہوئے۔ یہی مشہور کتاب شہام میں چھپوس رہے مشہور ہیں انکو آزادی مل گئی اور مختلف ملکوں میں اپنے والد بزرگوار کے مذہب کی تبلیغ کے لئے پھرنے لگے۔

مرزا بہار اللہ زبردست قابلیت کے آدمی تھے۔ انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں انکی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان کتابوں سے انکا فضل و کمال اور قوت تبحر زور پوری طرح ظاہر ہوتی ہے انہوں نے باب کے احکام میں بہت کچھ ترسیں کیں اور انکو بہت کچھ ترقی بھی دی انہوں نے اپنی کتاب "لوح الاول" میں بنیادی مذہب کے احکام جمع کر دیے ہیں۔ باب کے احکام میں جو اہم تر چیزیں انہوں نے لکھی ہیں وہ مذہب و حق ہیں مصلوۃ نفس کی جگہ صرف حق وقت کی نازیں فرض کیں، ہر ایک وقت کی نازیں صرف تین رکوع رکھے۔ سفر کی حالت میں یہ بھی ضروری نہیں بلکہ صرف بھلا ناکہ کہنا کافی ہے، اہم ترین عیدین صرف دو چھپیں ایس میں ہی ایک پارسیوں کی نوروز کو ملے لیا۔ روزے صرف انیس دن کے فرض رکھے کیونکہ پارسوں کا ہینڈل انیس دن کا ہو گا۔ اسلامی قانونی وراثت کو باطل بدل دیا طلب خیرات بزرگوں کی دست برداری نفس کشی اور ہجرت، مٹان کے خیالات کی وجہ سے اس کی نجاست کو حرام و ناجائز قرار دیا، حج بیت کا ذکر تو کیا ہے لیکن ایرانیابیوں کے خیالات کے مطابق اس سے باب کا مٹان مقصود ہے، حجاج صرف باب، اور بہار کا ہونا چاہئے اس کے علاوہ بیسوں اور باتیں ہیں جن کے متعلق لوح اول حسن میں احکام موجود ہیں۔

بہار نے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے خیال سے خولین خیالات کو ذکر کیا اور انکو اصلاح دینا چاہی۔ پوپ وغیرہ کو خط لکھے اور ان سے یہوں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دی۔

یہ تو بانی مذہب و عقائد کے تدریجی تخیل و ترقی کی حکایت تھی لیکن اس کے اشاعت و تبلیغ کو دیکھ کر ہوتی۔ اور اس میں یہیوں کو کیا کیا ترقی پیش آئیں۔ انکو کون مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسکا نتیجہ کیا ہوا۔ ان لوگوں نے اس کے لئے کیا کام کیا، اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی۔ ان حضرات کا اندازہ کرنے کے لئے اس مذہب کے تبلیغ و اشاعت کی تاریخ کا علم بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

زبانیں باب کے خاتمہ پر اس کا اعلان کیا قریب قریب اسی زمانہ میں حاجی ضیاء الحق نے مقدمات  
 انتقال کے بعد اور اس کے خاتمہ پر اس کے آداب کا سلسلہ پیش کیا، باب کا نام بھی اس سلسلہ میں پیش کیا  
 نہیں کیا، اسی قریب قریب کے عہد اور باب کے عہد میں ان لوگوں نے غایت جوش و خروش کے ساتھ باب کے  
 خیالات کی تبلیغ شروع کی، نتیجہ ہوا کہ دو سال کے اندر اس جماعت کی تعداد بہت بڑھ گئی، ایک طرف  
 بیوں کی اس تہرہ دست ترقی اور باب کے خیالات کے عروج اور روز افزوں دعاوے نے مستقل مزاج  
 قدیم ان خیال علماء کے دماغ میں ایسا سیلاب پیدا کیا کہ یہ لوگ کفر و کلام کے فتوؤں اور مناظرہ و مجاہدہ پر غایت  
 سرگرم ہو گئے، بلکہ قدیم اسلامی احکام کے استغناء کے خیال سے حکومت کے اثر سے کام لینے لگے۔ اسلامی مصلحتوں  
 میں حکومت پر علماء کا جواز ہے، اسے کون نہیں جانتا، بہشتیہ کے آخر سے ان لوگوں نے اپنے اثام سے کام  
 لینا شروع کر دیا اور بیوں کے خلاف زبان و قلم کے ساتھ توپ و تفنگ تک استعمال کے جانے لگے، پہلے  
 تو بابی خیالات کی تبلیغ کی طرف سے حکومت کی طرف سے ممانعت کی گئی اس فرقہ کے اہم اراکین کی نزدکو ب  
 کی گئی، اور بعض شہر بدر کر دیے گئے، لیکن جب یہ بھی سیکڑا ثابت ہوا تو ۱۲۸۷ھ میں مرزا علی محمد قید کر لئے گئے  
 یہ کچھ ہی دنوں قید میں رہے تھے کہ ایران میں طاعون کی وبا پھیل گئی اس وبا کی گڑبڑ میں حضرت کبیر علی  
 قید سے نکل بھاگے، پھر منوجہر خاں حال، مہمان کے زیر حکومت مقیم رہے، ۱۲۸۸ھ میں منوجہر خاں کا  
 انتقال ہو گیا۔ ان کے جانشین نے حکومت پر اپنا اثر بڑھانے کے خیال سے مرزا علی محمد کو فوج کی حراست  
 میں محمد شاہ کے پاس طہران بھیجا۔ بیوں کی سرکشی، باب کے واسطے سرفروشی اور عام بغاوت کا حکومت  
 کو آنا غٹ تھا کہ پاریخت میں مرزا علی محمد باب کا رہنا مناسب سمجھا گیا اور یہ پاریخت سے ہارنیا کو بھیجا  
 رکھے گئے۔

۱۲۸۹ھ میں محمد شاہ کے انتقال کے بعد ایرانی حکومت کی فضا میں جو عام ضعف و خستہ روی چھائی،  
 اس میں بیوں کے جوش و خروش اور قدیم ان خیال علماء کے زور و شور میں ایسا اتصادم ہوا  
 کہ کبیر علی محمد قید میں نہ رہ سکا، بلکہ ان کا قیود و غیرہ میں زبردست بغاوتیں ہوئیں۔ اور ایسی جگہ  
 کو ان کے فرو کرنے میں ہر دو دن بائیں قربان کی گئیں، اگر ایک ہفتہ حکومت کے توپ و تفنگ تھے تو ان کا



اس سوانح نامہ میں پڑھنے والوں کے قلوب و ذہنوں کے اس دور و بخیر ملک کے دلچسپ و دلکش اور دل میں ایک  
فرانسیسی متشرق نویسنہ کو مت گزرنی چاہیے جو اس زمانہ میں حکومت فرانس کے نامزد تھے۔ انہوں  
نے اپنی مشہور کتاب "ذہاب و فلسفہ و دانشائے وسطی" Le Réveil, ۱۸۶۵

Philosophie dans l'Islam کے قریباً ۱۰ صفحات میں بانی مذہب و سکی  
تعلیم پسین، تاریخ، حکومت ایران کے روح فرسا عالم، بابوں کے استقلال و عزیت، جوش و  
ہمت، غلوں و دروغ و عقائد و عیسویہ کو نہایت دلچسپ اور پُر اثر پیرایہ میں بیان کیا ہے اور تمام واقعات  
کی گویا زندہ تصویر کھینچ دی ہے، برون نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں تصوف کے شوق کی وجہ سے  
مذہب کے قریب اس کتاب کو دیکھا اور بابوں کے متعلق جو کچھ گوینیو نے لکھا تھا، اسے پڑھ کر بہت متاثر  
ہوئے، خیال ہوا کہ اس فسر کہ کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کئے جائیں، لیکن اسکی کوئی صورت  
نہی اُس وقت بابوں کے متعلق کسی یورپین زبان میں کوئی ذخیرہ موجود نہ تھا جو کچھ تھا وہ خود گوینیو کی  
ذکورہ بالا کتاب، فون کریمر کی ہرشدن ایرے (Herolden, 1866)

کالم کے رسالہ ژورنال ایشیاٹک پریس (Journal Asiatique Paris) میں چند مضامین، ڈاکٹر اتھیر کے مضامین و مطالعات (Essays & Studies) ۱۸۶۲  
میں محدود تھا، ان مضامین اور کتابوں کا برون کو غالباً پہلے چلا اگر تہ چل جاتا جب بھی برون کی پیاس  
اس سے نہیں بج سکتی تھی کیونکہ کریمر کا ماحذ زیادہ تر گوینیو ہی کی کتاب جو کالم بنے بھی گوینیو پر کچھ  
مستند و اضافہ نہیں کیا ہے، کیونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ناسخ التواریخ نے اخذ ہے، اور  
ناسخ التواریخ پر گوینیو کی نظر پڑ چکی تھی۔ لہذا تیر کی کتاب ان تینوں کے بعد شائع ہوئی اس لئے  
مکمل ہے کہ اس میں کچھ نئی باتیں مل سکیں، لیکن یہ کتاب کچھ ایسی نایاب ہوئی کہ اب اسکا صرف نام  
ہی نام باقی نہ گیا ہے۔

برون نے مجبور ہو کر اپنے شوق میں یہ ارادہ کر لیا کہ اگر کسی زیارت ایران کا موقع ملے تو اس  
فرق کے حالات و خیالات کے متعلق مزید تلافی و تفتیش کرے گا، چنانچہ جب یہ ایران گئے تو انہوں نے

ہیں فرشتے لوگوں سے ملنے کی پوری کوشش کی۔ ابتداء میں تو حکومت ناکامی ہوئی لیکن ایران میں  
 ستر یا ہشتاد ہزار عیسائیوں کے بعد آٹھ لاکھ ایک ارب سے ملاقات ہو گئی لیکن کے ذریعہ سے یہ پتہ چل گیا کہ  
 ملان سے ان کے تعلق بحث و مباحثہ کے، انکی تاریخ کے متعلق مزید معلومات حاصل کئے، انکی کتابیں  
 خریدیں، ان کے جلسوں میں شریک ہوئے اور ان لوگوں سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پتہ چل گیا کہ ان کو  
 باطنی عقیدہ سمجھنے لگے۔

اکتوبر ۱۹۰۷ء تک جبکہ بروکس واپس آئے، یورپ کے اس خاص صنف ادبیات میں  
 اچھا خاصہ اضافہ ہو گیا تھا، دورانِ کلیمان ہوارڈ کٹر و رزن اور ٹوئسکی اس فرقہ واداس کے اوجہ  
 کے متعلق فاضلانہ مضامین شائع کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ پولک و آسن اور لیڈی شائل بھی راجند  
 سیماہوں نے اپنے سفر ناموں میں بھی اس فرقہ کے حالات لکھے تھے۔

## مقدمہ

کچھ اپنی بے پروائی کچھ پرانی تعلیم کی وجہ سے ہم لوگوں نے کبھی سیاسی معاملات اور علم سیاست کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جو اس کا نتیجہ ہوا کہ جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب ڈوب گیا تو ہم اپنی زندگی میں کسی قسم کی روشنی پیدا نہ کر سکے، اور اگر نریزوں نے جب ہمارے دس پر قبضہ کر لیا تو سوائے ایک بیٹے جنگ کا کے ہیں اور نہ سوچا۔ ہم موقع پر خوشامد کرنا، خطرہ کے وقت دروازے بند کر لینا ضرور جانتے تھے اپنی عزت آبرو کے لئے لڑنے والے بھی پرانے زمانہ میں بہت مل جاتے تھے مگر ہم کو اپنی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جب ہماری قوم نے سیاسی معاملات یا حکومت میں حصہ لینے کی کوشش کی ہو۔ یا مجموعی حیثیت سے اپنی عزت آبرو باقی رکھنے کا ثبوت دیا ہو۔ اپنے اور اپنے عزیزوں کے فائدہ کے علاوہ کسی کو کوئی فکر نہ تھی ہمیں کسی قوم اور کسی کسی کے تصور میں نہ سامنے وہ زندگی کیا ہے جس میں ہم آفتوں سے بچنے کی دوائیں مانگا کریں وہ ملک کیا ہے جس میں ہم چوروں کی طرح رہیں، ڈرتے ہوئے اور شہل سہل کر اس طرح چلیں جیسے کوئی پرانے حکمت سے آنکھ بچا کر گزرتا ہے، مانا کہ جسے یورپ کی قومیں سیاسی زندگی کہتی ہیں ہمارے یہاں ایک طرح کا جوا تھا جس کے کھیلنے کی جرات صرف چند لوگوں کو ہوتی تھی بشیر کے منہ میں کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا، نہ سمندر کا سفر کوئی تنہا کرتا ہے قوم کی خدمت بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہو سکتی تھی، اور اس تک پہنچنے کی جو لوگ کوشش کرتے تھے وہ عام طور سے دربار اور درباریوں کے چمکدوں میں چھن کر رہ جاتے۔ یا اگر خدمت شاہی میں پہنچ بھی گئے تو بادشاہ کا خوش رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا جو جو کا اس کی عزت بھی گئی اور جان بھی بھر کیا تعجب ہو کہ بھدار لوگ سیاسی زندگی سے بھاگتے تھے مگر جو اکیلے صرف جوازیوں پر چوڑیا تھا۔ لیکن اگر ہماری سیاسی زندگی ایک بھنور میں تھی تو اس کے ذمہ دار ہم ہی ہیں، بادشاہ اور انکی تنگ مزاجی کچھ نازل سے ہماری تھی۔ ہمیں بھی تمہارا گرا نہیں ہے ہماری زندگی کسب فیض کر دیا تھا تو ہمارا فرض تھا کہ ہم ان کو بھڑکاتے



یورپ کی قوموں کا ہم پر احترام ہے وہ واقعی محسوس ہے ہم میں تنقید اور نا بھار کا ادہ  
 ابھل نہیں۔ نہ ہماری طبیعت میں وہ خود مختاری ہے کہ زندگی کو اپنی آنکھوں دیکھیں اور اپنے تجربے  
 اور فکر سے سمجھیں۔ نہ وہ ہٹ اور منہ کہ جوں میں تھان میں اُس پر قائم رہیں چاہے رگوں میں ایک قطرہ  
 خون باقی نہ رہے۔ نہ وہ جرات کہ اپنی کمزوریوں کا اقرار کریں اور صداقت کے لئے اپنے کاٹھ پڑاٹھا  
 جو کچھ ہوناسے سو ہوگا، جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا جو کچھ ہے اسے رہنے دو۔ یہی ہمارا فلسفہ ہے، اچھائی اور  
 برائی کا سوال ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم کتر اگر کسی نہ کسی طرح نکل جاتے ہیں۔ بجائے اپنے راستے  
 پتھر مٹانے کے ہم پتھر کو دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ ہم کو کبھی یہ نہ سوچا کہ بادشاہت، حکومت کرنے کا  
 ایک طریقہ ہے اور اگر اُس سے فائدہ کی نسبت نقصان زیادہ ہے تو ہمت کر کے دوسرے طریقے  
 بھی آزمائے جائیں ہم نے یہ ملے کر لیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں بعض نے بادشاہوں کے  
 سامنے گردن جھکا لی، چاہے اُس پر تلوار پڑے یا پھولوں کا ہار بعض نے "مقلندی" کی اور اس سے  
 جھگڑے سے الگ رہے، ہم ہر قسم کے لگان اور محصول دیتے چلے آئے ہیں، لیکن کبھی اس کی فکر نہ کی  
 کہ ہمارا یہ رویہ کیسے ختم ہوتا ہے۔ اس میں سے ہم کو کتنا داپس ملتا ہے اور کس صورت سے ہم صرف  
 افسوس کرتے رہے اور دیتے رہے۔ زبان سے ہماری سوائے تعریف اور شکر یہ کے کبھی کچھ نہ نکلا۔  
 کبھی ہم نے اپنی رائے کسی بات پر ظاہر کی نہ کسی چیز پر اعتراض کیا۔ اپنی "حکومت قلمی" تب یہ حال تھا  
 پر ایا راج ہے تب بھی وہی کیفیت ہو۔

جس قوم کے لئے سیاسی آزادی حاصل کرنا ممکن تھا اس کے مختلف افراد سے یہ توقع کرنا کہ وہ  
 اپنی زندگی پر اپنی طبیعت اور خیالات کی ہر گائیں گے یا شخصی آزادی کے لئے لڑیں گے بالکل بے گار  
 ہے۔ میدان جنگ میں شہید ہوا انسان ہے، وہاں ایک مرتبہ مرنا ہوتا ہے اور وہ بھی جلد ایک درخت  
 یا نصب العین کے پتھر یا عزیزوں دوستوں اور چوری سلی سے مقابلہ کرنا بہت زیادہ دشوار  
 ہے۔ اس میں ہر گھڑی لڑائی جاری رہتی ہے۔ اور مرنا نہیں بلکہ حالت میں زندہ زندہ ختم ہونے لگتا  
 ہے۔ اور آزادی اور دنیاوی طاقت کے لئے سیاسی آزادی سے بھی زیادہ ضروری ہے اسے زندگی کا

نہج جس کے بغیر سب کچھ بے فائدہ ہو جاتا ہے اور نئی کامیابی نہ ہونا اسی پر ہی ہے پیسے پوروں کا  
 بڑھنا ان کے سینے پر اس زمانہ میں سیاسی آزادی کی اہمیت کا اقرار عام طور پر لوگ آتے ہیں مگر  
 اس کے ساتھ یہ غلط فہمی بھی ہو رہی ہے کہ سیاسی آزادی کافی ہے اور سوراخ مٹے پر ماری سب امیدیں بچھا  
 ہو جائیں گی۔ مگر اس نے اپنی کتاب اسی غلط فہمی کے دور کرنے کیلئے کئی قسطیں لکھی ہیں اور اس زمانہ میں اس کے خیالات پر غور  
 کرنا خاص طور سے ضروری ہے۔

مگر سیاسی آزادی پر بحث نہیں کی ہے۔ وہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہر قوم کو اپنی حکومت خود کرنا  
 چاہئے۔ اس نے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوم آزاد اور خود مختار ہے، جیسے کہ کھانا کی حکومت اس زمانہ  
 میں تھی۔ اور اس کتاب میں وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ محض سیاسی آزادی کافی نہیں اور تو اس اسی وقت ترقی  
 کر سکتی ہیں جب وہ آزادی نسرد کا بھی پورا خیال کریں اور اگر اس معاملہ میں انہوں نے کچھ کی تو بادشاہت  
 اور جمہوریت میں کوئی فرق نہیں، اور سیاسی آزادی ایک بالکل بے معنی شے ہے۔ تاریخ سے اگر ہم کوئی سبق  
 سیکھ سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ ترقی خود بخود نہیں ہوتی، بلکہ وہ چند اہم شخصیتوں کی یادگار ہے، ایک شخص  
 ہے جو انہوں نے اپنی قوم کی ترقی کیا ہے، ایک بودا ہے جسے انہوں نے اپنے خون سے پہنچایا ہے اور ان  
 چوتھا ہے چنانچہ مورخوں کا ایک خاص فرقہ جو تاریخ کو صرف بڑی شخصیتوں کی سوانح عمری قرار دیتا  
 اور کچھ فلسفی بھی ایسے گذرے ہیں جو ماری زندگی کو انہیں شخصیتوں کی دین بجاتے ہیں۔

ان مورخوں اور فلسفیوں نے اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی عظمت دکھانے کے لئے واقعات کو بیشک  
 بہت کچھ توڑا کر ڈرا ہے، لیکن ان کے اصل دعوے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں جو کچھ ہوا ہے وہ  
 معمولی لوگوں یا عام رائے کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر معمولی لوگوں کے وجود اور ان کی رائے کے  
 خلاف ہوا ہے اور جہاں کارلائل اپنے ہیر کو پوری شان و شوکت کیساتھ تعریف اور تعجب کے لئے  
 ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور شے زردشت کو فعل کل قرار دے کر ہم کو ہماری حاکمیت سمجھا رہا ہے  
 وہاں اس کی کوشش ہے کہ اسی شخصیتوں کے مقابل کے لئے ہم کو آمادہ کرے اور ان کی آمد کے لئے  
 راستہ ہموار کرے۔ فرق ان تینوں میں صرف اتنا ہے کہ کارلائل حیثیت ہونے کے شخصیتوں کو نظر میں

ماہیت کھاتا ہے۔ مٹی، جام، گول کی بڑی اور میٹلی مذہب کی محبوبیت سے عاجز آکر انسان کمال  
نواب دیکھتا ہے اور دل بچانے میں وہ تو کی طرح ہندو داندی کر نیکی سماج کو اس کا قائل کرنا چاہتا ہے  
وہ ہر شخص کو آزادی دے جو اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

جو آزاد نہیں وہ انسان نہیں جس کو ہم پوری آزادی دینے سے انکار کرتے ہیں اس کو ہم پورا  
سلطان نہیں سمجھتے۔ یہی دل کے کتاب اور دل کے خیالات کا جوہر ہے۔ دل کے نزدیک آزادی انسان  
ماں خاصیتوں میں سے ہے جن کے بغیر وہ انسان نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہی اور تمام خاصیتوں کو کرت  
سلائی ہے۔ انسان کو خدا نے پھردی ہے لیکن اگر وہ اپنی سمجھ سے کام نہ لے یا دوسرے اُسے کام نہ لینے  
یہ تو اس میں اور دوسرے جانوروں میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اگر لوگ اپنی  
سمجھ پر چھوڑ دئے جائیں تو ہزار دلی غلطیاں اور حماقتیں کرینگے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو نیچے  
اُن پر چھوڑ دیا جائے۔ نہ بروستی، نہ کوراہ راست پر لانے کی کوشش نہ کریں۔ آدمی کو جانور بنا دینا  
دوسروں کے لئے ممکن ہے۔ انسان صرف اپنی ذاتی کوشش اور فطرت کی دی ہوئی قابلیت کو استعمال  
سے ہو سکتا ہے۔

جتنا اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں اتنا ہی ہم کو اس کی چال اور اہمیت کا اقرار کرنا ہوتا ہے۔  
سلطان عام طور سے اس کی شکایت کرتے ہیں کہ آج کل لوگوں میں وہ مذہبی جوش نہیں رہا جو ایک زمانہ  
پس تھا، اور جو ہر سلطان میں ہونا چاہئے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ طالب علم اگر ایک روز ہاکی کھیلنے جھانے  
وہ کسی کو خبر نہیں ہوتی، نماز میں غیر حاضر ہو تو استاد خفا ہوتا ہے۔ لیکن ہاکی اور دوسرے ورزش کے  
کھیلوں کی سبب تعریف کرتے ہیں، اُن سے جو فائدہ ہے وہ اسے سمجھتے ہیں، لیکن نازک بارے میں  
صرف یہ کہنیا کافی خیال کیا جاتا ہے کہ خدا کا حکم ہے اور قرآن مجید میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ کھیل  
ورزش کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے۔ لڑکے تجربہ سے معلوم کرتے ہیں کہ ہر کھیل کے اپنے اپنے  
فائدہ مند ہے، لیکن یہ سب کے سب میں ان کو اپنے تجربہ پر چھوڑنا اس کے لئے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ دیکھو

انسان کے لئے کوئی یاسیت، ایمان لگ کر کوئی معنی رکھتا ہے۔ تو اس میں کسی قسم کی زبردستی کرنا غلط ہے۔ مذہب کا نام ہے جو کچھ ہو۔ سجادہ اسی وقت ہے جب انسان نے اپنے تجربے سے اسے ایسا ثابت کیا ہو اس سے انکار کرنا گویا اپنے دین اور ایمان سے اپنی انسانیت سے انکار کرنا ہے۔

جہاں تک کہ آزادی خیال اور بحث کا تعلق ہے کل ایسے اصول اور ایسی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایسے صدق دل اور خلوص رکھ کر کہ اس کی مخالفت کرنا ناممکن ہے۔ چکو بجائے اس کی منطق میں بکڑیاں اور غلطیاں ڈھونڈنے کے اس سے اپنی آزادی اور اپنی انسانیت کی وقعت کا سبق لینا چاہئے۔ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ترقی انہیں کا حصہ جو جن کو اپنے اوپر اور اپنی عقل اور سمجھ پر کافی اعتبار ہوتا ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے آزادی لوگوں کو ہمیشہ ڈراؤنی شکلوں میں نظر آتی ہے۔ یوں کہ مذہب کے معاملہ میں آزادی دیدہ و گئے تو ان کے دلوں میں ذرہ برابر بھی دین و ایمان باقی نہ رہیگا۔ انکی اتنی سمجھ نہیں کہ راہ راست پر چل سکیں یا بڑے بچے میں فرق کر سکیں جو ایسی دلیلیں پیش کرتے ہیں ان سے اول تو پوچھنا چاہئے کہ یہ ایمان کیا ہے جس میں اتنا اثر بھی نہیں اور وہ سننے والے کیسے بیا کہ نہ خود دوسروں کو عبرت دلا سکے ہیں اور نہ اتنا اعتبار اپنے مذہب پر رکھتے ہیں کہ اسے سچا ثابت ہونیکا موقع دیں۔ عورتوں کے آزاد ہونے سے بھی لوگ اسی طرح گھبراتے ہیں جو خامیاں ان کے اخلاق اور انکی طبیعت میں ہیں وہ عورتوں پر تصویب بیاتی ہیں اور جہاں انکو اپنی اخلاقی صحت کا خیال کرنا چاہئے وہاں وہ دوسروں کے بیا رہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ عورتوں کی آزادی کے خلاف اس قسم کی دلیلیں پیش کرنا میں بڑا غلطی ہے۔ اور کسی توجہ کے قابل نہیں۔

اگر ہم نے آزادی خیال کی ضرورت کا اتنا ار کیا تو ایک حد تک آزادی افعال کو بھی ہم بھگوانا کر سکتے ہیں۔ لیکن نقصان نہ پہونے کے تو ہمیشہ ضرور ہے گا، لیکن ایک خاص دائرے کے اندر ہر شخص کو اپنی آزادی ملنی چاہئے۔

اس سے پہلے کہ ہم اس وقت ہر حکومت ہی کے ذمہ کو نظر نہیں رکھتے بلکہ

اور برادری جو ظلم اس معاملہ میں کرتی ہیں اس پر بھی اس نے کافی تردد کیا ہے۔ ڈرنے والے کا ڈر  
 انہیں ہی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور یہیں پر ان کا دی پسند لوگوں کی زیادہ مخالفت ہوتی ہے۔ مگر محض گفتگو  
 میں ایک مسلمان لڑکا عیسائی مذہب کی تعریف کرے تو باپ اس سے اس قدر ناراض نہیں ہوگا لیکن  
 اگر وہ عیسائی ہو جائے تو باپ بیٹے میں کسی قسم کا رشتہ قائم رہنا مشکل ہے۔ ایسے معاملہ میں ریاست  
 یا حکومت عام طور سے دخل نہیں دیتی یہاں پر جو لڑائی ہوتی ہے وہ سماج اور فرد کے درمیان ہوتی ہے  
 اور یہیں پر آزادی فرد کی حفاظت کرنا سب سے زیادہ مشکل اور ضروری کام ہو جاتا ہے۔

آزادی افعال کی نائید میں نئی دلیلیں پیش کرنا بیکار ہے، اور جب فرد اور سماج میں مخالفت  
 ہوتی ہے تو معاملہ بحث کے ذریعہ سے نہیں بلکہ باغی افراد کی جرات کے مطابق طے ہوتا ہے۔ اسی وجہ  
 سے آئی اس قدر جوش کے ساتھ سماج کو اطمینان دلانا ہے کہ ملاوہ تجربہ کے راہ راست تلاش کرنے کا  
 اور کوئی طریقہ نہیں، اور لوگوں کو جو اور دریافت کی اجازت دینے سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔

اگر مل خیالات اور افعال کی آزادی کی حمایت کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگ بچائی  
 اور برائی میں فرق کرنا چھوڑ دیں، یا بد اخلاقی اختیار کر لیں اور نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ سماج لوگوں کے ذاتی  
 معاملات میں دیکھی نہ ملے، یا ان کے اخلاق پر رائے زنی نہ کرے۔ اس نے زندگی کا خاص مقصد ہر قسم  
 کی روحانی اور جسمانی، دینی اور دنیاوی ترقی کو مقرر کیا ہے، یہ ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جب سماج  
 ارکان کو اس قدر آزادی دے کہ وہ تجربہ اور تحمل کے ذریعہ سے ترقی کا راستہ تلاش کر سکیں۔ سماج کو آج  
 کوڑا پس منظر پر ہو رہا ہے، بے قاعدگی کو بجائے اپنے قواعد قوانین کے خلاف بغاوت خیال  
 کر کے اپنی بھلائی کی کوشش بھی اپنے ان ارکان کو جو یہ راستہ اختیار کریں، زیادہ دلی اور جرات  
 کی ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت ہے کہ اگر سماج کی تمام راہ اور حدودی قواعد کے مطابق کوئی شخص نہیں  
 میں رہا ہے تو سماج اسے بے گناہ سمجھتا ہے، وہیں خوار و سکر میں کسی قسم کی ترقی نہیں  
 ہو سکتی۔ سماج کے ہر ایک کو اپنے حق کو ان کے لئے دینا ضروری ہے، ان کے لئے دینا ضروری ہے

بی کرنا چاہئے۔ تاریخ ہم کو دکھاتی ہے کہ لوگوں کے خیالات بدلتے ہیں۔ اُنکے علم اور تجربہ کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے۔ ادا سب ان کی فطرت کا تقاضا بھی رہی ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی ریت رسم اور خیالات و افعال کو روکے گاؤں کا نچانہ بنالینا چاہئے جس میں سے سراج کے تمام افراد ایک طرح سے ڈھلے ہوئے نکلیں بلکہ تجربہ اور عقل سے امتحان لیتے رہنا اور ضرورت کے مطابق انہیں بدلتے رہنا چاہئے۔

علم سیاست پر بہت سے فلسفیوں، مدیروں اور سائنس دانوں نے بحث کی ہے لیکن اصل اہمیت اس علم کو صرف چند شخصیتوں نے دی ہے جنہیں بطرفی کہا جا سکتا ہے۔ مدیر سائنس دان اُنکے پاس خدایک پروردہ دل کے سوا کوئی سہرا تھانہ ایک پر جوش محبت کے علاوہ اسکا کوئی سفارشی اگرچہ سیاست میں اس قسم کے مصنفوں کا بہترین نمونہ روسو ہے، اور اگرچہ مل ایک زبردست عالم اور فلسفی بھی تھا، مگر یہی جس اثر میں یکتا بھی گئی تھی وہ دل کا ہے و مانع کا نہیں جس شخص کو اپنے ہمفیلوں سے محبت ہو جس کو اپنی روحانی اور ماضی زندگی کی فکر ہے جس کے دل میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی پی خواہش ہے وہ اس کتاب کی عزت کرے گا اور اس کی خامیوں کے باوجود بھی اس سے محبت کرتا رہے گا۔

مل ۲۰ مئی ۱۸۷۱ء کو لندن میں پیدا ہوا، اور مئی ۱۸۷۳ء میں جنوبی فرانس کے شہر کوئی بولون میں اسکا انتقال ہوا۔ اس کی زندگی میں وہ سارا زمانہ آجاتا ہے جس کے علمی سیاسی اور ادبی کارناموں پر بیسویں صدی کو ایک خاص اہمیت دیتے ہیں، اور مل کی شخصیت ایسی تھی اور اسکی تعلیم اس طور پر ہوئی تھی کہ ہر قسم کی تحریکوں میں پورا حصہ لے سکا۔

جس زمانہ میں بے پیکر کو دہلی میں مشغول رہتے ہیں، اس نے یونانی اور رومی زبان سیکھ لی تھی لیکن میں اس نے تعلیم ادب سے بوری و شخصیت حاصل کر لی، اور میں برس کی عمر تک اس کی معلومات چہ جہ بلوچستان میں بہت بڑی تھی کہ وہ جنوبی ان سالی میں بھی داسے لے سکتا تھا جو اس زمانہ کے دہلی میں غالباً ہیچ نہ تھا۔ میں نے ایک شخص سے اس کی تعلیم اس کے باب میں سنی ہے اسنے ذرا بے بسی کی

بھی بچھی ہی نہیں بلکہ ان کو اپنی دریافت کے ذریعہ سے ترقی دینے کی قابلیت بھی انہیں پیدا ہو گئی تھی۔  
 جیمز مل علاوہ عالم ہوئیے کیسیا سیات، اخلاقیات اور معاشیات میں اپنے ذاتی عقیدے ہی کو رکھتا تھا  
 اور دل کی بردوش انہیں عقیدوں میں ہوئی بار جو جیمز مل کی خواہش تھی کہ اُس کے خیالات کا پتہ  
 اُس کے لڑکے کے ذریعہ سے ہو مگر وہ کیسی طرح سے نہیں چاہتا تھا کہ دل انہیں بغیر سوچے سمجھے یاد کر لے  
 اُس کا مدد تھا اس پر اصرار رہتا تھا کہ دل اپنے عقیدوں کے نئے نئے ثبوت دریافت کرتا رہے، اور  
 اپنی تعلیم کو تنگ نظری یا تعصب کی وجہ سے ناپسندیدہ یا بیکار نہ بنا دے۔

ایسی وجہ سے کہ کہیں اور جوانی میں اس کا تعلق جیمز مل، رکارڈو اور ہٹیم سے تھا، آل کو وہ حیثیت مل گئی  
 جو بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے زمانہ کے خیالات اور تحریکوں سے واقف ہی نہیں تھا  
 بلکہ اپنے سے ایک قرن پہلے کے خیالات کا بھی خزانہ اپنے دماغ میں رکھتا تھا۔ ایڈم سمنڈ اور رکارڈو کی  
 معاشی تعلیم، ہٹیم کی افادیت اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ کی دنیا، فلسفہ منطق سب مل کے  
 ہاتھوں میں تکمیل پاتی ہیں، اور وہ صورت اختیار کرتی ہیں جو اُس زمانہ کے تخیل کے لئے مخصوص  
 ہے جس میں ان تمام لوگوں کا جیسے بڑھاپے میں نامزدہ تھا، ویسے ہی باب بھی ہے۔ اگر ہمیں اُس زمانہ کے  
 تخیل کی کسی شکل سے واقفیت پیدا کرنی ہو تو ہمیں مل کی کتابیں پڑھنا ضروری ہوں گی، کیونکہ مل ہی  
 نے اسی تخیل کو ترتیب دیا، اور پچاس برس کے تجربہ کے بعد کات چھانٹ ضروری تھی وہ بھی اسی  
 کے ذریعہ سے ہوئی۔

مل نے اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کی صورت بدلتی دیکھی، اپنی مشہور کتاب "تنتے ہولوات  
 پیش میں" سے تھے، تجربہ ہر طرف سے سبق سکھاتا تھا۔ جب مل نے اپنی تعلیم مکمل کر کے لی دنیا میں قدم  
 رکھا۔ اس وقت ڈراہنسی انقلاب میدان جنگ میں شکست کھا کر یورپ کی سیاست پر فتنہ افروز ہوئے  
 لگتا تھا یورپ کے تمام ممالک میں آزادی پسند لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی، یورپی حکومت کے پاس  
 جنگی بیادیں تھیں جس نے انہیں مل نے اپنی صحافت پر اپنی کتاب "آزادی" لکھی اس وقت تک  
 یورپی سیاست کی پاکستان میں "تنتے ہولوات" نامی صحافت نے سیاسی مسائل کو حل کیا تھا۔

صورت دیدی تھی اور جہاں شروع میں لوگ پارلیمنٹ کو چند دس اور زبیر خنداران کے قبضے  
 ہلاکتی نگریں تھے، ان کو شکستہ میر یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں جمہوریت کے راج میں شخصیت  
 زبیرہ موبھائے یورپ میں انقلابی جوش بہت پیدا ہو گیا تھا اور جہاں شکستہ علی دیا کی کانگریس  
 میں تاخیر راستوں نے انقلاب اور انقلابی اصولوں کی مخالفت کا پیرا اٹھایا تھا وہاں شکستہ میں  
 انقلاب کے طوفان نے قرب قرب ہر ریاست کی کشمکش کو ڈبو دیا تھا۔

جس دنیا کی ضرورتوں کے لحاظ سے مل کو معاشیات کی تعلیم دی گئی تھی وہ بھی مل کے بڑھاپے  
 میں بدل گئی تھی صنعت و حرفت کے انقلاب کے شروع میں تجارت اور تاجروں کو آزادی کی ضرورت  
 تھی ہر ایہ دارا و مزدور کے تعلقات، اگرچہ وہ اچھے کبھی نہیں تھے پھر بھی اس زمانہ میں وہ سماجی اور  
 سیاسی اہمیت نہیں رکھتے تھے جو بعد کو انہیں حاصل ہوئی۔

اخلاقیات میں مل اپنی تعلیم کے لحاظ سے افادی تھا۔ فیتیم کے افادی اصول جب تک کہ پاکستان  
 میں قانونی سدھار کی گنجائش رہی، اپنی سچائی اور فائدہ مندی کا ثبوت دیتے رہے جب مل نے افادیت  
 پر اپنی کتاب لکھی قانونی سدھار کی تکمیل ہو چکی تھی۔ پارلیمنٹ نے بھی اپنے دروازے کھول دئے تھے۔ افادیت  
 کو اب یا تو ناکارہ میں شامل کرنا، یا اسے ایک مستقل اخلاقی اصول ثابت کرنا تھا۔

مل میں نہ عقیدہ کی کمزوری تھی کہ وہ ایسے اصولوں کو جنہیں اس نے زندگی بھر صحیح اور سچا سمجھا تھا  
 لوگوں کے اعتراض کی وجہ سے چھوڑ دے اور نہ اس تک نظریہ استعصاب تھا کہ جو خامیاں اسے اپنے  
 عقیدہ میں نظر آئیں انکا اسرار نہ کرے یا انکو دور نہ کرے۔ لیکن وہ خیالات اور عقیدے جن میں اس نے  
 نے پرورش پائی تھی، اسے انکا کافی معلوم ہوتے رہے اور اگر ہم اس کی تصانیف کا ان مضامین کو مطالعہ  
 کریں جو اس نے جوانی میں لکھے تھے تو ہم بظاہر ہو جائے گا کہ اس کے خیالات میں کسی تبدیلیاں ہوئی  
 رہیں لیکن مجموعی حیثیت سے مل اسی زمانہ کا نمائندہ رہا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور ہمارے  
 لئے اس کی خاص اہمیت ہے۔ اس کے خیال ایک کمری ہے جو زمانوں کے خیالات کو جوڑتی ہے۔  
 ایک بلند ہے جس پر سے ہمیں نئی اور پرانی دنیا کو نظر آتی ہیں۔ مل نے ایک عمر کے خیالات



کرنے کو دوسری پشت کو سمجھائے اور جو تبدیلیاں زمانے نے پیدا کر دی تھیں انکی پوری داد دی۔  
 اور پھر من کیا گیا ہے کہ تنظیم کی افادیت کے لئے جب ”قانون کی سوجا رگی تکمیل ہو چکی، اس وقت  
 علمی دنیا میں کوئی خاص کام باقی نہیں رہ گیا، اور اس پر ہر طرف سے اعتراض ہونے لگے کیونکہ اُسے  
 عامیوں نے اس کے ایک دائمی اخلاقی اور سیاسی اصول ہونے کا دعویٰ کیا، افادیت کو جو خاص  
 بنیادی رنگ تنظیم اور اس کے خیال لوگوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے وہ کسی طرح ایک اخلاقی اصول  
 نہیں بن سکتا تھا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی ”افادیت“ میں، اور ایک دو جگہ ”آزادی“ میں بھی ملتا  
 کہ اس قدر مادی نہیں بناتا۔ ”ایک غیر مطمئن سقراط ایک مطمئن بیوقوف سے اچھا ہے“ اس ایک جملہ  
 اس نے اُن تمام اعتراضات کو تسلیم کر لیا جو افادیت پر کئے گئے تھے، لیکن افادیت کا وہ پھر بھی قابل رہتا  
 جیسا کہ ”آزادی“ میں اس نے لکھا ہے کہ ”اخلاقیات کے تمام مسائل میں میں افادہ کو سب سے آخری،  
 سمجھتا ہوں، یعنی ”اخلاقی تعلیم میں میں ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا کہ لوگوں کو اس سے فائدہ بھی پہنچتا  
 یا نہیں، اور اگر ہے تو کتنوں کو“ افادیت آج کل ایک پرانی خیالی عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے، لیکن لوگ  
 اس کی تاریخی اہمیت اور اس کی خدمات کا تسرا بھی کرتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ مل کی شخصیت ہے۔  
 اگر ایک اور مثال کے طور پر ایڈم اسمتھ کے چند نظریے ہیں تو مل کا اثر اور اس کی حیثیت علوم کو  
 آج بھی ہیں اور صاف نظر آنے لگے گی۔ ایڈم اسمتھ ”آزاد تجارت“ کا بڑا حامی تھا، اور اس کے خیال  
 میں، باسٹ کے لئے سب سے مناسب پالیسی یہ تھی کہ وہ معاشی معاملات میں دخل نہ دے، لیکن  
 نے معاملہ سے کوشش کی کہ قانون کے ذریعہ سے آج کا بھاؤ اونچا رکھے صرف اس وجہ سے  
 پارلیمنٹ پر زمینداروں کا بہت اثر تھا اور اس طرح سے ملک میں کئی سال تک ایک مصنوعی قحط  
 افادیت کی ساری تعلیم تنظیم کے اس مشہور جدول میں موجود ہے ”زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ  
 لیکن ہر شخص اپنی جگہ کی تعریف اپنے طور پر کرتا ہے اور جس سے ایک کو فائدہ ہوتا ہے دوسروں کو نقصان  
 پہنچ سکتا ہے، مگر افادیت کے حامیوں کی رائے میں یہ معلوم کرنا ممکن تھا کہ کس چیز سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے  
 زیادہ فائدہ سائنس ہوتی ہے، انہوں نے اس مفصل میں سائنس کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی جو

اس حرکت نے آزاد تجارت کے حامیوں کو اپنے عقیدے میں اور مضبوط کر دیا، اور بجائے حکومت کی چند حرکتوں کی مخالفت کرنے کے ردِ دشمن خیال لوگ عام طور سے حکومت کی مداخلت ہی کے دشمن ہو گئے اور جو تحریک چند معاشی قوانین کی مخالفت کے لئے شروع ہوئی تھی اس نے ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی جو عدالت سے کوئی پندرہ برس کے عرصہ میں ایک عام عقیدہ بن گئی اور جواب بھی ایک مذہب قائم ہے۔ اس تحریک کی بنیاد واصل حکومت کی طرف سے بدگمانی تھی۔ پارلیمنٹ پر چند اثر گوئیوں کا قبضہ تھا جو اپنی اغراض اور اپنے فائدے کے مطابق قانون پاس کراتے تھے۔ انہی منہور غرضانہ معاہدے کی مخالفت بیتیم کو بھی کرنی پڑی تھی یہی لوگ باوجود قوم کی کوششوں کے تجارت کی آزادی پر راضی نہیں ہونے تھے یہی لوگ مزدوروں کی خراب حالت دیکھ کر بھی انکو زبردستی اسی مزدوری کے نرخ پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ اور انہی لوگوں نے ٹریڈ یونین وغیرہ کو خلاف قانون قرار دیا تھا تاکہ مزدور دل کے پاس مزدوری بڑھانے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔ ان سب باتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن رفتہ رفتہ پارلیمنٹ ان لوگوں کے اثر سے نکل رہی تھی حکومت کی بنیاد قوم کی رضامندی قرار پائی اور اس کا مقصد قوم کی فلاح و بہبود تھا۔ تجربہ نے یہ دکھا دیا تھا کہ بہت سے معاملات بغیر حکومت کی مداخلت کے نہیں طے ہو سکتے۔ سیاسی زندگی کے بہت سے فرائض تھے جو صرف حکومت پورے کر سکتی تھی اور اس لئے اس کی طرف سر بدگمانی رکھنا اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا تھا۔

اس مسئلہ میں بھی مل گذشتہ موجودہ اور آئندہ کو پیوستہ رکھتا ہے اس کے زمانہ کا عام رجحان اگر ہم ہر برٹ اسپنسر کے نظریوں کو انفرادیت کی اتہا قرار دیں جیسا کہ واقعہ ہے، انفرادیت کی طرف تھا اس نے پہلے یا تو سیاسی معاملات کی طرف سے بے توجہی تھی یا حکومت قوم کو بھلائی پہنچانے کا ایک ایسا ذریعہ بھی جانتی تھی مسئلہ کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے اثر کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، عوام اور حکومت میں کسی قسم کی بدگمانی باقی نہیں رہتی، اور بجائے حکومت کی مداخلت پر اعتراض کرنے کے قوم اس کی اور مدد کرتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مل خود انفرادیت کا قائل تھا، لیکن اس میں اور اس کے زمانہ کے

سیاسی فلسفوں میں بڑا فرق ہے۔ اسپنسر ریاست کو محض ٹوم یا ساج کے جان و مال کی حفاظت کا کام سپرد کرتا ہے۔ اس کی مدد سے میں بڑی خدمت جو وہ سماج کی کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دے اور سماج کو چاہئے کہ جہاں باہر کے چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتی ہے وہاں اس گھر کے چور پر بھی نظر رکھے یعنی ریاست کو اپنے معاملات میں دخل دینے سے اور اپنی آزادی کے محدود کرنے سے روکے۔ یہ سب کچھ کہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسپنسر ریاست کو ضروری نہیں سمجھتا اور زندگی کا مرکز اور اس کی چلانے والی طاقت اس کے نزدیک مختلف افراد ہیں، انفرادیت اس کا مذہب ہے، فرد کی عقل اور سمجھ کے علاوہ زندگی میں اسے اور کوئی روشنی نظر آتی نہیں۔

انسان کی وقعت اور اہمیت پر زور دینا بہت قابل تعریف بات ہے۔ لیکن اسپنسر جس انسان کے لئے میدان جنگ میں آتا ہے وہ انسانیت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں، اسپنسر کا فرضی انسان جس کو وہ میدان آدمی کہتا ہے، محض ایک تاجر ہے جس کا نقطہ نظر خالص بویا پیوں کا ہے، یعنی اسے تمدن، تہذیب اور ان دلچسپیوں سے جن کو عام رائے نے اس زمانہ تک انسانیت کا خاص حصہ سمجھا ہے، کوئی مطلب نہیں سماجی سیاسی، ادبی زندگی کو وہ اگر حقارت نہیں تو بے قدری اور بے پروائی کی نظر سے ضرور دیکھتا ہے۔ ریاست اس کے نزدیک ایک نظام ہے جو دشمنوں سے لڑنے اور چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان خدمات کا شکریہ ادا کرنے پر تیار ہے، پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ ریاست اس کے معاملات میں کسی قسم کا دخل دے، کیونکہ ریاست اس کے معاملات کو اس سے بہتر نہ سمجھ سکتی ہے نہ انجام دے سکتی ہے۔

لہذا ان تمام غلطیوں سے بچا جا رہا ہے۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ سماجی زندگی کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو وہ اہل دنیا چاہتے ہیں لیکن انسانیت کو وہ اس کے بدلے میں بہت اعلیٰ مرتبہ دیتا ہے۔ اسپنسر کے تخیل پر سائنس نے ایسا قبضہ کر رکھا ہے اور اس میں اتنی جابجائی ہے کہ وہ پٹریوں پر چلنے پر بھی راہ نہیں مل سانس کو انسان کے بہترین مشاغل میں شمار کرتا ہے، لیکن اس کی نظر سائنس کے دعووں پر گم نہیں رہ جاتی۔ اسپنسر نے ریاست اور حکومت کا فرق بھول کر دونوں کو اپنے ”آدمی“ سمجھ لیا۔

دکھائے کی کوشش کی جو۔ مل اگر ریاست اور حکومت کی مداخلت کا قائل نہیں پھر بھی اس کی انفرادیت بعض ایک اونٹنے چوپاری کی خود غرضی کا بنایا ہوا اصول نہیں اور نہ اس کے نزدیک اسپنسر کا "سیدنا، آدمی انسان کا بہترین نمونہ ہے، انسان کی آزادی کا خیال اس کے دل میں ایک سچا جوش پیدا کرتا ہے، اور آزادی کے اس نے بہت وسیع معنی لئے ہیں۔

اچھے زمانہ میں اسپنسر کا اثر بے شک زیادہ تھا، کیونکہ اس نے اپنے نظریوں کو سائنس کے بھیس میں پیش کیا تھا، اور سائنس کا اس وقت لوگوں کے دلوں پر بہت رعب چھایا ہوا تھا۔ آج کل سائنس کا جو سیاسیات میں دخل ہے اسے لوگ بہتر سمجھتے ہیں، یا یہ کہئے کہ علاوہ نفسیات کے اور کسی سائنس کو سیاسیات میں دخل نہیں رہا، اور اسپنسر کے نظریوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ مگر مل کی قدر تانی ہی ہوتی رہی۔ ریاست کے معاملہ میں لوگوں کی رائے بدل گئی ہے، لیکن انسان اور انسانیت کی وقعت نہیں گھٹی اور زندگی کے آدھش یا نصب العین جو مل نے قرار دئے تھے، اگرچہ ان میں خامیاں بھی ہیں، لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

اسے صحافی مقالات کے علاوہ ریاست کی مداخلت کے بارے میں مل کا جو خیال ہے وہ اس بحث کی بخوبی ظاہر ہوتا ہے جو وہ ریاست اور تعلیم پر کرتا ہے۔ مفت اور جبری تعلیم کا وہ حامی ہے۔ اسپنسر کی طرح وہ اسے ضروری نہیں سمجھتا کہ ریاست کو اس معاملہ سے بھی دور رکھنا چاہئے۔ ریاست کی طرف سے تعلیم دینے کے خلاف اگر کوئی کہا جاتا ہے تو اس کے یہ مقصد نہیں کہ ریاست سے تعلیم لازمی نہ کرائی جائے بلکہ یہ طلب ہے کہ ریاست کو اپنے اغراض کے مطابق تعلیم دینے سے روکا جائے بالکل دوسری شے ہے۔ پڑے پیمانہ پر تعلیم کا انتظام صرف ریاست ہی کے لئے ممکن ہے، لیکن مل نہیں چاہتا کہ تمام تعلیمی نظام اور اسکول وغیرہ ریاست کے قبضہ میں آجائیں، کیونکہ اس کا اثر برا ہوگا۔ عام ریاست کی طرف سے تعلیم صرف شخص کو دوسرے جیسا بنانے کی ایک ترکیب ہے، پرائیویٹ اسکولوں کے ساتھ ریاست کی طرف سے اسکولوں وغیرہ کا جو نام ریاست کی طرف سے پرائیویٹ اسکولوں کو مالی امداد دینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں سمجھتا ہے۔ تاہم اسے کہ عام تعلیم افراد پر نہیں چھوڑی جاسکتی، اور اگر اس زمانہ میں ریاست اس قدر رجحان نہیں ہے جتنا کہ مل چاہتا ہے، لیکن پھر بھی اسپنسر سے اس کی رائے واقعات کے نقطہ نظر سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔

اسپنسر کا یہ خیال تھا کہ سیاسی مسائل کو جس نچرل سائنس، خاص طور سے حیاتیات (بایولوجی)، دیکھو صفحہ ۲۸

حکومت کی خرابیوں اور اُس فرقہ کے خیالات نے جس میں اپنسر کی پرورش ہوئی تھی اُسے ریاست کا دشمن اور انفرادیت کا حامی بنا دیا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے جب سے حکومت پر چھوڑ کا اثر پڑنے لگا حکومت کی طرف سے بدگمانی جاتی رہی اور اُس کے ساتھ اپنسر کے نظریے بھی۔ اور اگرچہ اب بھی بہت سے ایسے اہل فکر موجود ہیں جو انفرادیت کو سیاسی اکیسہ جیتے ہیں لیکن ریاست کی پالیسی، عام رائے اور وقت کا تقاضا بالکل وہی ہے۔ اپنسر ایک زمانہ کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے، اگرچہ اُس کا مقابلہ اُس سے پہلے کے خیالات سے کریں تو مل کی انفرادیت ایک کڑی ہے جو دور کو جوڑتی ہے، اور اگر محض دور کے بعد کی اجتماعی سے کریں تب بھی مل کی حیثیت ہی رہتی ہے اُس نے اپنے سے پہلے کے خیالات جذب کر لئے تھے، اور اس کے زمانہ کے جو خیالات تھے وہ بھی، لیکن اُس نے اپنے قبل کو ایسی وسعت دی تھی کہ آئندہ تحریکوں سے بھی اُس کا گہرا تعلق رہا، کیونکہ اگرچہ موجودہ زمانہ کی سخت گیر تعقید کے سامنے انفرادیت یا سیاسی پالیسی کی صورت میں نہیں بڑھ سکتی تاہم مل نے آزادی کے جو معنی قرار دئے ہیں، اور اصلی آزادی سے اُس نے انفرادیت کا جو تعلق دکھایا ہے وہ کبھی کسی تنقید کے ذریعہ سے غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

---

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ کے متصل اور قوانین کے مطابق مل کرنا چاہئے۔)

اپنسر پر دانتی مذہب کے لحاظ سے اس فرقہ میں شامل تمام جو انگلستان کے ریاستی کلیسا کے عقائد کا قائل نہ تھا۔ فیسر تہ کئی صدیوں سے ریاست اور کلیسا دونوں کی مخالفت کے باوجود ابھی تک قائم ہے، مگر یہ اب بہت مصیبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ سیاسی صورت میں ظاہر ہے کہ مخالف کلیسا کے لئے ریاست کا دوست ہونا ممکن

# روحانی کلام اور روحانی عمل

الفاظ محض حرفوں کا مجموعہ نہیں۔ وہ اثر بھی رکھتے ہیں۔ ہماری کتب مقدسہ میں مذکور ہے کہ ایک رازِ واجب الفاظ میں جادو، حد درجہ اثر آفریں جادو ہوتا تھا۔ قدیم سنسکرت نقطہ الفاظ تھے۔ مگر ان میں سحر تھا، وہ عربی ہمارے فلسفہ میں پران کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ نفوس جو لوگ اور ریاضت کے ذریعہ کامل ہو چکے تھے ان سنسکرتوں کو پڑھتے تو دنیا لرز اٹھتی اور ساکت رہ جاتی۔ اپنی زبان سے کچھ کہتے تو غماص سر جھکا تے۔ مسندوں کا پانی ٹہر جاتا، ہوا رک جاتی، گئے جنگلوں کے درمیان بھی ہونی لگیوں سے الفاظ، محض الفاظ نکلتے، آگ بھڑے، روشنی لئے، انسانیت کو مصفا، زندگی کو پاک کرتے۔

آج ممکن ہے کہ ہم یہ باتیں بالکل لغو معلوم ہوں۔ مگر آئیے ذرا سوچیں، اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے سے سوال کریں: کیا الفاظ میں اثر ہوتا ہے؟

بارہا ہم نے یہ جملے سنے ہونگے: ”مظلوم کی آہ عرش کا گنگرہ ہلا دیگی“ کیا ہم انہیں بھی لغو ٹھہرا سکتے ہیں؟ مظلوم کے جلے دل سے نکلے ہوئے الفاظ کیا سخت سے سخت آدمی بھی ان سے لرز نہیں جاتا؟ ہندوستانی فلسفہ ایک بے پناہ طاقت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور جب کسی الفاظ پر ان سے بھرے نکلتے ہیں تو یقیناً وہ اثر رکھتے ہیں۔ آئے مثال میں ایک اور منظر کو لیں، ایک اجتماع کو، جو کوئی اچھی تقریر سن رہا ہو۔ الفاظ کا جادو چل رہا ہوگا۔ سامعین بالکل مسحور ہونگے اور مقرر کا ان پر پورا اختیار ہوگا۔ گویا وہ واقعی ساحر ہے۔

ایسی حالت میں بھی کہ کسی گروہ کو یا سٹاری ہو، زوردار الفاظ مردہ دلوں میں نئی روح پھونک سکتا اور بزدلوں کو مرد و بنا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ طاقت الفاظ میں نہیں ان خیالات میں ہوتی ہے جن کے وہ حامل ہوتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ خیالات میں ضرور طاقت ہوتی ہے، لیکن الفاظ میں بلاشبہ ایسی طاقت موجود ہے جو اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ آپ کسی زید عمر کو کہیں کہ پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیجئے۔ تقریر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ سامعین جہاں کے تہاں رہے۔ لیکن جب کوئی خطیب زبان کھولتا ہے

تو اس کی آتش میانی مردہ تنوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ الفاظ اس حالت میں ایک ذریعہ محض نہیں رہتے  
وہ بذات خود ایک مقصد بن جاتے ہیں۔

لیکن خطیبانہ الفاظ ان کا انداز بیان، انکی ساحری، زیب بالکل ماضی چیزیں ہیں جہاں خلیب  
کی آواز بند ہوئی، اسکا اثر بھی کم ہونے لگا۔ یہ صحیح ہے کہ اشتعال کے وقت بہت بڑے بڑے کاموں کا  
آغاز ہو سکتا ہے، جو ایک عرصہ تک جاری رہ سکتے ہیں، تاہم خطیبانہ الفاظ کے ساتھ بے ثباتی اثر کا تحمل اگر  
طور پر وابستہ ہے۔

مگر کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو اپنے مخصوص اوزان اور مخصوص انداز رکھتے ہیں اور جن میں اگرچہ  
ماضی اشتعال انگیزی کا عنصر نہیں ہوتا، لیکن وہ زیادہ گہرا اور پائدار اثر رکھتے ہیں۔ یہ شاعرانہ الفاظ ہیں  
شاعرانہ الفاظ عموماً ایک فائوس کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے اندر تصور کے جلد جلد گزرنے والے  
لمحات میں جھلک جانیوالی حقیقت کی روشنی کو ہمیشہ کے لئے مقید کر دیا جاتا ہے، لیکن جب شاعرانہ الفاظ  
سچے دل سے نکلے ہوں، جب وہ تیج ہوں روح کے سچے شاعرانہ کیف کا، تو ان کی حیثیت محض ایک فائوس  
کی نہیں رہ جاتی جس میں حقیقت کی روشنی مقید ہو، بلکہ وہ بذات خود روشنی کا مخرج بن کر لوڑ علی نور ہو جاتا  
ہے۔

انہیں آپ ایک رنگین جام سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں، جو خفاف پانی سے لبریز ہو۔ اس کی رنگینی مستعار  
لیکر پانی خوشنابن جاتا ہے، اور یہ خود پانی کے بغیر ہی پایہ ہوتا۔ شاعرانہ الفاظ تعلق میں کل تناسب اور  
رنگینی پیدا کرتے ہیں جس کے بغیر وہ ایک بے ہیت چیز ہو، اور تصور الفاظ کے خالی پیکر میں جان ڈال دیتا  
ایک شاعر لکھتا ہے کہ ”شعر میں روح کے اعلیٰ و صادق ترین جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ شعر ایک  
نقش ہے جو استعارہ کی لوح طلسمی پر بنایا جاتا ہے، اس میں لفظ اسے سرسبز رنگت اور زمین اور آسمان  
سماں آغوش ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسرے جو ایک عام کلیہ قائم کر رہے ہیں، ان میں غالباً اعتراض کے پہلو بھی  
سکیں گے، لیکن آئیے انکو نظر انداز کریں اور جگہ سے سنی اس کے اندر پوچھیں کہ انکی حقیقت  
شعر میں کون روح کے اعلیٰ و صادق ترین جذبات کا اظہار ہوتا ہے؟ اس لئے کہ شاعر دراصل ایک

ہوتا ہے جس کے ذریعہ روح اپنے اعلیٰ ترین انمول کو سناتی ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پر بخودی طاری ہو شاعری انسان میں سب سے زیادہ بخودی پیدا کرتی ہے کسی اخلاقی یا معاشرتی مصلح یا مدبر کے لئے اظہار خیال کے وقت بخود ہونا ناممکن ہے، کیونکہ اس کے فرائض اور کمپیوں کی نوعیت اسے ناگزیر طور پر خارجی دنیا سے وابستہ رکھتی ہے۔ ایسے کم اخلاقی یا معاشرتی مصلح ہونگے جو اپنے کو خارجی دنیا کے علاق سے متاثر نہ ہونے دیں لیکن شاعر کے لئے خارجی دنیا محض ایک محرک کا کام دیتی ہے۔ اسے قید نہیں کرتی یعنی اس کے علاق تیار کی ساری توجہ کو اپنی طرف کھینچ نہیں لیتے۔ اگر ایسا نہ ہو اور یہ ایک معینہ حد سے زیادہ اثر اور اہمیت حاصل کر لے تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ شاعری ختم ہو رہی ہے اور علیٰ قوتیں پیدا ہو رہی ہیں شاعر پھر ایک علی انسان بن جاتا ہے۔

شاعری کا سچا کیف جو اعلیٰ کے علاق سے شاعر کو متاثر نہیں ہونے دیتا، انسانی روح کی ارفع ترین ماحصل کے سامنے اپنی ندرت پیش کرتا ہے۔ اسی مذکوریں ”روحانی کلام“ کہتا ہوں۔ روحانی کلام ان تصویات کو دوام بخشتا ہے جو شاعر کے دماغ میں گزرا کرتے ہیں۔

دوسروں کو بھی ایسے تصورات نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن وہ یا تو ان کو یوں ہی محو ہو جانے دیتے ہیں یا انکا بہت کم اثر لیتے ہیں۔ اگر زیادہ اثر ہوتا بھی ہے تو اس قسم کم جو انہیں فوراً کچھ کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے لیکن شاعر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اس کی خدا داد قوت کا ایک دوسری طرح عمل ہوتا ہے۔ وہ تصورات کو اپنے فن کے سنہری جلال میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپا لیتا ہے۔ وہ انہیں غیر فانی بنا دیتا ہے تاکہ دوسرے بھی ایسے کیسے اور حقیقت تک پہنچ سکیں۔ ذیل میں ایک شاعر کے چند طور و راج کے جاتے ہیں جس سے روحانی کلام کی مثال واضح ہوگی۔

خیال کی ابتدائی تحریک خارجی دنیا کی طرف سے ہوتی ہے۔ غریبوں کی انتہائی مصیبت اور انکی دردناک یکیں نامک پر حسرت مبروشکر یہ باتیں شاعر کے احساس دماغ پر اثر ڈالکر حالت فکر طاری کرتی ہیں شاعر صبر و ضبط ہوتا ہے غریبوں کے مصائب کا خیال لکھ لکھ کر سکا دل کو قضا ہے اور وہ اپنے



دل سے یہ سوال کرتا ہے کہ آخر خدا کا انصاف کہاں ہے، خدا ان سے محبت کیوں نہیں کرتا، پھر تیس کیوں نہیں کھاتا، پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ خدا ہی خدا ہیں پر اسکا کمال ایسا ہے، بذات خود دنیا کی ان فقیر ترین ہستیوں کے ساتھ رہتا ہے، انہیں کے لباس میں انکا دوست۔ انکا ساتھی، انکا رہنما بنکر شاعر فرط انبساط سے اچھل پڑتا ہے اس کے دل سے اللہ اکبر کی صدا نکلتی ہے، اور وہ جذبہ پرستش سے بے اختیار ہر گھر گھر سجدہ ہو جاتا ہے۔ مگر محسوس کرتا ہے کہ اسکا سر جھک کر بھی اس پتی تک نہیں پہنچ سکتا جہاں خدا کے قدم ”منفلوں، فقیروں، اور گرم گشت گلوں کے ساتھ رہتے ہیں!“

یہ تصور اسکو شاعر نے روحانی کلام کی صورت میں لا کر غیر فانی بنا دیا ہے ہم جو اس روحانی کلام سے واقف ہیں، جب بھی چاہیں انہیں پڑہ پڑہ کر شاعر کی طرح جھومیں اور جو کچھ اس نے دیکھا خود بھی دیکھیں۔

آئیے اب ایک ایسے آدمی کا خیال ذہن میں لائیں جو شاعری کی جگہ عمل کی خدا داد وقت بدرہم رکھتا ہے۔ اسے بھی ایسا عمدہ تصور نظر آ سکتا ہے۔ وہ بھی ان عم زدوں کی حالت پر غلین مل گیا تھا سوچ میں ڈوب سکتا ہے، اس غور و فکر کے وقت میں خارجی دنیا جو اسکا موضوع فکر ہوتی ہے، اس کے سامنے غیر معمولی اہمیت حاصل کر کے اسے براہ راست عمل کی طرف لیجاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو منفلوں حقیروں، اور گرم گشت گلوں سے جا ملاتا ہے۔

ایک شاعر اور عملی انسان میں یہی فرق ہے۔ وہ خارجی دنیا جو عملی انسان کے سامنے ہوتی ہے اس سے اپنی خدمت اور اصلاح کا مطالبہ کرتی ہے۔ عملی انسان اس مطالبہ کے سامنے تسلیم خم کر دیتا ہے لیکن شاعر خارجی دنیا کے بچے میں نہیں آتا۔ وہ اس کے مطالبہ کے جواب میں شکر کہہ دیتا ہے، شاعر کے جواب کو میں اپنی اصلاح میں ”روحانی کلام کہتا ہوں اور عملی انسان کے جواب کو ”روحانی عمل“ دونوں روح ایک ہی کیفیت کی پیداوار ہیں لیکن ایک ہی کیفیت کا دو طرح اظہار کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ شاعر کی دائمی ساخت عملی انسان کی دائمی ساخت سے مختلف ہوتی ہے

مطلوبہ کیفیت ہی ہوتا ہے۔ معاذ خود ہوتے ہیں۔ ایک کانفرنس دعائی کلام ہے دوسرے کانفرنس دعائی عمل لیکن میرا دعویٰ ہے کہ شاعر اور علی انسان میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ بے عمل ہے اور یہ باعمل ایک شاعر عارف، جو حقیقت کا ڈھروشا بدہر کر سکتا ہے اور اپنے واردات قلب کو غیر فانی بنا کر سرزبانہ کے لوگوں کو اپنا ہم آہنگ بنا سکتا ہے، اس کا شعر کہنا بھی اسی طرح عمل ہے جس طرح کسی علی انسان کی شخصیت فرق صرف یہ ہے کہ وہ عالم معقول میں ہوتا ہے اور یہ عالم محسوس میں۔

کچھ اور کہنے سے قبل میں تھیلارابندزاتہ ٹیگور کو ایک بڑے شاعر اور ہاتھ کا گاندھی کو ایک بڑے علی انسان کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں جن میں سے ہر ایک ان اوصاف سے متصف ہر جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

اس سے میری مراد نہیں کہ دونوں اپنے اپنے دائرہ عمل کے استقدر پابند ہیں کہ دوسرے کے دائرہ عمل میں قدم نہیں لگھ سکتے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ نظرت نے دونوں کو جو غیر معمولی صلاحیتیں بخشی ہیں انہیں سے کسی ایک کا حقیقی مدعا دوسرے کے دائرہ عمل میں کام کرنے سے نہیں پورا ہو سکتا۔ ٹیگور صرف شاعروں ہی کے ستراج نہیں ہیں۔ وہ صرف بلندی تخیل اور ملکہ شعر گوئی ہی نہیں رکھتے بلکہ ایک علی انسان کے اوصاف بھی رکھتے۔ اور بہت سے مفید خیالات کو علی جا رہی پہنچا سکے ہیں۔ انہوں نے بھی خدمت خلق کا بیڑا اٹھایا ہے اور دنیا کے سرگرم خادموں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ہاتھ کی عظمت کا ثبوت صرف میدان عمل میں نہیں ملتا، فکر و تخیل کی سلطنت میں بھی ان کے لئے جگہ ہے۔ انہوں نے بھی چشم تخیل سے محبت اور جن و ہمدردی کے دلفریب پیکردن کا نظارہ کیا ہے۔ انہوں نے بھی من و غفلت کے ایسے تخیلات کو جو درخشاں بن سے روح ہزار کرتی ہے اور جو ہمیں اپنے تنگ گھروں سے بھاگلا امید اور محنت کی وسیع دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک کی ممتاز خصوصیت روحانی کلام اور دوسرے کی روحانی عمل ہے۔

جس وقت کلام کا بادشاہ علی کی سلطنت میں قدم رکھتا ہے تو اپنے کو لازمی طور پر کمزور پاتا ہے یہی علی انسان کا ہے جب وہ کلام کی سلطنت میں گھرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں سے ہر ایک اپنے

کو ایک ایسے عالم میں پاتا جس کی خیریت میں اسے نئی وجہ اور بعض اوقات سبب معنی فطرتی ہیں جن کو  
 ٹیگور گاندھی کی دنیا میں آکر پرخوں اور ہنگیوں کی سمیع غراش آواز دل کو سننے اور نفس کش و راہب نا  
 کار کنوں، انکے موٹے کپڑوں، مگر کا لود پیروں، اور عرق آلود چہروں پر نظر ڈالتے ہیں تو خواہ الہامی داغ یہ  
 سمجھ سکے کہ ان شقتوں کی تہ میں غریبوں سے محبت و ہمدردی کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ لیکن وہ گھبرا کر غیرو  
 کہہ اٹھتے ہیں کہ بھلا یہ دنیا اپنی باطنی بلکھلا اور لاتنا ہی شقتوں کے ساتھ میری سنور، مہط اور پرنس دنیا کا  
 بھی مقابلہ کر سکتی ہے، جہان کا آسمان قدرت کے برفلوں رنگوں سے رنگین درویش ہے جہان کے گل  
 بوٹوں سے محبت کی خوشبو نکلتی ہے، اور جہان کے پرندے نغموں کی آتش سیال کا جام پیش کرتے  
 ہیں اسی طرح جہان کا گاندھی جنہوں نے اپنے حواس و جذبات پر قابو حاصل کر کے انہیں عقل اور قوت ادا  
 کیے آج کر لیا ہے۔ ٹیگور کی دنیا میں داخل ہو کر یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس عیش و نشاط کے  
 کیا معنی جب دنیا کی وسیع سبستی میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، جب افلاس سے منسلکوں کی جھوٹیاں  
 تاریک اور روئیں تاریک تر رہتی ہیں اور جب ہر شخص کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں  
 کی حاجت روائی کرے۔ یہ ٹیگور اور گاندھی کے اختلاف طبع کا ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک چرخہ کے امکانات  
 کو نہیں سمجھ سکتا اور دوسرا نمون لطیفہ کے پیام کو۔

شاعر کا داغ عموماً باتوں کی تحلیل نہیں کر سکتا۔ وہ فطرتی طور پر ترکیب کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے  
 دوسری طرف اخلاقی حیثیت، جس کا اثر جہان کا گاندھی پر غالب ہے، جالی حیات کو ابھرنے نہیں دیتی۔  
 جو شخص اپنی فطرت کے ایک ہی حصہ کی تکمیل چاہتا ہے، ممکن ہے اس کو شش میں کامیاب  
 ہو، مگر وہ اس پوری تکمیل سے اتھوڑ دیتا ہے جو ہر دو حصوں کی متناسب تکمیل سے ممکن ہے  
 مگر برگسان نے اپنی کتاب العجاہطبعیات میں لکھا ہے کہ کسی بات کا مفہوم سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ  
 نہیں ہے کہ آدمی اس کی کوشش میں عقل کو اس کے گرد چکر دیتا رہے بلکہ چاہئے کہ روحانی اتحاد کے  
 ذریعہ سمجھے وہ وجدان کہتا ہے، اس چیز کی تک پہنچ جائے، اور پھر آئینہ کو گرد کیجئے۔

حقیقت تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ یہی وجدانی ذریعہ ہے عقل کیلئے بیش بہا شش ہے

کو نہ پسند کرے کسی ایک پن کوئی خاص نقطہ نظر سے دیکھے لیکن وجدان سے منسلک پوری نوعیت کا کلکتاؤ  
ہو جاتا ہے۔

یہ وجدان شاعر میں بھی ہوتا ہے اور علی انسان میں بھی، لیکن اسی وقت تک جب تک کہ وہ اپنے اپنے  
دائرہ عمل میں ہوں۔ اس لئے کہ وجدان مجموعی شخصیت کی ایک صفت ہے۔ شاعر کی شخصیت کا رجحان عالم  
معقول میں تخلیق کی طرف ہوتا ہے۔ اور علی انسان کی شخصیت کا رجحان عالم محسوس میں مل کی طرف۔  
مکن ہے کہ کسی شاعر محدودی کے جذبہ سے متاثر ہو کر عالم معقول میں سرگرم عمل ہو نہ پائے۔  
مگر چونکہ یہاں کام کرنا اس کی شخصیت کے رجحان کے خلاف ہوگا۔ وجدان اس کی رہنمائی نہیں کرے گا  
اور اسے صرف اپنی عقل پر غور نہ کرنا پڑے گا جو غامض ہو نیکی و برے سے حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی۔ پس اس کے  
کام کی حالت باطل اتر رہے گی۔ یہ اسی سبب کا نتیجہ ہے کہ ٹیگور جب چرند پرکھ لکھنے میں نا تشبیہیوں اور  
استعاروں کے میدان میں جنگ کر نفس مضمون سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک علی انسان عالم  
معقول میں آکر وجدان کی رہنمائی سے محروم ہو جائیگا۔ اسکو بھی یہاں صرف عقل سے کام لینا پڑے گا جس  
سے حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکے گی۔ پس وہ عالم معقول کی باتیں سمجھنے سے قاصر رہیگا۔ خود جہاتا  
گاندھی اس دراندگی کی زندہ مثال ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا چرند پرکھ لکھنے کے اعتراضات کے جواب میں  
انکا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے صریحاً ٹیگور، یا اگر وہ نہیں تو نونوں کے متعلق اشارہ  
کر دیا ہے کہ کھاتا گندہ دنیا میں اس ساحر کو باسانی عزت کی نگاہ میں جاتی ہے جو بیچا چوند پیدا کر نیوالی  
پیریز پیش کرے۔ یہ بات اگرچہ جہاتا گاندھی کے قلم سے نکلی ہے مگر میں اس کے ماننے میں متعلق ہوں  
ہے۔ نونوں کی دنیا میں جوئی نئی تخلیق ہوتی رہتی ہیں ان میں صرف ظاہری جگہ ہی نہیں ہوتی بلکہ  
قیمتی جوہر بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ جو قویہ ہے کہ ہر بڑی تخلیق روح کے لئے ایک ضروری پیغام رکھتی۔  
لہذا آپ ٹیگور ہی کے گیتوں کو پڑھ دیکھئے۔

طبع غمیسہ کے وقت، ایک کہ ستماء دل کی روشنی ہنود سایہ وار درختوں کے پتوں میں

ہو جاتا ہے۔ ان کیوں کا جھٹکا سکتا ہے شاعر کی فضا کو نونوں سے سمیر کر دیا ہو اگر تیا ہے؟

دل ان انہوں میں بعض نغموں کو نکر اسی طرح معرور ہوتا ہے جس طرح ہاتھ گاندھی کے کاموں میں کوئی تہی خوبی معلوم کر کے۔ یہ نئے، یہ گہرائی، یہ شاعری، زندگی کی عظمت، آب حقیقت کا اسی طرح جہد ہیں جس طرح مہمدی کے کام، یا خدمت خلق، بلکہ یہ خود بھی کار ہائے مہمدی میں داخل ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لطیف تر ہیں۔

ہاتھ گاندھی کا یہ کہنا بھی خلاف واقعہ ہے کہ دنیا را باب فن کو آسانی سے عزت کی جگہ دیتی ہے لہذا مثالیں اس بیان کی تغلیط کرتی ہیں۔ رولینڈ کو سا لہا سال کتنی مشقت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑا لوگوں کے اختلاف کو اس کو کسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ کیٹس دل شکستگی کے صدمہ سے جان نہ ہوگا خود را بند زاتھ شیکور با وجود خدا دلیاقت کچھ آسانی سے نامور نہ ہو سکے۔ انہیں کس کس طرح دل طمانا پڑا تنگ نظر قدامت پسندوں کی کیا کیا نہ سننی پڑی۔ اور آج بھی جبکہ ساری دنیا میں انکی شہرت ہو، ننگال اہل سائے ہندوستان کے اندر کتنے لوگ ایسے موجود ہیں جو ان سے نفرت رکھتے ہیں۔

کسی بڑے آرٹسٹ کی جدت پسندی سے پرانی چیزوں کو کہیں نہ کہیں صدمہ ضرور پہنچتا ہے چونکہ انسان قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ اسے گوارا نہیں کرتا۔ پس آرٹسٹ کو لوگوں کی مخالفت کرنی اور اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہو۔ وہ بھی صلیب پر لٹکایا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کی صلیب لوہے اور کیلوں کو ہیں بلکہ ذہنی درد و مالی گرفت سے بنتی ہے۔

پھر کہتا ہوں میرا یہ دھوئے نہیں کہ ہاتھ گاندھی کا دل جالی جس نہیں رکھتا۔ غائب کی طرح انہیں بھی ابرو بھرے آسان کو دیکھ کر جدا جاتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہاتھ گاندھی جیسا علی انسان ایک شاعر کی طرح حسن کو خدا نہیں سمجھتا۔ وہ اسے ایک ثانوی چیز سمجھتے ہیں اور تقویٰ اور ضبط نفس پر زور دیتے ہیں۔ ہی وجہ یہ کہ وہ فنون کو صرف ظاہری طرائق کی چیز خیال کرتے تھے اور انکو لوازمات زندگی سے بے سرو کاہ سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اداسیہ کے فائدہ زوول کا خیال مجھے خواب میں ہوتا ہے اور بیداری میں بھی چیز انہیں بچا ہے ہی میری نگاہوں میں حسین و "پیرنگی جالیات"

پس یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ شیکور اور گاندھی جیسا اسلطانوں کے آجیاد میں ایک کی عظمت و

قول میں ہے۔ دوسرے کی سلطنت عالم محسوس میں۔ ایک کا نشاط دنیا کو اپنے روحانی ام سے متفیض کرنا ہے۔ دوسرے کا روحانی عمل ہے۔

مگر یہی کہہ دینے کو قصہ ختم نہیں ہو جاتا کہ ٹیکو ٹیکو رہیں اور گاندھی گاندھی رہیں۔ غور کرنا ہے کہ انسان نصب العین کیا ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک تو کامل انسان وہی ہے جس میں دونوں کے خصائص جمع ہوں۔ زندگی بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے اندر مختلف عناصر ہیں، جو کبھی تو متضاد مہوتے ہیں اور کبھی آہنگ، ہار اور نصب العین انہیں عناصر کی کامل ہم آہنگی ہونا چاہئے جس سے ہم اس درجہ پر پہنچیں کہ ہمیں جہاں کا انسان گیتا کے الفاظ میں۔

”بھر زخار کے اندھے، جو دنیا کے سیلابوں کو اپنی آغوش میں لیٹتا ہے مگر ابل نہیں پڑتا جس میں دریاؤں سے پانی آتا ہے مگر سیلاب نہیں پیدا کرتا۔ اس کی روح کے سمندر میں دنیا مادی کے چشمے آکر ملتے ہیں مگر وہ جس کا تس رہتا ہے، ان سے پانی کا حراج لیتا ہے مگر سمندر ہی رہتا ہے۔“

معلوم نہیں اس نصب العین تک کوئی پہنچ سکے گا یا نہیں۔ مگر ہمیں اس کے امکان یا عدم امکان سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ نصب العین اس بلند معیار کا نام ہے جو ہمارے خیال میں آسکتا ہے۔ خواہ وہ قابل عمل ہو یا نہ ہو۔

لیکن یہاں ایک نیا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے۔ اس کامل ہم آہنگی تک پہنچنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ مسلسل کوشش اور تدریجی ترقی کو ہی قابل ہو سکتی ہے اور ذہن کی نوری و جدائی ٹکڑوں سے ملجی۔

یہاں پھر ہم گاندھی اور ٹیکو کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ گاندھی مسلسل کوشش کے رستے

پر چل رہے ہیں، ہر کوشش کا اثر ان کی شخصیت پر بڑا کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کرتا اور اسے تکمیل کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن ٹیکو کی شاعرانہ طبیعت اس سیدھے راستے پر مشقی ہے۔ وہ کچھ دور چلتے پھر ہیک کر غائب ہو جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اصل گم ہو گئے۔ مگر دوسری بار پھر جب ان پر شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے

تو وہ بجلی کی طرح اڑتے اور ایک لمحے میں حقیقت سے ہٹنا رہ جاتے ہیں۔  
عامۃ الناس کو گاندھی کا آہستہ مگر ندیدی ترقی کا راستہ زیادہ بجاتا ہے۔ کیونکہ یہ یقینی معلوم ہے کہ  
اگرچہ شکل پر لیکن شاعر کی پرواز بہت کم لوگوں کے لئے ممکن ہے۔ گاندھی کی ترقی میں ذہنی اور اخلاقی  
غالب ہے۔ نیکیوں کی ترقی میں جمالی اور جذباتی۔

کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون سا طریقہ بہتر ہے ہم ان میں سے وہی اختیار کر لیتے ہیں جو ہماری  
کے موافق ہو۔ اگر کوئی "وسائی" یا "بزاز" گاندھی کا طریقہ اختیار کرتا ہے، تو اس سے صرف یہ ظاہر  
ہوتا ہے کہ انکی طبیعت اس طریقہ کے موافق ہے۔ دوسری طرف اگر کوئی جمالی ذوق رکھتا ہے تو  
کے لئے صرف ہنگوڑی کا طریقہ ممکن ہے۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا غلطی ہے۔

# عرب فرامیسی ادبیات میں

## رولان کا گیت

(۵)

ارسل کو جب ہوش آیا تو اسے اس کے خاص محبوب داکرہ میں لے گئے، اس کمرہ میں رنگ ہرنگ  
یا تصویریں بنی ہوئی تھیں<sup>(۱)</sup>، بلکہ براہیموند اس کی حالت پر زار قطار رو رہی تھی اور اپنے بال نوچے ڈالتی  
تھی کہیں زود زور سے چنیں مار کر یوں کہتی تھی:-

”افسوس اسرار گوس کے نام پر کیا انٹ و جبہ لگے گا اگر بادشاہ مارسیل آج دنیا سے اٹھ گیا  
ہمارے سب خدا دعو کے باز نکھے، آج صبح انہوں نے ہمارے بادشاہ کو دشمن کے ہاتھوں شکست  
دلائی، اگر امیر فرامیسیل سے لڑنے آیا جنہیں اپنی جانوں کی بالکل پروا نہیں، تو بڑی بڑی کاشتوت  
دیگا، اگر وہ ان سے لڑنے آیا تو ابھکا بادشاہ جس کی دارمیں پھولوں کی سی ہے بھلے گا، تھوڑی، دھڑا  
گھنڈی اور بھادور ہے، افسوس! ہمارے آدمیوں میں کوئی نہیں جو اسے قتل کر ڈالے۔“

بادشاہ شارل پورے سات سال اسپین میں رہا، کوئی گدھی اور قلعہ نہیں جو اسے فتح نہ کر لیا  
ہو، مارسیل نے مقابلگی پوری تیار کیا، ہریر لگوا لگوا کر اپنی حکومت میں ہر جگہ حکماء بھجوائے اور  
بال کے امیر ایچکان سے مدد کی درخواست کی، یہ امیر بڑا عا اور زمانہ دیکھے ہوئے تھا، اس کی عمر چیل

(۱) اندک کل مسلمانوں کی فنون لطیفہ کی ترقی مسلمہ، اس گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کی کسی دنیا میں مسلمانوں  
کی اس ترقی کا ہر جگہ چرچا تھا، یورپ کے موجودہ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی اور تصویر کشی مسلمانوں کے بڑی حد تک  
رجحانست ہیں، نشاۃ الثانیہ کے اطالوی مصوروں کی تصویریں سان بول تھیں جن میں کس حد تک وہ ایرانیت پر متاثر  
ہیں، جہد فانی میں اس کی تصویروں کو بیکر نہ جاننے والا بڑی شکل سے تیز کر سکتا ہے، آیا انیس کوئی پیرہ جو مشرقی تھیں  
جن میں تصویر کشی کی موجودہ تحقیقات اسی ایرانی اثر کو تسلیم کرتی ہیں، اسی طرح موسیقی میں عربی اثر مسلم ہے۔



اور پھر مکی عمروں سے بھی زیادہ غمی، مارا بیل نے اسے کہلا لیا کہ اگر وہ اس کی مدد کو آتا ہے تو اسے ورنہ وہ اس کے خداؤں سے انکار کر دے گا اور اس کے بتوں کو پوچھا پھوڑ دے گا اور یہی قانون اپنی اہل قبول کر کے شاکل سے صلح کرنے لگا۔

امیر بالیگان بہت دد رہے، آتے آتے بھی اسے بہت دیر لگے گی، اس نے اربیل کا پیغام سنکر اپنی پالیس دلائیوں سے آدمی طلب کئے، اپنی ساری کشتیاں، ڈونگے اور جہاز تیار کر لئے سکندریہ کے قریب اسکا بندر گاہ ہے اس نے اپنا سب بیڑا وہاں اکٹھا کیا۔ منی کے پھینے میں گر میوں کے موسم کے شروع میں، وہ اپنے بیڑے کو لیکر سمندریں روانہ ہوا، ان کافروں (پتائی) کی فوجیں بہت تھیں، وہ بادبانوں کی مدد سے بڑے زور شور سے اپنی کشتیاں کھینچتے ہوئے چلے آ رہے ہیں، متول کے سر پر اور جہازوں کے ہر دوں پر اور سب کشتیوں میں چراغ جل رہے تھے، ان چراغوں کی روشنی سے سارا سمندر جگمگا رہا تھا، جب وہ اسپین کی سرزمین کے قریب پہنچے تو کنارا روشنیوں سے جھل جھل ہونے لگا۔

ان کانسروں کو آرام کرنیکی ذرا بھی پروا نہیں، سمندر چھوڑ کے فوراً وہ بیٹھے پانی (یعنی دریا) میں داخل ہو گئے، ماہرین، دربار بردار سے گزرتے ہوئے دریائے ابرا میں انہوں نے اپنی کشتیاں ڈال دیں، رات بھر دریا کے کنارے روشنی سے جگمگاتے رہے اور سویرے ہی سویرے وہ سارا گوس پیونج گئے۔

دن روشن تھا اور سورج خوب چمک رہا تھا، امیر اپنے آدمیوں کے ساتھ کشتیوں کو اترتا

(۱۱) بادشاہ بابل کا سکندریہ کے قریب بند گاہ بنانا یورپ کی ارسنہ وطنی کی خبرانی معلومات کا بڑا پرفٹ اظہار ہے اسلوی تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ درج نہیں کہ اندلس کی مسلمانوں کی مدد کے لئے کسی دوسرے ملک کے مسلمان بگئے ہوں، لیکن بے مراکش یا شمالی افریقہ سے کسی کچھ مدد آئی ہو جسے بھانٹوں نے شاہ بابل کی مدد سمجھا یا یہ کہ بابل اور سکندریہ کے نام عوام میں خاص اہمیت رکھتے ہونگے اور اپنے مخصوص اعتراض کے لئے ان ناموں کا استعمال اس بات پر ظاہر ہے کہ وہ نقطہ گزرنے کے گردوں اور عوام کی انبیات کو خوب واقف تھا اور یہاں پر گویا کفر و کفر تھے۔

اس کے بعد سے آہر پاپا نکلے تھا، سترہ بجگذا رہا بادشاہ اس کے پیچھے پیچھے تھے، ان نوابوں اور بجگذا رہوں کا شمار نہیں جو ان بادشاہوں کی اردلی میں تھے، ایک پٹر کے تلے کھیت کے سچوں بچ ہری گھاس پر سفید ریشم کی چادر بچا کے اس پر ہاتھی دانت کا تخت رکھا گیا اور اس پر کافر بالیگان بیٹھا، دوسرے سب کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بالیگان نے یوں تقریر شروع کی :-

میرے بہادر دوستو! اگر میں حکم دوں کہ بادشاہ شارل پر کھانا پناہ حرام کر دو تو ایسا ہی ہو۔ اس نے اسپین میں ہر طرف دھمکانا دہرایا رکھا ہے، میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ وہ ہار نہ مان لے یا قتل نہ ہو جائے۔ اس بات کی پوری تصدیق کرنے کے لئے اس نے اپنا سیدھا دستا نہ گھٹنے پر مارا۔

بالیگان نے پوری طرح یہ بات اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ آسمان کے نیچے جتنا سونہ ہے اس کے بدلے میں بھی دیکس جائے بغیر مالے گا نہیں، ایکس شارل کا دار السلطنت ہے، وہ دہاں اپنی کپہری جاتا ہے، بالیگان کے سب مصاحبوں نے اس کی ان باتوں پر خوب تعریف کی، بالیگان نے پھر دو مشہور سوار کلا رتیان اور کثیریان کو طلب کیا اور ان سے کہا :-

”تم دونوں بادشاہ مالیرین کے بیٹے ہو جو خوش خوش ہمارے پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کرتا تھا، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم دونوں ابھی سارا گوس جاؤ، میری طرف سے ہم سب کے پیچھے کی خبر بادشاہ مارسل کو پہونچاؤ اور اسے ہر طرح سے دم دلا سادو کہ ہم لوگ فرانسیسیوں کے خلاف اس کی مدد کو آن پہونچے ہیں، پہلا موقع ملے ہی ہم لڑائی شروع کر دیں گے، ان باتوں کی ضمانت میں بیڑ سنہرا دستا نہ تہہ کر کے اسے دو اور اسے سیدھے ہاتھ میں پہننے کو کہنا، یہ خالص سونے کی جھڑی بھی لے جاؤ، اسے اپنی بجگذا رہی کے اعتراف کے لئے بھی کہنا اور اسے یقین دلانا کہ شارل کو شک کر کے کو ہم فرانس تک میں جائے کو تیار ہیں، مگر شارل اس بات پر تیار نہیں کہ مجھ سے معافی مانگے، رحم کی درخواست کرے، میرے پاؤں پڑے اور سبھی قانون سے انکار کرے تو میں اس کے تاج اور ملک سب پر قبضہ کر لوں گا۔ یہ سب مصاحب چلا آئے، واہ واہ حضور نے کیا بات کہی ہے۔“

بالیکان۔ میرے سوار جاگیر دار اقامت میں سے ایک دستا نہ لیجائے اور دوسرا چٹری سجدہ نل سے  
 اردہ اسکی مرضی کے مطابق سب کا اردوانی کرینگے، انہوں نے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دئے اور بہت  
 دیر راگوس پہنچ گئے، دوسوں بھاگلوں سے گزر کر اردو دریا کے چاروں پہلوں کو پار کر کے وہ سیدی شکر  
 پہنچے، اسی شکر پر کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے، جب وہ خاص شہر کے قریب پہنچے تو انہیں محل کی  
 بند سے شور و غل سنائی دیا، جب وہ محل کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کافروں کی پوری نسل  
 مگر رہی ہے جسے دیکھو روئے پٹنی میں مشغول ہے، وہ اپنے خداؤں، تراد اگان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم،  
 راجپوتوں، تہرانہیج رہے تھے اور آپس میں یوں باتیں کر رہے تھے۔“

”بھئیسی! ہماری اب کیا حالت ہوگی؟ ہم پر یہ بلائیں کہاں سے نازل ہو رہی ہیں؟ ہم اپنے  
 رشاہ مارسیل کو کھو بیٹھے، رطلان کی تلوار نے کل اسکا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا، سارا اسین اب قتل کیلئے  
 کے دم پر ہے۔“

یہ باتیں سن کر دونوں ایلی اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے اور انہیں ایک نزدیک زیتون کے پٹر کے  
 قریب چھوڑ دیا، دو عرب انکی لگام پکڑے کھڑے رہے، دونوں ایلی مع اپنے لبادوں کے محل کی سب  
 سے اونچی منزل پر پہنچ گئے، جب وہ محراب دار کمرے میں داخل ہوئے لگے تو دوستانہ طریقہ پر انہوں  
 نے یہیں سلام کیا۔

”کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تراد اگان اور راجپوتوں ہمارے آقا بادشاہ مارسیل اور رانی کو ہمیشہ  
 سلامت رکھیں۔“

براہمہوند۔ میں یہ آج کیسی حماقت کی باتیں سن رہی ہوں، یہاں سے خدا جن کے تم نے ابھی نام پڑ  
 سب کچھ بچکے، سب نے ہمیں دھوکا دیا، رانسیہ و مدین انہوں نے مجھ سے دھکائی، انہوں  
 نے ہمارے سواروں کو زمین خاک و خون میں پڑا مرنے دیا اور میرے میاں کی لڑائی میں کوئی مدد نہیں  
 کی، رانسیہ یوں کے شہر کو نت رطلان نے اسکا سیدھا ہاتھ کاٹ ڈالا، اب سارا اسین قتل کیلئے  
 کی نوابی میں چلا جائیگا، تباہی میں اب کیا کروں، میں غمزدہ ہوں، بیمار ہوں، ہائے افسوس کیا کوئی مدد نہیں

جو میرا بھی خاتمہ کر دے“

کیریاں ایسی اگل پھوپھیاں نہ کرو ہم لوگ بالیگان کے ایلی ہیں، وہ مارسیل کی حمایت کا دھڑ کرتا ہے، اس نے ضمانت کے طور پر اپنا دستاں اور اپنی پھڑی بھی ہے، دریائے ایبر کے کنارے ہمارے چار ہزار بھادر جہازوں، کشتیوں اور ڈونگوں میں بڑے ہیں، ہمارا بڑا اتنا بڑا ہے کہ مجھے ٹھیک تعداد بھی یاد نہیں۔ امیر قوت والا زبردست ہے، شارل کے پیچھے وہ فرانس تک جائے بغیر نہ سننے والا نہیں۔ وہ یاقو اسے قتل کر گیا یا اپنے رحم سے اسے معاف کر دیا“

برا میونڈ۔ بھلا فرانسیسیوں کا بچھا کرنے کے لئے اتنی دو جانیں کونسی ضرورت ہو وہ یہاں سے بہت فاصلہ پر نہیں، آج سات برس سے بادشاہ شارل اس ملک میں ہے، وہ ایک مضبوط اور زبردست ہے کہ کسی لڑائی کے میدان سے منہ موڑنا نہیں جانتا، آسمان کے نیچے کوئی بادشاہ نہیں جس سے اس کو ڈر ہو، شارل دنیا میں کسی کا ڈر نہیں مانتا“

بادشاہ اریل۔ اچھا اب یہ قصہ چھوڑو (ایلیوں سے مخاطب ہو کر) تمہیں مجھ سے بات چیت کرنا پڑے تم دیکھتے ہو میں موت کے منہ میں ہوں، میرا کوئی داؤد نہیں، ایک بیٹا قہار قتل ہوا، اپنے آقا سے کہو کہ آخری وقت میں مجھے دیکھ جائیں میں امیر بالیگان کو اسپین کی زمین کے سارے حقوق دیتا ہوں میں اسے سیاہ سفید کا اختیار دیتا ہوں، لیکن اسے فرانسیسیوں کے خلاف ملک کی مدافعت کرنی پڑے گی میری ایک آرزو ہے کہ ایک بیٹے کے اندر اندر تم شارل کو قید کر لو۔ امیر بالیگان سے کہو کہ وہ بغیر کنجیوں کے سارا گوس فتح نہیں کر سکے گا، کنجیاں میرے پاس ہیں، انہیں لیجاؤ“

دونوں ایلی۔ جی حضور آپ بالکل درست فرماتے ہیں،

مارسیل۔ شارل نے مجھے، میرے آدمیوں کو اور میرے سارے ملک کو تباہ کر ڈالا، شہروں کو مجھ پر کر کے اس نے لوٹا، اس رات وہ دریائے ایبر کے کنارے خیمہ ڈالے پڑا ہے، مجھے معلوم ہے یہ جگہاں سے سات کوس سے زیادہ نہیں ہوگی، امیر سے اس طرف اپنی فوجیں لیجاو کہ وہ کوہ میلینجا پہنچے کہ اس کے لئے فوج لڑائی شروع کر دے۔

یکہر مارسل نے ساراگوس کی کنجیاں ایچیوں کے حوالے کیں، دونوں ایچی کو رشتہ سمجھائے اور رخصت ہوئے۔

دونوں نے گھوڑے سرٹ دوڑانا شروع کئے اور بہت جلد امیر بالیگان کے پاس پریشان پہنچے اور شہر ساراگوس کی کنجیاں اس کے حوالے کیں، کنجیاں لیکر بالیگان نے کہا:۔

”تم کیا کرتے؟ مارسل کہاں ہے؟ تم نے میرا پیغام پہنچا دیا؟“

کلیریان۔ مارسل کو بڑے جھک زخم لگے ہیں، بادشاہ شامل بڑے چٹکوں کے قریب سے گزر کے فرانز واپس جاتا چاہتا تھا، اس نے اپنے عقب میں اپنے بھتیجے رولان اور اولیوے اور بارہ نوابوں کو مع میں ہزار فرانسیسی فوج کے چھوڑ دیا تھا، بادشاہ مارسل نے اس عقب کی فوج سے لڑائی کی، رولان اور اس کا مقابلہ ہوا اور رولان نے اپنی دردناک سے ایسا دار کیا کہ مارسل کا سیدھا ہاتھ دھڑکے الگ ہو گیا۔ مارسل کا بیٹا بھی جس سے اسے بہت محبت تھی، رولان کے ہاتھ سے قتل ہوا، اب بڑے بڑے نواب بھی مارے گئے، مارسل جان بچا کر بھاگ آیا، شامل اس کا پیچھا کر رہا ہے، اب مارسل کی ساری امیدیں آپ کی امداد پر ہیں، وہ اسپین کی ریاست پر آپ کے حقوق تسلیم کرتا ہے۔

بالیگان نے یہ سب باتیں سنیں اور کچھ سوچنے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ غم سے پاگل ہو جاتے گا۔

کلیریان۔ حضور والا! انیسوڈ کے مقام پر کل بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، رولان اور اولیوے اور باہجوں نواب قتل ہوئے، لیکن مارسل کا بھی کوئی سپاہی باقی نہیں رہا جو فرانسیسیوں کے ہتھوں قتل نہ ہوا ہو یا دریائے ایر میں ڈوب کر نہ رہا ہو، فرانسیسی دریائے کے کنارے غیمہ زن ہیں، تو ہم سب بہت نزدیک ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں فرانس واپس جانا دیکھو اور جانیں۔

کلیریان کی باتیں سنکر بالیگان کی نظروں سے خوشی، جوش اور غرور ٹپکنے لگا، اپنے تخت پر بیٹھے کھڑے ہو کر اس نے یوں تقریر شروع کی۔

”میرے نواب اب کیا دیر ہے اپنی کشتیوں اور رزگوں سے تیار ہو کر اور کھڑے ہو جائیں۔“

لو ماریل کے ہاتھ کٹے گا بدل لینا ہے، ہاتھ کے بدلے میں ہمیں چاہئے شامل کا سر کاٹ لیں۔  
عرب کے کفار بالیگان کی یہ تقریر سن کر اپنی اپنی کشتیوں سے باہر نکل آئے اور اپنے گھوڑوں اور  
فردوں پر سوار ہو گئے، انہوں نے اپنے گھوڑے، شامل کی فوج کی طرف بڑھائے، امیر بالیگان نے  
پنے خواہش میں سے گیا آغین کو طلب کیا اور اپنی فوج کی سرداری اس کے سپرد کی۔  
بالیگان اپنے کئی گھوڑے پر سوار تھا، اس کے ہر کاب چار باجگزار نواب تھے، گھوڑے بڑھاتے ہوئے  
یہ سارا گوس برآں دھکے، بالیگان کے گھوڑے کی رکابیں چاروں نوابوں نے تھام لیں اور وہ  
نگہ مرم کی سیر بھی پر سیر رکھ کر اپنے گھوڑے سے اترا، بادشاہ ماریل کی بیوی برامیونداس سرٹنے  
کے لئے آئی اور یوں کہنے لگی:-

”جنور دالا میں بیاہ اور خوش گھڑی کی پیدائش اپنے آقا کو کوئی بیوی نہ بھی کس ذلت کی مانند۔“  
یہ لکھ کر وہ شمس سے گری جاتی تھی کہ امیر نے بڑھ کر کھڑا اور لوگ اسے ایک کمرہ کی طرف لے گئے  
بادشاہ ماریل نے امیر بالیگان کو دیکھ کر دوا بینتی خدمت گزاروں سے کہا: ”مجھے اپنے بازوؤں  
میں لیکر بٹھا دو۔“ جب بالیگان اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے اٹے ہاتھ سے دستا نہ اٹھا کر  
یوں کہا:-

”جنور دالا! میں اپنی ساری ریاست اور سارا گوس کا شہر تمہیں دیتا ہوں، میں تباہ ہو گیا  
اور میرے سب لوگ بھی تباہ ہو گئے!“

بالیگان۔ مجھے بڑا صدمہ ہے، اب اس وقت تفصیل سے گفتگو کرنے کا وقت نہیں، میں  
جانتا ہوں شامل میرا بالکل منتظر ہو گا، اس لئے اس حالت میں خود اس پر حملہ کر دینا چاہئے، میں  
آپ کے اس دستا نہ کو لئے لیتا ہوں۔“

وہ درجہ محل کی میز پر سے اترا، گھوڑے پر سوار ہو، مہینہ لگا تا آن کی آن میں اپنی  
پاؤں میں دھکیں آگیا۔

یہ ساری باتیں سن کر ماریل نے کہا کہ حضرت عبرت لیں، ہاتھ سے اسے رانیہ کی

طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ بھگیا کہ حضرت جبریلؑ فرامیسی شہید دل کی لاشوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔  
 معاً اپنی سپاہ کے تیار ہو رہا سیود و روانہ ہو گیا، وہاں اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھ کر اس کو مضرب  
 نہ ہو سکا اور وہاں مارا کر رونے لگا۔ اور اپنے آدمیوں سے یوں مخاطب ہوا:-

”ساتھیو! میں اپنے بھتیجے رولان کی لاش کو دھو بیٹے تمہارے ساتھ چلتا ہوں، مجھے یا  
 ہے جب ایک دفعہ ایکس میں میرے سب سردارانہ اپنی ہموں کے قصے بڑے گمنام سے بیان  
 کر رہے تھے، میں نے رولان کو کہتے سنا ہے کہ جب کبھی وہ دشمنوں کے زمرے میں مرا تو اس کی لاش  
 اپنے ساتھیوں میں دشمن کی طرف سب سے آگے پڑی ہی پائی جائیگی اور اس کا چہرہ دشمن کے ملک  
 کی طرف ہوگا۔

آگے بڑھ کر ایک مٹی کے ڈھیر کے قریب اس نے دیکھا کہ جھاڑیوں کے سارے پھول فرا  
 شہیدوں کے خون سے رنگین ہو رہے تھے، انہیں جھاڑیوں میں اس نے رولان کی لاش پہچانی  
 کچھ تعجب نہیں اگر شارل یہ منظر دیکھ کر رنج سے کپکپا اٹھا، وہ لاش کے قریب گیا اسے اٹھا کر اپنے دونوں  
 ہاتھوں میں رکھ لیا اور صدمہ کی وجہ سے غش کھا کر گر پڑا۔

جب شارل کو ہوش آیا تو ڈیوک، ٹائم اور کونٹ اسٹیلون، جافری والسی انجو اور اس  
 بھائی ہنری اسے ایک چہرہ کے درخت کے نزدیک لے گئے، اس نے آنکھیں کھولیں اور رولان  
 لاش کو خاک و خون میں پھرا ہوا دیکھا، رولان کی لاش سے حسن و مردانگی ٹپک رہی تھی، اس کی آنکھ  
 پٹ گئی تھیں اور ان پر سیاہی آگئی تھی، شارل لاش کو دیکھ کر یوں مخاطب ہوا،

”پیارے رولان! خدا تیری روح کو بہشت کے پھولوں میں جگہ دے، اب تیرے بعد کوئی  
 نہیں جو دور دراز ملک کی لڑائیاں جیتے، میری ساری عزت و دولت سے بدل گئی، اب سپر  
 آیا کوئی ایسا دل نہ ہوگا کہ میں تیرے مرنے کا ماتم نہ کر دوں، میری ساری قوت اور جوش اب تم ہو  
 آسمان کے تلے اب میرا ایک دوست نہیں۔“

پیارے رولان! جب میں لادین پونچوں گا تو دوسرے ملکوں سے میرے بھائی راکٹر

نہر امان پوچھیں گئے، کوئی دن ایسا نہ ہو گا کہ میں تیرے لئے روؤں نہ اور تم نہ کروں۔  
 ”ارے میرے سورا! میرے حسین جوان! میں اکیس ہونچکیر جب اپنے باجگزاروں کو تیرے  
 یکی ناقابل یقین خبر سنا دنگا تو انہیں تعجب ہو گا، میں کہوں گا کہ میرا بھتیجا مر گیا، پوچھ جس نے میرے لئے  
 اری زمینیں فتح کیں، باغی سکنوں، جگر واد اور بگاریوں کا سر کچلا، وہ مر گیا۔ وہ جس نے رومن پوٹی  
 الوں، پالرن والوں اور افریقہ والوں کو نیچا دکھایا وہ مر گیا۔ اب ان باغیوں کے خلاف کون ٹٹری  
 ریگا۔ ہائے فرانس! تو کس نام میں مبتلا ہو گیا، میرا بیچ ایسا ہے کہ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں  
 راجھا ہے، شارل کی یہ حالت دیکھ کر ایک لاکھ فرانسسیوں کو غش آگیا۔

پیارے رولان! تیری روح کو خدا بہشت کے پھولوں میں جگہ دے، جس نے تجھے قتل کیا اس  
 نے مارے فرانس کو نام اور مصیبت میں مبتلا کیا، ہائے میرے سواروں نے میرے لئے اپنی  
 جانیں دیں، خدا اور مریم کا بیٹا میری حالت پر رحم کرے، پیشتر اسکے کہ میں ستر کے بڑے پچھکوں تک  
 ہونچوں، میری روح تن سے جدا ہو کر ان پاک روحوں میں مل جائے تو بہت اچھا ہو۔  
 یہ حالت دیکھ کر ڈیوک نام بولا، ”شارل کو بہت صدمہ ہو۔“

باغری والی انجو، حضور والا! اس بیچ سے اس قدر متاثر ہو جائے، یہیں چاہئے کہ یہاں جیتوں  
 میں ہمارے جتنے آدمی پڑے ہوئے ہیں انہیں ایک خندق میں پہلے دفن کر لیں،  
 شارل۔ اچھا، سپاہیوں کو حکم دو کہ ایسا ہی کریں،

باغری والی انجو کے حکم سے سب سپاہی گھوڑوں سے اتر پڑے اور اپنے شہیدوں کی لاشوں  
 کو اٹھا کر ایک خندق میں رکھنے لگے، فوج میں جتنے پادری، راہب اور سرمنڈے زیادہ تھے وہ ان  
 سب کی خضر شکی جہانیں مانگے اور خوشبوئیں لگا کر دفن کرنے میں مشغول ہو گئے۔

شاہی لشکر کے کمانڈر رولان، اور اولیوئے اور جہا پادری تریان کو ایک ہی کفن میں لپیٹ کر دفن  
 کیا جائے، اس نے پھر ایک مرتبہ اپنے بھتیجے کی لاش کو دیکھا اور ریشم کے کفن میں رکھوا کر دفن کرایا،  
 ان تینوں کی قبر پر سنگ مرمر، مقبرہ تعمیر کیا گیا۔



اس کے بعد تینوں نوابوں کی مراثیوں کو جو مشہور لکھنؤ اور شراب سے پہلا کر بارہ شے کی کمال  
میں رکھوایا اور حکم دیا کہ تیمال، گینوا، آن اور کوت ملون ان تینوں جوازوں کو گاڑیوں پر رکھوا کر،  
برشم کی چادروں میں لپیٹ کر ساتھ لے چلیں۔



(۱) لاش کو شراب سے نہلائی کہ دم آج کل فرانس میں کہیں نہیں پائی جاتی، مگر جو دسویں گیارہویں صدی عیسوی  
جرمنوں میں جب وہ فرانس میں آکر آباد ہوئے ہیں اس قسم کی کوئی رسم فرانس کی انگوری شراب کی قدردانی اور بعد  
استرام کے لئے موجود ہو، یہ تو آج بھی ہے کہ فرانسیسی شراب کی قدردانی خود فرانسیسیوں سے زیادہ امریکن، جرمن  
انگریز کرتے ہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ سپریم کی سڑکوں پر بہت آدردہ گردی کر نوابوں کے احباب و شمار میں معتد  
حصہ فرانسیسیوں کا نہیں بلکہ غیر ملکیوں کا ہے جن میں انگریز، امریکن اور جرمن اکثریت کا نمونہ کئے ہیں۔  
(۲) معلوم نہیں اکی کیا ہے کہ شارل نے ملان، اویسے اور تران کو میں بھی کیا امدادیں دیں تو ان کی مراثیوں کو بھرا  
لے گیا۔

# آیتوں میطوی اراج

مصنفہ انیٹن جیونف

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں، بی۔ اے۔ کیمبرج، سابق متعلم جامعہ

شام کا وقت ہے، پانچ اور چھ بجے کے درمیان، اور ایک مشہور علامہ۔ جو اس کہانی میں محض علامہ ہی کہلائے گا۔ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا ہے چین ہو کر اپنے ناخن دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔

اور اپنی گھڑی پر بار بار نظر کر کے کہتا ہے ”سخت کمینہ حرکت ہے یہ! اور دوسرے شخص کے وقت اور کام کی طرف سے بے اتہالا پروانی اس سے ظاہر ہوتی ہے، انگلستان میں ایسا شخص ایک دہری نہ کہلے، بھوکا مر جائے، تم آتو لو، میں تم لوں گا تم سے“

اپنی بے صبری اور غصہ کی پائیس وہ کسی نہ کسی پر بھجانا چاہتا ہے، اور اپنی بیوی کے کمرے کے دروازہ پر دستک دے کر اس کو بلاتا ہے، اور غیظ و غضب میں کہتا ہے۔

”دیکھتیا، دیکھو، ڈان لچ سے طو تواس سے کہہ دو کہ یہ دستور شریف لوگوں کا نہیں، یہ بے حد قابل نفرت ہے۔ وہ مجھ سے معاف کر آئے کہ اس لڑکے کو اپنا منشی بنالوں، اور یہ دیکھتا ہوں کہ مجھے شخص کی عیادت کر رہا ہے، بلا ناغہ یہ لڑکا روزانہ تین گھنٹے دیر کر کے آتا ہے، ایسے شخص کو کیا تم منشی کہتی ہو؟ میرے لئے وہ دو تین گھنٹے اور دوں گے دو تین سالوں کے برابر ہیں، آج آئے تو گتوں کی طرح اس سے بات کروں گا، ایک دہری اُسے نہیں دوں گا، رخصت کرو دوں گا اُسے،

بیوی۔ ”تم نہ دیکھتی ہو کہتے ہو“ اور وہ دہری دے دے کا دیبا آتا رہتا ہے۔“

علامہ: ”آج میں نے یہ سب سنا ہے اور اس کے بارے میں کافی قصص اور افسانے سنا ہیں، اس کی جبروت میں عجیب اور کمال ہے۔“

گھنٹی بجتی ہے، علامہ کا چہرہ ممانت کی تصویر بن جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سمیت ساٹھ ٹیڑی کی طرف جاتا ہے، وہاں اسکا منشی آئینوں میں طوی اچ ایک المارہ سالہ نوجوان بیضاوی چہرہ مونچہ دار صحت، ایک گدلا سا کوٹ پہنے کھڑا ہے، ہیٹ مینڈر ایک پہنچ چکا ہے، گولائش اس کے جوتوں پر نہیں ہیں، جلدی کی وجہ سے وہ بیدم ہو رہا ہے، اور ہیٹ اٹھا سے وہ ڈور میٹ پر اپنے بوٹ پونچتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے بوٹ کے ایک سوراخ کو جس میں ایک سفید جراب دکھلائی دے رہی ہے، ماما سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے علامہ کو دیکھ کر ایک دیر یا گرا عقانہ سا تبسم اس کے ہونٹوں پر آ جاتا ہے، ایک ایسا تبسم جو کہ محض بچوں یا بید خوش خزان لوگوں کے چہرہ پر ہی پڑ دکھلائی دیا کرتا ہے، سلام کہتا ہوا، اور اپنا مینہ سے تر ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتا ہوا، آئینوں پوچھتا ہے، "آپ کے گلے کی خرابی تو رفع ہو گئی؟"

غصہ سے کانپتا ہوا، اور ایک دو قدم پیچھے ہٹتا ہوا علامہ ہاتھ لیل کے پکارتا ہے "آئینہ آئینوں" پھر جلدی سے اس کے شانے پکڑ کے اور آہستہ سے اسے سمجھوڑ کے یا س بھری آواز میں کہتا ہے،

"آئینوں تم یہ کیا کرتے ہو بے سمجھ شخص، تم نے یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے، کیا تم مجھ پر مس رہے ہو؟ ہیں؟"

تبسم کے ان آثار سے جوابی ٹک آئینوں کے چہرہ میں باقی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اور تبسم کے استقبال کی توقع تھی، اور علامہ کے چہرہ کو دیکھ کر جو تبسم و غصہ کی اس وقت بولی تھا ہے، آئینوں معمول سے زیادہ بیضاوی چہرہ سے جواب دیتا ہے۔ "آپ ک، کیا فرماتے ہیں؟"

علامہ پھر ہاتھ لیل کے جواب دیتا ہے، "دعا تھا تم یہ بھی پوچھتے ہو، تم جانتے ہو کہ وقت علامہ گولائش جوتوں کے اوپر پہنے جاتے ہیں، تاکہ جو تے کیڑ و میوہ سے اکوڑ نہ پہنیں۔"

نے کتنا قیمتی ہے اور تم اتنی دیکر کر کے آئے ہو، تم دو گھنٹے لیٹ ہو۔ . . . . کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟  
 آئیون اپنا گلو بند کھولتا ہوا دھیمی دھیمی آواز میں جواب دیتا ہے ”جناب، میں سیدھا گھر سے  
 نہیں آ رہا، میری مچھی کے روز تسمیہ کا جلسہ تھا۔ . . . اور میری مچھی کا گھر یہاں سے پانچ میل ہے  
 البتہ اگر میں سیدھا گھر سے آتا تو دوسری بات تھی۔“

علامہ ”آئیون، ذرا سوچو، تمہاری باتوں میں قتل کس حد تک ہو، تمہیں یہاں کام کرنا ہوتا ہے، اور  
 کام لمبی وقت معینہ پر، اور تم ہو کہ تسمیہ کی تقریبوں اور چوپیں کی طرف بھاگتے پھرتے ہو، جلدی کرو اب  
 اور اپنا گلو بند کھولو، میری قوت برداشت انتہا کو پہنچ رہی ہے۔“

علامہ بھاگ کے اس کی طرف جاتا ہے اور اسے گلو بند کھولنے میں مدد دیتا ہے

علامہ ”تم تو کان عورتوں کی طرح پلٹے ہوئے ہو۔ . . . . آداب۔ . . . . جلدی کرو۔“

ایک گندے اور حبیب میں بے ترتیبی سے رکے جانیکے باعث بہت جگہ ہوتے ہوئے بڑال  
 میں ناک صاف کر کے اور اپنا خاکی رنگ کا دوسرے سینے والا کوٹ نیچے کھینچتا اور ڈیوڑھی اور گول کمر  
 سے ہوتا ہوا، آئیون کمرہ مطالعہ میں جاتا ہے، وہاں پر جگہ، کاغذ، اور سگریٹ اس کے لئے پہلے  
 ہی سے تیار ہیں۔“

علامہ بے صبری میں ہاتھ ملتا ہوا، اسے جلدی سے بیٹھ جانے کو کہتا ہے ”تم ناقابل برداشت  
 ہو، تم جانتے ہو کہ وقت معینہ پر کام ختم کرنا ہے، اور پھر مچھی تم دیر سے آتے ہو، مجبوری سے تم پر ناراض ہوا  
 پڑتا ہے۔ . . . . آداب لکھو۔ . . . . ہم نے ختم کہاں کیا تھا؟“

آئیون اپنے چہرے پر چھوٹے بالوں کو جو کھڑے ہو رہے ہیں ہاتھ سے سنوارتا ہے، اور قلم اٹھالتا  
 ہے، علامہ کمرے میں ادھر ادھر ٹپکتا ہے، توجہ سی سوچنے لگتا ہے، اور لکھنا شروع کر دیتا ہے،  
 ”حقیقت یہ ہے۔ . . . . کا۔ . . . . کہ بنیادی۔ . . . . صورتوں۔ . . . . لکھ چکے ہو۔ . . . . کا انحصار

ملاحظہ فرمائیے کہ علامہ لکھتا ہے، کس دن کی تقریب بھی روز تسمیہ میں سال بال سنائی جاتی ہے، اس  
 روز تسمیہ کی ہے۔“

... ان ہیوں کی ہیت پر ہوتا ہے ... کا ... جو کہ ... ان مکتول میں ظاہر ہوتے ہیں ... اور علی جامہ پہنتے ہیں ... نہی مطر ... یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی مکتول کی خصوصیت کا ان پر اثر ہوتا ہے ... بچے الفاظ آئے کاسوں میں ... ہیں ؟ ہیں ؟ وہ بانی سکول کی باعث تم کب کہنا چاہتے تھے ؟

آئیون : ” میں کہ میرے وقت میں سکول کا عروج لباس اور تھا “  
 علامہ : ” ہوں ... تمہیں سکول چھوڑے کتنا عرصہ ہوا ہے ؟ “  
 آئیون : ” یہ تو میں نے کل ہی آپ کو بتلایا تھا ... مجھے سکول چھوڑے تین سال ہوئے ہیں میں اس وقت بانی اسکول کی چوتھی جماعت میں تھا “  
 علامہ آئیون کی تحسیر کی طرف دیکھتا ہوا پوچھتا ہے ” تم نے بانی سکول کیوں چھوڑا ؟ “  
 آئیون : ” خانگی معاملات کچھ ایسے ہو گئے تھے “

علامہ : ” آئیون ، میں تمہیں کتنی مزید کہوں تم کب سطرول کو اس قدر بھلا دینے کی عادت سے باز آؤ کسی سطر میں بی چائیس سے کم حرف نہیں ہونے چاہئیں “  
 آئیون : ” (وقفہ میں) ” کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہوں ، دوسری بعض سطرول پر چائیس سے زیادہ حرف بھی ہیں ، گن کے دیکھ لیجئے ... اور اگر آپ سمجھتے ہوں کہ میں سطرول میں کافاظ نہیں لکھتا ، تو میری تنخواہ سے کچھ کاٹ لیجئے ،

علامہ : ” نہیں نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں تھا ... تم میں نفاست بالکل ہے نہیں ... ذرا نہیں ... اے اور تم روپیہ کا سوال کچھ لگاتے ہو ، ضروری چیز تو صحت ہے ، آئیون صحت ، تحریر کی صحت ، ماہیچانے کا خوان لاتی ہے جس پر دوپائے کے گلاس دھرے ہیں ، اور ایک مشائی کو آئیون بہت بھروسہ انداز سے اپنا گلاس اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے اور فوراً اسے بیٹا شرمجہا ہے ، پائے تخت گرم ہے اپنے منہ کو بل جانے سے بچانے کے خیال سے آئیون چھوٹا سا گھونٹ ہے ، پھر مشائی کا ایک ٹکڑا کھاتا ہے ، پھر دوسرا ، پھر تیسرا ، پھر ذرا شرمندہ ہو کر ...

دیکھتا ہوا چہرے کھڑے کھڑے اپنا ماتہ بڑا آتا ہے۔ . . . . . بچتے وقت جو آواز اس کے منہ سے نکلتی ہے جس لحظ سے وہ اپنے ہونٹ چاٹتا ہے، اور بھوکا اور لالچی ہونیکے جو آواز اس کے چہرے سے ظاہر ہیں علامہ کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ ”جلدی جلدی ختم کرو، وقت بہت قیمتی ہے، آئیون یہ آپ کھلتے جانے، میں دونوں کام ساتھ ساتھ کر سکتا ہوں، . . . . . مجھے ذرا بھوک زیادہ لگ رہی ہے

علامہ ”تھارے اتنا پیدل چلنے کے بعد بھوک نہ لگتی تو اور کیا ہوتا“  
آئیون یہ جی ہاں، اور دیکھئے موسم بھی تو کتنا برا ہے، . . . ہمارے صوبہ میں تو اب تک بہار بھی پکی ہوئی اور برف پگل پگل کر چھوٹے چھوٹے ٹالے بنے ہوئے ہونگے۔  
علامہ ”تم جنوبی علاقہ کے رہنے والے ہو؟“

آئیون یہ میں ڈان کے خطہ کا رہنے والا ہوں۔ . . ہمارے ہاں تو پائچ ہوتے تک پورا بہار کا موسم ہوتا ہے، یہاں یہ اس قدر کڑھ ہے، ہر وقت دھندلا سماں رہتا ہے۔ . . وہاں تو اب تک گھاس اگ آتی ہے۔ . . تقریباً تیسریا ہر جگہ خشک ہوتی ہے اور چاہئے تو کھڑے کو کھڑیاں بھی ہوتی ہیں۔“

علامہ ”کھڑیاں تم کیوں کھڑتے ہو؟“  
آئیون۔ (آہ بھر کر) ”یہ نہیں، ایک مشعلہ سمجھ کے۔ . . اچھے کھڑے میں مزا آتا ہے، ایک تانگے کے ایک طرف لاسا لگاتے ہیں، اس سے کھڑی کوشت پر آہستہ آہستہ اترتے ہیں، کھڑی غصہ میں اگر اپنے پنجوں سے آسے کھڑ لیتی ہے، اور اس سے چٹ جاتی ہے، . . . ہم تو نوکر ابھر کھڑیاں کپڑے ان میں ایک بھونرا ڈال دیتے تھے۔“

علامہ ”بھونرا کیا چیز ہوتی ہے؟“  
آئیون ”وہ ایک قسم کی کھڑی ہوتی ہے، جو عام کھڑیوں سے قدرے مٹی جلتی ہی ہے۔“

علامہ میں سے کچھ کم سطریں لکھوا آئے اور پھر خیال میں غرق کچھ دیر بیٹھا رہتا ہے، جب تک علامہ خیال میں متغرق ہے، آئیون اپنی گردن اونچی اٹھا آئے اور اپنی قمیص کا کارٹیک کر ٹکی کو شش کرتا ہے، اس کی کٹائی ٹیک طور سے بیٹھی نہیں، سڈ بائرنکل آیا ہے، اور کارل بار بار اٹھنے لگتا ہے، علامہ: ہوں تو آئیون، کیا تمہیں باجی تک کوئی لازمت نہیں ملی۔

آئیون: نہیں صاحب ملے کیے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ فوج میں وائٹیر ہو جاؤں، البتہ میرے ابا کا یہ بشار ہے کہ میں کسی ہنپاری کے یہاں لازم ہو جاؤں۔

علامہ: ہوں... لیکن تمہارے لئے تو کالج میں داخل ہونا بہتر ہوگا، امتحان تو مشکل ہے، لیکن محنت اور استقلال سے کام کرو تو کامیاب ہو جاؤ، مطالعہ کیا کرو اور پڑھا کرو... تم کافی کتب بینی کرتے ہو یا نہیں؟

آئیون: (مگرٹ جلاتے ہوئے) نہیں صاحب، یہ تو مجھے افسوس سے ماننا پڑتا ہے۔  
علامہ: تم نے ٹورگنیف TURGENEV پڑھا ہے۔

آئیون: ن، نہیں

علامہ: اور گوگول GOGOL؟

آئیون: گوگول، ہاں... گوگول... نہیں میں ملے اُسے بھی نہیں پڑھا۔

علامہ: ہیں آئیون؟ تمہیں شرم نہیں آتی، تم ایسے اچھے آدمی ہو تم میں استعداد بھی ہے... اور تم نے گوگول نہیں پڑا، تمہیں گوگول ضرور پڑھنا چاہئے، اس کی کتابیں تم مجھ سے لو، اسکا پر محنت نہایت ضروری ہے... اگر تم نے نہ پڑھا تو بلادی قہاری لڑائی ہوگی۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہتی ہے علامہ خور کرنے لگتا ہے۔ اور ایک نرم نرم سونے پادھا لیا آدھا بیٹھا ہوا ہے، آئیون لمبے لمبے اپنے کار سے توجہ ہٹا کے اُسے بائیں اپنے بوتل کی طرف مہذول کر لیتا ہے، اُس نے بھی تک نہیں دیکھا کہ برف نے جو اس کے پاؤں کے تھروں سے گھلتی رہی ہے قالین پر دو برسے برسے داغ بنا دیے ہیں، اس کو شرم آنے لگی ہے،

علامہ - (دینی دینی آواز میں) بھائی آئیون آج تو مجھ سے کام نہیں ہونی کا۔ کل صبح آجانیو، لیکن پورے  
نوبے، خدا تمہیں دیر سے آنے سے محفوظ رکھے۔

آئیون اپنا قلم رکھ دیتا ہے، میز کے پاس سے اٹھ جاتا ہے، اور ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے، پانچ  
مت خاموشی میں گزرتے ہیں، اور آئیون کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے جانے کا وقت آگیا  
لیکن علامہ کا کمرہ ایسا پر لطف اور گرم ہے، اور چائے اور مٹھائی کے مزے کی یاد اس کے دل میں استعد  
تازہ کہ گھر کا خیال آنے سے لمبی اس کے دل میں ایک درد سا اٹھنے لگتا ہے، مگر میں ابلاس بھوک، سردی،  
ایک دائمی الاماض باپ، اور اس کی خبر کیوں کے سوا کچھ بھی نہیں، یہاں وقت ایسے مزے میں گزرتا  
ہے اور اس کے پرندوں اور اس کی کڑیوں تک میں بھی دلچسپی لجاتی ہے۔  
علامہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور ایک کتاب اٹھا لیتا ہے۔

آئیون - (اٹھتے ہوئے) تو پھر آپ مجھے گو گول دیں گے؟

علامہ - ہاں ہاں آئیون لیکن سنریزی تم اتنی جلدی میں کیوں ہو آؤ اور مجھے اور کچھ باتیں سناؤ  
آئیون بیٹھ جاتا ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم نمودار ہو جاتا ہے، تھریا ہر شام وہ  
اس کمرہ مطالعہ میں بیٹھتا ہے، اور اس کو اس کمرہ کا سال کچھ عجیب طور پر رزم معلوم ہوتا ہے جو اس  
کے لئے ایک خاص کشش سے بھرا ہے اور علامہ کی نگاہوں اور اس کی آواز سے مشابہ ہے، بعض لمحہ  
اپنے بھی آتے ہیں کہ اس کو خیال ہونے لگتا ہے کہ علامہ اس سے انوس ہو رہا ہے اور اس کا بہ  
مشاق ہے، اور اس کے دیر سے آنے پر جو اس پر ڈانٹ پرتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ علامہ کمرہ  
اور ڈال کی چیلیوں کی بابت اس کی سرگزشتوں کا منتظر ہوتا ہے۔



# ٹالسٹے کے عشقیہ خطوط

بنام ولیریا آرسنیف

(۱۸۵۶ء - ۱۸۵۷ء)

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں بنی، اے کیمبرج باقی متعلم جا

خط نمبر ۱

۲۲ اگست ۱۸۵۶ء

خواتین سوڈا کو ف

تمہارا نامہ میری مجھے ابھی ملا ہے، پہلے خط میں میں واضح کر چکا ہوں کہ میں کیوں تمہارے ساتھ  
خط و کتابت کرنے پر آمادہ ہوا اب میں لکھ تو رہا ہوں، لیکن اس سے بالکل مختلف دلی کیفیت میں ہے  
میں نے پہلا خط لکھا تھا، اس وقت میں مد سے زیادہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس محبت کو روکنے کی  
کوشش کروں جو وہ کہ میرے دل میں آتی تھی، اب میں اس نفرت کو روکنے کی کوشش کر رہا ہوں  
جو اس خط نے میرے دل میں پیدا کر دی ہے جو تم نے میری بچی کو لکھا، اور نفرت ہی نہیں بلکہ رنج اور  
اپہوشی بھی، یہ قاعدہ جو "نظری کو نظر کی سے باہر پھینکو، وہ دروازہ سے موجود ہوگا" کیا سچ ہے؟  
نہروں کی خوبصورت پوشاکیں، اور ایڈی کاٹک جیشہ کے لئے تمہارا منتہائے سرت پرہے ہیں  
یہ سخت نظم اور بے انصافی ہے، تم نے کیوں یہ بات لکھی؟ تمہیں مجھ سے پوری پوری واقفیت تھی،  
یہ بھی تم کا کہ مجھے یہ بات کس قدر ناگوار گزرے گی، کیا یہ میری بچی کو مرعوب کرنے کے لئے لکھا گیا ہے؟  
یقیناً کوئی شخص کو یہ کہنے کا کہ میں کیا ہوں سب سے بڑا ظالم ہے، اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ  
"میں یہ ہوں" اول تو اگر تم ان چیزوں کا ذکر کرو جو تمہارے دل میں تھیں تو یہ یاد رکھو کہ

بہنے دیکھا میں اس سے زیادہ تمہاری عزت کرینگے مگر تمہارے اپنی تعریف آپ کرنے سے اور دلوں میں تمہارا خیال بھی زیادہ رکھیں گے، دوسرے اگر کوئی اور شخص انکا ذکر کرے تو لوگوں کی نظروں میں تم میں ایک کی خوبی پیدا ہو جاتی ہے، یہی چاہا انسان کا شاعر یا فلسفہ دان جو لوگوں کے دلوں میں اس کی اتنی وقعت نہیں پیدا کر سکتی کہ معاملات میں سوچ بچار یکم کششی نمونے کی توجہ خوبصورت پوشاک میں حد سے زیادہ بری معلوم نہ ہوتی ہوگی، اور عقین مانو کہ اپنے سفری لباس میں کرڈوں درجہ بہتر۔

یہ بات دیانت سے دُور ہے کہ انسان اعلیٰ سوسائٹی سے محبت رکھے اور انسان سے نہ رکھے اس میں خطرہ بھی بہت ہے۔ کیونکہ ناکارہ لوگ اعلیٰ سوسائٹی میں دوسری سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ پائے جائیں گے اور تمہارے لئے اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ تم خود اعلیٰ سوسائٹی کی نہیں ہو، اور تمہارے تعلقات جس کی بنا ایک خوبصورت چہرہ اور صرخ کششی نمونے کی ایک پوشاک ہوگی، اندوختہ گوارا ہی ہو سکتے ہیں، اور نہ ان سے تم اپنی شان قائم رکھ سکتی ہو، رہا سوال یاڈی کانگوں کا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی پوری پوری تعداد چالیس کے قریب ہے، اور میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ان میں سے صرف دو ایسے ہیں جو بڑے درجے کے بد معاش نہیں، اس لئے اس بات سے بھی کوئی اتنی بڑی سرت نہیں ہو سکتی جیسے کہ کس قدر خوشی ہے کہ تمہارے کششی نمونے کے لباس میں پریڈر فیکٹینس پگتیس، وہ گرم نام نواب جس نے تمہیں بچا یا کس قدر بیوقوف ہوگا، اگر اس کی بجائے ہوتا، تو میں بڑی خوشی سے جوم میں شامل ہو جاتا، اور کششی کو سفید لباس کے اوپر کھیلتا، میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ تم یقیناً کسی سخت خطرہ کی حالت میں نہیں تھیں، یہ بات محض بکوک ہی میں تمی جس کی کہانی تم نے نہیں پڑھی ہے کہ وہ ایک پریڈر فیکٹسریا کپل ڈالا گیا، لیکن یہ کہ ایک نوجوان خاتون جو کہ تاجپوشی کے موقع پر موسیقی کا لطف اٹھانے آئی ہے پر بڑی ایسی خوشگوار اور مصحوانہ دل لگی میں کھلی جائے، میں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا اور اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ ہوا ہو۔ ہمارے علاقہ میں اب موسم بہت اچھا ہے، اور آج میں چھپے چھپے آٹھ بجے شام تک شکار میں پھرتا رہا اور مجھے اس میں ایسی سرت حاصل

ہوئی جیسی دیکھی وزیر اعظم کو حاصل ہو سکتی ہے، نہ کسی نوجوان قانون گوہر کے گلکاری کی پوشاک پہ  
 ہو، اس لئے گوہر میں اسکو آنے کے لئے قیاب ہوں کہ تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر اپنی طبیعت کو غصہ  
 وجہ سے بے قابو کروں، لیکن میں نہ آؤں گا۔ اور تمہیں ہر قسم کی جتنی پرواز خوشیوں اور نائے کام  
 نتیجوں کی دعا دیتا ہوں میں ہوں تمہارا سب سے بڑا اور سب سے ناخوشگوار خادم  
 کاؤنٹ لٹوٹالٹے

”نیا زندان جذبات کے ساتھ مجھے افسوس ہے کہ میں یہ اعلیٰ درجہ کی اصطلاح جس پر  
 قدر قدرت اور لطافت پر کھنسا بھول گیا نہیں، مذاق پس پشت، اگر تم اس خط لکھنے کے باوجود  
 کر دو تو تم بہت اچھی ہو، مس درجانی، میری سفارش کرو“

# غزل

از لسان الثوم مولانا علی نقی صاحب مثنوی مجلسہ اعلیٰ

گر دہم بر دل نشست آواز پائے برنحاست  
از لب شوریدگانِ غم نوائے برنحاست  
عشق را زینک درو آشنائے برنحاست  
عرصہ میخانہ را ناما ز کم پر شور و شہر است  
کے تو اں ز دو کام در راہ محبت بے خطر  
از درون سینہ صد پیکانِ نشت و نالہ  
چار باغ طبع را تصریت کز بام و درش  
طغیانِ آشوبِ دل نور چشمِ افتاد و باز  
نے سرے دارِ ہمدوش و نہ تے در پرین  
آں سچِ محبت کو خیمے بر مرادِ منِ نخواست  
چوں من میکن ز کوشش بے نوائے برنحاست  
دربارے مغفرت دست دوائے برنحاست

قلب محزون و دلفریبِ ہر ماں غل شد مثنوی  
کار دل نے رفتہ و باگ درائے برنحاست



# غزل

از مصوٰفحات باشتین میر و غالب میرزا غالب لکھنؤ

کیوں کوئی آئے اس طرف سایہ نہیں	حیرت اہل آرزو شک ہے بلکہ درختیں
درد تو میرے دلیں ہے ہاتھیں پاؤں انہیں	بجبری جو ہے آدھرا اس لئے کچھ خبر نہیں
محرم عشق ہوں تو خیر قلب حریف نہ چھوڑنا	آئے ہوا بوجہ یاد کیوں لہو چہرہ گز نہیں
جلد کا سوراخ مہم ہے اب کو کوئی اثر نہیں	تو تو ہی جل کہ شمع دل شمرے لئے بحر نہیں
صحیح اول سے جذب ہو سخن میں عشق سو سوا	میں تو بلکہ ہر کھو گیا آپ ہیں جوادہر نہیں
منکر محبت دلی کاشیں کہیں سے دیکھ لے	راہ ہے اور ہے قدم ایک ہی ہم سفر نہیں
غیمہ گل کو دیکھ کر ہاتھ بڑا کے رہ گئے	خانہ غیر ہے یہ دہر کوئی ہمارا نہیں
طبل شب فراق بس میں نمودار ہو چلا	ماؤں نے اٹھ کے دور دورہ دیکھ لیا نہیں
تیرہ سوائے دہر میں قیادہ نیست لاش گپ	ایک طرف تو دل ہمیں ایک طرف جگر نہیں
زودوی سے کیا غرض جینے کا اعتراض ہو	عالمی دید ہے جو شے ہر کونئی نظر نہیں
دو جگہوں پہ ہر گزری رکھتے تو تلیہ دھوپ	اڑ گئے ہلکے بات میں ایک ہی نگاہ نہیں
بزم میں ہے مری طلب وہ بھی سوز و غم کی	دھوم دھم تو ہم جہاں حیف کہ میں ادھر نہیں
رو کا نام نہ کیا دل جو مرا نسبت	اے کو موت آگئی اد کوئی نوہ گز نہیں

زندگی جفا و ظلم تھی مری زندگی کے ساتھ  
 وہ نہیں خیر میں تو ہوں نذر مصائب و فراق  
 میں نہ ہسی نگہ ہسی جانے دے پابان اسے  
 چھٹ گئے ساکن لمحہ محنت و اندھا دے  
 خانہ قبر میں تیرا دل سے رہیں لطف ہوں  
 اب کہاں وقت از من آؤ مجھے ملے اعلیٰ  
 ایک ہی کاہ و آن ہے قافلہ سرشت کہ غم  
 باز دے آج میں تیرے دل کی عزت پر بار ہیں  
 رعب جالی نے قطعہ میر سکوت اہل دہر  
 مرنے کے بعد کیا ہوا پھر مجھے کچھ خبر نہیں  
 تالہ واک دہر میں بے اثر نہیں  
 بزم میں ہے زمانہ بھرا ایک مری نظر نہیں  
 روئے کوئی اثر نہیں کوئی ہنسے خبر نہیں  
 میرے لئے کھلا ہو جو ایسا تو کوئی در نہیں  
 حشر اسی کا نام ہے میرا تمہارا گھر نہیں  
 دل کا سوائے عشق دوست کوئی بھی راہ نہیں  
 قید میں ہوں تو کاٹ دو حاجت بال و پیر نہیں  
 در نہ جہاں میں کون ہے حکو مری خبر نہیں

نقاب اس انجن میں تو ہر زہ سہا ہوا تو کیوں  
 جگہ بجز کمال غیب تجو میں کوئی مہر نہیں

# غزل

از تراوش ملک مانظ محمد علی صاحب قاری دیل غازی پور

اے خوش آن شبہا کہ سر آستانے داشت  
اے خوش آن شبہا کہ در بر جان چائے داشت  
یاو اماں عہد کان بستی بھر بندہ  
اور نازار سرگرایہا بمن میداشت من  
بود از دقن کہ آنایم بہ یزم خاص او  
سکنم صحرائے سودا و جنوں آمد کنوں  
و رنج و جور یا من اگر مست از بود  
جان و دل و دادم لبش را در بہانے بوسہ  
سرد تو اے فاختہ دیدی گزشتہ پاگل  
چوں خدکش در دل آمد جان ز دل گشتہ بدر  
فاطم گوید دو عالم چوں بجنتے زان من  
حرف حریف از یاد من شد چوں دیدم پیش او  
لال شد از رب و دواب شہر یار ملک حسن  
بخت بدیر دل کشید انداخت در ویرانہ

کار با فریاد و آہ فغانے داشت  
طالع فرخندہ و بخت جو آنے داشت  
من ہاں ہستم کہ چشم خوں شانے داشت  
در نیاز بے نہایت نیک شانے داشت  
مسلط الی دانش زان خوش گلداد داشت  
پیش ازین در کوہ آتش مگانے داشت  
من بہ تسلیم در رضا صد گونہ آنے داشت  
بہ ازاں امید از شیریں دہانے داشت  
در چمن چوں با خود آں سر و چہانے داشت  
تیرا اندر دل خود میجو جانے داشت  
تیرا از خرگان و اناہر و گمانے داشت  
ورنہ از ایام ہجر الی فغانے داشت  
آنکہ من اندر وہان خود زبانے داشت  
در رضاے قدس و ذہ آشیانے داشت

قاری ارجمتم ترم بر خاست طوفان عظیم  
غرق گردید آنکہ من با خود چہانے داشت

## ولہ

نفع سونے کعبہ آمدہ تراہم پاکہارا  
 کیست کہ پے برد بکنہ رازینا زوارا  
 سوخت و لم ز شعلہ شمع جہاں رخنے اور  
 دولت خویش از زکوۃ پاک کنند دنیا  
 ملک و لم اسمن بود مرغ چونود شاہ من  
 حوصلہ سے گس کن در نہ گفتار کما  
 ہر دو جہاں نہاد ماست سرزمین طبری  
 بر لب و حود و جنگ و نیت مگر بہانہ  
 در غم ابروئے کسے قبلہ مانا زرا  
 شد سپر بنگلیں بندہ نازا یا زرا  
 جز دل سوختہ کہ یافت لذت این گدا زرا  
 بوسہ لب زکوۃ بہت دولت حق نازا  
 لشکر غم گردنہ عشق آمدہ ترکست زرا  
 دست چو شاہ خود بداد جانشینا زرا  
 پایہ بلند آمدہ من کرشمہ سازا  
 مستی مار فانی کجا جنت نوائے سازا

قاری بے نوا ترا بار کجا بہ بزم ناز  
 ہاں چو کنی دلیل راہ از پے خود نیاز



# اقتباسات

ہندوستان کی معاشی حالت اکچھر صد ہوا جنوا میں تمام دنیا کی ایک معاشی کانفرنس ہوئی تھی جس میں تقریباً ۲۵ ریاستوں کے نمائندہ اور ماہرین فن معاشیات دنیا کی موجودہ معاشی حالت پر غور کرنے اور اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے لئے مجتمع ہوئے تھے۔ اس میں ہندوستان کی طرف سے بھی ایک وفد شریک ہوا تھا جس کے اراکین ڈاکٹر کریم حیدر لودھی کیمبل ہڈوس اور ایک پارسی صاحب تھے۔ اس وفد نے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے جو رپورٹ ہندوستان کی معاشی حالت پر کانفرنس کے سامنے پیش کی اس کے چند اقتباسات ذیل سے ہندوستان کی تجارتی حالت اور تجارت کے متعلق حکومت کا جو رویہ ہے اس کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی معاشی حالت اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات بہت ہی اجمال کے ساتھ بیان کئے جاسکتے ہیں، ہندوستان اس لحاظ سے ایک مقروض ملک ہے کہ برطانوی اور دیگر بیرونی سرمایہ یہاں کی ریلوں، نہروں اور بعض صنعتوں میں اس سے زیادہ لگائے جتنا کہ ہندوستان کا سرمایہ غیر ملک میں لگائے، اس سرمایہ پر ہر سال بڑی بڑی رقم بطور سود کے براہ راست یا کٹری طور پر مطالبات وطن کے نام سے ادا کی جاتی ہیں اس میں چین اور دوسرے قسم کے وہ مطالبات شامل ہیں جن کی ادائیگی اگر بڑی سکوں میں ہونا چاہئے، اس کی مجموعی رقم تقریباً ۴۰ کروڑ روپیہ سالانہ ہوتی ہے۔ ان مطالبات کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہر سال کل برآمد اس کی کل درآمد سے زیادہ قیمت کی ہو بالفاظ دیگر سامان تجارت کی درآمد و برآمد کے توازن ہندوستان کے فوائد قائم رکھ جائے، یہ اس طرح ممکن ہے کہ ہندوستان کے اندر پیداوار و دولت صرف ویت نام سے زیادہ ہو۔ ہندوستان کا رقبہ بھی کونکلا کر برعظم یورپ کے مساوی ہے کل اپنی نصف انسان پانچواں حصہ یہاں آباد ہے، باشندگان کی ضروریات بہت معمولی ہیں جو کسی پیداوار سے چوبیس بار زیادہ

ہیں اور مقامی ضروریات کی تمام اشیاء قرب و جوار سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

اس وقت پیدائش دولت کے لئے ہندوستان کی تمام تر سعی و کوشش بیرونی منڈیوں سے زیادہ ملکی منڈیوں پر مرکوز ہے۔ ہندوستان کی زرعی برآمدات کی کل برآمد کے دسویں حصہ کے برابر ہے حالانکہ یہ عشر کل زرعی پیداوار کا صرف گیارہواں حصہ ہوتا ہے۔ ہندوستان اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے اکثر کثیر آبادی، وسیع رقبہ، اور بیش بہا قدرتی خزانہ اور وسائل کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ ملک کے اندر مختلف صوبوں کے درمیان کسی قسم کی تجارتی و قین اور رکاوٹیں نہیں ہیں، یورپ کی ریاستوں کا اتنی مناسبت نہیں رکھتا جتنی کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے۔

”جہانگیر علی تجارت کا تعلق ہے حکومت کی طرف سے ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جو مواقع ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لئے تھے ان سے کما حقہ فائدہ اٹھایا جائے، وہ مصنوعات جو مقامی محنت اور مقامی سرمایہ سے اور مقامی مواد سے مقامی ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے تیار ہونے لگی تھیں ان کو اس بیرونی سامان کے مقابلہ میں نہ مرنے دیا جائے جو ازاں قیمت پر ہندوستان کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا ہے جو فائدہ از رانی قیمت کی وجہ سے ہندوستان کو ہوتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ ملکی مصنوعات کو زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جائے اور ان کو ترقی دی جائے۔ ہندوستان کی تائینی پالیسی کا بھی یہی مقصد ہے کہ صرف ان مصنوعات کی حفاظت کی جائے جو ایک روز بلا کسی تائین اور امداد کے دنیا کی منڈیوں میں مقابلہ کر سکیں ماسی وجہ سے سرکاری امداد و خواہ درآمدی محصول کے ذریعہ سے خواہ دوسری صورت سے ہو صرف ایک مقررہ زمانہ کے لئے چند خاص خاص مصنوعات کے لئے دی جاتی ہے۔“

”کچھ تو جنگ اور کچھ بعد جنگ حالات کی وجہ سے ۱۹۱۸ء سے لیکر ۱۹۲۲ء تک ہر سال حکومت

ہند کے میٹرنائیٹ میں آمدنی و خرچ کی مقدار۔ مساوی نہ ہو سکی اور برابر خوارہ ہوا ماسی کی کل میٹرنائیٹ تقریباً ایک ارب روپیہ ہوتی ہے مختلف محصولات کے اصفافہ اور مصارف میں تخفیف کر کے حکومت ہند کی مالیات میں آمد و خرچ کا توازن اب دوبارہ قائم کیا گیا ہے، ماسی ان فومی قرضہ ۱۹۳۱ء میں

۱۸ ارب ۶ کروڑ روپیہ اور ۲۲ کروڑ ۷ لاکھ پونڈ تھا، یہ قرضہ اب بڑھ کر ۵۲ ارب ۳۱ کروڑ روپیہ اور ۳۳ کروڑ ۹ لاکھ پونڈ ہو گیا ہے۔

ہندوستان کو آزادی کب ملنا چاہئے؟ اگر فرنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کو نافذ ہوتے اب آٹھ سال سے زائد ہو گئے ہیں، حکومت خود اختیاری کی ابتدائی منزل میں جو تھکرات ہوئے ہیں اور کئی بنا پر آئندہ آزادی کی دوسری خط ملنا چاہئے یا نہ ملنا چاہئے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے زیر دفعہ ۴۲ الف فرنٹ آف انڈیا ایکٹ ۲۴ کم از کم دس سال کی مدت ختم ہونیکے بعد اب ایک شاہی کمیشن تفتیش حالات کے لئے آئیوا ہے، اس آئیواے امتحان کے لئے تیاریاں ابھی شروع ہو گئی ہیں ایک گروہ ہے جو ہندوستانی ہے یا ہندوستان کا بھی خواہ ہے اور برطانوی مواعید پر پورا اعتماد رکھتا ہے، یہ گروہ تقریر تحریر اور ذاتی اثرات کو کام میں لاکر حکومت خود اختیاری کے لئے ہندوستان کی اہلیت کو ثابت کرا چاہتا ہے دوسرا گروہ دفتری حکومت کے ارکان کا ہے یہ جماعت اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستانیوں کو ہر طرح حکومت خود اختیاری کے لئے نااہل ثابت کر چکی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

ڈاکٹر جے، ٹی سنڈرلینڈ امریکہ کے ایک فاضل مصنف ہیں اور چونکہ ہندوستان کی آزادی کے حامی ہیں اس لئے ان کا شمار اول الذکر گروہ میں کیا جاسکتا ہے، آپ کی ایک تصنیف 'ہندوستان' امریکہ اور عالم گیر اخوت کے نام سے شائع ہوئی تھی جو بہت مقبول ہوئی، اب ایک تازہ تصنیف 'آزادی کے لئے ہندوستان کا مطالبہ' عنقریب شائع ہونیوالی ہے، اس

کتاب کے چند ابواب اور ن ریویو میں مل رہی ہیں جس میں مصنف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ، "ہندوستان کو آزادی کب ملنا چاہئے" مصنف کی رائے ہے کہ حکومت خود اختیاری کی قابلیت اور اہلیت تعلیم اور تدبیر سکھانے سے نہیں پیدا ہوتی ہے، اگر امریکہ کے قوم پروردوں نے غلطی نہ کی ہوتی تو انہیں جوئے کا ذہنوں سے نہ مٹا رہنمکا ہوتا اور متغیر رہے کہ برطانوی قوم ہمیں حکومت خود اختیاری کے لئے تیار کر دے تو قیامت تک امریکہ دوائے حکومت خود اختیاری کا اظہار کرنے نہ

جاپان نے حکومت خود اختیاری کی تعلیم اپنی قوم سے نہیں حاصل کی، نہ سیام نے، پھر  
 ہی آج یہ دونوں قومیں ترقی کی جس منزل پر ہیں وہ اظہر من الشمس ہے، ترکی نے اپنی اثر و اقتدار سے  
 آزادی حاصل کر لی اور اب وہ ترقی کی شاہ راہ پر ہے، یہی حال جنوبی امریکہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں  
 کا ہے لیکن ان سب سے زیادہ قابل ذکر امریکہ کے جینیوں کی وہ ترقی ہے جو انہوں نے عرصہ  
 میں آزاد ہونے کے بعد سے کی ہے، اگر ہم لوگوں نے بھی ان سے دہی کیا ہوا جواج اگر زہند و تانیہ  
 سے کہتے ہیں کہ ”جلدی نہ کرو، رفتہ رفتہ قدم اٹھانا چاہئے“ جب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤ  
 تو تم کو آزادی دینگے، تو کیا جیسی آج آزاد ہوتے یا نہ رسال میں بھی وہ آزادی حاصل کر سکتے تھے۔

”دنیا کی ہر آزاد قوم نے محض اپنے تجربہ سے اپنے اور حکومت کرنا سیکھا ہے نہ کہ ایک اپنی حکومت  
 کے سامنے زانو تکر کے، سپہوں نے پیرنا سیکھا ہے، لیکن ہمیشہ پانی میں اتر کر آج ہندوستان بھی صفر  
 پانی کے اندر اترنے کا مطالبہ کر رہا ہے، ایک سال تک اپنے اور در اقتدار حکومت کر کے غلطیاں کر کے  
 اور انکی اصلاح کر کے ہندوستانی قوم سوادع کی وہ تعلیم حاصل کر سکتی ہے جو ہزار برس تک برطانوی آقاؤ  
 اتادہ حکومت سکھلا سکیں گے، کیا آج کوئی شخص مجید راستوں کے اس قول کے خلاف کچھ کہنے کی جرات کر سکتا  
 ہے کہ ہر سال اور ہر ہینہ جو کوئی محکوم قوم ایک استبدادی نظام حکومت کے تحت گزارتی ہے وہ اس  
 قوم کو حکومت خود اختیاری کے لئے اور زیادہ ناقابل اور نااہل بنا دیتا ہے۔“

”میں نے جو کچھ اب تک عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر  
 ”اجنبیوں“ اور آقاؤں کے ذریعے اسکو ”آزادی کے لئے تیار کرنے کا خواب دیکھنا محض ایک دھوکا  
 ہے، اپنی نوع انسان کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے اور اس مضمون کا مطالبہ کرنے والے اور صاحب  
 اسے لوگوں نے اس خیال کی تردید کی ہے جدید تعلیم اور جدید نفس نے اس کی غلطی ظاہر کر دی ہے۔  
 دنیا کی تاریخ میں کہیں بھی یہ تجربہ کامیابی کی تہ نہیں ہوا اور ایسا ہونا قدرتِ مہی ممکن نہیں ہے“ خود سے  
 نیتی میں ”اپنی لوگ کو تیراں کر توبل کی طرح کھڑا نہیں کر سکتے۔ اگر برطانوی قوم ہندوستان کو سکھلا بھی  
 سکے کہ ہندوستان کی طرح ایک نظام حکومت تیار کرے اور جہاں تک ممکن ہو انگریزی نو نہ پر اس کو چلا دے

تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ محض "معمومی" اور غیر فطری ہوگا۔ اور بہت جلد ہی اس کا  
 برطانوی اور ہندوستانی طور طریقے ایک نہیں ہیں، نہ برطانوی ضروریات اور ہندوستانی  
 ضروریات یکساں ہیں، برطانیہ کی دست برداری کے بعد بھی ہندوستانیوں کو اپنے تمام نظام حکومت میں  
 ایسی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی جو ان کے نصب العین کے لحاظ سے سوز و دل اور مناسب ہوں اور ان کی  
 ضروریات کو پورا کر سکیں، برطانوی قوم آخر اس کو محسوس کیوں نہیں کرتی اور بلا مزید اعتقاد اور ایمان  
 و تاخیر کے وہ ملک اس کے جائز داروں کو کیوں نہیں واپس کر دیتی ہے کہ وہ ایک ایسا نظام  
 حکومت بنائیں جو ان کے تمدن ان کی معاشرت اور ان کی ضروریات کے مطابق ہو اور اسی وجہ سے زیادہ  
 مفید اور زیادہ پائدار ہو۔

ہندوستان کے لئے ایک پبلک اسکول [کچھ عرصہ ہو جب حکومت ہند کے شیر قانونی مشر اس کو داس نے  
 ایک پبلک اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جس کی تائید با اثر حلقوں سے کی گئی تھی اور اب کئی لاکھ  
 روپے کا اس کے لئے چندہ بھی جمع ہو گیا۔ مقرب اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے انتظامات بھی شروع  
 ہوئے۔ اسے پبلک اسکول کی اس تجویز پر رسالہ جامعہ میں رائے زنی کی جا چکی ہے۔ کچھ ہم ایک  
 مشہور ماہر تعلیم ریفرنڈیشاوری کی رائے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ  
 "بڑے غلط اور جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان میں ایک خاص پبلک اسکول کے  
 قیام کی تجویز حال میں پیش کی گئی ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس تجویز نے کم از کم مجھے تو افسردہ کر دیا  
 اس لئے کہ اولاً یہ مدرسہ اپنے کثیر مصارف کو جو ہندوستان اپنے خرب ملک کے لئے بالکل ناموزن  
 ہے اور محض املہ کے بچوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ جائے گا جن کے لئے یہ کسی نہ بھی مفید نہ ہوگا۔ ایک  
 ایسی عظیم کی فضا میں تربیت حاصل کریں۔ اسکی وجہ سے انہیں بھیا کبر، خود بینی اور خود غمانی کی خرابیاں  
 پیدا ہو جائیں گی جن کو ان کی جمہوری نظام زندگی میں کوئی نہیں برداشت کر سکتا، جن لوگوں کو پبلک  
 اسکول نظام تعلیم پر پورا اعتماد ہے انہیں ہرگز اس کی جدید تصنیف تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہیے جن میں

اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیشک ایک زمانہ تھا جب پبلک اسکول سے اس قسم کے لوگ پیدا ہوتے تھے جو مملکت کی توسیع اور حکومت میں بہت حصہ لیتے تھے اور مفتوحوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے لیکن اس جدید زمانہ میں اس قسم کی روح طلبہ میں پیدا کرنا محض بے ملادہ ازیں اس طرح کا ناٹکی طریق تعلیم ہندوستان کی روایات کے بالکل خلاف ہے جہاں قدیم زمانہ میں شاہی خاندان کے شہزادے پر ہم چارویں کے پہلو پہ پہلو سادھو مل اور رشیوں کی بھٹیڑی میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے سب سے زیادہ یادگار واقعہ سری کرشنا جی کا ہے جو باجوہ اس کے کہ خود شاہی خاندان سے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا دوست اور مدرسہ کا رفیق سوداگر تھا جو ایک غریب برہمن کا لڑکا تھا۔ اس دوستی اور سادات کی تہہ میں جو بات ہے اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، سرسوتی دیوی نے اپنے مندر میں اہلی اور ادنیٰ کے درمیان کوئی تفریق اور امتیاز نہیں قائم کیا پھر ایک درس گاہ جو صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو جو بڑی فہمیں ادا کر سکتے ہوں اور جہاں کی تعلیم یہ ہو کہ ہمیشہ یورپ والوں کے قدم جو منافرت سمجھا جائے ایسی درس گاہ نہ تو ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام میں کوئی مفید انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور نہ ہندوستانیوں کو وسیع نظر بنا سکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ملک کا ایک ایک پیسہ جو مل سکتا ہو موجودہ ایسی اسکولوں کی اصلاح اور بہتری پر صرف کیا جائے اور ہر ہندوستانی چاہے وہ کسی قدر معزز اور اہلی مرتبہ پر کیوں نہ ہو اس کو اپنی وطن کے خلاف نہ سمجھے کہ اس کا لڑکا ایسی اسکولوں کے دیگر معمولی طلبہ کے ساتھ تعلیم حاصل کرے۔

# تاریخ الامت کا ایک ورق

آخری فاطمی خلیفہ عاصم الدینؒ

۳۵۵ھ سے ۳۶۵ھ تک

جب سے جامعہ علیگڑہ سے دہلی میں منتقل ہوئی اس وقت سے بعض جوابات و تاریخ الامت کا سلسلہ بند رہا۔ اس سال ایک چھٹی جلد بھی لکھی گئی اور کتاب صاحب الکی کتابت کر رہی ہیں انشاء اللہ رمضان شریف تک یہ حصہ پیکر تیار ہو جائیگا۔ اس میں طوفان لوح کے بعد سے ۳۵۵ھ تک کی جس میں خلافت مصر سے آل عثمان کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی مصر کی ایک حالی تاریخ لکھی گئی جو اب تک اردو زبان میں لکھی۔ اسی حصہ کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اہم

خلیفہ فائز بنصر اللہ کی وفات کے بعد وزیر صالح نے فاطمی خاندان کے ایک سن رسیدہ شخص کو خطا کے قابل سمجھ کر بیعت لینے کا ارادہ کیا مگر کسی خیر خواہ نے اس کے کان میں کہا کہ پہلے وزیر راتم سے زیادہ ماضی تھے جو بچوں کو خلیفہ بنا کر خود امور سلطنت کے متولی بن جاتے تھے۔ یہ سنکر اس نے حافظ الدین اللہ کے ایک نابالغ پوتے عبداللہ کو حامد کا لقب دیکر خلیفہ بنادیا اور جمہات سلطنت پر بلا شرکت غیر سے قابض ہو گیا۔ فرید تقریب کے لئے اپنی بیٹی بھی اس کے ساتھ بیاہری اور پیش قیمت جہیز رخصتی کے قیمت اس کے ساتھ بھیجا۔

**قل صالح** | صالح کے استبداد سے لوگ تنگ آ گئے، خاص کر خلیفہ کی چوپٹی۔ اس نے اس نے اپنے چند ملا حوں کو بھیجا جو قصر کی دہلیز میں چپ رہے۔ جب وہ نکلے لگا تو خمر سے اس کا شکم جاک کر دیا۔ لوگ اسکو اٹھا کر گھر لے گئے۔ اور وہ ۱۹ رمضان ۳۵۵ھ کو مر گیا۔ مگر موت سے پہلے خود خلیفہ کے حکم سے اس کی چوپٹی سے اپنا انتقام لے لیا۔

صالح ریشکوہ، فاضل شجاع، نئی اور مدیر تھا فرض شریع کا پابند، لیکن شہسیت میں غلو کرتا تھا حضرت علی کی خلافت کا فاضل پر علماء و فقہاء سے مناظرے کئے۔ اور ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام رکھا

”الا اعتمادی الرد علی اہل الغنادیہ شرعی کتا تھا۔“

مشہد حسینؑ | اسی کے زمانہ میں مصر میں شہد حسین تعمیر کیا گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ امیر الجیش جس زمانہ شام کی جہم پر تھا اس کو معلوم ہوا کہ عتقلان میں امام حسین کا سر مدفون ہے۔ اس نے وہاں ایک قبۃ تعمیر کرا دیا۔ صالح نے اپنے عہد میں چاہا کہ اسکو مصر میں لائے۔ اسی غرض کے لئے قاہرہ کی تحصیل کے باہر ایک مدفن بنایا اور جامع تعمیر کرائی۔ لیکن خلیفہ نے اس اثر شریف کو شہر کے باہر رکھنا گوارا نہ کیا اور اپنے قصر زمردیں اس کے لئے ایک جگہ مخصوص کی۔ وہیں مشہد بنایا گیا جس میں عتقلان سو خاک منتقل کی گئی۔

شاور۔ | صالح کے بعد اسکا بیٹا محی الدین وزیر ہوا جس کو خلیفہ نے ملک مادل کا خطاب دیا مگر وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا اور اسکی جگہ شاور نے لے لی۔

صالح کے آدر دہلی اور پردہ دل کی ایک جماعت تھی جنکا سر غنہ ضرغام تھا۔ اس نے اپنی ساری کوششوں کو متفق کر کے چاہا کہ شاور کو نکال کر خود وزیر ہو جاؤں۔ رمضان ششم ۷۴۰ء میں اس کے محل پر حملہ کیا گیا۔ شاور کا بڑا بیٹا مارا گیا مگر وہ خود بچکر نکل بھاگا اور شام کی طرف چلا گیا۔ ضرغام سندو وزارت پر شکن ہو گیا۔

ضرغام | آپس عقل، شجاعت، کرم، شہس زبانی اور حسن صورت جملہ صفات تھیں لیکن ایک غیبیہ تھا کہ جو حکایت کسی کی سنتا اس پر فوراً یقین کر لیتا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد کسی ذریعہ سے اسکو اطلاع ملی کہ امراء مصر شاور کو بلانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اس بنیاد پر ان سب کو حرن کی تعداد ۴۰۰۰ تھی جو کہ اپنے ہانے سے بلا کر اپنے گھر میں قتل کرا دیا۔ ان رجال دولت کے خاتمہ سے ملک میں بین انحرال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ صلیبیوں نے مصر پر چڑائی کر دی۔ ضرغام نے اپنے بھائی ہام کو مقابلہ میں بھیجا مگر وہ شکست کھا کر بحال تباہ قاہرہ واپس آیا اور صلیبی ایس کے قلعہ میں داخل ہو گئے۔

اسلامی شہر کوہ | شاور مصر سے بھاگ کر سلطان نور الدین کے پاس پہنچا جو اسوقت صلیبیوں کے مقابلہ میں مشرکوں کو قتل کیا اور تمام مسلمانین و نوک اسلام میں قوت و شکست میں سر بلند۔ اور اس سے مدد کا مطالبہ ہوا۔ اس نے مصر کو زیر بار۔ ان رکھنے کے لئے ہوا تو غنیمت سمجھا اور اپنے رفیقوں کو



سے ایک خاص متمدن الدین شیر کو گزشتہ دور کے ساتھ روانہ کر دیا۔

شیر کوہ کے قبیلہ زادہ سے تھاجس کی سکونت مقام دربن ناحیہ آذو بیجان میں تھی۔ اس نے اور اس کے بھائی نجم الدین ایوب نے سلطان نور الدین کے ہمراہ صلیبیوں کے ساتھ جہاد میں اپنی شجاعت اور ریاضت کا اظہار کیا تھا جس سے سلطان کی نگاہ میں انکی خاص وقعت تھی

صلاح الدین | نجم الدین ایوب کا بیٹا یوسف صلاح الدین بھی اس سفر میں اپنے چچا کے ہمراہ مصر کو چلا۔ اس کا باپ بوجہ اس کی کم سنی کے راضی نہ تھا لیکن تقدیر اسکے یوسف صدیق علیہ السلام کی طرح کھینچ کر مصر لگئی کہ وزیر بنا دے۔

یوسف صلاح الدین کی ولادت قلعہ کمریت میں ۳۲ھ میں ہوئی تھی۔ یہی وہ نوجوان ہے جو لگے چکر سلطان صلاح الدین ابوبی فاطمہ جنگ صلیبی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور جس کے کارنامے اسلامی تاریخ کے ادراک کے زرب وزینت بنے۔

سلطان نور الدین صلیبیوں کے حملہ کے خوف سے خود اس فوج کو حدود مصر تک پہنچا کر واپس واپس گیا۔ ۲۹ جمادی الاول ۵۹ھ کو یہ لوگ مصر میں داخل ہوئے۔ ضرغام مغالیہ کے لئے آیا اور ہار گیا۔ شاد و پھر وزیر ہوا۔ اور ایک شلٹ مصر کا خراج سلطان مذکور کے پاس اس کے اس احسان کے معاوضہ میں بھیجے لگا۔

لیکن سلطان کی غرض یہ تھی۔ بلکہ وہ چاہتا تھا کہ فاطمی سلطنت پر جو اتہانی ضعف کو پہنچ چکی تھی جو بعض ہو جائے۔ اس بارہ میں شیر کوہ کو لکھا۔ اس نے شاد سے مشورہ کیا۔ دونوں معنی طور پر اہم متفق ہوئے کہ صلاطی قبضہ کا اعلان کر دیں۔ مگر شاد کے دل میں فیضان نے یہ دوسرہ ڈالا کہ شیر کوہ اور اس کے معنی بھراقیوں کو بھرتے نکال سکتا ہے، اور نور الدین یہاں پہنچ نہیں سکتا۔ پھر کوہ نے اس کے جواب دیا کہ جاتے۔ یہ سوچ کر صلیبیوں کو لکھا کہ تم فوجیں لے کر آؤ اور شیر کوہ کو بھرتے نکالو۔ میں میری مدد کرو۔ ورنہ اگر نور الدین کے قبضہ میں چلا گیا تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کو بہت کچھ مل و سناج دیئے گئے تاکہ وہ کامیاب رہ سکے۔

صلیبیوں نے اپنی جمیت لیکر وھاوا کیا نور الدین کو جب اس کا علم ہوا تو وہ فوجیں لیکر انکی طرف بڑا کہ نہ جانے پائیں لیکن وہ نہ رک سکے کیونکہ انکے لئے یہ خطرہ عظیم اٹان تھا علاوہ بریں امید بھی رکھتے تھے کہ شاید اس نادر موقع پر مصر کو فتح کر لیں۔

شاد کو جب انکی آمد کا حال لگیا تو اس نے شیر کوہ کو لکھا کہ مصر سے چلے جاؤ وہ اپنے لئے عہدہ مصر رہا۔ اور اپنی فوج کو لئے ہوتے بیس میں جہاں سے صلیبی بھاگ چکے تھے جا کر قلعہ گیر ہو گیا۔ شاد نے صلیبیوں کو ساتھ لیکر محاصرہ کیا باوجود اسکے کہ انکی تفصیلیں بلند تھیں اور لذت و صبح و شام کو نکل کر وہ مقابلہ بھی کرتا تھا لیکن تین مہینے پورے گزر گئے اور یہ لوگ اس کا کچھ نہ کر سکے۔

اس درمیان میں نور الدین نے شام میں صلیبیوں کو جا بجا شکستیں دیں اور قلعہ حادم بھی قبضہ کر لیا جو انکا بہت بڑا مرکز تھا۔ جب پیغمبریں مصر میں پہنچیں تو صلیبیوں نے گھبرا کر اپنے گھر کی حفاظت کے لئے مصر سے واپسی کا ارادہ کیا۔ شیر کوہ کو لکھا کہ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو ہم محاصرہ اٹھالیں۔ وہ واقعات سب سے خبر اور قلت و خیرہ سے تنگ تھا راضی ہو گیا۔ اور مصر چھوڑ کر نور الدین کے پاس چلا گیا۔

وہاں تک کہ وہ تک رہا مگر مصر کا خیال اس کے دل کو چین نہ لینے دیتا تھا۔ آخر کار اس نے منقب بہادر و دل کی فتح مرتب کی اور سلطان سے مصر کی اجازت چاہی۔ وہ راضی نہ تھا لیکن اس کے دفتر فوج سے جیو ہو کر اجازت دی اور اپنے چند امیر و دل کو بھی ساتھ کر دیا۔ اس کل جماعت کی تعداد دھڑائی۔ شاد کو جب انکی اطلاع ملی تو اس نے پھر صلیبیوں کو بلا یا۔ وہ بیچارہ کرتے ہوئے پہنچے۔ شیر کوہ نے دیا نیکو کار کر کے بالائی مصر میں پہنچ چکا تھا اسکے پیچھے مصری اور صلیبی لشکروں کا مطرح ہو جیں راتے ہوئے چلے شیر کوہ نے دیکھا کہ میری فوجیں اور غریب الدیار جو۔ ایسا نہ ہو کہ انکے دل جمیوت جانیں اس لئے سب کو جمع کر کے مشورہ لیا۔ بعضوں نے کہا کہ یہاں اگر ہم شکست کھائے اور گمان غالب بھی ہو تو ہمارے لئے کوئی نیاہ کی جگہ نہیں رہا اس ملک کے حامی و شگرمی اور رازداری و طعن و کجی سب جن جگہ ہم کو قتل کر ڈالیں گے اور کوئی بھی بچ نہ بچے۔ چکر و انجمن کے ملکیت میں جو ایک شخص غریب الدین پرش نامی کوڑا ہوا۔ اور بولا کہ بھلا یہاں سے سے تم آئے۔ حال میں یہاں سے چاہئے گیا اپنی سوئی کے ساتھ گھر میں بیٹھے۔ لکھ رہا ہے



کہا کہ ہمارا مصر کی طرف چلنا مناسب نہیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگ ملک کو ہمارے حوالہ نہ کریں گے اور جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ بلکہ یقین ہے کہ نور الدین کو بلائیں گے۔ اس صورت میں اگر شیر کوہ کو اس نے مصر میں بھیج دیا اور خود شام پر چڑھائی کر دی تو سوائے جلا وطنی کے اور کوئی صورت ہمارے لئے نہیں رہ جائے گی۔ لیکن صلیبی امداد نے اس کی بات نہیں مانی اور کہا کہ جب تک نور الدین تیاری کر چکا اس وقت تک ہم مصر پر قبضہ بھی کر سکیں گے۔

اسی اثناء میں مصر کے بعض اعیان و ارکان دولت کے بھی جو شادور کے مخالف تھے اس کے پاس خطوط پہنچے کہ ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اسوجہ سے وہ قوی دلی ہو کر روانہ ہوا۔ اور مصر پر چکر صفر ۶۷۳ھ میں طبرستان کو قتل و غارت سے تباہ کر ڈالا۔ پھر قاہرہ کی طرف بڑھا۔ وہاں کے لوگوں نے اس خوف سے کہ طبرستان کی طرح یہاں بھی قتل و غارت ہو جائے بند کر لئے اور پوری قوت و مدافعت کر لئے۔

خلیفہ مامد نے سلطان نور الدین کے پاس خط بھیجا کہ اس مصیبت سے مصریوں کو نجات دلائے۔ اور خط کے اندر اپنے حرم کے بال بھی رکھ دے تاکہ اسکو ترس آئے۔ اس نے فوراً شیر کوہ کو چھ ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کیا۔ اس کے پہنچتے ہی صلیبی غائب و غاسر شام کی طرف پلٹ گئے۔ لیکن اس جنگ میں نظام الدین علیا عظیم الشان شہر باہر اٹل دیوان ہو گیا جس میں مومنین کے بیان کے مطابق تین ہزار سے زائد مسجدیں تھیں۔

شیر کوہ کے آجانے سے مصریوں کو اطمینان ہو گیا۔ انہوں نے اس کی فوج کی ضیافتیں کیں۔ خلیفہ نے بھی اس کو خلعت اور اس کے سپاہیوں کو انعامات دے۔ البتہ شادور دل ہی دل میں بیچ تاب کھاتا تھا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

ایک بار اس نے جاہلکہ دعوت کے بہانے باکر شیر کوہ کو قتل کر دے۔ مگر اس کے بیٹے ہاں سے مخالفت کی بلکہ کہا کہ اگر تم نے ایسا ارادہ کیا تو میں خود اسکو مطلع کر دوں گا۔ شادور نے کہا کہ اگر ہم اسکو نہ ماریں گے تو یقینی ہے کہ وہ ہم کو مار ڈالے گا۔ بیٹے نے جواب دیا کہ بلا سے تم قتل ہو

مکہ تو مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے گا۔ یہ یاد رکھئے کہ جس دن خیر کوہ مارا گیا اسی دن مصر پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس وقت اگر خود ماضی کی نور الدین کے پاس جاتے گاتے بھی لاکھ ایک ہزاری روکھ لے کر نہو چکا چنانچہ وہ اپنے ارادہ سے باز رہا۔

اسی اثناء میں صلاح الدین نے اطلاع پائی کہ شادریلیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اس لئے اس کو گرفتار کر لیا خلیفہ نے جب سنا تو اس نے بھی اس کے قتل کا حکم دیا لوگوں نے اس کا گھر بھی لوٹ لیا۔ اسی میں اس کا بیٹا کامل مارا گیا۔ خیر کوہ کو اس کے مارے جانے کا براہمنوں ہوا کیا لگا کر وہ زندہ رہتا تو میں اس کو اس کے اس احباب کا اپنے آپ کو میرے قتل سے روکا تھا اچھا بدہ دیتا۔

اس کے بعد خلیفہ نے خیر کوہ کو بلا کر شادری کی جگہ پر وزارت کا خلعت اور فرمان عطا فرمایا لیکن صرف بدھ مینے پانچ دن وہاں منصب پر رہنے پایا تھا کہ ۲۲ رجاوی الثانی ۶۶۲ھ کو انتقال کر گیا ماضی نے صلاح الدین کو اس منصب پر مامور فرمایا۔

موتن الخلافہ

صلاح الدین کے صفات اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے اہل مصر اس کے گرویدہ ہو گئے یہ دیکھ کر اس کے حاکم کو شک آیا جس میں سب سے مقدم موتن الخلافہ تھا۔ یہ خفی غلام قصر خلافت کے جلا مور کا مندر اور خدم و حشم کا سرور تھا۔ اس نے چند مصری امرا کے ساتھ اتفاق کر کے صلیبیوں کے پاس خط لکھا کہ صلاح الدین کو مصر سے نکلنے میں ہماری مدد کرو۔ یہ خط جوتے کے تلے میں سلوا کر ایک غلام کو دیا گیا کہ وہ مخفی طور پر پہنچائے۔ وہ راستہ میں جوتہ ہاتھ میں لئے ہوئے چلا جاتا تھا۔ صلاح الدین کے کسی دی کو خبر ہوا اس نے پکڑ لیا۔ خط برآمد ہوا۔ اور تحقیقات سے ساری کیفیت معلوم ہو گئی۔ موتن الخلافہ نے خوف کی وجہ سے قصر سے باہر نکلتا چھوڑ دیا۔ صلاح الدین خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جوتہ مٹن ہو گیا اور باہر آنے جانے لگا تو اس کو قتل کر دیا۔ پشیدیوں نے غضبناک ہو کر خود کشی کی۔ اور قمریہ بھاسی چڑھ کی جمعیت فراہم کی کہ صلاح الدین پر حملہ آور ہوئے خلیفہ بھی ایک بھروسہ پر شیکرانگی حایت کر رہا تھا۔

صلاح الدین نے غلامانہ زہل کو حکم دیا کہ اس بھروسہ کو جلادیں جب خلیفہ وہاں سے جاکا اس وقت  
شیدائیوں کی جہتیں بہت ہو گئیں صلاح الدین کے بھائی شمس الدولہ نے ان سب کو شکست دیکر توبہ  
وہمق سے فٹا کر دیا۔ اس وقت کو اسکا نام نشان مٹ گیا اور ماضی بھی بے کس و معمول ہو گیا اسکا  
ذکر بھی لوگوں نے چھوڑ دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مصر کو فاطمیوں کے لئے جس غلام نے فتح کیا تھا اسکا نام بھی جوہر تھا اور  
جس کی بدولت اسکا قبضہ جا آ رہا یعنی موتی غلام اسکا نام بھی جوہر تھا۔

صلاح الدین نے اب اہلینان کے ساتھ ملی انتظامات شروع کئے اور سلطان نور الدین کے  
حکم سے محرم ۶۷۷ھ کے پہلے جمعہ میں مصر میں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ کا خطبہ رائج کیا۔ اس وقت  
سے فاطمی خطبہ منقطع ہو گیا۔ ماضی مرض الموت میں تھا صلاح الدین نے مناسب نہ سمجھا کہ ایسی حالت  
میں اس کو اس خبر کی اطلاع دے جو اس کے لئے رنج کا موجب ہوگی۔ چنانچہ وہ بلا اس  
علم کے ماضی راہ کے دن گزر گیا۔ اسی موت سے فاطمی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ ماضی کے معنی یہ ہیں۔  
میں قاطع کے ہیں۔

ماضی نہایت فاطمی خبیثہ تھا اور سنیوں کے خون کو حلال سمجھتا تھا۔

# شذرات

سال ختم ہو رہا ہے اور اس موقع پر میں اپنے سال بھر کے کام کا تبصرہ کرنا ہے۔ رسالہ عوام وقت پر نکلتا رہا۔ البتہ اکتوبر کے پرچے میں اتنی دیر ہوئی کہ اُسے نومبر کے پرچے کیساتھ نکالنا پڑا۔ اسکا سبب جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ ٹائپ میں چھپنے کا تجربہ تھا جو چند وجوہ سے ناکامیاب ہوا۔ اب انشا اللہ رسالہ ہمیشہ وقت پر نکلے گا۔ معنائیں اس سال مجموعی حیثیت کے سال گذشتہ سے بہتر تھے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ آئندہ سال اس سے زیادہ دلچسپ اور بلند معنائیں پیش کئے جائیں۔ ظاہری خوبیوں کے اعتبار سے بھی ترقی ہوئی اور انشا اللہ اور ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام آئندہ سال بھی ایسی قدر دلچسپی کا اظہار کرتے رہیں گے۔ جتنی انہوں نے اس سال ظاہر فرمائی ہے۔ ان سے یہ بھی التجا ہے کہ اس رسالے کے پھر بچنے ہی اپنا سالانہ چندہ یا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں یا دی پی بی بھیجے کی اجازت دیں۔ جو حضرات جنوری کے بعد خریدار ہوئے ہیں، انہیں ابھی چندہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

مجموعی گزشتہ اشاعت میں عرض کر چکے ہیں کہ جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کا از سر نو انتظام کیا گیا ہے اور اسکا نام اردو اکادمی رکھا گیا ہے۔ اس اکادمی کی نگرانی میں اس سال تین کتابیں چھپیں اور چھ سات کتابیں چھپنے کے لئے تیار ہیں۔ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے ایک سال میں پچھ سے زیادہ کتابوں کا چھپنا دشوار ہے۔ مالی اعتبار سے اکادمی کے کام میں آسانی پیدا کر لینے کے مناسب معلوم ہوا ہے کہ اکادمی محدود دست حضرات کو اپنا ممبر بنے جو اس کی تمام مطلوبات کے خریدار بن کر اس کی مالی مدد فرمائیں۔ اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ جو حضرات اکادمی کو کم سے کم دو روپیہ یا چندہ دیں وہ اس کے مجبور قارئین بن جائیں اور انہیں رسالہ جامعہ پڑھنا تعلیم اور اکادمی کی مطلوبات بن کی تعداد سال میں پچھ سو پچھپنے کے بعد فوراً بھیجی جائیں۔ چندہ دہائی یا سٹشیا ہی پیشگی

صول کیا جائے گا۔ دبیر کی تعطیل میں ایک وفد جس میں ڈاکٹر سید عابد حسین ناظم اکادمی اور عبد الحلیم حراری صاحب رفیق اکادمی شامل ہیں صوبہ متحدہ کے بعض شہروں کا دورہ کریں گے تاکہ علم دوست حضرات کو اکادمی کا مہر بنائے۔

رسالہ جامعہ اب اکادمی کا آرگن قرار دیا جائے گا۔ اور اس میں اُس کے کام کی تفصیل چھپتی تاکہ سب ہی میں تباہی مگر اس سے امید ہے کہ وہ خود اکادمی کے ممبر بنیں گے اور اپنے دوستوں کو بتائیں گے تاکہ اُن کے پاس دو مفید رسالے اور چھ اعلیٰ درجہ کی کتابیں ہر سال پہنچتی رہیں۔

فرانزوائے افغانستان شاہ امان اللہ خاں ادام اللہ ملکہ و اقبالہ کی ہندوستان میں تشریف آوری بھی موجودہ عہد کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ جس وقت سے کہ حضور مروج نے ہماری سرحد میں قدم رکھا یہ معلوم ہونے لگا کہ ہندوستان کے کل باشندوں کے جسم میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک جہتی لہری دوڑ گئی خصوصاً کراچی اور بمبئی کے لوگوں نے تو اپنے معزز بھائی کے استقبال میں ایسے جوش کا اظہار کیا کہ تیسرا آج تک کسی نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان غلام ہے لیکن میں آزادی کی تمنا رکھتا ہے۔ منتشر ہے لیکن اتحاد کا آرزو مند ہے۔ سیاست میں طفل مکتب ہے۔ لیکن دولت دشمن میں تیز کر سکتا ہے۔ اس نے جب اسے ایک ایسے اولوالعزم بادشاہ کی مہمانداری کا فخر حاصل ہوا جس نے اپنے ملک کو بزدل شیر آزاد کیا ہے جس نے اپنی رعایا کے مختلف فرقوں کو یکایک و کرم متحد کر لیا ہے اور جس نے ہمیشہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ محبت و اخلاص کا ثبوت دیا ہے تو اس کے مردہ جسموں میں جان پڑ گئی اور اُس نے آپس کے منافقوں کو پس پشت ڈاکٹر متحدہ آواز سے دھمکانے لگا۔ حضرت بلینہ کے جو حامدوں کے دل میں تیر بن کر پیوست ہو گئے خدا بکر سے یہ جوش مخزن جاری ہے۔ حضرت ثابٹ جو بگڑے دلوں میں اسکا اثر ہمیشہ باقی رہے۔

حضور مروج نے جامعہ علیہ کے پانچاٹھ کے جواب میں جو قابل قدر الفاظ فرمائے ہیں وہ



ہمارے لئے ازبکستان کا سرمایہ ہیں۔ خدا میں یہ توفیق دے کہ ہم اس تعریف کے مستحق ثابت ہوں اور ملت اسلامیہ کو یہ توفیق دے کہ وہ ہماری درسگاہ کی بنیادوں کو اپنی متفقہ مدد سے مضبوط اور مستحکم بنادے۔ آمین۔

ہمارے ملک میں ایک اور پہلی کمی آیا ہوا ہے جو تاج و تخت کا مالک تو نہیں لیکن ملک علم و دانش کا فرما زرا تصور ہے۔ پروفیسر انترش لودرس جو معانی ذوق محترمہ کے کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر ہندوستان تشریف لارہے ہیں۔ جرمنی کے فضلاء میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ملکرت اور ہندو قدیم کے آداب کے معرالم ہیں اور برلن کی یونیورسٹی میں انڈالوجی (ہندیات) کے استاد خصوصی ہیں۔ آپ پندرہ سالہ میں کوٹنگن یونیورسٹی میں سنسکرت کے گجرا وقرر ہوئے تھے۔ علامہ عین رائیگ میں اسی زبان کے پروفیسر ہوئے اور علامہ عین رائیگ سے کیل یونیورسٹی چلے گئے۔ پندرہ سال سے آپ برلن کی یونیورسٹی میں ہیں۔ اسی سال پردیشیائی اکادمی نے آپ کو انبارکن ہونر کیلڈورٹ میں سکرری منتخب کیا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو جرمنی میں نہایت قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔

پروفیسر لودرس پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں ذیل کے موضوع پر چھ لکچر دیں گے۔  
۱۔ ہندو لائیسز کا آثار قدیمہ کا اکتشاف اور اس کا تعلق ہندوستان کے آداب و تمدن کی تاریخ  
۲۔ کلکتہ سے روانہ ہو کر پروفیسر صاحب تمام ہندوستان کا دورہ کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر شہر میں جہاں آپ تشریف لیجائیں گے ارباب علم آپ کا تہ دل سے غیر مقدم کریں گے اور ثابت کریں گے کہ ہندوستان بے مبالغہ کی کچی قدر کرتا ہے۔

ہمارے پورا خیال ہے کہ اگر اس ماحول میں کوئی شخص ملک محکم ہوا اس کا صاحب نے رات کو سوچا  
میں ایک شخص کو دیکھا جس نے دینی بن کر دین کی تعلیم صاحب کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص کا دل ہوا  
میں ایک شخص کو دیکھا جس نے دینی بن کر دین کی تعلیم صاحب کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص کا دل ہوا



**ایک فلسفہ اسلام** از ڈاکٹر سعید حسین ایم

الہند کے مشہور فلسفی اور شرق و غرب کی بڑی  
نامور نقد تصنیف کا براہ راست جرمن سے سلیس اردو  
ترجمہ جو اعلیٰ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت صرف ۶۰۰۰۰۰

**آینح الدین** غلام نبی امین نبی عباس کے

علامہ جامعہ زیدیان مترجم مولانا نیاز فتح پوری ...  
آینح قدیم قدم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر  
آینح ہندیم لیکن نہایت جامع خاکہ سوانح قدیم  
ملائق مطالعہ از ایم پانیکار (اردو ترجمہ) قیمت ۶۰۰۰۰۰

**تاریخ نجد مولانا امیر جبر جبروری کی تازہ تصنیف قیمت ۶۰۰۰۰۰**

**قواعد عربی** مصنف اردو زبان میں عربی شہر  
پر نہایت مستند اور مکمل  
کتاب ہر از علامہ سورتی استاد جامعہ قیت ۶۰۰۰۰۰

**مبادی معاشیات** علم المعیشہ (اکنامکس) پر  
مبتدیان کے لئے نہایت مفید و مستند کتاب از ڈاکٹر حسین  
مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم پی پی ایچ ڈی ۶۰۰۰۰۰

**لی خواجہ مرحوم کامل دیوان** مع نوٹوں و تعلیقات مضبوط جلد، عمدہ طباعت سائز بڑا (زیر تیاری) قیمت ۶۰۰۰۰۰

**سہ ماہی حضرت میر تقی میر کے کلام کا دلکش انتخاب**  
حالات و مقدمہ میں آپ کی خصوصیات و  
تمایزات شاعری پر کچھ بحث ہو اور مولانا نور الرحمن صاحب  
نے اسے ایک خوبصورت و مضبوط جلد عہد کیا۔  
دنیا کے بننے والے غیر کچھ مضمون ہے

**مقدمہ شاعر شاعری** خواجہ حالی مرحوم کے دیوان کا مقدمہ  
بمشاورہ شاعری کی مشاعرہ نہایت دلچسپ و لطیف  
مع نوٹ و عمدہ طباعت خوبصورت جلد زیر تیاری قیمت ۶۰۰۰۰۰

لیکن ہمیں جناب شیر حسین صاحب زیدی بی بی کے کتب  
دار علیہ السلام یونیورسٹی اسکول علی گڑھ نے اس پر کچھ  
نیشنل انوائس کیا اور ان کے ہاتھوں کے حالات لکھے  
ہیں کہ شاعری کے بغیر شاعری نہیں جانتا۔ یہ جلد ابھی  
چھاپا اور نہایت اعلیٰ طباعت پر شائع ہو گا۔ قیمت ۶۰۰۰۰۰

**بدائع سعدی** کا نہایت مستند و پرکیزہ  
نثر مطبوعہ جرمنی قیمت ۶۰۰۰۰۰  
**ترکوں کی کہانیاں** بحوالہ کتب خانہ  
جسے شیخ محمد داود صاحب مسلم کی سیرت پر مبنی ہے  
اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں قیمت ۶۰۰۰۰۰

# تاریخ الامت

(از حافظ محمد عالم صاحب امتیاز و ناشر)

تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ سیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں بالکل پہلی مرتبہ طرز بیان نہایت سادہ اور زبان سید آسان عام فہم جس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ کتاب باب کا داخل نصاب ہو رہی ہے۔ مکمل سیٹ کی قیمت ۷۰/-  
حصہ اول سیرۃ الرسول ص ۱۰۰ خلافت راشدہ ص ۱۰۰  
حصہ دوم خلافت بنی امیہ ص ۱۰۰ خلافت عباسیہ ص ۱۰۰  
حصہ پنجم عباسیہ بغداد ص ۱۰۰

# تفسیر القرآن

(از خواجہ عبدالحی صاحب امتیاز و ناشر)

قرآن کریم کی اس سب سے تفسیر اب تک اردو میں نہیں تھی خواجہ صاحب کا یہ کارنامہ یقیناً اسی مقبولیت اور قدر دانی کا مستحق تھا جو اسے حاصل ہوئی  
لکھنؤ تفسیر سورہ بقرہ قیمت ۱۰/- جلد ۱  
اصطلاح مستقیم تفسیر سورہ انفال و توبہ ۱۰/-  
بیان تفسیر سورہ آل عمران ۱۰/-  
سبیل الرضا تفسیر سورہ ہجرات ۱۰/-  
عبرت تفسیر سورہ یوسف ص ۱۰/- بران تفسیر سورہ نورہ ص ۱۰/-

# دیوان غالب

مطبع شرکت کا دیوان برلن (جسٹری)

اسکی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلا ایڈیشن صرف ۱۰ ماہ کے اندر ختم ہو گیا۔ دیوان مکمل ہے۔ مزید اضافہ کا خود فوجہ مقدسہ غزلیات، قصائد وغیرہ سب میں ملے گی  
نفاست صوفیہ کے متعلق ہے۔ شروع میں فارسی زبان میں  
اب نون فوٹو لکھنؤ کی تقریر جن ہر مندی کا نمونہ ہے۔  
یہ وہ عقلیت فن و مانیسی کا اعلیٰ نمونہ تعلیم نوان  
اور یہ ہر قوم کے لیے ایک اعلیٰ ملی طبقے کے سربراہ  
ہوئے اردو میں پہلی مرتبہ ایسا از و فکر سید عین امین  
نے لکھا۔ ڈی ماسٹر کی قیمت ۱۰/-

# دیوان شیدا

مالیہ نایب سراج الملک حکیم محمد اعلیٰ صاحب رحمہ

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ  
حکیم صاحب قبل کی دوسری نمایاں خصوصیات کے دریاغ  
ہو لیکن اگر آپ انہیں ایک مینا شاعر کے پیکر میں دیکھنا چاہیں  
تو یہ اور نگار سے طلب سمجھو جو دیوان غالب کی طرح عربی میں  
دیوانی حین اور دیدہ زیب چھاپا اور ایسی ہی جلد قیمت ۱۰/-  
یہ اور نگار سے سجاد علی انصاری مرحوم کے  
محشر خیال ناقدانہ اور لطیف مضامین کا دلکش مجموعہ  
ہو چکے ہیں صرف چند نمونے باقی ہیں فوراً منسلک ہو کر  
عرصہ کی تیار کرنا ہوگا تفسیر کا قدر و قیمت ۱۰/-

# علی گڑھ میگزین کا نو کوشن نمبر

ہندوستان کے مشہور اور ممتاز رسالہ علی گڑھ میگزین کا نو کوشن نمبر خاص اہتمام اور نہایت آب تاباً دسویں جنوری ۱۹۲۶ء میں شائع ہوگا اس پرچہ میں تعادیر کے علاوہ ملک کو متاثرانہ ساز و سازوں کے مضامین اور بلند پایہ شعروں کے انکار و ایشیہ شائع ہونگے اس پرچہ کی ضخامت بھی غیر معمولی ہوگی اور اردو کے کتب طباعت کا سرسبز نظریہ نمونہ ہوگا۔ تمام اہل علم و ادب اور خصوصاً ان اہل علم و ادب کا تعلق مسلم یونیورسٹی کی حیثیت اور لڈ بوائز ماسٹر اسٹڈی مالکی جانی ہو کہ اپنے ماور علی کو اس سال کے خاص نمبر کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں مضامین اور جملہ نظم و نثر صاحب علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پتہ پر جلد از جلد پہنچا جائیں۔

خوداری و والدہ حیرت آہنارات کے واسطے منبر صاحب علی گڑھ میگزین کے پتہ پر جلد از جلد پہنچا جائیں۔

منبر علی گڑھ میگزین